ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
ستمبر 2015
منی نہیں گیتا - ایدھی سنٹر کی گونگی گیتا جو اپنوں میں پہنچنے کے لیے کسی معجزے کی منتظر ہے

کے قلم سے ستمبر 2015ء کے شمارے میں منفرد صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

کبھی خوشی امیدی اور کبھی مایوس کن جذبات میں

الجھی زندگی کے تیکھے انداز... آپ کی دلچسپی کا ہر رنگ لیے

جلد 25 ❖ شمارہ 08 ❖ ستمبر 2015ء

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد عفان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی نازش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن
ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ،
کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اس بات میں دو رائے نہیں ہے کہ تحریک پاکستان کی کامیابی شعور و آگہی کی رہینِ منت ہے۔ اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا پرچم نہ سنبھالتے، برصغیر کے قریہ قریہ میں بکھرے ذی شعور افراد قلمی جہاد کو تیز نہ کرتے تو شاید قیامِ پاکستان کا معجزہ 1947ء میں ظہور پذیر نہ ہوتا، مزید انتظار کرنا پڑتا۔ سیاست اور قلمی جہاد نے مل کر ہی مسلمانانِ برصغیر کو بیدار کیا تھا۔ یہ صرف قیامِ پاکستان کی تاریخ نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ تعلیم کا زیور ہی قوم کو عروجِ وقت کا خطاب دلاتا ہے، ترقی کی معراج پر پہنچاتا ہے لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے پاکستان کی شکل میں تحفہ خداوندی تو حاصل کرلیا لیکن تعلیم کی اہمیت کو نظر انداز کرتے رہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک ہم یہی دیکھ رہے ہیں کہ تعلیم پر بھرپور توجہ نہیں دی گئی بلکہ اس راہ کو دشوار ترین بنانے کی کوشش ہی ہوتی رہی۔ سازشوں کا جال بُنا جاتا رہا۔ سرکاری اسکولوں کی کارکردگی صفر بنادی گئی۔ اس کے مقابلے میں پرائیویٹ اسکولوں کا جال بچھایا گیا، انہیں مراعات دی گئیں اور پھر ان میں بھی کئی کئی درجے بنائے گئے۔ اس طرح عام لوگوں کی پہنچ سے تعلیم کو دور رکھنے کی سازش ہوئی کہ معمولی حیثیت کا آدمی مہنگی تعلیم کا بوجھ اٹھا ہی نہ سکے جب کہ کئی ممالک میں اس قسم کی سازش کو سرکاری سطح پر ناکام بنایا گیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق بھارت کے الہ آباد ہائی کورٹ نے سرکاری افسران پر پابندی لگادی ہے کہ اگر انہوں نے سرکاری اسکول کی بجائے بچوں کو کسی مہنگے اسکول میں داخل کرایا تو وہ جتنی فیس اس اسکول کو دیں گے اتنی ہی رقم سرکاری خزانے میں بھی جمع کرائیں گے۔ ورنہ بچوں کو سرکاری اسکول میں داخل کرائیں، اس حکم نامے سے فائدہ یہ ہوا کہ سرکاری اسکول کی گرتی ہوئی ساکھ سنبھل گئی۔ کیا ایسا ہی کوئی قانون ہمارے ہاں بنایا نہیں جاسکتا؟ اگر ایسا ہوا تو سرکاری اسکولوں کی کارکردگی تو بہتر ہوگی ہی ساتھ تعلیم کا معیار بھی اعلیٰ ہوجائے گا اور تعلیم کو جو لوگ کاروبار کی شکل دے رہے ہیں ان کی بھی حوصلہ شکنی ہوجائے گی۔

معراج رسول

ہمارا ہیرو

برصغیر کا سیاسی آسمان دھواں دھواں ہوتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کی آبادی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ہندو اور مسلمانوں کے دلوں میں دراڑ گہری ہو گئی تھی۔ مشرقی بنگال کے ضلع نواکھالی کے مسلمان مضارع نے ہندو زمینداروں کے ظلم پر بدلہ لینے کے لیے ان کے مکانات پھونک دیے تھے۔ گنتی کے گھر جلے تھے مگر گاندھی نے کلکتہ پہنچ کر اس وقت کے وزیر اعلیٰ بنگال حسین شہید سہروردی کے سامنے دہائی دینا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں پر بہت ظلم کیا ہے۔ چل کر وہاں کا دورہ کریں۔ جب وزیر اعلیٰ جائے گا تو پریس بھی ساتھ چلے گا۔ گاندھی کی منشا بھی یہی تھی۔ نواکھالی کے اس حادثہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور اس کے جواب میں کلکتہ میں ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا جس کا دائرہ بڑھتے بڑھتے اڑیسہ، آسام اور بہار تک پھیل گیا۔ اور پھر اس فساد نے پورے ہند کو لپیٹ میں لے لیا۔ بہار سے یوپی اور پھر پنجاب تک پہنچ گیا۔ ہندو مسلم ایک دوسرے کو مارنا کاٹنا شروع ہو گئے۔ اسی افتاد کے دور میں بلکہ اس سے کچھ ہی پہلے 1940ء میں لدھیانہ کے ایک مسیحی گھرانے میں ایک بچے نے جنم لیا۔ بچے کا باپ پری مڈل کوٹ ایک خدا پرست شخص تھا۔ اس دور میں پنجاب کا سب سے بڑا شہر لاہور تھا۔ پنجاب، سندھ، پختونخواہ اور بلوچستان سے لوگ قسمت آزمانے یہیں آتے تھے۔ پری بھی لدھیانہ سے اپنی آنکھوں میں امید کے دیپ سجائے یہاں آیا تھا۔ اس کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ جب ہندو مسلم فساد کی آگ پورے برصغیر میں پھیل گئی تو پری کی بیوی ڈیزی مڈل کوٹ نے شوہر کو خط لکھا کہ وہ جلد اپنے گھر آ جائے۔ خط دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ لدھیانہ ہر حال میں انڈیا کی جھولی میں گرنے والا تھا جب کہ لاہور پاکستان کے حصے میں آتا۔ اس نے کافی غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ انڈیا میں رہائش صحیح نہیں۔ پاکستان ہی مناسب ہے اور وہ بیوی بچوں کو لانے کے لیے نکل پڑا۔ وہ وقت ایسا تھا کہ کوئی کسی کو پہچان نہیں رہا تھا۔ انسانیت مر چکی تھی اور صرف حیوانیت زندہ رہ گئی تھی۔ ہر جانب لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ وہ زندگی کو ہتھیلی پر لے کر لدھیانہ پہنچا اور بیوی سے بولا کہ جلدی کرو۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت نکلنا ہے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ اعلان بھی ہو گیا ہے اب وہی ہمارا ملک ہے۔ مگر وہ تو مسلمانوں کا ملک ہے، بیوی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ بیوی کا جواب سن کر اس نے کہا' ہندو کافر ہیں اور مسلمان خدائی دین کے ماننے والے۔ مسلمان ہمارے بھائی ہیں اور ہندو بنیا صرف اپنا مفاد سوچتا ہے۔ اس لیے ہمیں مسلمانوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اور وہ زبردستی بیوی بچوں کو لے کر پاکستان آ گیا۔ راستے میں کن مصائب کا سامنا کرنا پڑا یہ الگ کہانی ہے۔ لاہور پہنچ کر اس نے راحت کی سانس لی۔ اسے فکر معاش تھا نہیں۔ اس لیے کہ لاہور میں اس کے کام سے سب واقف تھے۔ جلد ہی اس نے پھر سے خود کو سیٹ کر لیا۔ بیٹے کو اس نے شہر کے ایک اچھے اسکول سینٹ انتھونی ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ بیٹا بھی باپ کی طرح تیز تھا۔ اچھے نمبروں سے کامیابیاں حاصل کرتا چلا گیا۔ میٹرک کے بعد اسے لارنس کالج گھوڑا گلی، مری بھیج دیا گیا۔ اس کالج کا ایک نام تھا اور بیٹا بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے کسی اچھے کالج میں داخلہ دلایا جائے۔ لارنس کالج میں ہر کس و ناکس کو داخلہ ملتا نہیں تھا۔ مگر اس کے نمبر اتنے اچھے تھے کہ اسے فوراً داخلہ مل گیا۔ کالج کی تعلیم کے دوران میں ہی اس نے ائرفورس میں داخلے کی درخواست بھیجی۔ اسے بھی مقابلے کے امتحان میں بیٹھا لیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ذہین ترین بنایا تھا۔ اس امتحان میں بھی وہ کامیاب ٹھہرا اور اسے ہوائی فوج میں شامل کر لیا گیا۔ 1954ء میں اس نے پاس آؤٹ کیا۔ جس میں اسے بیسٹ پرفارمنس آن گراؤنڈ ڈیوٹی کا اعزاز بھی ملا۔ ہوائی مستقر پر اسے ایک منفرد ہواباز کہا جاتا تھا۔ اس نے بہت قسم کے جہاز اڑائے مگر وہ ماسٹر آف F104 کہلاتا تھا۔ 27 ستمبر 1957ء کو اس نے کراچی کی جینی نامی لڑکی سے شادی کر لی اور 21 اکتوبر 1959ء کو خدا نے لیزلی این نامی بچی کا باپ بنا دیا۔ اب لوگ انہیں عزت سے مخاطب کرنے لگے تھے۔ 1965ء میں وہ فلائٹ لیفٹیننٹ بن چکے تھے۔ اسی دوران میں بھارتی بزدلوں نے رات کے اندھیرے میں پاکستان کی پاک سرزمین پر حملہ کر دیا۔ اس وقت وہ مسرور بیس پر تھے۔ انہیں خبر ملی کہ دشمن نے کراچی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ F-86 لے کر دشمنوں پر جھپٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے دو انڈین طیاروں کو مار گرایا۔ ان کی بہادری پر ہر کوئی اش اش کرتا تھا۔ ان کی جرأت و بہادری پر انہیں تیسرا سب سے بڑا فوجی اعزاز ستارۂ جرأت دیا گیا۔ ان کی بہادری کے قصے لوگ دلچسپی سے سناتے سنتے تھے۔ ان کی بچی چھوٹی تھی۔ اسکول میں کسی بچی نے اسے کہہ دیا کہ یہ ملک مسلمانوں کا ہے، تم لوگ کرسچن ہو یہاں سے نکل جاؤ۔ بچی روتی ہوئی گھر واپس آئی۔ ماں نے سنا تو بھڑک گئی۔ اس نے شوہر سے مطالبہ کر دیا کہ پاکستان سے یورپ منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انہوں نے وہ تاریخی جملہ کہا جو اپنے اندر گہرائی و گیرائی لیے ہوئے ہے۔ ''ایسا جاہل لوگ کہا کرتے ہیں' یاد رکھو یہ ملک ہم سب کا ہے۔ اس ملک میں میرے والدین کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اس ملک کی حفاظت میں میرا بھی کردار رہا ہے۔ اور ایک دن اس ملک کی حفاظت کے لیے میں اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔ آئندہ ایسا جملہ زبان پر بھی نہ لانا۔'' 1971ء کی جنگ پاکستان پر تھوپی گئی اس وقت وہ اردن کے دورے پر تھے۔ حکومت نے ان سے درخواست کی کہ وہ پاکستان آ جائیں۔ وہ فوراً واپس آ گئے اور جنگ میں شامل ہو گئے۔ واپسی کے دوسرے ہی دن جوابی حملے کا پروگرام بنا اور حملے کا مرکز امرتسر کا ریڈار ٹھہرا۔ انہوں نے نہایت کامیابی سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس ریڈار کو تباہ کر دیا۔ 12 دسمبر کو انہوں نے جام نگر پر حملہ کیا اور دشمنوں کے کئی جہازوں کو زمین پر ہی تباہ کر دیا۔ لیکن جب وہ واپس آ رہے تھے تو انہیں بھارتی طیاروں نے گھیرنے کی کوشش کی اور میزائلوں سے حملہ کیا۔ دو میزائلوں سے تو انہوں نے خود کو بچا لیا مگر ایک میزائل جس کے بارے میں انڈین فلائٹ لیفٹیننٹ بھارت بھوشن سونی کا دعویٰ ہے کہ اس نے فائر کیا تھا۔ وہ اس کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے جلتے ہوئے جہاز سے چھلانگ لگائی تھی مگر وہ اس وقت بحیرۂ عرب پر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شارک مچھلیوں کا گڑھ ہے۔ کیونکہ ان کی لاش مل نہ سکی۔ بعد میں انہیں ایک اور ستارۂ جرأت دیا گیا۔ ان کا کہا سچ ہو گیا کہ ایک دن وطن کی خاطر میں جان بھی دے دوں گا۔ اس عظیم مرد مجاہد کا پورا نام میرون لیزلی مڈلکوٹ ہے۔

شہرِ خیال

☆ منظر علی خان کا تجزیہ لاہور سے۔ ''مسائل وطن ہمارے معاشرتی مسائل اور اخلاقی صورتِ حال کا عکاس ہے۔ اخلاقی طور پر پاکستانی معاشرہ پستی کی پاتال کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ آج سے تیس برس پہلے ایسا نہ تھا۔ ''ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی''۔ زر پرستی نے تمام اخلاقی اقدار اور رشتوں ناطوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ ''میں برہمن'' کے عنوان سے کہانی خوب ہے۔ شک اور وسوسہ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ کسی کے اتنا قریب مت ہو کہ ٹھوکر کھاؤ اور ٹھوکر کھا کر سنبھلنے کے لیے دوسروں کو عزت اور تکریم دینا ضروری ہوتا ہے۔ خریدی ہوئی شے کبھی بھی پائیدار نہیں ہوتی۔ ''منی بدنام ہوئی'' پسند آئی۔ ''دو گھڑی کی قربت'' دھوکا بھی دے سکتی ہے مگر کردار کو پرکھنا انسانی نظر سے ضروری ہے۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ظاہر کا باطن مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ ''خطِ تنسیخ'' میں متواتر غلطیوں نے جیل پہنچا دیا۔ کاش ثمرہ احمد جذباتی نہ ہوتیں۔ ''سوری'' کہہ دینے سے کسی نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی مگر حوصلہ رکھیے وقت کرتا ہے پرورش برسوں۔ حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔ ''رشتوں کا کرب'' خاندانی بدمزگیوں کی کہانی ہے۔ اس انتہا تک حد لالچ اور کینہ ہی لے جاتا ہے۔ فیصل کو بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کوئی اچھا حل مل سکتا تھا۔ ''لارڈ کلائیو'' ایک کلرک سے کیسے وائسرائے بنا۔ قومی جذبوں میں اخلاقیات کو روند ڈالا۔ مکر و فریب سے جو کھیل کھیلا۔ اس کا نقصان اس کی قوم کو بھی پہنچا۔ یہ کوئی اچھی تاریخ نہیں ہے اور برصغیر کے باسیوں کو بھی آپس کی لڑائیاں اور لالچ لے ڈوبی۔ ''اگست کی شخصیات'' اچھا سلسلہ ہے۔ ''لفظ پاکستان کا خالق کون'' تحقیقی تحریر ہے۔ آپ نے یومِ آزادی کو بھی متنازع بنا دیا۔ ''صوفی'' پسند آیا۔ ''مساوات'' اسلام کا خصوصاً ہر مذہب کا عموماً درس ہے مگر کیا کیمونزم میں کیمونسٹ پارٹی کے چھ سو اسی جنرل سیکریٹریز کی اجارہ داری معاشرہ کو جس جبر اور ظلم کی طرف لے جاتی ہے وہ بھی انصاف نہیں ہے۔ تعصب سے آزاد معاشرہ بہت ضروری ہے۔ کسی بھی قوم کے بنیادی عوامل میں وطن، مذہب، زبان، نسل، ثقافت، رسم و رواج وغیرہ ضروری ہیں مگر یہاں یکجہتی کا فقدان ہے۔ قوم کی بنیاد کو کھوکھلا کرنے کے بعد معاشرتی روابط کیسے قائم رہ سکتے ہیں۔ کاش کوئی آ کر قوم کو قوم بناتا۔ ''تاریخ عالم'' معلوماتی ہے۔ ان کا تسلسل جاری رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنی کم علمی کا اعتراف ہے مگر دنیا کے مختلف ممالک میں زبان نسل ثقافت کیا تھی۔ قطبین کے ہر پچاس ہزار سال بدل جانے کی کہانی کیا ہے۔ برفانی دور کتنی بار آیا۔ مختلف موسموں کے اثرات کیا تھے۔ طوفان نوح کیا تھا۔ پوری زمین پر آیا یا کچھ حصے پر۔ حامی، سامی یافث کی اولاد کہاں رہی؟ آرین سے پہلے دراوڑ کہاں سے آئے۔ ان کے اثرات کیا ہیں۔ غرض یہ کہ بہت کچھ کہنے سننے والا ہے۔ ''شکاریات'' کا دلچسپ سلسلہ جاری رکھیے گا۔ ''سراب'' کا سلسلہ جاذبِ نظر ہے۔ ''احسان'' اچھی کہانی ہے۔ امریکن بھی اتنے اچھے ہو سکتے ہیں۔ ورنہ دہشت و بربریت میں تو ان کا جواب نہیں یہ صدیوں کی بات ہے۔ اب آتے ہیں ''شہرِ خیال'' کی طرف۔ اعجاز حسین ستار صاحب یاد آوری کا شکریہ، ہم عاجزی اور انکساری کو ہی ماحصل زندگی سمجھتے ہیں۔ ''بے رخی'' اور پھر اپنوں سے یہ ہمارا شیوہ نہیں ہے۔''

☆ خرم علی راؤ کا ای میل۔ ''میں ایک پرانا قاری ہوں۔ میں نے جاسوسی، سسپنس، سرگزشت سے بہت کچھ سیکھا۔ گزشتہ شمارے میں میرے جواب میں آپ نے لکھا ہے کہ سراب، بازیگر سے مختلف ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ 80ء فیصد قسط وار کہانیاں بازیگر سے متاثر ہیں۔ یہ میرا خیال ہے۔ کاشف زبیر ایک اچھے رائٹر ہیں لیکن سراب ریپٹیشن ہے۔ برائے مہربانی صفحات بچائیں۔'' (پتا نہیں آپ کس طرح بازی گر کو سراب سے مماثل پا رہے ہیں)۔

☆ سیف اللہ ملک وال سے رقم طراز ہیں۔ ''فلمی دنیا کے بارے میں انور فرہاد صاحب کا انداز اور رواں ماہ سے جڑی اہم شخصیات کا تعارف کا انداز یقیناً بہت اچھا ہے۔''

☆ مجید احمد جائی کی خیال آفرینی ملتان شریف سے۔ ''اداریہ میں معراج رسول رمضان مبارک میں قوم کی کوتاہیوں کی طرف اشارہ کرتے نظر آئے۔ ایسا لگا ہے جیسے ماہ صیام اس بار ناراض ناراض سا گیا ہے۔ ہم نے کچھ خدمت نہیں کی۔ نہ رب رحمان کو راضی کر پائے اور نہ ماہ صیام کا احترام کر پائے۔ تاجر حضرات شعبان میں ذخیرہ اندوزی شروع کر دیتے ہیں کہ ماہ صیام میں دونوں ہاتھوں سے لوٹا جائے۔ رب رحمان پر یقین نہیں رہا ورنہ ہمارے کرتوت ایسے نہ ہوتے۔ دوسرے ملکوں میں ماہ صیام میں قیمتیں پہلے سے کم کر دی جاتی ہیں اور ہم قیمتوں کو آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ ''شہسوار سخن'' سیماب اکبر آبادی پڑھ کر ششدر رہ گیا۔ ''شہر خیال'' میں بشریٰ افضل صدارت سنبھالے ہوئی تھیں۔ مبارکاں۔ بشریٰ افضل، رانا محمد سجاد، قیصر خان، سدرہ بانو ناگوری، رانا محمد شاہد، شاہد جہانگیر شاہد، عبدالجبار رومی، احمد خان توحیدی، محمد سلیم قیصر نے صدارت ملنے پر مبارک باد دی۔ بہت شکریہ۔ سید مجاہد حسین کاظمی، شکوے کرتے نظر آئے۔ منشی محمد عزیز میمن اس بار بھی شہر خیال سے غائب ہیں (اللہ خیر کرے)۔ اگست شروع ہوتے ہی عجیب بے قراری میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ خوشیاں مناؤں یا ماتم کروں۔ خون کے آنسوروں یا بھنگڑے ڈالوں۔ اپنے سائبان کے لٹ جانے پر ماتم کروں یا اپنی دنیا میں آمد کی خوشی مناؤں۔ ہاں جی، 20 اگست میرا جنم دن ہے اور 24 اگست میرے والد گرامی کی وفات۔ شاید خوشیوں کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ جس طرح ماں کے بغیر آنگن سنسان ویران ہو جاتا ہے اسی طرح باپ کے بغیر آنگن قبرستان بن جاتا ہے۔ ماں جنت ہے تو باپ جنت کا دروازہ۔ مگر افسوس دنیا والے ماں کو یاد رکھتے ہیں مگر باپ کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ دنیا میں پہلے باپ آیا پھر ماں کا رشتہ بنا۔ طاہرہ گلزار جی دل چھوٹا نہ کریں ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔ ایک خاندان میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے محبتوں کی نوید ہوتے ہیں۔ محبتیں بانٹیں، سبھی اپنے لگیں گے۔ مرد اور عورت رب رحمان کی کاریگری ہے۔ برا کوئی بھی نہیں، کردار برے ہوتے ہیں۔ عید کارڈ بھیجنے والوں کو مبارک باد۔ کاش ہم بھی عید کارڈ کی روایت قائم رکھ سکتے۔ خیر..... سرورق کی کہانی ''بن باس'' پڑھی۔ (اپنی روایت کی پاسداری ضروری ہے) بظاہر سائرہ نے وقت گزاری کے لیے منصور کے ساتھ مذاق کیا تھا لیکن منصور نے قربانی دے کر سائرہ کی زندگی خوشیوں سے بھر دی۔ زبردست کہانی تھی۔ ''خط تنسیخ'' ثمرہ احمد نے اپنی ناراضی میں کی ہوئی غلطی پر پردہ ڈالا اور پھر اسی غلطی کی سزا اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے گئی۔ ہمارے معاشرے میں ایسے ناسور ہیں جو ہوس کو محبت کا نام دے دیتے ہیں۔ نتیجہ گٹروں میں معصوم بچوں کی لاشوں کا ملنا ہے۔ ''سوری'' ڈاکٹروں کی لوٹ مار کا واقعہ، اس حقیقت کا چشم دید گواہ میں خود ہوں۔ میرے ساتھ ڈاکٹروں نے کیا کیا حربے اختیار کیے، یاد کر کے روح تک کانپ اٹھتی ہے۔ بہت جلد اپنی آپ بیتی سرگزشت کے حوالے کروں گا۔ المیہ یہ ہے کہ دین اور قرآن کو ڈھال بنا کر جعلی پیر بھی عوام کو لوٹ رہے ہیں۔ دین کے ساتھ کھلواڑ کر رہے ہیں۔ ''دو گھڑی کا قرب'' واقعی لوگ چہرے پر چہرہ سجائے پھرتے ہیں۔ ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہے۔ دلوں کے بھید رب رحمان ہی جانتا ہے۔ روشنی نے جینے کا طریقہ ڈھونڈ لیا تھا اور پروین شاکر نے ٹھیک کہا ہے کہ دو گھڑی کی قربت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں۔ ''مٹی بدنام ہوئی'' سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں لکھی کہانی بور لگی۔ اس کے علاوہ ''آگ'' از محمود حسن، ''رشتوں کا کرب'' از دانیہ صدیقی، ''میں برہمن'' از کنول چنا اور ''مسائل وطن'' شاندار تحریریں تھیں۔ ''احسان'' صائمہ اقبال کی کیا کمال تحریر تھی۔ ''سفر امریکا'' علیم شاہ بہترین انداز میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ فن سے بڑا، گولڈن وائس، پُراسرار کتب، تاریخ عالم کا دوسرا حصہ، لباس دل چسپ تحریر تھی۔ ''صوفی'' میں ابن کبیر نے کمال انداز اپنایا۔ لفظ پاکستان، لاجواب تحقیق کے حوالے سے تحریر تھی۔ شاطر دماغ نے کیا کیا چالیں چلیں۔ واہ اگست کی شخصیات تو واقعی کمال کی تھیں یہی اگست تھا جس نے پاکستان دیا۔ آزادی دی۔ اس اگست کو کیسے بھول سکتا ہوں جو خون کے آنسو لاتا ہے۔ جو قربانیاں مانگتا ہے، نہ جانے ہم سب کب تک اس کا قرض اتارتے رہیں گے۔''

☆ خالد محمود کا تبصرہ ملتان سے۔ ''لارڈ کلایو کا قصہ 1955ء میں میٹرک کے کورس میں پڑھ چکا تھا۔ منظر امام صاحب دو ماہ سے انسان کی شکل کے بارے میں بحث کر رہے ہیں حالانکہ جو شکل اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی بنائی تھی اس میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آئی ہے۔ (حالانکہ سائنسی تحقیق کچھ اور کہہ رہی ہے کہ خدوخال اور قد وغیرہ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ اسلامی روایات میں بھی کئی پیغمبروں کی امت کی جسامت غیر معمولی بتایا گیا ہے)۔ محترمہ کشمالہ حسن صاحبہ کا مضمون ''پُراسرار کتب'' اگر ابھی تک سمجھ نہیں آسکا تو شاید مزید ہزار سال لگ جائیں۔ اس کو پڑھ کر ہمارے علم میں کیا اضافہ ہوا؟ (غیر معمولی چیزوں کی معلومات لوگ پسند کرتے ہیں۔ غیر ملک کے ایک ذیلی قصبے کا ذکر سفر نامہ میں کیا جائے تو کیا آپ یہی کہیں گے کہ ہمیں اس قصبے میں جانا نہیں، کیوں ذکر کیا گیا۔ معلومات کی ترسیل ہی سرگزشت کا خاصہ ہے ورنہ کہانیوں کے لیے ہمارا ادارہ سسپنس اور جاسوسی و پاکیزہ بھی شائع کرتا ہے)۔ پچھلے چار ماہ سے ''سراب'' پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پہلا اور آخری صفحہ تھوڑا بہت دیکھ کر چھوڑ نا پڑتا ہے۔ محترم کاشف زبیر صاحب کو ہم نے بہت برداشت کر لیا ہے۔ اب ہمیں بخش دیں۔ آفاقی صاحب کے جانے کے بعد خانہ پری کی کوشش کی گئی ہے جو کہ گوارہ ہے لیکن اس میں تین کریکٹر ڈال کر ڈراما بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس کی وجہ سے تسلسل ختم ہو جاتا ہے۔ سفر نامے اور پارچہ جات کچھ کچھ سہارا دے رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب سرگزشت کا ایک ایک لفظ پڑھتا تھا اور رسالہ کا انتظار رہتا تھا جو کہ اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان مشاہیر میں سے کسی ایک کا مضمون ہونا چاہیے۔ (اتفاق ہے کہ زیادہ تر مشاہیر جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے ان پر مضمون آچکے ہیں۔ پھر بھی ہم وقتاً فوقتاً مشاہیر پر تحریریں دیتے رہتے ہیں۔ ہماری اولین

ترجیح نے لوگ ہیں جو اپنی مثال قائم کر رہے ہیں)۔ کسی ایک مشہور کھلاڑی کا ذکر ہونا چاہیے۔ ماضی میں ہم ہاکی، کرکٹ، اسکوائش اور دیگر کھیلوں کے نامور کھلاڑی پیدا کر چکے ہیں۔ (گاہے بگاہے دیتے رہتے ہیں)۔ مسلمانوں کے مشہور غداروں کا علم موجودہ پود کو کرانا بہت ضروری ہے۔ اس طرح معروف سپہ سالار بھی۔ (وہ بھی دیا جاتا رہا ہے)۔ پاکستان کی ترقی کو رد کنے والوں کو بھی بے نقاب کرنا ضروری ہے جو کہ بھارت سے رشوت لیتے ہیں۔ کالا باغ ڈیم بننے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ دو ملکوں کی نیشنلٹی رکھتے ہیں۔ جعلی ڈگریاں لے کر اہل لوگوں کا حق مارتے ہیں، پاکستان کا سرمایہ باہر رکھتے ہیں۔ (اس کے لیے نیوز میگزین کافی ہیں۔ ہمیں کسی ایک کو نہیں لاکھوں قارئین کی پسند کو نظروں میں رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ''مکس پلیٹ'' بنا کر قارئین کو مطمئن کرنا ہے)۔ سچی کہانیاں بڑھائیں۔ بیت بازی بے شک ختم کر دیں۔ (صفحات میں اضافہ ناممکن ہے، پھر یہ پرچہ انفارمیٹو ہے۔ معلومات فراہم کرنے والا، کہانیوں کے لیے مزید تین پرچے ہیں)۔ ''شہر خیال'' میں میرے بھائی بہنوں سے درخواست ہے کہ رسالے کی بہتری کے لیے کچھ لکھیں۔ بجائے ایک دوسرے کی تعریف کرنے کے مثبت تنقید کریں اور بے جا تعریف سے پرہیز کریں۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کراچی سے رقمطراز ہیں۔ ''سرورق جاذب نظر تھا۔ اچھا لگا۔ اداریے میں انکل نے اہم نقطے کو موضوع بنایا۔ ٹھیک کہتے ہیں انکل آپ کہ لوٹ مار کا بازار اس قدر گرم ہے کہ اس کی گرمی سے سب ہی اپنی اپنی جیبوں کو گرم کرنے میں لگے ہیں۔ ابھی عید کی چھٹیوں میں ہمیں ایک تفریح گاہ جانے کا موقع ملا۔ وہاں جا کر ایک شاک سا لگا کیوں کہ وہاں دکانوں پر کولڈ ڈرنک کی بوتلوں میں پانی ملا کر بیچا جا رہا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ لوٹنے والے انہیں کس خوب صورتی سے بے وقوف بنا رہے ہیں مگر سب خاموش تھے۔ لٹ رہے تھے اور اپنا ہی تماشا دیکھنے پر مجبور تھے۔ اس وقت مجھے لگا کہ شاید اس بے اعتباری کی سب سے بڑی وجہ یہی خاموشی ہے جو ایک دن ہمیں بھی خاموش کر ڈالے گی۔ بشریٰ افضل جی صدارت کی کرسی کی بہت بہت مبارک باد۔ فلک شیر ٹائٹل پر ہیروز کی تصویر لگانے والی تجویز پسند نہیں آئی۔ آپ پرانے قاری ہیں مگر پھر بھی یہ بھول گئے کہ ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ'' رانا شاہد 14 ستمبر کو آپ کی بٹیا رانی کی برتھ ڈے ہے تو میری طرف سے آپ کی ننھی منی گڑیا کے لیے بہت ساری نیک تمنائیں اور بہت سارا پیار۔ آپ کا تبصرہ جاندار تھا۔ سلیم قیصر یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ خدا کی رضا پر راضی ہیں۔ دعا ہے کہ خدا پاک آپ کی مشکلات آسان فرمائے۔ انجم فاروق آپ کا اظہاریہ معلومات سے بھرپور رہا۔ شاہد جہانگیر نے اقبال عظیم کے حوالے سے بڑا خوب صورت تبصرہ پیش کیا۔ دیگر دوستوں کے خطوط بھی بھرپور رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شاطر دماغ شاندار رہی معلومات کا وسیع خزانہ ہے جو ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلتا ہے اور پڑھنے والے پر سحر طاری کر دیتا ہے۔ ''سفر امریکا'' کی روداد دلچسپ رہی۔ امریکا میں گھومتے ہوئے مصنف نے ایسا دلکش منظر پیش کیا کہ چند لمحات کے لیے ہم بھی ان مناظر میں کھو کر رہ گئے۔ لفظ پاکستان کا خالق کون؟ ایک حیران کن تحقیق ہے۔ حیرت انگیز انکشافات بھی ہیں۔ شکوک وشبہات بھی ہیں اور شاید اُن دیکھے خدشات بھی مگر اس تحریر کو پڑھنے کے بعد یہ تو واضح ہے کہ لفظ پاکستان کے خالق درحقیقت علامہ غلام حسن شاہ کاظمی تھے ''فن سے فنکار تک'' کا فنی سفر خوب رہا۔ ''پُراسرار کتب'' میں کشمالہ حسن نے پوشیدہ کتابوں کے اسرار سے پردہ اٹھایا۔ ''اگست کی شخصیات'' میں اس ماہ کے حوالے سے پاکستان کی اہم شخصیات سے متعارف ہوئے۔ انجم فاروق نے ''لباس'' کی ایجاد کا بھید کھولا۔ منظر امام کی کاوش لاجواب رہی۔ ویلڈن منظر امام اتنی اہم معلومات کی طرف توجہ کرانے کا شکریہ۔ ''ابن کبیر'' نے متاثر کیا۔ حق کی خاطر لڑنے والے صوفی نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کٹ تو سکتا ہے مگر جھک نہیں سکتا۔ اس صوفی نے اپنی جان قربان کر کے عالم اسلام کے لیے ایک فخریہ مثال قائم کر دی۔ سلام ہے ایسے لوگوں پر کہ جن کے کارناموں کے سنہرے باب ہمارے دلوں کو ہمیشہ منور کرتے رہیں گے۔ ''گولڈن واکس'' انور فرہاد کی اچھی تحریر ہے۔ ''سراب'' انتہائی اہم موڑ پر آ کر رک گئی ہے۔ پہلی سچ بیانی پڑھی۔ ''بن باس'' میں سائرہ کی بے باکی اچھی نہیں لگی۔ منصور کا دل بھی ٹوٹا قسمت نے عجب پلٹا کھایا۔ سائرہ جیسی عورتوں کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہیے۔ انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ غلطی ایک عورت کرتی ہے تو معاشرہ ہر عورت کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ''مسائل وطن'' روداد نہیں بلکہ ایک طمانچہ تھا جو بڑی شدت سے ہمارے چہروں پر لگا اور ندامت سے سر جھک گیا۔ ایسے طمانچے تو روز ہی لگتے ہیں لیکن فقط یہی سوچ کر دل کو تسلی دیتے ہیں کہ ''اس شہر کے لوگوں کے رویوں پر نہ جاؤ، یہ ایسے درخت ہیں کہ جو سایہ نہیں کرتے'' آخری سچ بیانی میں فیصل کے حوصلے کی داد دیتے ہیں کہ جس نے اپنی بے حس ماں اور بھائی کا ساتھ آخری وقت تک نہ چھوڑا۔ رشتوں کا کرب سہہ کر مسکرانا بڑی بات ہے۔ ہم نے تو ہمیشہ ماں کو مہربان روپ میں دیکھا تھا لیکن اس ماں کی حرکتوں نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ خدا پاک ہمارے حالوں پر رحم فرمائے اور ہمارے اپنوں کو سلامت رکھے۔''

☆ فلک شیر ملک کی رحیم یار خان سے تشریف آوری۔ ''شہر خیال میں اپنا خط پڑھا۔ میں نے اپنے افسانے ''زرد پتا'' کے بارے میں پوچھا تھا جواب میں کہا گیا کہ سرگزشت کے انداز میں لکھیں۔ مزید بتا دیں کہ اسے کس رسالے میں بھیجوں۔ میں اس کو شائع کروانا چاہتا ہوں پلیز بتا دیں کہ پاکیزہ، جاسوسی، سسپنس میں بھیج دوں؟ (ان میں سے کسی بھی رسالے کے مزاج کی نہیں ہے)۔ رانا حبیب الرحمن، ہماری دعائیں اور محبتیں آپ کے لیے ہیں۔ آپ اللہ پر بھروسا رکھو اور حضرت یونس علیہ السلام والی دعا کا کثرت سے ورد کرو۔ خدا بزرگ و

برتر جلد آپ کو رہائی دے گا۔ سلیم قیصر صاحب کے لیے بھی دل دکھتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ ''شاطر دماغ'' پڑھی۔ سراج الدولہ بھی غداری کی بھینٹ چڑھا۔ افسوس مسلمانوں کو جب بھی شکست ہوئی زیادہ تر غداروں کی وجہ سے۔ ''اگست کی شخصیات'' میں نازیہ حسن کی جوانی کی موت کا بہت دکھ ہوا اور ساتھ نصرت فتح علی خان بھی دنیا کو موسیقی کا ایک انوکھا انداز دے کر چلے گئے۔ جانا تو سب نے ہے مگر کچھ لوگ وقت سے پہلے جاتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ منظر امام کی ''تاریخ عالم'' بہت اچھی تحریر ہے۔ تاریخی بھی اور معلوماتی بھی۔ فن سے بڑا فنکار بھی کچھ خاص نہ تھی۔ طلعت محمود کے بارے میں ''گولڈن وائس'' میں انور فرہاد نے جو لکھا، پسند آیا۔ وہ میرے پسندیدہ گلوکار رہتے۔ ''سفر امریکا'' اور ''احسان'' کچھ مزے دار نہیں تھیں۔ ''سراب'' ابھی زیر مطالعہ ہے۔ سنچری مکمل کرنے پر کاشف زبیر کو مبارک ہو۔ سائرہ کی ''بن باس'' اچھی کہانی تھی۔ فیضان اختر کی ''مسائل وطن'' میں جن مسئلوں کو اجاگر کیا گیا ہے، زبردست انداز تھا۔ کنول چنا ''میں برہمن'' میں جو سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اچھا لکھا گیا۔ مزید کوشش کریں گی تو آپ کا قلم ضرور موتی بکھیرے گا۔ ''دو گھڑی کی قربت'' ہو یا دس سال کی جانچنے والی نظر ایک پل میں ہی سب کچھ سمجھ لیتی ہے۔ سبق آموز تحریر مختصر انداز میں تھی۔ اچھی لگی۔ معین الدین نے ''منی بدنام ہوئی'' میں کرکٹ میچ بھی دکھا دیے جن میں ٹیم کی ناکامی سرفہرست رہی اور موہن بابو کو اپنی پرانی بجنی سے بھی ملوا دیا۔ خوب صورت انداز تحریر تھا۔ ''آگ'' سے میں مطمئن نہیں ہوا۔ واجپائی صاحب نے ابھی تک کنوارہ رہ کر یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ آگ کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ثمرہ احمد کی ''خط تنسیخ'' ایک زبردست تحریر تھی۔ بس ثمرہ پہلے ہی شہزاد کو بتا دیتی کہ مریم میری بیٹی ہے تو بہتر تھا۔ شاید ایک جان بچ جاتی۔ نوید صاحب کی ''سوری'' بہت پسند آئی۔ ایک سبق آموز تحریر جس میں بہت تھوڑے الفاظ میں واضح کیا گیا ہے کہ عطائی ڈاکٹروں کی بجائے اچھے اور اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ آخر میں ادارے اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کو اچھے رسالے چھاپنے پر مبارک باد۔''

☆ منشی محمد عزیز میمن کا خط لڈن دہاڑی سے۔ ''جولائی کا شمارہ 25 جولائی کو اور اگست کا 30 جولائی کو موصول ہوا۔ ارے آپ چونک گئے؟ یہ حقیقت ہے مگر اس میں آپ کا یا ڈاک والوں کا کوئی قصور نہیں۔ دراصل جولائی کا شمارہ ایک دوست لے کر چلا گیا تھا اور میں مصروفیت کی وجہ سے نہ کہیں سے خرید سکا اور نہ دوست سے واپس لا سکا۔ سو ابھی تک جولائی کا شمارہ مکمل پڑھا نہیں اور اب اگست کے شمارے پر تبصرہ حاضر ہے لیکن پہلے یہ تو بتا دیں کہ سلور جوبلی نمبر کا اعلان آپ لوگ کب کر رہے ہیں؟ ہماری تو سانسیں تھمی ہوئی ہیں سلور جوبلی نمبر کے بارے میں سوچ کر۔ نہ جانے اسے پا کر کیا کیفیت ہوگی۔ اگست کے شمارے کا سرورق مختلف حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک طرف ایک آفس در کراپنی ملازمت کے سلسلے میں مصروف دکھائی دے رہی ہے تو دوسری طرف وہی خاتون اپنے زبردست قسم کے عاشق کو شرما کر دیکھ رہی ہے جو کہ انہیں بے موقع پھول پیش کرنے کی کوشش میں ہے اور تیسری طرف وہی خاتون اپنے محبوب کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جا رہی ہیں۔ سرورق کی کہانی ''بن باس'' واقعی ایسی تحریر ہے کہ جس پر افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے سبق ہیں۔ ایسی لڑکیوں کے لیے بھی جو محبت کو مذاق کے طور پر لیتی ہیں، ان عورتوں کے لیے جو اپنی جلد بازی کی وجہ سے اپنا جنت نظیر گھر برباد کردیتی ہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی سبق ہے جو بہت جلد حوصلہ ہار دیتے ہیں۔ دوسری سچ بیانی ''مسائل وطن'' میں فیضان اختر نے بڑی باریک بینی کے ساتھ ہمارے ملک کے الٹے سیدھے نظام کی عکاسی کی ہے۔ یقیناً بہت سے لوگ ایسی ہی باتوں کی بنا پر اپنے ملک سے دوری برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ ''میں برہمن'' کی کنول چنا یقیناً محبت کے لحاظ سے تو بڑی بدنصیب ہے اور اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ دولت سے کبھی محبت خریدی نہیں جاسکتی۔ ''دو گھڑی کی قربت'' بڑی گہری قسم کی آپ بیتی ہے۔ یقیناً بہت سے لوگ روشنی جیسی لڑکیوں سے شادی کرنے سے کتراتے ہیں۔ کیوں کہ وہ صرف ظاہر میں دیکھتے ہیں اور کسی کے اندر جھانکنے کی کوشش یا زحمت نہیں کرتے۔ ''منی بدنام ہوئی'' میں معین الدین صاحب اپنے پرانے قصے چھیڑے بیٹھے تھے۔ ثمرہ احمد کی ''خط تنسیخ'' منفرد قسم کی آپ بیتی تھی۔ انسان کا گناہ کسی بھی روپ میں اس کے سامنے آسکتا ہے۔ ''سوری'' آج کل کے نام نہاد ڈاکٹروں کے منہ پر طمانچہ تھی۔ ''آگ'' بھی عجیب وغریب قسم کی داستان تھی۔ خاور کی حالت قابل رحم تھی۔ ''رشتوں کا کرب'' میری نظر میں اس ماہ کی بہترین تحریر تھی بلکہ مجھے محسوس ہوا کہ شاید دانیہ صدیقی نے میری ہی داستان لکھ دی ہے لیکن میرے حالات ایسے ہیں کہ کہیں فرار بھی نہیں ہوسکتا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی بات ہے۔ ''سراب'' نے سنچری مکمل کرلی۔ کاشف زبیر کو مبارک باد۔ احسان میں فریدہ نے بہت خوب صلہ دیا ہے اپنے احسان کا۔ ''گولڈن وائس'' میں محترم انور فرہاد اس مرتبہ گلوکار طلعت محمود کا زندگی نامہ لیے

انتقال پر ملال

ادارے کے شعبہ سرکولیشن سے طویل ترین وابستگی رکھنے والے مخلص اور محنتی رکن حاجی بدرالدین احمد 89 سال کی عمر میں 12 اگست کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ قارئین سے مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ ادارہ مرحوم کے پس ماندگان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

حاضر تھے۔ بہت ہی اچھا ہے یہ سلسلہ میرا پسندیدہ ترین سلسلہ ہے۔ اس ماہ کی شخصیات، اگست کی شخصیات بھی بہت زبردست تھیں۔ ''پُراسرار کتب'' نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ لباس کے موضوع پر انجم فاروق ساحلی نے مختصر مگر تفصیلی مضمون لکھا۔ ''تاریخ عالم'' میں منظر امام صاحب ہمیں تو زمانہ قدیم میں لے کر چلے گئے اور ہم خراماں خراماں ان کے ساتھ مزے لے لے کر چلتے رہے اور یہ سفر ابھی جاری ہے۔ ابن کبیر صوفی کے نام سے بہت زبردست تحریر ڈھونڈ کے لائے۔ عقیل عباس جعفری ایک اور زبردست تحقیق کے ساتھ حاضر تھے۔ بہت زبردست کام کررہے ہیں جعفری صاحب۔ ''شاطر دماغ'' رابرٹ کلائیو کی داستان حیات پڑھ کر ایک بار پھر جنگ آزادی کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھوم گئے اور میر جعفر اور میر صادق جیسے غداروں کی بے غیرتی پر دل کڑھنے لگا۔ ادارا یہ ظاہری نمود ونمائش کرنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ یک صفحی داستان میں سیماب اکبر آبادی کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ ''شہر خیال'' کی صدارت اس بار محترمہ بشریٰ افضل کے نام تھی۔ مبارک بادیاں جی۔ ویسے اس بار عمومی حالات سے ہٹ کر شہر خیال میں مختصر مگر تعداد میں زیادہ لوگ شامل تھے۔ اویس شیخ اور مجید احمد جائی صاحبان! بہت شکریہ کہ آپ نے میری کمی کو محسوس کیا۔ سبھی نیو کمرز کو ویلکم۔ منظر علی خان کا نام پڑھ کر مجھے احمد اقبال کی ''شکاری'' یاد آگئی جس میں ایک کردار ایڈووکیٹ منظر تھا۔ رانا حبیب الرحمٰن کا نام کافی عرصے بعد پڑھنے کو ملا۔ موصوف غصے میں تھے۔ باجی طاہرہ گلزار نے بات تو درست کہی ہے سو آپ بھی پلیز ایک اُلو کے پٹھے کی وجہ سے بھی دوستوں کو بلاوجہ شک کی نگاہ سے نہ دیکھا کریں اور پلیز غصہ بھی نہیں کرنا۔ محمد سلیم قیصر! ہم آپ کی رہائی کے لیے ہمہ وقت دعا گو ہیں۔ احمد خان تو حیدی! اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے! مجید احمد جائی، رانا محمد سجاد، قیصر خان، اعجاز حسین ستھار اور شاہد جہانگیر شاہد کے خطوط تبصرے سے بھرپور تھے۔ پڑھ کر لطف آگیا۔ نہ جانے کس نے کہا تھا کہ دوسروں کے خطوط پڑھنا غیر اخلاقی حرکت ہے لیکن ایسی غیر اخلاقی حرکت مزے لے لے کر کرتا ہوں، اب اللہ حافظ۔''

☆ نعیم الحسن شاہ کا تبصرہ ترنول اسلام آباد سے۔ ''سرگزشت ایک اچھا اور معیاری رسالہ ہے جس میں ہمیں دنیا جہان کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ''سراب'' پڑھی۔ اس بار کی قسط زیادہ متاثر نہیں کرسکی لیکن گوہر، اسمار اور ہارن جیسے جانوروں کے بارے میں پڑھ کر مزہ آگیا۔ ''پتھر لوگ'' پڑھی۔ اچھی سچ بیانی تھی۔ باقی سچ بیانیوں میں ''دست قاتل'' محمد خان، ''کینگرو'' حمید، ''دل کے پھپھولے'' میں شوکت زمان جیسے مجبور لوگوں کے بارے میں پڑھ کر دکھ محسوس ہوتا ہے۔ شوکت زمان کو اللہ پر یقین رکھنا چاہیے تھا تو وہ یقیناً کامیاب ہوتا۔ ''لغزش'' میں جمی بھائی کے کردار نے بہت متاثر کیا۔

☆ محمد احمد رضا انصاری کا پیام کوٹ ادو سے۔ ''ایک صفحے میں باکمال ادیب محمد اسماعیل پانی پتی کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ''شہر خیال'' میں اپنا خط پاکر بہت خوشی ہوئی۔ مجید احمد جائی، محمد سلیم قیصر، فیروز علی اور آپی طاہرہ گلزار کے تبصرے اچھے لگے۔ ''پرندے'' میں کچھ پرندوں کے نام تو سنے ہوئے تھے دیگر روایتی پرندوں کے بارے میں پڑھ کر محظوظ ہوئے۔ جولائی میں اہم شخصیات کے بارے میں پڑھ کر بھی معلومات میں اضافہ ہوا۔ ہانگ کانگ کا سفرنامہ بہت دلچسپ لگا۔ ''سایۂ اجل'' ایک سنسنی خیز تحریر تھی۔ ''سراب'' کی یہ قسط بھی شاندار تھی۔ پہلی سچ بیانی ''پتھر لوگ'' ایک دل دکھا دینے والی کہانی تھی۔ پڑھ کر آنکھیں بھر آئیں۔''

☆ ظہیر احمد تبسم کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ''علی سفیان آفاقی صاحب کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا تھا۔ مصروفیات کی وجہ سے وقت پر تعزیت نہ کرسکا۔ اللہ پاک آفاقی صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ شاہد جہانگیر صاحب آپ کی بیماری کا پتا چلا تھا۔ باقی چاہنے والوں کی طرح میں بھی آپ کے لیے دعا گو تھا۔ آپ کا تبصرہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اگر اداریہ کے بعد میں کوئی تحریر پڑھتا ہوں تو وہ آپ کا خط ہے اور آپ کے بعد بہن سدرہ ناگوری کی تحریر۔ سدرہ بہن ایک گزارش ہے کہ آپ یہ لڑائی جھگڑا کچھ کم کردیں۔ بالکل ختم مت کیجیے گا کیوں کہ زندگی میں جہاں محبت ہو وہاں تھوڑی سی لڑائی ہو تو اچھا لگتا ہے۔ اب کچھ شمارے کے بارے میں۔ سید مجاہد حسین کاظمی صاحب نے لکھا کہ ''سراب'' کو مختصر کردیں۔ تو میں کہوں گا کہ جناب ایک تو آفاقی صاحب کی ''فلمی الف لیلہ'' کے ختم ہونے سے سرگزشت کی آدھی زینت کم ہوگئی ہے اور جو آدھی ہے وہ ''سراب'' کے دم خم سے ہے۔ اُمید ہے کہ سراب ابھی مزید آگے چلے گی۔ سائرہ جی کی ''بن باس'' بہت اچھی رہی مگر کسی کے دل سے کھیلنا اچھی بات نہیں۔ فیضان اختر صاحب نے جس طرح وطن عزیز کے مسائل پر اتنی باریک بینی سے روشنی ڈالی ہے کہ باقی کسی اور کا تو پتا نہیں پر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اگر کسی پسماندہ علاقے کی بات کرتے تو بات سمجھ میں آتی۔ پر انہوں نے کراچی کے وی آئی پی علاقوں میں سے ایک علاقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے یہ زیادہ درست نہیں ہے۔ شہر قائد میں اتنے مسائل ہیں مانتے ہیں پر اب اتنے بھی نہیں ہیں۔ کنول چنا کی ''میں برہن'' تقریباً اچھی رہی۔ ''جلد بازی'' دیکھی۔ پر کبھی جلد بازی اچھا نتیجہ بھی دیتی ہے پر انہیں جن کی قسمت اچھی ہوتی ہے مگر کیا کریں ہم ہیں ہی جلد باز قوم۔ جہاں تک میرا ذاتی مشاہدہ ہے عورت بے وفا نہیں ہوتی۔ بس مردوں کی اپنی ہی غلطیاں ہوتی ہیں اگر میری یہ بات کسی بھائی کو غلط لگی ہو تو ایڈوانس میں معذرت۔ باقی تمام سچ بیانیاں بہت

زبردست تھیں۔ پُراسرار کتب کے ذریعے کشمالہ حسن نے کافی زبردست معلومات دیں۔ منظر امام صاحب ہمیشہ جو بھی لکھتے ہیں اپنے آپ بے مثال ہوتا ہے۔''

☆ بشریٰ افضل بہاولپور سے۔ ''میں یہ تبصرہ لاہور سے لکھ رہی ہوں۔ عید کے بعد میگزین ملا، انکل کی باتیں سنیں۔ ''شہسوار سخن'' ایک صفحی سرگزشت معلومات سے بھری تھی۔ اپنی محفل میں پہنچی تو خود کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ تھینکس انکل۔ مجید احمد جائی میں آپ کی بات سے متفق ہوں تبھی تو لوگوں کو صحت مند ہونے میں وقت لگتا ہے۔ رانا محمد سجاد آپ کی والدہ کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔ میرے دو بہن اور بھائی کے بعد ستائیسویں روزے کو بڑی بہن بھی ہمیں تنہا چھوڑ گئیں۔ نو ماہ میں دو بہنیں اور ایک بھائی ہم سے بچھڑ گئے۔ سرگزشت نے میرے زخم پر مرہم کا کام کیا۔ ہمیں کرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا۔ ''خط تنسیخ'' اس کہانی نے خون کے آنسو رلا دیا۔ ڈاکٹر ثمرہ اپنے شوہر کو اعتماد میں لے کر بیٹی کا بتا دیتیں تو وہ بیٹی کو قبول کر لیتا اور وہ جان سے نہ جاتی۔ ایک ڈاکٹر کی ''سوری'' مریض کے نقصان کو پورا نہیں کر سکتی۔ ''اگست کی شخصیات'' میں مشہور لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ ''بیت بازی'' میں سیف اللہ کو پہلا نمبر آنے پر مبارک ہو۔ ''لباس'' اہم معلومات حاصل ہوئیں۔''

☆ رانا حبیب الرحمٰن نے لاہور جیل سے لکھا ہے۔ ''محفلِ دوستاں میں تو اس دفعہ محترمہ بشریٰ افضل گیٹ پر کھڑی تھیں۔ انہوں نے مجھے روک لیا کہ کون ہو اور کس سے ملنا ہے۔ میں نے انہیں ماہ تاب گل، ڈاکٹر قرۃ العین، سعدیہ بخاری، راجا ثاقب نواز ثاقب، قیصر اقبال کچھ، زویا اعجاز جیسے کئی نام گنوا دیے لیکن انہوں نے کہا جناب ادھر اس نام کا کوئی دوست نہیں آ رہا۔ میں نے کہا چلو مجھے اندر جانے دو شاید کسی اور دوست یا کسی نئے دوست سے ملاقات ہو جائے تو انہوں نے بے چارگی سے مجھے دوسری طرف بھیج دیا کہ میں ان صاحب سے پوچھ لوں ان صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے میرا نام پوچھا اور میں نے بتاتے ہوئے کہا جناب اویس شیخ صاحب پلیز مجھے محفل میں کئی لوگ جانتے ہیں۔ آپ کے ضلع کا رہنے والا ہوں تو انہوں نے خوش ہوتے ہوئے مجھے اندر بھیج دیا۔ اندر گیا تو مجید احمد جائی نظر آئے انہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ تھوڑی دور سدرہ بانو تا گوری کسی بات پر طاہرہ گلزار سے لڑ رہی تھیں حالانکہ طاہرہ گلزار بڑی ہیں ان سے۔ طاہرہ گلزار کی طرف داری کرتے ہوئے میں نے سدرہ بانو سے کہا۔ سدرہ جی آپ غصہ نہ کریں یہ مردوں کے خلاف ہیں تو مرد کو بولنے دیں۔ آپ ان کا بدلہ کیوں لے رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے مرد جھوٹے ہوں جوان کی بولتی بند ہے۔ یہ بات طاہرہ گلزار کے حق میں تھی۔ کیوں کہ ہم نے انہیں دوست کہا ہے اور زبان سے بھاگنے والے ہم نہیں ویسے راز کی بات ہے کسی کو بتانا نہیں ہم سدرہ بانو کی بات پر دل میں خوش ضرور ہوئے تھے (خطوط رواں انداز میں لکھیں اور صرف اہم باتیں ہوں۔ شاعری کے بحر پر ابھی آپ کی گرفت نہیں ہے اس لیے اشعار کہنے سے گریز کریں۔'')

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے اس بار کراچی سے لکھا ہے۔ ''اگست کا سرگزشت تحفۂ خاص تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک تحریر نے بہت محظوظ کیا۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ اگر فکر انگیز اور قابلِ غور تھا تو شہسوار سخن سیماب اکبر آبادی اپنی ریاضت و محنت سے شعراء کے جھرمٹ میں چمکتے نظر آئے۔ لارڈ کلائیو کے شاطر دماغ نے مسلمان نوابوں اور جاگیرداروں میں سے کمزور اور بودے لوگوں کے بل بوتے پر کامیابیاں سمیٹ کر اپنی قوم کو برصغیر کا شہنشاہ تو بنا دیا لیکن انجام وہی ہوا جو ایسے لوگوں کا مقدر ہے یاسیت اور مایوسی کے ہاتھوں خودکشی کر کے اس نے اس خیال کو تقویت دی کہ غداروں کی مدد سے کامیابی سمیٹنے والا خود اپنے غداروں کے ہاتھوں عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔ جنگ پلاسی میں لارڈ کلائیو کی کامیابی میں میر جعفر کے کردار کو تخلیق کرنے والے خالق نواب سراج الدولہ اگر رشتے داروں کے حقوق کے امین ہوتے تو میر جعفر ہرگز پیدا نہ ہوتا۔ سلیم الحق فاروقی اگست کی قوسِ قزاح سجائے ہوئے تھے اس میں موجود شخصیات کے رنگ بہت ہی حسین تھے۔ لفظ ''پاکستان کا خالق کون'' کے عنوان سے عقیل عباس جعفری کا جواہر پارہ ان کی عرق ریزی کی دلیل تھا اور ساتھ ہی ثبوت و شواہد ساری صورتِ حال واضح کر رہے تھے۔ اگر نیت ٹھیک ہو تو تاریخی غلطی درست کی جاسکتی ہے لیکن تعصب کی عینک اتارے کون؟ ابن کبیر صوفی کے ذریعے ہمارا ایمان تازہ کر گئے۔ شاہ عنایت شہید کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عزم و ہمت و استقلال کا پیکر دل کو بہت بھایا، کاش مغلیہ سلطنت کے دامن پر اس مردِ حق کے خون کے چھینٹے نہ پڑتے۔ لباس اور پُراسرار کتب بہت ہی معلوماتی اور حیرت انگیز تحریریں تھیں جو اپنے کھوجیوں کی تعریف کرنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ لہٰذا کشمالہ حسن اور انجم فاروق ساحلی کو سلام، پٹیالہ گھرانے کے بڑے غلام علی واقعی فن کے بڑے فنکار تھے۔ سید زین مہدی نے تو کمال کر دیا۔ طلعت محمود کی گولڈن وائس کے ہم بہت پہلے سے معترف تھے۔ ''سفر امریکا'' واجبی تحریر تھی۔ البتہ صائمہ اقبال کی ''احسان'' انسان دوستی کی مثال تھی۔ سچ کہتے ہیں رشتہ نہیں احساس ضروری ہوتا ہے۔ فریڈ نے قبائلی بچوں سے کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کا احساس کر کے خود کو انسانیت کی تاریخ میں امر کر لیا۔ ''سراب'' جب معمول آرام سے پڑھیں گے۔ سچ بیانیاں پڑھ لی ہیں۔ ''بن باس'' فکشن سے بھرپور جب کہ ''مسائل وطن'' اور ''سوری'' حقیقت سے قریب تر تھیں۔ اب آتے ہیں شمارے کی

سب سے خوب صورت تحریر منظر امام کی تاریخ عالم کی طرف جس کی پہلی قسط تو بہت ہی چونکا دینے والی تھی جس پر ’’شہرِ خیال‘‘ کے بہت سے ساتھیوں نے خیال آرائی فرمائی ہے۔ منظر علی خان لاہور سے فرماتے ہیں کہ موجودہ آدم تیرہ ہزار سات سو اٹھانوے سال کا ہے جب کہ بہت سے آدم اس سے پہلے گزرے ہیں۔ شاید کروڑوں سال پہلے آدم نوعِ انسانی کے حوالے سے بیس لاکھ سال کی ابتدائی کو سائنس تسلیم کرتی ہے۔ تو جنابِ عالی سائنس کا کیا ہے وہ تو اپنے ہی مفروضات و نظریات صدیوں بعد خود ہی رد کر دیتی ہے اگر موجودہ آدم کی عمر چودہ ہزار سال تقریباً ہے تو حضرت آدمؑ میں تو بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر چودہ ہزار سال کے قلیل عرصے میں وارد کیے گئے ہوں اگر موجودہ آدم سے پہلے بھی مبہم آدم موجود تھے تو کیا یہ چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقا سے ہم آہنگی ہونا نہیں ہے۔ انسان پہلے بندروں کی طرح تھا اگر وہ آدم ہی تھا شعور سے عاری و بے بہرہ آدموں کے لیے رشد و ہدایت کی خاطر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کیوں بھیجے گئے جن کو تسلیم کیے بغیر ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ آخر میں ان تمام ساتھیوں کا شکریہ جنہوں نے ہماری اہلیہ روبینہ اشرفی کی دائمی جدائی پر ہم سے تعزیت کی اور رانا محمد شاہد سے معذرت کہ ہم اپنے غم اور اپنی نمناک آنکھوں کی وجہ سے یہ دیکھ نہیں پائے کہ ان کی والدہ ماجدہ ان سے جدا ہو چکی ہیں خدا انہیں غریقِ رحمت کرے اور آپ کو صبر دے اور طاہرہ گلزار صاحبہ کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم اپنے بچوں کے بارے میں دیے گئے ان کے مشوروں پر ضرور عمل کریں گے۔‘‘

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ’’اگست کا سرگزشت پریشان کن حالات میں خریدا۔ کچھ گھریلو پریشانیوں میں گھرا ہوں۔ دعاؤں کا طلب گار ہوں۔ ’’شہرِ خیال‘‘ میں بشریٰ افضل سرِفہرست تھیں۔ شبنم اور ندیم کی جوڑی پاکستان فلم انڈسٹری کی سب سے ہر دلعزیز جوڑی تھی۔ انور عباس شاہ! زندگی کے بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں شاید الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ماں کا بچھڑ جانا بھی ایسا ہی دکھ ہے۔ رانا محمد سجاد! سرگزشت 29 تاریخ کو ملا ہے تو یہ لیٹ نہیں ہے۔ عموماً اسی تاریخ تک ملتا ہے۔ والدہ کے لیے دعاؤں پر شکر گزار ہوں۔ محمد یوسف سانول! موت اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ سب سے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ہم ہر چیز پر کام کی پلاننگ کرتے ہیں مگر موت کی کوئی پلاننگ کوئی تیاری نہیں کرتے۔ سدرہ بانو ناگوری! اصل میں ہم اپنے ہیروز کو وہ مقام نہیں دے پاتے جو دوسرے ممالک دیتے ہیں۔ شاید ہمارے ہاں قدر کرنے کی روایت کمزور ہوگئی ہے۔ رانا حبیب الرحمن! آپ کے حالات پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ آپ کو آسانیاں دے اور جیل سے رہائی نصیب کرے، آمین۔ اگر آپ حق و سچ پر ہیں تو حوصلہ نہ ہاریں کیوں کہ تاریخ کے بڑے بڑے نام جیل میں رہے ہیں۔ انجم فاروق ساحلی! خیالات کی پسندیدگی کا شکریہ۔ قرآن مجید کے حوالہ جات کے ساتھ آپ کا خط بہت اچھا لگا۔ ہمارے اسلاف کے علمی و سائنسی کارنامے آج بھی ہمارا اثاثہ اور فخر ہیں۔ اعجاز حسین سہتار! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ نے سعودی عرب میں بہت سی تاریخی جگہوں کی زیارت کی۔ عبدالجبار رومی! یاد رکھنے کا شکریہ۔ محمد سلیم قیصر! آپ کے لیے بھی دعا گو ہیں کہ آپ کے ساتھ انصاف ہو۔ ڈاکٹر ساجد امجد! برصغیر کے ایک شاطر دماغ حکمران کی سرگزشت بڑے دلچسپ پیرائے میں تحریر کر گئے۔ معروف محقق عقیل عباس جعفری کا مضمون ’’لفظ پاکستان کا خالق کون؟‘‘ منفرد تھا۔ صوفی شاہ عنایت کے حوالے سے ابن کبیر نے خوب لکھا۔ ایسے عظیم سپوت ہی دھرتی کا فخر ہوتے ہیں جو اپنی زندگیاں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے حقوق کے لیے لڑتے اور خدمت کرتے گزار دیں۔ انجم فاروق ساحلی نے لباس پر معلوماتی اور تاریخی باتیں تحریر کیں۔ لباس کے حوالے سے منفرد و دلچسپ واقعات سے تحریر میں اضافہ ہوسکتا تھا مگر پھر بھی تحریر مختصر مگر مؤثر تھی۔ کشمالہ حسن کی ’’پُراسرار کتب‘‘ پر تحریر لاجواب تھی۔ کاشف زبیر کو ’’سراب‘‘ کی سنچری پر مبارک باد۔ حال ہی میں انتقال کر جانے والے معروف ناول نگار عبداللہ حسین کی زندگی کے حوالے سے بھی کوئی تحریر شائع کریں۔‘‘

☆ نثار احمد گورگیج لاڑکانہ سے لکھتے ہیں۔ ’’گزارش ہے کہ ماہنامہ سرگزشت کافی وقت سے زیرِ مطالعہ ہے اس کی ہر چھوٹی سی چھوٹی تحریر بھی اپنا ایک الگ اور منفرد انداز رکھتی ہے۔ سرگزشت میری اب کمزوری بن گیا ہے یہ جینا سکھاتا ہے۔ میں سندھی ڈائجسٹ میں لکھتا تھا لیکن اب لکھنا بند ہوگیا ہے۔ صرف مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ ’’لفظ پاکستان کا خالق کون؟‘‘ یہ جان کر عجیب لگا کہ اس لفظ کا خالق چوہدری رحمت علی نہیں کوئی اور ہے۔ ہم کس پر اعتبار کریں جناب؟ ابن کبیر کی تحریر ’’صوفی‘‘ پڑھی۔ بہت خوب صورت انداز تھا بہت ہی قیمتی تحریر تھی معلومات میں اضافہ ہوا اور یہ جان کر خوشی بھی ہوئی کہ سوشلزم سے بہت پہلے مساوات کا نعرہ ہمارے سندھ میں ہی گونجا تھا۔ ’’اگست کی شخصیات‘‘ میں نامور شخصیات کے بارے میں بہت کارآمد معلومات ملیں۔ اس سلسلے کو رکنا نہیں چاہیے۔ ’’تاریخ عالم‘‘ اور ’’لباس‘‘ کو بار بار پڑھنے کی کوشش کی لیکن پتا نہیں کیوں دل نے مذکورہ تحریریں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ ’’فن سے بڑا فنکار‘‘ بھی زبردست تھی۔ کافی وقت سے مذکورہ کرداروں کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ انور فرہاد کی ’’گولڈن دائس‘‘ پڑھی تو آس پاس کا بھی احساس نہ رہا، جب تحریر ختم ہوئی تو پتا چلا کہ گھر میں ہی ہوں۔ صائمہ اقبال کی ’’احسان‘‘ پڑھی تو اس شخص کے لیے دعائیں نکلنے لگیں جس نے ایک وحشی قوم کا حق ادا کیا اور انہیں تعلیم جیسی بیش بہا دولت عطا کی۔ ’’سراب‘‘ کی 100 ویں قسط پڑھی لاجواب تھی۔ ’’بن باس‘‘ کو

ٹائٹل پیج پر رکھا گیا ہے جو اس کا حق تھا۔ کہانی ہی ایسی ہے۔ سائرہ نے اس کہانی سے بہت انصاف کیا ہے۔ فیضان اختر کی ''مسائلِ وطن'' پڑھ کر بے چارے پر بہت رحم آیا لیکن ہم پر کون رحم کرے گا۔ ہم تو جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں پینے کے پانی کے لیے بھی پانچ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ 2007ء، 2010ء، 2011ء سے مسلسل سیلاب سے مقابلہ ہوتا رہتا ہے اس دوران کئی مہینوں تک اِدھر اُدھر بھٹکنا پڑتا ہے۔ اب بھی سیلاب کی بات ہورہی ہے کہ بس آنے ہی والا ہے اور ہم نے بھی اپنا چھوٹا موٹا سامان باندھ لیا ہے اور ذہنی طور پر تیار ہیں کیا کریں جناب زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا پڑے گا ناں؟ ''میں برہمن'' کنول چنا کی غلطی اسے کہاں سے کہاں تک لے گئی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ پھر بھی قدرت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ بھٹکنے سے بچ گئی۔ اللہ تعالیٰ سب کو بھٹکنے سے بچائے۔ ویسے ان کے لیے میرے دل سے دعا ضرور نکلی کہ اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ کے لیے خوش رکھے۔ ''دو گھڑی کی قربت'' نعمان ارشد کا فیصلہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔ بڑا سخت امتحان تھا۔ ''منی بدنام ہوئی'' معین الدین کی کہانی نے جسم سے دھواں نکال دیا۔ ''خط تنسیخ'' ثمرہ احمد غلطی ہی تو بربادی کا سبب بنتی آئی ہے۔ ''سوری'' ایک ڈاکٹر کی غلطی نے ان دونوں کو تباہ و برباد کردیا۔ بے چارے نوید کے پاس باقی کیا رہ گیا۔ ارے ظالم ڈاکٹر تم نے ظلم کردیا۔ ''آگ'' واقعی بہت خطرناک ہوتی ہے لیکن اس آگ کو کیا کہیں یہ تو خطرناک سے بھی خطرناک ہے۔ ''رشتوں کا کرب'' توبہ......توبہ فیصل نے جو صبر کیا اور ماں کے لیے برداشت کررہا تھا اسے سلام ہے۔ کہانی سے لگ رہا تھا جیسے اس کی ماں اسے ایدھی سینٹر سے لائی تھی۔ آخر میں انہوں نے جو فیصلہ کیا وہ صحیح تھا سکون کے سوا بھی کوئی زندگی ہے۔ ارے یہ سرگزشت تو ختم ہو گئی۔ ابھی تو پانچ تاریخ ہے پورا مہینا انتظار کرنا پڑے گا خیر کوئی بات نہیں۔ انتظار میں ہی تو مزہ ہوتا ہے۔''

☆ نجمی رحمٰن نے یو ایس اے سے لکھا ہے۔ ''اداریہ آپ نے بالکل صحیح لکھا۔ اس پر یہی کہا جاسکتا ہے۔ یہ کیا ستم ہے اے باغبانوں کہ جن کے دم سے بہار آئی۔ وہی شگوفے کھٹک رہے ہیں تمہاری نظروں میں خار بن کر۔ یہ آندھی تو برسوں سے چل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری پاک فوج کو سلامت رکھے جن کے دم سے دشمنوں پر ہیبت طاری ہے۔ پاکستان سے دور ہم سب پاک وطن کے حالات کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ ہر گھڑی دعا گو ہیں۔ شیخ اسماعیل پانی پتی کی مختصر سوانح پڑھی۔ زندگی اسی مد و جزر کا نام ہے۔ ''شہرِ خیال'' میں داخل ہوئے خوشگوار حیرت ہوئی۔ سب ساتھیوں نے کتنی اپنائیت سے مجھے خوش آمدید کہا خاص کر مجید احمد، قیصر خان، انور عباس شاہ، فیروز علی عاجز، سدرہ بانو ناگوری آپ سب کے محبت و خلوص کا شکریہ۔ سدرہ رنگون والا گانا اگر یاد آرہا تھا تو اپنی امی کو اسی انداز میں سنا دیتیں آگے جو بھی پیش آتا بس یہی دعا ہے۔ تمہارا ہمسفر کہیں کوپ جیسا نہ ہو۔ اقبال عظیم کی شاندار سوانح پڑھی، ہر نفس کو ہر قدم زندگی کے پیچ و خم۔ مجید احمد، رانا شاہد محمد سلیم قیصر، مظفر علی، قیصر خاں، انور عباس، فیروز علی، اعجاز حسین، شاہد جہانگیر، ناصر حسین، سدرہ بانو، احسان سحر، طاہرہ گلزار سبھی کے خطوط بامعنی تھے۔ امریکا اور ان کا معلوماتی مضامین اچھے لگے۔ ''تاریخ عالم'' میں منظر امام نے بہت اچھا لکھا۔ آیندہ بھی قرآن الحکیم کے حوالے ضرور دیں۔ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے یہ دنیا بنانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کیا کرتے تھے۔ بہرحال لطیف پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے۔ محبت آئینہ ہو چکی تھی وجود بزم جہاں سے پہلے۔ پرندوں کا ذکر تو بہت ہی خوب صورت ہے۔ دنیا کی رونق ننھے بچوں کی معصوم باتیں۔ خوش رنگ پھول اور صد ہا قسم کے اڑتے چہکتے ہوئے پرندے ہیں۔ یہاں لان میں اکثر بڑے خوب صورت رنگوں والے پرندے نظر آتے ہیں۔ یہاں کی معلومات کے مطابق امریکا میں 17 ہزار قسم کے پرندے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو صاف ستھری جگہ، پھر درختوں کی بہتات، گھروں کے درمیان گھنے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ کبھی کبھی تو ہرن بھی نکل آتے ہیں۔ ہر علاقے میں چھوٹی چھوٹی جھیلیں ہیں جہاں مختلف قسم کے آبی پرندے تیرتے ہیں۔ میرے بیڈ روم کے سامنے 5 کونوں والی جھیل ہے جہاں سے بہت پیارے منظر نظر آتے ہیں۔ ماہ جولائی کے مشاہیر محترمہ فاطمہ جناح لاجواب ہستی تھیں۔ جب الیکشن کے لیے ایوب خان کے مقابل کھڑی ہوگئیں تو تقریباً پورا پاکستان ان کے ساتھ تھا۔ وہ ڈھاکا سے ناظم الدین کے ہمراہ چکلالہ ایئرپورٹ پر اتریں تو ہم بیگم منو کے ساتھ ان کے استقبال کو گئے تھے۔ وہ لمحہ میری زندگی کا بہترین لمحہ تھا۔ 72 سال کی عمر میں ان کی آنکھوں کی چمک اور ہاتھوں کی مضبوطی مجھے یاد ہے۔ انہوں نے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ ہم نے ان کے گلے میں موتیا کے ہار ڈالے تھے مگر افسوس اقتدار والوں نے انہیں ہرا دیا۔ پاک فوج کے جوان زندہ باد۔ ابنِ صفی کے ناول بہت پڑھے۔ قدرت اللہ کا شہاب نامہ ان کا سادے سے لہجے میں ماں جی لکھا ہوا بہت پُراثر ہے۔ دلاور فگار کو بھی ٹی وی پر سنا تھا۔ ذوالفقار بخاری یہ لوگ پاکستان کا سنگار ہیں۔ سر آغا خان سوم نے پاکستان کے لیے بہت کچھ کیا تھا۔ قتیل شفائی کی شاعری بہت اچھی ہے۔ ساغر صدیقی جیسے لوگ دنیا میں اکثر رل گئے۔ روزینہ کی کچھ فلمیں دیکھیں ہیں۔ اچھی تھیں۔ اشعار میں نرجس زیدی، عاصمہ اکبر، شیر نواز گل کا شعر بہت پسند آئے۔''

تاخیر سے موصول خطوط: اکبر جہانزیب، فراست خان، انعام اللہ (کراچی)۔ نازش مغل (لاہور)۔ فہیم الدین (جہلم)۔ حسنین تلوری (کوئٹہ)۔ سید زاہد علی رضوی (شیخوپورہ)۔

ڈاکٹر ساجد امجد

اردو ادب کے معماروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ سب نے اپنا اپنا حصہ ڈال کر اس خزانے کو بھرا ہے۔ ولی دکنی سے امیر خسرو تک اور غالب سے منیر نیازی تک، اردو کی ترویج و ترقی میں سب نے اپنے تئیں سعی کی۔ اسی فہرست میں خاندانِ بلگرام، خانقاہِ برکاتیہ کے چشم و چراغ، داغ دہلوی کے شاگردِ خاص، مارہرہ کا نام مزید بلند کرنے والے احسن مارہروی کی محنت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اپنے وقت کے نامور محقق، قلم کے دھنی جن کے آگے الفاظ سربسجود محسوس ہوتے ہیں۔ اردو کا دامن بھرنے میں پیش پیش رہنے والے قلم کار کی زندگی کے شام و سحر کا تذکرہ۔

ایک شہرآفاق معمارادب اردو کا زندگی نامہ

بلگرام سے مارہرہ منتقل ہو کر مارہرہ کو مارہرہ شریف بنانے والے روحانی فضیلت اور رشد و ہدایات کے حامل خانوادے کا کوئی رکن عزیز، فرد وحید، صاحبزادہ روشن پیشانی، خانقاہ سے اٹھے اور مدرسہ فرنگیاں کو زینت بخشے کم از کم قیامت کی نشانی تو تھی۔ کچھ لوگ بھاگم بھاگ سید شاہ مجتبٰی احسن کی خدمت میں پہنچے اور قیامت قریب ہے کہ نوید سنائی۔

”حضرت! اپنے صاحبزادے شاہ میاں (سید احسن) کی تو خبر لیجیے۔“

”خیر تو ہے اس سیدزادے کو کیا ہوا۔“

”آپ اور آپ کا پورا خاندان اسلام پھیلانے میں پیش پیش رہا۔ اسلام کی خدمت کی لیکن نئی روشنی ہے نئے زمانے کا اثر ہے۔ شاہ میاں پوری طرح عیسائی ہونے کو تیار بیٹھے ہیں۔“

”ایسی بے ہودہ بات کس نے کہی اور کیونکر کہی۔“

سید شاہ مجتبٰی کو جلال آ گیا۔

”صاحبزادے نئے کھلنے والے انگریزی اسکول میں دیکھے گئے ہیں۔ نہ صرف دیکھے گئے ہیں بلکہ گٹ پٹ سیکھنے کے لیے باقاعدگی سے جانے بھی لگے ہیں۔“

”ہم تحقیق کے بعد ہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔“

سرسید احمد خان مسلمانوں میں پہلے شخص تھے جنہوں نے 1857ء کے بعد مسلمانوں کی ترقی کا راستہ انگریزی تعلیم کے حصول میں تلاش کیا۔ ان کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ جب تک مسلمان انگریزی تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہوں گے ترقی نہیں کر سکیں گے چنانچہ انہوں نے ہندوستان میں اپنے زمانہ ملازمت میں متعدد مدرسے کھولے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ محمڈن کالج علی گڑھ کا قیام تھا جو انہوں نے نوجوانوں کو جدید علوم کی تعلیم دینے اور بالخصوص انگریزی پڑھانے کے لیے قائم کیا تھا۔

سرسید اور علی گڑھ کے اثر سے مارہرہ میں بھی انگریزی مدرسہ قائم ہو گیا تھا۔

مارہرہ کے مشہور خاندانِ برکات کا دستور تھا کہ سن شعور

کو پہنچتے ہی بچوں کو آبائی خانقاہ میں بٹھا دیا جاتا تھا جو روحانیت اور دینی علوم کا سرچشمہ تھا۔ اس خانقاہ میں روح کی آسودگی، قلوب کی پاکیزگی اور اذہان کی تربیت کا پورا پورا سامان فراہم کیا جاتا تھا۔ سید علی احسن کو بھی جو اس وقت شاہ میاں کہلاتا تھا ان ہی خانقاہی مدرسوں میں سے ایک میں بٹھا دیا گیا۔ خاندان میں پیری مریدی کا سلسلہ ابتداء سے چلا آرہا تھا۔ شاہ میاں اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور حصولِ تعلیم کے لیے خانقاہ جانے لگے۔

تعلیم کی ابتداء اس وقت کے عام دستور کے مطابق قرآن سے ہوئی۔ والد کی زیرِ نگرانی قرآن شریف کی ابتداء کی اور پھر اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم کے لیے مختلف اساتذہ کے حوالے کر دیے گئے۔

وہ ان دنوں حفظ قرآن سے نیا نیا فارغ ہوا تھا کہ ایک دوست نے انگریزی کی طرف رغبت دلائی۔ اس نے اس اسکول میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ ایک ترکی ٹوپی اور ایک انگریزی کا قاعدہ بھی خرید لیا۔

سید شاہ مجتبیٰ حسن کو اطلاع ملی کہ وہ انگریزی مدرسے میں جانے لگا ہے اور خوب تحقیق بھی کر لی تو ایک دن اپنے حضور طلب کر لیا۔

''آپ کو معلوم ہے قصبہ مارہرہ میں آپ کے خاندان کو کیا مقام حاصل ہے۔''

''ہمیں اس کا علم ہے۔''

''مگر اب معلوم ہوتا ہے یہ مقام برقرار نہیں رہ سکے گا۔ اس خاندان کے بچے جب انگریزی پڑھ کر عیسائی بنیں گے تو یہ حیثیت کیونکر برقرار رہے گی۔ سنا ہے آپ بھی انگریزی مدرسے میں جانے لگے ہیں۔ عربی، فارسی کا میدان مار لیا جو اب انگریزی فتح کرنے چل دیے۔ اب میں وہاں آپ کو نہ دیکھوں۔''

''جی بہتر۔'' اس وقت یہی جواب دیا مگر بہت بعد میں اس کا احوال بھی نظم کر دیا۔

سن نواسی عیسوی گزرے جیسے چالیس سال
اس زمانے کے رواج علم کا لکھتا ہوں حال
میرا مسکن تھا جو پونے دو صدی سے خانقاہ
ایک سجادہ تھے جس میں عارفانِ دیں پناہ
اس احاطے ہی میں ایک اسکول انگریزی کھلا
درس لینے کے لیے جس کی طرف عالم ڈھلا
میں کہ جس کی نوجوانی کا ہوا تھا عنفواں
اس کی تعلیم کی خواہش میں دوڑا بیٹکاں
تھا نہ کوئی بعد حائل آمد و شد کے لیے
بیٹھ جاتا تھا کتابیں لے کر شُد بُد کے لیے
آتے جاتے دیکھنے والوں کی پڑائی بھی نظر
رفتہ رفتہ والد ماجد کو بھی پہنچی خبر
میرے اس شوقِ تعلیم پر بہت برہم ہوئے
اور بالتصریح ارشادات یہ پیہم ہوئے
تجھ کو انگریزی نہ پڑھنے دیں گے ہم اور روسیاہ
مار ڈالیں گے جو اب اٹھی ادھر تیری نگاہ
مجھ کو ان احکام کی تعمیل کرتے ہی بنی
زندہ رہ کر عالمِ فانی میں مرتے ہی بنی

اساتذہ کی کمی کیا تھی۔ والد خود جید عالم و فاضل تھے۔ آستانہ برکاتیہ پر حاضری دینے والے کتنے ہی اساتذہ عربی و فارسی تھے جو اس کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ بیرونِ مارہرہ سے آنے والے بزرگ جتنے دن خانقاہ میں قیام پذیر ہوتے۔ سید علی احسن ان کی خدمت میں پہنچتا اور مشرقی نصاب کے جتنے اسباق دہرا سکتا تھا دہراتا۔

اس وقت پورے ہندوستان پر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا جس کے سائے میں انگریزی تہذیب اپنے پاؤں پھیلا رہی تھی اور مشرقی تہذیب نہ چاہتے ہوئے بھی جدت طرازی کا جلوہ دیکھ رہی تھی لیکن بعض خاندان وہ تھے جن کے خیالات کو تغیر آشنا ہونے میں دیر لگ رہی تھی۔ سید علی احسن کے خاندان کا شمار بھی انہی دیر آشناؤں میں ہوتا تھا۔ اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے انگریزی تعلیم سے دور ہو گیا جس کا افسوس اسے زندگی بھر رہا لیکن اسی خاندان کی عظمت کی بدولت اسے یہ مواقع بھی مل سکے کہ وہ عربی، فارسی میں کمال مہارت حاصل کر سکے۔ اس نے ابتدائی قاعدوں اور دینی کتب ہی سے اکتساب علم نہیں کیا بلکہ اس کی ذہنی نشوونما اور شخصیت کی تعمیر اور حصول علم بھاری بھرکم علمی شخصیات کے فیضِ صحبت کو بھی بڑا دخل رہا۔

بزرگوں کو احساس نہیں تھا لیکن زبان و ادب ایک زبردست تبدیلی سے دوچار ہونے کو تھے۔ سرسید نے ایک ایسی طرزِ تحریر کی بنیاد ڈالی تھی جو فارسی سے الگ اپنا آشیانہ اردو کے تنکوں سے تعمیر کرنے والا تھا۔ علی گڑھ تحریک علمی و ادبی تحریک میں ڈھل رہی تھی۔ ابھی تک ادب و شعر انفرادی فعل سمجھا جاتا تھا لیکن اب اس اجتماعیت کا دخل ہوتا جا رہا تھا۔ ادبی رسائل کا اجراء ہو رہا تھا۔ پہلا ادبی رسالہ مولانا

عبدالحلیم شرر کا ''دلگداز'' لکھنؤ سے جاری ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے کونے کونے سے بے شمار ادبی معیاری پرچے نکلنے شروع ہوگئے۔

یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی پڑھا لکھا شخص ان تحریکات سے بے خبر رہتا۔ اس کے والد اردو، فارسی کے شاعر تھے۔ اردو کے کئی پرچے ان کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ سید علی احسن کو ادب سے خاص شغف تھا۔ لہٰذا یہ تمام پرچے اس کے مطالعے میں رہنے لگے۔

وہ حفظِ قرآن کی دولت سے مالا مال ہو چکا تھا۔ عربی میں متوسطات تک اور فارسی میں انتہا کی درجوں تک دست نگاہ حاصل کر چکا تھا۔ سیکڑوں اشعار تھے جو اسے ازبر تھے۔

گھر ہو یا مردانہ خانقاہ، وظائف کی محفلیں روز جمتی تھیں۔ ایسی ہی ایک محفل میں اس کے والد نے اعلان کیا کہ اس مرتبہ وہ حج بیت اللہ کی سعادت کے لیے جائیں گے۔ انہوں نے اس وقت یہ جملے اپنی زوجہ یعنی سید علی احسن کی والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے اس لیے علی احسن کا یہ سمجھنا بجا تھا کہ اس بابرکت سفر میں وہ ان کے ساتھ نہیں ہوگا۔ اس محرومی نے اس کی آنکھیں نم کر دیں۔ اس نے یہ سوچ کر وہاں سے اٹھ جانا چاہا کہ والد کو اس کے حال سے واقفیت نہ ہو جائے لیکن والد اس کی کیفیت کو دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے نہایت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''شاہ جہاں، تم کیوں دل چھوٹا کرتے ہو، تم بھی تو ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔''

''آپ نے پہلے تو صرف امی جان کو مخاطب کیا تھا۔''

''بھئی میں نے ''ہم'' کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ اس ہم میں تم بھی تو شامل ہو گئے۔''

''جہاں دو افراد ہوں وہاں ہم کا صیغہ لاگو ہو جاتا ہے اور میں تیسرا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ آپ کو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانے کی قدرت نہیں۔''

''نہیں نہیں، تم بھی ہمارے ساتھ جاؤ گے ابھی سے تیاری شروع کر دو۔''

تیاری کیا کرنی تھی وہ تو یہ سنتے ہی سرشار ہو گیا تھا کہ درِ رسول پر حاضری مقدر ہو گئی۔ رات کو سونے کے لیے لیٹا اور مدینے کا تصور باندھا تو عقیدت نے لفظوں کا روپ دھار لیا۔ نعتیہ اشعار خود بخود زبان پر جاری ہو گئے۔

پیاسا ہے جو دیدارِ رسولِ عربی کا
کیا خوف قیامت میں اسے تشنہ لبی کا

تو احمد و محمود و محمد ہے بلاشک
شہرہ ہے فرشتوں میں تری خوش لقبی کا
دشمن بھی ہیں مداح شہنشاہِ رسالت
ادنیٰ سا یہ اعجاز ہے اخلاقِ نبی کا

اس سے پہلے اس نے کبھی شعر نہیں کہے تھے۔ یوں اگر کبھی کوئی تک بندی کر لی ہو تو الگ بات ہے۔ تک بندی کرنے سے کوئی شاعر نہیں ہو جاتا لیکن وہ ان نعتیہ اشعار کو تک بندی نہیں کہہ سکتا تھا۔ تو کیا میں شاعری کر سکتا ہوں؟ یہ تو میرے اشعار دیکھ کر کوئی ایسا شخص بتا سکتا ہے جسے شاعری پر عبور ہو۔ والد صاحب شاعر ہیں لیکن انہیں کیسے بتاؤں کہ میں بھی شعر کہنے لگا ہوں۔ اس نے فی الحال اپنے سوال کو ادھورا چھوڑا اور حج پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی عمر اس وقت سترہ سال تھی۔

تکمیلِ حج کے بعد جب ان کا قیام مکہ میں تھا تو والدہ علیل ہو گئیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے حجاج کرام بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ان کی بیماری کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ علاج ضرور کرایا گیا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اب مارہرہ کی زمین پر قدم نہیں رکھ سکیں گی۔ علاج سے افاقہ تو کیا ہوتا وقت آ گیا تھا ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔ باپ بیٹے نے انہیں مکہ کے قبرستان ''جنت المعلیٰ'' میں دفن کیا اور کچھ دن مکہ میں گزارنے کے بعد اس عزیز ہستی کو چھوڑ کر واپس ہوئے۔

سید مجتبیٰ حسن کی طبیعت جہاز ہی میں خراب ہو گئی تھی۔ شاہ میاں بجا طور پر سمجھ رہا تھا کہ والدہ کی وفات کا صدمہ ہے جو ابا جان یوں گردن ڈالے بیٹھے ہیں۔ خود سید صاحب نے بھی اپنی تکلیف بیٹے پر ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن جہاز نے جیسے ہی ممبئی کی بندرگاہ کے پاؤں پکڑے سید صاحب کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ ان کے کچھ مریدان کا استقبال کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں لے کر ایک حکیم صاحب کے پاس چلے گئے۔ وہ انگریزی علاج کے قائل نہیں تھے۔ ورنہ ممبئی میں کئی اسپتال تھے جہاں انہیں داخل کرایا جا سکتا تھا۔

ان کا ایک مرید انہیں اپنے گھر لے گیا۔ حکیم کا علاج ہوتا رہا لیکن شفا ان کے مقدر میں نہیں تھی۔ بیوی کو مکہ میں چھوڑ آئے تھے۔ بیٹے کو ممبئی میں چھوڑ دیا۔ راہیِ ملکِ بقا ہوئے اور ممبئی کے قبرستان سوناپور میں دفن ہوئے۔

دو عظیم ہستیوں کو کھونے کے بعد وہ مارہرہ پہنچا تو خود

کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ ابھی پورے اٹھارہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ماں باپ دونوں سے محروم ہو گیا۔ شاعری اپنے آپ سے مکالمہ کرنے ہی کا نام تو ہے۔ ایسے میں جب وہ دل کا حال کسی کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے خود سے باتیں کیں یہی باتیں اشعار کی صورت میں ڈھل گئیں۔

خاموش کیوں ہے اے دل بیمار کیا ہوا
کچھ کہہ تو منہ سے یہ تجھے آزار کیا ہوا
میں کہہ رہا ہوں قصہ غم ہنس رہا ہے تو
یہ انقلاب اے مرے غم خوار کیا ہوا
احسن لگی ہے چپ تجھے کیسی زباں تو کھول
بیٹھے بٹھائے تجھ کو یہ آزار کیا ہوا
جب تک اپنے دل میں ان کا غم رہا
حسرتوں کا رات دن ماتم رہا
ہجر میں دل کا نہ تھا ساتھی کوئی
درد اٹھ اٹھ کر شریکِ غم رہا
کر کے دفن اپنے پرائے چل دیے
بے کسی کا قبر پہ ماتم رہا
آج اک شورِ قیامت تھا بپا
تیرے کشتوں کا عجب عالم رہا
لے گیا تا کوئے یار احسن وہی
مدعی کب دوستوں سے کم رہا

چند غزلیں کہنے کے بعد اس یقین نے اس کے کانوں میں اذان دے دی کہ وہ شاعری کر سکتا ہے بلکہ جو غزلیں اس نے کہی ہیں وہ شاعری ہی تو ہیں۔ یہ غزلیں ابھی ابتدائی عمر کی یادگار ہیں لہٰذا ان میں اعلیٰ درجے کی فنی خوبیاں کثرت سے نہیں مل سکتیں۔ لیکن ہیں یہ شاعری کے نمونے۔ اس نے ابتدا ہی سے قدیم اساتذہ کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا لہٰذا شاعری کے جتنے روایتی مضامین غزلوں میں بیان ہو رہے تھے وہ ان سب سے واقف تھا۔ ان اشعار میں انفرادیت پیدا کرنے کے لیے ابھی وقت درکار تھا لیکن یہ تھی شاعری اس کا علمی میلان اور تنقیدی نظر ان اشعار کو جانچ پرکھ چکا تھا لیکن شاعری کی تصدیق اسی وقت ہو سکتی تھی جب کسی استاد کی مہر تصدیق اس پر ثبت ہو۔

اس نے اس نظر سے اپنے اردگرد نظر ڈالی تو زیادہ دور جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ یہ کسی اور کا نہیں امیر و داغ کا زمانہ تھا۔ بلکہ داغ کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ جب رام پور میں داغ اور امیر اکٹھے ہو کر بیٹھتے تو امیر مینائی جیسا عالم اپنی علمیت بھول کر داغ کی سادگی پر مرمٹا۔ داغ کی شوخی کلام پر فریفتہ ہو گیا چنانچہ جب اس کا دیوان ''صنم خانہ عشق'' شائع ہوا تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ امیر نے داغ کی پیروی کی ہے۔

1857ء کی جنگِ آزادی میں ناکامی کے بعد دوسرے بہت سوں کے ساتھ داغ بھی دہلی سے نکلا تھا اور رام پور پہنچ گیا تھا۔ رام پور کے آسمانی ادب پر کئی ستارے ایک ساتھ چمک رہے تھے۔ داغ اس وقت نوجوان بھی تھا اور اتنا مشہور بھی نہیں تھا لیکن یہاں پہنچا تو اس انداز سے غزل سرا ہوا کہ نواب کلب علی خان کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ یہی وہ رام پور تھا جہاں اس کی ملاقات منی بائی حجاب سے ہوئی۔ یہ ملاقات معاشقے میں تبدیل ہوئی اور اس طوائف کے پیچھے رام پور سے کلکتہ تک ہو آیا۔ کچھ اور ہوا نہ ہوا اس کی شہرت کے شادیانے کلکتہ تک سنائی دینے لگے۔ اگر وہ منی بائی سے ملنے کلکتہ نہ گیا ہوتا تو اس کی شہرت بنگال تک نہ پہنچی ہوتی۔ اس کے شاگردوں کا سلسلہ کلکتہ تک پہنچ گیا۔

عیش و نشاط کی یہ محفلیں اس وقت دم توڑ گئیں جب نواب رام پور کلب علی خان کا انتقال ہو گیا۔ اس نے نواب کو نمک خواری کا یقین دلایا لیکن اب رنگ جہاں کچھ اور تھا۔ شعر و سخن کے چرچے کلب علی خان تک تھے۔ نئے نواب کو شعر و سخن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کبوتر چھتیں بدلنے لگے۔ وہ بھی کہہ اٹھا۔

رہے کیا مصطفیٰ آباد (رام پور) میں داغ
وہ سارے لطف تھے خلد آشیاں تک

اس نے استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ منظور بھی ہو گیا۔ اسے یاد آیا اس نے ایک مرتبہ کسی بات پر ناخوش ہو کر استعفیٰ دے دیا تھا۔ کلب علی خان کا دور تھا۔ انہوں نے استعفیٰ قبول نہیں کیا مگر اب کوئی کلب علی خان نہیں تھا۔ مستعفی منظور ہوتے ہی بنا۔

''آپ نے استعفیٰ دے دیا۔ میں کہتی ہوں کسی ریاست سے تعلق کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔''

''ریاستوں میں اب کیا رہ گیا لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے۔ نکلتا ہوں۔ ہر شہر میں شاگرد موجود ہیں کہیں نہ کہیں کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔''

آگرہ، اجمیر، علی گڑھ، متھرا، جے پور جہاں اُمید کی کرن نظر آئی پہنچ گیا۔ مشاعرے بھی ہوتے رہے۔ شاگردوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ لیکن روزگار کی

سبیل نظر نہ آتی تھی۔ مایوسی کے انہی دنوں میں اسے ایک خط ملا۔ خط کیا تھا کسی دیکھے خواب کی تعبیر تھی۔ یہ خط مولوی سیف الحق ادیب کی طرف سے آیا تھا جس میں اسے حیدر آباد آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ اطمینان بھی دلایا گیا تھا کہ ارکان سلطنت سے مشورہ کرلیا گیا ہے آتے ملازمان شاہی میں تقرر ہو جائے گا۔

میر محبوب علی خان سریر آرائے سلطنت تھے۔ ان کی علم پروری اور ادب نوازی کے بڑے چرچے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اہل حیدر آباد اس کی شاعری کے مداح ہیں۔ اس کے کئی شاگرد وہاں تھے۔ محفلوں میں اس کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔

اس نے ارادے کے پتھر کو پگھلایا اور حیدر آباد چلا آیا۔ مولوی سیف الحق نے یہاں تو یہ کہہ کر بلایا تھا کہ ارکان سلطنت سے مشورہ ہو گیا ہے۔ آتے ہی تقرر ہو جائے گا یا اب ''بہانوں'' کے قافیے تلاش کیے جا رہے تھے۔ وہ بے چارے بھی کیا کرتے۔ حکمرانوں کے مزاج دیکھ کر بات کرنی پڑتی ہے۔

ادب نواز اسے ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے لیکن اس کی نظریں تو کہیں اور لگی ہوئی تھیں۔

محمد ابراہیم، خانساماں شاہی، داغ کے پرستاروں میں تھا۔ اس نے جو سنا کہ دلی سے داغ آئے ہیں تو وہ دوڑا چلا آیا۔ اس خانساماں کو نظام حیدر آباد کا قرب حاصل تھا۔ اسے داغ کی خواہش کا علم ہوا تو وہ اسے دربار تک پہنچانے کے لیے رضا مند ہو گیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔ ''اس کام میں کچھ وقت لگے گا۔'' وقت نے اپنے پاؤں پھیلائے کہ سوا سال کا عرصہ گزر گیا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ درخواست پیش کی جا چکی ہے اور وہ تمام سرمایہ خرچ ہو چکا ہے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ حیدر آباد میں وہ کسی سے قرض لینا نہیں چاہتا تھا اور شاید تمنا بھی نہیں۔ دلی اپنا شہر ہے اگر اب برے دن ہیں تو اس شہر کے لوگوں نے اچھے دن بھی دیکھے ہیں کوئی نہ کوئی زندہ رہنے کا سامان کر ہی دے گا۔ اس نے حیدر آباد ہی سے اپنے دوست سعد آباد کے رئیس کو خط لکھا کہ رقم فوراً دلی روانہ کرو۔

رقم بھی آگئی۔ وہ خود بھی آگیا۔ تقدیر تھی کہ کبھی دھوپ دکھاتی تھی تو کبھی چھاؤں میں لے آتی تھی۔ وہ دلی آکر بھی دس مہینے کامل سولی پر لٹکا رہا اور پھر ایک دن حیدر آباد سے لفافہ آگیا۔ اسے نظام نے بلوایا تھا۔ اس مرتبہ کسی دوست نے نہیں بلوایا تھا۔ دعوت خود نظام نے دی تھی لہٰذا فوراً روانہ ہو گیا۔

حیدر آباد پہنچ کر معلوم ہوا نظام نے بلوایا ضرور تھا لیکن ملاقات کا وعدہ نہیں کیا تھا کیوں کہ وہ نظام کو اپنے آنے سے مطلع کر چکا تھا اور جب اتفاق سے ملاقات ہوئی تو اسے حیدر آباد آئے ہوئے ایک سال گزر چکا تھا۔

ملاقات ہوئی تھی ملازمت ابھی باقی تھی۔ دن پھر اوپر تلے ہو کر گزرتے رہے۔ غضب خدا کا ایک سال اور گزر گیا تب جا کر کنویں کو خیال آیا کہ کوئی پیاسا کھڑا ہے۔ مہر بند لفافے میں اعلیٰ حضرت نے اصلاح کے لیے غزل بھیجی اس کا مطلب تھا ملازمت ہو گئی، وہ استاد شہ مقرر ہو گیا۔

ریاست سے تعلق ہونے کی دیر تھی کہ نوازشات کی بارش ہونے لگی۔ وہ ایسا بھیگا کہ برسوں کی پیاس بجھ گئی۔

ملازم ہوتے ہی ریاست بھر میں اس کی ہر طرف عزت و توقیر کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ ریاستوں کا قاعدہ بھی یہ ہوتا تھا جو نواب کی نظروں میں چڑھا سب کی نظروں میں چڑھ گیا۔ آدھی ریاست اس کی شاگردی میں آگئی۔ ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تلامذہ داغ کو بھی معلوم ہو گیا کہ داغ اب ایک جگہ ٹک کر بیٹھ گئے ہیں۔ لہٰذا اصلاح کے لیے غزل کے انبار پہنچنے لگے۔ اس خدمت کے لیے بھی کچھ شاگرد مقرر تھے جو خطوط اس کی خدمت میں پیش کرتے، حاضر شاگرد ہی اس کی طرف سے خطوط کے جواب دیتے۔ یہ اتنا بڑا کام تھا کہ اس کا گھر ڈاک خانہ بنا ہوا تھا۔ سیکڑوں غزلیں تھیں جو اصلاح کی منتظر الماریوں میں بھری پڑی تھیں۔

ایک شاگرد جو اس وقت اسی خدمت پر مامور تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنا شروع کیا۔

عالی جاہ!

میں ایک مشہور قصبے مارہرہ کا رہنے والا ہوں۔ ہمیشہ سے آپ کے کلام کو دیکھنے کا شوق رہا۔ اب تفنن طبع سے میں نے بھی کچھ کہنا شروع کر دیا ہے مگر بے اصلاح استاد شعر گوئی کس مصرف کی۔ شعر گوئی اگرچہ آسان ہے لیکن استاد کی ضرورت ہے اگرچہ مجھ سے ہیچ کا کلام ایسا نہیں جسے آپ سے استاد دیکھیں مگر میں امیدوار ہوں کہ مجھ کو بھی حلقہ بگوشوں میں داخل کیجیے اور سرفراز فرمائیے۔ ایک غزل برائے اصلاح مرسل ہے۔

المعلف سید علی احسن، احسن مارہروی، مارہرہ ضلع

لیئے سرکار خورد۔

ارے یہ تو مارہرہ کے خاندان برکات میں سے کوئی صاحب لگتے ہیں۔ خاندان تو علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ اب دیکھیئے یہ صاحب زادے کیا فرماتے ہیں۔ ذرا غزل بھی کہہ لیجیے جو انہوں نے اصلاح کے لیے بھیجی ہے۔ وہاں حاضر ایک شاگرد نے غزل پڑھنی شروع کی۔

اے دل نہ سن افسانہ کسی شوخ حسیں کا
ناعاقبت اندیش رہے گا نہ کہیں کا
ہیں تاک میں اس شوخ کی دزدیدہ نگاہیں
اللہ نگہبان ہے اب جانِ حزیں کا
حالتِ دل بے تاب کی دیکھی نہیں جاتی
بہتر ہے کہ ہو جائے یہ پیوند زمیں کا
گو قدر وہاں خاک بھی ہوتی نہیں میری
ہر وقت تصور ہے مگر دل ہے وہیں کا

''مضامین میں تنوع تو نہیں ہے لیکن کلام زود بیانی کی خوبی سے ضرور مزین ہے۔ روایتی مضامین ہیں مگر ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ عشق کریں گے تو یہ عیب خود بخود جاتے رہیں گے۔'' پھر فرمایا۔ ''اس غزل کو الماری کے اس خانے میں رکھ دو جہاں اصلاح کے لائق غزلیں رکھی ہوئی ہیں۔''

احسن مارہروی کو پورا یقین تھا کہ خط کا جواب ضرور آئے گا۔ داغ کے لیے مشہور تھا کہ وہ نالائق سے نالائق شاگرد کو بھی نامراد نہیں لوٹاتے۔ احسن جانتا تھا کہ وہ معمولی شاعر تو ہوسکتا ہے لیکن نالائق نہیں ہوسکتا۔ پھر کوئی ایک مہینے کی تاخیر کے بعد داغ کی طرف سے جواب آگیا۔

جناب من!

آپ کا نام شاگردوں میں لکھا گیا۔ اطمینان رکھیے۔

ڈاکٹر مہدی حسن صاحب نے تاریخ گوئی میں ایک کتاب لکھی ہے ضرور منگوایئے۔ پتا یہ ہے گوالکنڈہ۔ حیدرآباد دکن۔

اس خط کے بعد دونوں کے درمیان مراسلت شروع ہو گئی۔ احسن غزلوں پر غزلیں لکھتا رہا۔ یہ غزلیں داغ کی طرف سے اصلاح ہوکر آتی رہیں۔

داغ کی شاگردی کا لطف اٹھاتے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے کہ اس کے خاندان والوں کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ والدہ اور والد دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی بڑا بھائی یا بہن بھی نہیں تھی جو اس کی شادی کی فکر کرتا۔ عمر کوئی ایسی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ بیس اکیس سال عمر زیادہ نہیں ہوتی لیکن اس وقت شادیاں اوائل عمری میں ہی ہو جاتی تھیں۔ اس اعتبار سے یہ عمر زیادہ ہی ہوگئی تھی۔ خاندان کی کچھ ہمدرد بڑی بوڑھیوں نے نظر دوڑائی تو اس کی ماموں زاد بہن افضال فاطمہ ہی ایسی لڑکی نظر آئی جو شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔

اس کے ماموں حافظ سید عبدالجلیل کا شمار مارہرہ کے جید علماء میں ہوتا تھا۔ انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ علی احسن ان کی مرحومہ بہن کی یادگار تھا۔ انہوں نے پہلی فرصت میں اپنی دختر افضال فاطمہ کا نکاح اس سے کردیا۔

شادی کے بعد شاعری کے علاوہ ایک اور ذمہ داری کا اضافہ ہوگیا۔ سوچا کوئی ایسا ذریعہ بن جائے کہ شوق بھی پورا ہوتا رہے اور کچھ نہ کچھ آمدنی بھی ہو جائے۔ ایسا ذریعہ اخبار یا کوئی رسالہ ہی ہوسکتا تھا۔ اس عہد تک اردو صحافت باوقار انداز اختیار کر چکی تھی۔ بے شمار اخبارات و رسائل شائع ہو رہے تھے۔ اس نے بھی سوچا مارہرہ سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا جائے۔ وہ ضروری تیاریاں کرتا رہا۔ ایسے صاحب ذوق حضرات سے خط کتابت بھی جاری رہی جو پرچے کی اشاعت میں اس کے معاون ثابت ہوسکتے تھے۔ داغ سے مراسلت ہوتی ہی رہتی تھی۔ ان سے ذکر کیا انہوں نے بھی حوصلہ افزائی کی۔ اب سوال سرمائے کی دستیابی کا تھا۔ انہوں نے اپنے چچا مولوی افتخار عالم صاحب آزاد سے ذکر کیا۔ وہ منافع کی امید میں فوراً تیار ہو گئے۔ دونوں کے اشتراک سے ماہ نامہ ''ریاض سخن'' جاری ہوگیا۔

ریاض سخن ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا تھا اور چوبیس صفحات پر مشتمل تھا۔ ابتدائی سولہ صفحات نظم کے لیے مخصوص تھے جن پر ممتاز شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا۔ آخر کے آٹھ صفحات نثر کے لیے مخصوص تھے ان پر مختلف عنوانات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

یہ رسالہ کچھ اس خوبی سے شائع ہوا کہ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی رسائی میر محبوب علی خاں والی دکن تک ہوگئی اور اس میں ان کی غزلیں شائع ہونے لگیں۔

احسن نے اس پرچے کی ترقی کے لیے انوکھی ترکیب نکالی۔ اس نے ہزاروں کی تعداد میں اشتہاری کارڈ تیار کیے جن پر ریاض سخن کی تعریف اور اسے خریدنے کی تاکید چھاپی گئی تھی۔ یہ کارڈ اس داغ کی خدمت میں ارسال کردیے اور ان سے استدعا کی کہ فہرست تلامذہ سے ان کے نام اور پتے لکھ کر اپنی مہر ثبت کر کے انہیں مکتوب الیہ تک پہنچا

دیں۔

داغ کے شاگردوں تک ان کی ہدایت کے ساتھ یہ کارڈ پہنچے تو ان میں سے بہت سے ''ریاض سخن'' کے سالانہ خریدار بن گئے۔

خشک کنویں میں قطرے ڈالنے سے کیا ہوتا ہے۔ داغ کی کوششوں سے یہ ہوا کہ چند خریدار اور بن گئے لیکن پرچہ شائع ہوتو خریدار کام آئیں۔ سال ڈیڑھ سال باقاعدگی سے چلنے کے بعد وہی حال ہونے لگا جو ادبی پرچوں کا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ تو چار ماہ مستقل شائع نہ ہوا۔ احسن کے چچا افتخار عالم جن کے اشتراک سے پرچے کی اشاعت شروع ہوئی تھی انہوں نے بھی علیحدگی اختیار کرلی۔ اب تمام اخراجات احسن کے سر آپڑے اس نے گھبرا کر مضطر خیر آبادی والی ٹونک نواب ابراہیم علی خان سے رابطہ کیا اور پرچے کا حال گوش گزار کیا۔ مضطر کی کوششوں سے نواب صاحب نے پرچے پر توجہ دی اور ایک ہزار روپے بطور عطیہ دینے کا حکم دیا۔

احسن مارہروی نے بطور شکر گزاری اپنے پرچے کا نام ریاض سخن سے تبدیل کر کے ریاض خلیل کردیا کیونکہ والی ٹونک ''خلیل'' تخلص کرتے تھے۔

مضطر کی شکر گزاری کے لیے ان کا ایک مصرعہ ''ہماری آرزو تم ہو ہمارا مدعا تم ہو'' بطور مصرعہ طرح دیا ریاض سخن میں چونکہ طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں یعنی مصرعہ طرح دے دیا جاتا تھا اور شعرا اس پر غزلیں لکھتے تھے جو اگلی اشاعت میں شائع ہوتی تھیں۔

مضطر کا مصرعہ دینے کے بعد اس نے داغ سے غزل کی فرمائش کی۔ داغ اور مضطر کی رنجش تھی لہٰذا داغ نے مضطر کے مصرع پر غزل لکھنے سے انکار کردیا۔

احسن کو معلوم تھا کہ داغ کسی بات پر مضطر سے روٹھے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بہانے دونوں میں راہ و رسم بحال ہو جائے لہٰذا وہ برابر اصرار کر رہے تھے۔ داغ نے غزل کہنے کی بجائے احسن کے نام تہدید نامہ لکھا جو یہ ہے۔

''میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ٹونک کی طرح میں ہرگز نہ لکھوں گا اور وہ لڑکا (مضطر) رئیس کا استاد ہو کر میرے اشعار پر اعتراض کرتا ہے حالانکہ اس کے بھائی نے رام پور میں مجھ سے اصلاح لی تھی۔ آپ اپنے پرچے کی رونق اس کے کلام سے بڑھائیے یہاں کسی کو غرض نہیں۔''

نواب ٹونک کی جانب سے جس عطیہ کا اعلان ہوا تھا وہ

نام: سید علی احسن
قلمی نام: احسن مارہروی
ولدیت: سید مجتبیٰ حسن
وطن: قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ
شاگرد: نواب مرزا داغ دہلوی
قیام دکن: 1896ء تا 1903ء
قیام لاہور: 1905ء تا 1906ء
قیام علی گڑھ: 1922ء تا 1938ء
اولاد: سعید احسن، سید محمد احسن، انعام احسن، سید احسن، سید رفیق احمد، انعام فاطمہ
پیدائش: 10 نومبر 1876ء
وفات: 30 اگست 1940ء
تدفین: 31 اگست 1940ء، درگاہ برکاتیہ، مارہرہ

☆☆☆

تصنیفات وتالیفات

جلوۂ داغ، یادگار داغ، کلیات ولی، تاریخ نثر اردو، انشائے داغ، فصیح اللغات (غیر مطبوعہ) منتخب داغ، احسن الکلام (دیوان)

بوجوہ احسن تک نہ پہنچ سکا۔ غالباً یہ عطیہ داغ اور مضطر کے اختلافات کی نذر ہوگیا۔ داغ کا شاگرد ہونا اسے مہنگا پڑ گیا۔

یہ عطیہ اگر مل گیا ہوتا تو پرچے میں پھر سے جان پڑ گئی ہوتی۔ حالت روز بروز خستہ ہوتی چلی گئی۔ پرچہ بچانے کے لیے جب آبائی جائیداد کا بڑا حصہ نذر ہوگیا تو مجبوراً ہاتھ کھینچنا پڑا۔ ریاض سخن بند کردیا۔

ایک مرتبہ پھر وہ اپنے رشتے کے چچا سید افتخار عالم کے پاس پہنچ گیا۔ ''چچا اب کیا کروں۔ ریاض سخن جو آپ کے اشتراک میں شروع کیا تھا کب کا بند ہوگیا۔''

''میاں سجادہ نشینی کے دور گزر گئے۔ جائیداد بیچ کر کب تک گزارہ کرو گے۔ ایک بچے کے باپ بھی بن گئے ہو میری مانو تو کہیں ملازمت کرلو۔''

''مارہرہ میں ملازمت کہیں اور مل بھی گئی تو لوگ کیا کہیں گے سید مجتبیٰ کا بیٹا اور فلاں کا ملازم۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ ملازمت مہیا کرنی ہے۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے۔ مارہرہ سے نکلو کچھ نہیں تو لکھنو

ہی چلے جاؤ۔‘‘

’’جب جانا ہی ہے تو استاد کے پاس حیدر آباد نہ چلا جاؤں۔ حضرت داغ جس مرتبے کے آدمی ہیں اس کے پیش نظر وہ میری ملازمت کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل نکال سکتے ہیں۔ مجلسی آدمی ہیں ان کے سیکڑوں شاگرد ہیں۔ ان کا کہا کوئی نہ ٹالے گا۔ میں ریاض سخن میں نظام حیدر آباد میر محبوب علی خان کی غزلیں شائع کرتا رہا ہوں۔ وہ میرے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ داغ نے اگر سفارش کی تو ہرگز ضائع نہیں جائے گی۔‘‘

افتخار عالم نے بھی اس کی تائید کی لیکن یہ مشورہ بھی دیا کہ حیدر آباد جانے سے بہتر ہے کہ یہاں رہ کر بذریعہ خط کتابت کوشش کی جائے اور جیسے ہی کوئی صورت نظر آئے حیدر آباد کے لیے سامانِ سفر باندھ لو۔ احسن نے نصیحت پر عمل کیا اور استاد کی خدمت میں خط ارسال کر دیا۔

’’میں آج کل اپنی ملازمت کے لیے مختلف جگہوں پر سلسلہ جنباں ہو رہا ہوں۔ اس لیے اچھا موقع ہے کہ حضور تک بھی اپنی استدعا پہنچا دوں۔ اگر توجہ ہو گی تو کوئی بڑی بات نہیں اس سے میری ایک بہت بڑی آرزو نکلے گی کیوں کہ حضور کی خدمت میں رہ کر بہت اچھی طرح سے اپنے دلی منصوبے نکال سکتا ہوں اور خوب اچھی طرح چشمۂ فیض سے سیراب ہو سکتا ہوں۔‘‘

اس کا جواب آیا لیکن ایک فقرے میں دفتر بند تھا۔ اس کے لیے الگ کاغذ کی کیا ضرورت اس کے خط کے حاشیے پر لکھ دیا گیا۔

’’ابھی روزگار کا یہاں نام نہ لو۔‘‘

وہ کیسے نام نہ لیتا۔ استاد کو جانتا بھی تھا کہ تاخیر پسند ہیں جب تک تقاضے نہ کرو مفہوم تک پہنچتے ہی نہیں۔ وہ جب بھی غزل اصلاح کے لیے بھیجتا خط کا آغاز نوکری کے تقاضے سے کرتا۔ بالآخر اس کا خط آیا۔

’’بادشاہی فیض عام ہوتا ہے، خصوصیت نہیں۔ آپ کو کیا معلوم ہے کہ کس قدر درخواستیں آتی ہیں۔ مجھ کو چار روز سے تپ لرزہ ہے۔ ایک تپ رہتی ہے اور ایک آتی ہے، اس وقت تک بخار نہیں اترا۔‘‘

اس کے بعد احسن مارہروی نے نظام حیدر آباد کے نام قصیدہ لکھا اور داغ کو روانہ کر دیا کہ اس کی جانب سے نظام کی خدمت میں پیش کر دے۔

داغ کو قصیدہ موصول بھی ہوا اس نے نظام کی خدمت میں پیش بھی کر دیا۔ واہ واہ ہوئی اور بات ختم ہو گئی۔ داغ نے پھر اسے لکھا۔ ’’سید صاحب، میں اکثر لکھ چکا ہوں کہ قسمت یاور ہو تو اس سرکار عالی سے عطا ہو۔ قصیدہ قطعہ سب لکھ چکے گویا وہ عرضیاں تھیں۔‘‘

جب وہ ہر کونے میں جھاڑو دے چکا تو اس نے کمرے کو تالا لگایا۔ بیوی سے اجازت لی۔ چچا افتخار عالم کو ساتھ لیا اور یہی سوچا کہ حیدر آباد جا کر جو معاملات پیش آ رہے ہیں ان سے بذاتِ خود نمٹا جائے۔ اس سفر کے لیے یہ شوق بھی ہاتھ پھیلا رہا تھا کہ استاد کے دیدار سے فیض یاب ہوا جائے۔ اس نے ابھی تک داغ کو دیکھا نہیں تھا۔ داغ بھی اسے نہیں پہچانتے تھے۔ حیدر آباد میں رہنے کا ٹھکانا بھی نصیب تھا۔ اس کے ہم زلف کاظم علی شوکت بلگرامی حیدر آباد ہی میں مقیم تھے۔ جب تک ضرورت ہو ان کے گھر رہا جا سکتا تھا۔

وہ حیدر آباد پہنچا اور اپنی سالی کے گھر پہنچ گیا۔

کوئی حیدر آباد میں رہتا ہو اور داغ کے در دولت سے واقف نہ ہو۔ اس کے ہم زلف اسے لے کر افضل گنج پہنچ گئے۔

’’یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وہ افضل گنج میں رہتے ہیں۔ بس ذرا مکان ڈھونڈنا پڑے گا۔‘‘

’’اس کی نوبت بھی کیوں آئے گی۔ اگر یہ افضل گنج ہے تو استاد کے مکان سے سب واقف ہوں گے۔‘‘ یہی ہوا اس نے کسی راہگیر سے داغ کا پتا پوچھا۔ وہ الٹا بگڑ گیا۔

’’حیدر آباد میں رہتے ہو اور نواب کے استاد کا گھر نہیں جانتے۔‘‘

’’میں حیدر آباد میں نہیں رہتا باہر سے آیا ہوں۔‘‘

’’تبھی تو۔ حیدر آباد میں رہتے تو کبھی نہ کبھی کوئی ضرورت تمہیں یہاں کھینچ لائی ہوتی۔ اب بھی جاؤ گے تو کئی ضرورت مند دروازے پر مل جائیں گے۔ حیدر آباد میں ایک ہی تو گھر ہے جہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔‘‘

اس شخص نے پتا سمجھا دیا اور وہ دونوں بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئے۔ اطلاع کرائی فوراً طلبی ہوئی۔ وہ داغ سے کبھی نہیں ملا تھا۔ کبھی ایک تصویر استاد کی خدمت میں بھیجی تھی اس کی مدد سے انہوں نے ایک نظر میں پہچان لیا۔

’’اب تو آپ مسلمانوں کی صورت میں نظر آتے ہیں۔‘‘

’’آپ اس تصویر کی روشنی میں کہہ رہے ہیں جو میں

نے آپ کو بھیجی تھی۔''

''جی ہاں اور جسے میں نے ایک ہفتے بعد ہی واپس کر دیا تھا۔ میں ایک سید کو جو حافظ قرآن بھی ہو اس حلیے میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔''

''اس کے گناہ گار بھی میں نہیں یہی صاحب ہیں جو میرے ہم زلف ہیں۔ میں ان کے پاس آگرہ گیا ہوا تھا۔ وہ لباس بھی ان ہی کا تھا جو میں نے اس تصویر میں پہنا ہوا تھا۔''

''خیر مجھے تشفی ہوئی کہ آپ ''وہ'' نہیں۔ محض تصویر میں تھے۔'' اس کے بعد انہوں نے دو حضرات کا تعارف کرایا جو اس وقت ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ان میں ایک تو حیدرآباد کے مشہور رئیس میر حسن علی خان تھے اور دوسرے مظفر حسین بارق تھے جو تلکوکنڈ کے مدرسے میں مدرس تھے۔ داغ کے اوّلین شاگردوں میں سے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ ہر جمعرات کو داغ کی خدمت میں آتے اور جمعہ کا دن گزار کر جاتے۔

گفتگو کا آغاز ہوا تو احسن یہ بھول ہی گیا کہ وہ اتنے بڑے شاعر کے سامنے ہے اور وہ شاعر اس کا استاد بھی ہے اور وہ اس سے پہلی مرتبہ مل رہا ہے۔ نہ بڑے شاعر ہونے کا تکبر تھا، نہ پہلی مرتبہ ملنے کی اجنبیت، نہ استاد ہونے کا نمائشی رعب۔ داغ اس سے اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے بے تکلف دوستی ہو لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ باتوں باتوں میں احسن کی استعداد علمی کا امتحان لے رہے ہیں۔ داغ کی تعلیمی قابلیت زیادہ نہیں تھی لیکن قلعہ معلی میں پرورش ہوئی تھی۔ رام پور میں امیر مینائی جیسے بزرگوں کے درمیان جوانی گزاری تھی۔ زندگی بھر اشعار کے موتی رولے تھے۔ بڑے بڑے علماء کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ زبان دانی وجۂ شہرت تھی۔ احسن کی فارسی و عربی دانی کا ان پر کیا رعب پڑتا بلکہ الٹا یہ ہوا کہ احسن ان کی زبانی زم زم سے دھلی اردو سن کر مسحور ہو گیا۔ داغ نے ٹھیک کہا تھا

کہتے ہیں اسے زبانِ اردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

اور یہ بھی کچھ غلط نہیں کہا تھا

اردو ہے جس کا نام ہمی جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

صحن میں دھوپ پھیلی تو یاد آیا کہ دوپہر ہو گئی اب گھر چلا جائے۔ داغ کا وقت قیمتی ہے بہت دیر بیٹھ لیے لیکن جانے کا سنتے ہی داغ نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''اوّل تو مجھے یہ گلہ ہے کہ تم میرے پاس نہیں ٹھہرے شوکت صاحب کے گھر ٹھہرے۔ بالائے ستم یہ کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے اور کھانا کھائے بغیر تشریف لے جا رہے ہیں۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔''

احسن تلاش روزگار میں حیدرآباد آیا تھا۔ داغ کے کمال ہنر کا ایسا اسیر ہوا کہ پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ روز کا معمول ہو گیا کہ دن نکلے داغ کی صحبت میں حاضر ہوتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔

بزم داغ میں جو ذمہ داری اسے سونپی گئی وہ بیرونی تلامذہ کے کلام کی پیش کاری تھی۔ ملک کے طول و عرض میں داغ کے بے شمار شاگرد پھیلے ہوئے تھے اور سیکڑوں خطوط ہر روز آتے تھے۔ ان خطوط کے ساتھ اتنی ہی غزلیں برائے اصلاح آتی تھیں۔ اتنی غزلوں پر اصلاح کرنا اور خطوط کے جواب دینا آسان نہیں تھا جب کہ داغ مجلسی آدمی تھے۔ فرصت کے اوقات کم ہی ملتے تھے۔ اس کے لیے تو کوئی ایسا آدمی چاہیے تھا جو ان چیزوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھے۔ اس نے الماریاں کھول کر دیکھا تو بے شمار غزلیں اصلاح سے محروم ان الماریوں میں بھری پڑی تھیں۔ اس نے ان مسودوں کو نکالا اور بڑے سلیقے اور نفاست سے انہیں استاد کی خدمت میں پیش کیا اور ان پر ان سے اصلاح لی، تعداد اتنی تھی کہ اس کے باوجود مہینوں لگ گئے۔

یہ کام نمٹانے کے بعد اس نے خطوط کے جوابات میں تعجیل کے لیے باقاعدہ ایک دفتر قائم کیا اور اس کی نگرانی اپنے ذمہ لی۔ یہ بھی ادب کی ایک خدمت تھی کہ سیکڑوں تلامذہ اور داغ کے درمیان رابطے کو مستحکم بنا دیا۔ اس سے خود اسے یہ فائدہ پہنچ رہا تھا کہ سیکڑوں غزلیں اس کی نظر سے گزر رہی تھیں۔ اصلاح کس طرح دی جاتی ہے، کون سا لفظ کیوں بدلا گیا ہے لفظ بدلنے سے شعر کی دنیا کتنی بدل گئی۔ اس کا شعور اسے ہوتا جا رہا تھا۔ سیکڑوں کلیات پڑھنے کے بعد بھی اسے وہ فائدہ نہ ہوتا جو اب ہو رہا تھا۔ اس پیش کاری کا اثر خود اس کی اپنی شاعری پر بھی پڑ رہا تھا۔ داغ کے تتبع میں سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی جانب میلان ہوا۔ زبان کی صحت کا خیال اور متروکات سے احتیاط بہت بڑھ گئی۔ جیتی جاگتی شوخی، رنگینی اور جدت آفرینی داغ ہی کے اثر سے آئی۔ داغ کی شوخی اور معاملہ بندی مشہور تھی۔ احسن کا کلام ابتدا میں اس سے خالی تھا لیکن ہمہ وقت صحبتِ داغ

نے یہ وصف اس کے کلام میں پیدا کر دیا اس کا کلام اب یہ رنگ پیش کر رہا تھا۔

کب وصل کے ہونے کی مجھے آس ہے تم سے
جھنجلا کے جو کہتے ہو کہ ہاں ہو نہیں سکتا

رخِ نازک بچائیے اپنا
عکس پڑتا ہے شمعِ محفل کا

چشم بد دور آپ کا جوبن
اب طلب گار ہے کسی دل کا

پڑے رہتے ہیں اپنے ناخنوں میں بیسیوں ایسے
وہ کہتے ہیں ہلالِ چرخ دیکھے انگلیاں میری

وہ سن کر سرد مہری کی شکایت اس قدر برسے
کہ بانسوں آب خجلت ہو گیا اونچا مرے سر سے

واعظ کے ساتھ دیکھیے احسن کا میل جول
عمامہ سر پہ اور بغل میں کتاب ہے

قبر میں بھی تو مر کے پہنچا ہوں
راس کوئی سفر نہیں مجھ کو

داغ حسن کی دنیا کے باسی، عیش پرستوں کے ساتھی اور عاشق ازلی تھے۔ اس کے برخلاف احسن مارہروی کسی اور ہی کوچے کے رہنے والے تھے۔ خانقاہوں کی فضا میں پرورش ہوئی تھی۔ عبادت و ریاضت کی چھاؤں میں پلے بڑھے تھے۔ کلام میں جو حسن وعشق کے داؤ پیچ نظر آنے لگے یہ اس کا تجربہ نہیں استاد کی شاعری کو قریب سے دیکھنے کا نتیجہ تھا۔

ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ داغ سے ملاقات کے لیے جتنے باکمال لوگ آتے تھے احسن کو ان کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک درس تھا جو مسلسل جاری تھا۔

احسن نے داغ کے مکان سے متصل مکان لے لیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں کم استاد کی خدمت میں زیادہ نظر آتا تھا۔ اس کے شب و روز خدمت داغ میں بسر ہو رہے تھے۔ لہٰذا جتنے قریب سے داغ کو دیکھنے کا موقع اسے ملا اتنا تو ان کے کسی عزیز کو ملا نہ تلامذہ میں سے کسی کو۔ دوسرے تو محض تماشائی تھے۔ گھڑی دو گھڑی کے ساتھی تھے لیکن احسن تو داغ کی پرچھائیں بن گیا تھا۔ حال و قال کی محفلیں ہوں یا نغمہ و سرور کی نشاط انگیزیاں وہ ہر جگہ موجود ہوتا۔ بے تکلف دوستوں کی زبانی داغ کے وہ راز زندگی بھی اس کے علم میں تھے دوسروں کو جس کی ہوا نہیں لگی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا عقیدہ بھی تھا۔

"وہ دو ایک نفوس جن کو اسلاف کا فخر کہنا چاہیے باقی رہ گئے ہیں ان کے بعد چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا ہے۔"

سناٹا ہونے سے پہلے کچھ آوازوں کو قید کر لیا جائے تو یہ بڑی خدمت ہو گی۔ اس نے سوچا اگر داغ کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے اہم واقعات اگر ضبط میں تحریریں لا کر محفوظ کر لیے جائیں تو بڑا کارنامہ ہو گا۔ کام تو خوب سوجھا تھا لیکن یہ کام داغ کے علم میں لائے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے یہ کھٹکا بھی تھا کہ اگر داغ نے اس "اقدامِ رسوائی" کو پسند نہ کیا تو کم از کم داغ کی زندگی میں تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس کام کو دوسرے لوگ کریں گے۔ دوسرے لوگوں کی مرتب کردہ سوانح صداقت سے عاری ہو گی اور یہ استاد کے ساتھ سخت ناانصافی ہو گی۔

سوانح مرتب کرنے کی کوشش ممکن ہے اس کے ذہن ہی میں مرتب ہو کر اختتام پذیر ہو جاتی یا استاد سے اجازت لینے کی ہمت ہی نہ ہوتی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ محمد دین فوق سوانح داغ لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو اسے فکر ہوئی۔ سوانح کا حق جس طرح وہ ادا کر سکتا ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ وہ حیدرآباد میں تھا۔ داغ کا ہمسایہ تھا۔ ان کا چہیتا شاگرد تھا۔ داغ کے نہایت قریب تھا اور پھر یہ کہ وہ صرف شاعر نہیں تھا، قابلِ ذکر نثر نگار بھی تھا۔ اپنے پرچے ریاض سخن میں نثر نگاری کے جوہر دکھا چکا تھا۔ ان سب اوصاف کے پیشِ نظر اسے حق پہنچتا تھا کہ وہ سوانح داغ مرتب کرے۔ اس نے داغ کے سامنے اپنے ارادے کا ذکر کیا۔ داغ نے وہی کہا جو اسے کہنا چاہیے تھا۔

"بس یہی کسر رہ گئی تھی جو تم پوری کر دو گے۔ رو سیاہیوں کے جو شب و روز میں نے گزارے ہیں انہیں طشت از بام کر دو گے۔ جسے نہیں معلوم اسے بھی معلوم ہو جائے گا۔ کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے دل بستگی کے لیے اختر جان کو ملازم رکھا ہوا ہے۔ کیا اس میں رام پور کی رنگین راتوں کو ذکر نہ ہو گا۔ کیا منی بائی حجاب کا پیچھا کرتے ہوئے کلکتہ جانے کا ذکر نہ ہو گا۔ بھائی تم سید زادے ہو۔ کیوں اپنے قلم کو داغ دار کرو گے۔"

"استادِ زماں، یہ آپ نے اچھی کہی۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ سوانح کسی فرشتے کی نہیں انسان کی سوانح ہو گی اور انسان بھی وہ جو شاعر کا دل رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کی زندگی صرف راتوں سے عبارت نہیں۔ ان میں دن بھی تو نکلے ہیں۔ آپ کی شعری ولسانی خوبیاں بھی تو ہیں۔"

"یہ ضرورت میرے دواوین سے پوری ہو جائے گی۔ میرے نقاد خود لکھ دیں گے کہ میں کس پائے کا شاعر تھا۔"

"لیکن وہ یہ نہیں لکھ سکیں گے کہ ان عظیم شعروں کے خالق نے کیسی زندگی گزاری۔ دلی اجڑی تو اس باکمال شاعر پر کیا گزری۔ رام پور کے مشاعروں کی کیا کیفیت تھی۔ دربار نظام میں باریابی کے لیے اسے کن کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ شاعر کلکتہ ایک طوائف کے پیچھے ضرور گیا تھا لیکن وہاں پہنچتے ہی اردو زبان کے کتنے چراغ روشن کردیے۔ اس لیے سوانح کا لکھا جانا ضروری ہے۔"

"پھر بھی کیا ضروری ہے۔"

اس لیے بھی ضروری ہے کہ بعض مشاہیر اس راہ میں قلم اٹھانے والے ہیں۔ وہ حضور سے زیادہ واقف نہیں۔ بہت سی باتیں ایسی لکھ جائیں گے جو صداقت سے بعید ہوں گی مگر لوگ یقین کرلیں گے اور وہی باتیں رواج پا جائیں گی۔ ان کی تردید بھی ہوئی تو بھی ان کے اثرات رہ جائیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نقش اوّل کے طور پر اس کی ابتدا میں کردوں کیوں کہ مجھے حضور سے قربت ہے۔ بہت سی باتوں کا عینی شاہد ہوں اور پھر تصحیح کے لیے حضور موجود ہیں۔

اتنی دلیلوں کے بعد داغ نے اجازت دے دی۔ نہ صرف اجازت دی بلکہ وہ معلومات بھی فراہم کیں جو احسن کے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے کی تھیں۔ ولادت، نسب نامہ، بچپن، تعلیم، بہادر شاہ ظفر کے مشاعروں میں شرکت وغیرہ سے متعلق تھیں۔

احسن نے داغ کی سوانح "جلوۂ داغ" کے عنوان سے لکھنی شروع کردی۔ یہ اس کی پہلی باقاعدہ نثری کاوش تھی جو عقیدت واحترام کی نذر ہوگئی۔ داغ کی والدہ کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور تھیں۔ سوانح نگار کی حیثیت سے ضروری تھا کہ وہ تحقیق کرتے اور کسی نتیجے پر پہنچتے اور ممکن ہو پہنچ بھی گئے ہوں لیکن داغ کی زندگی میں داغ کے سامنے وہ اس کی تفصیل میں نہیں جاسکتے تھے۔ صرف یہ لکھ کر آگے بڑھ گئے۔

بہر حال اس پریشانی کے زمانے میں مرزا صاحب کی والدہ ماجدہ نے ولی عہد بادشاہ دہلی کے دامن عاطفت میں امان کی اور اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ شاہی محل میں گزارا اور نواب شوکت محل بیگم خطاب پایا۔

کے بارے میں تو دو سطریں لکھ بھی دیں، ننھیال کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

اگرچہ "جلوۂ داغ" ایک عقیدت مندانہ تالیف تھی۔ لہٰذا بعض اہم اختلافی امور کا تحریر و تحقیق سے باہر رہ جانا ایک قدرتی امر تھا۔ نیز بعض ایسے معاملات میں اس سوانح میں تحریر ہونے سے رہ گئے جو داغ کی نجی زندگی سے متعلق تھے۔ وہ داغ کی زندگی میں انہیں طشت ازبام نہیں کر سکتے تھے۔ یہی اس سوانح کی کمزوری تھی جسے احسن نے لکھنے سے پہلے محسوس نہیں کیا ہوگا لیکن لکھتے وقت یہ دقتیں اس کے سامنے آئیں۔ وہ استاد کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں لکھ سکتا تھا بلکہ بعض واقعات تو وہ تھے جن کے بارے میں وہ داغ پر ظاہر بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ان سے واقف ہے۔

یہی وجہ ہوئی کہ داغ جیسے عظیم المرتبت شاعر کی سوانح

معاصرین کی نظر میں

"مرزا غالب نے صاحب عالم کے نام خط لکھ کر مارہرہ کو ملک سے روشناس کرایا۔ اس کے بعد اس قصبے کا نام حضرت احسن کی بدولت ایسا روشن ہوا کہ اردو زبان کے طلبہ اور اردو داں طبقے میں اس کی شہرت ہوگئی۔ "مارہروی" حضرت احسن کے نام کا لازمی جزو ہوگیا اور اس نے مارہرہ کا نام روشن کیا۔

حضرت احسن نے فارسی اور اردو ادب کا بڑے غور سے مطالعہ کیا جو ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ وہ بہت اچھے شاعر اور نثار تھے۔ انہوں نے اردو ادب اور زبان کے متعلق بہت سے مضامین لکھے۔ علی گڑھ کالج میں انہوں نے ایک خاص مقام حاصل کرلیا تھا۔

وہ بڑے مہمان نواز، صاحب ذوق اور سچے دوست تھے۔ طبیعت میں بڑی نفاست تھی۔ قدیم آداب کے نہایت پابند تھے۔ اردو ادب ان کی تصانیف یادگار رہیں گی۔

(مولوی عبدالحق)

اردو زبان کے شعرا میں از روئے علم وفن مولانا مرحوم کا کوئی ہم پلہ نہ تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کے زمانے کے بعض مسلم الثبوت اساتذہ ان سے اکثر ادبی نکات پر استفسار کرتے تھے اور ان کے فرمان کو بے چوں وچرا حرف آخر سمجھ کے تسلیم کرلیتے تھے۔"

(مینا زبیری)

عمری صرف ایک سو اٹھاون صفحات میں سمٹ گئی۔ داغ نے قطعہ تاریخ کہا۔

زندگی کے مری احسن نے سوانح لکھے
عمر کے باغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھا
داغ نے مصرعہ تاریخ کہا یہ برجستہ
جلوۂ داغ کا یہ آنکھ سے جلوہ دیکھا

۱۳۲۰ھ

جب احسن مارہرہ میں تھا۔ شاعری کی ابتدا کر چکا تھا اور علم پاروں کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا تھا ان دنوں امیر مینائی کا مرتب کردہ ''امیر اللغات'' کی بڑی دھوم تھی۔ یہ لغت اس کے مطالعے میں بھی رہتی تھی لیکن جب وہ حیدرآباد آیا اور داغ کی صحبت سے آشنا ہوا تو امیر اللغات کو کسی اور ہی نظر سے دیکھا۔ اب وہ ایک ایسی کتاب نظر آئی جو دبستان لکھنؤ کی ترجمانی کر رہی تھی۔ وہی محاورے وہی ضرب الامثال جو لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز تھے۔ اس لغت کی سطروں پر بکھرے ہوئے تھے۔ مقالوں میں جو اشعار درج تھے وہ بھی لکھنوی رنگ شاعری کی ترجمانی کرتے تھے۔ داغ کی صورت میں رہ کر اور داغ کے محاورے سن سن کر اسے دبستان دہلی کا خیال آیا۔ کوئی ایسی لغت بھی تو ہو جو دبستان دہلی کی ترجمانی کرتی ہو۔ اس لغت میں داغ کے رنگ شاعری کا علم بلند ہوتا ہو۔

داغ کی صحبت میں احسن کو یہ خیال بھی ہوا کہ داغ کی جو لسانی خدمات ہیں وہ فراموش ہو جائیں گی اور امیر اینائی کا یہ کارنامہ داغ پر ان کی فوقیت پر دلیل بن جائے گا لہٰذا احسن کے دل میں بھی ایسی ہی ایک لغت کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا تاکہ استاد کی یادگار کے طور پر باقی رہے ''جلوۂ داغ'' کی تکمیل کے بعد اس نے فیض داغ کے نام سے ایک لغت کا آغاز کر دیا جس کے بعد میں نام تبدیل کر کے ''فصیح اللغات'' رکھا گیا۔

احسن نے ''فصیح اللغات'' کی ترتیب کے لیے داغ کے کلام سے ایسے اشعار جمع کیے جن میں دلی کے روزمرہ اور محاورے استعمال ہوئے تھے۔ احسن نے انہیں ردیف وار، لغوی انداز میں ترتیب دیا نیز جن الفاظ اور محاورات کے اشعار داغ کے کلام میں موجود نہیں تھے اس نے اس کے لیے مخصوص نشست کا انتظام کیا اور داغ سے اس پر خاص طور سے اشعار لکھوائے۔ بلکہ وہ لغت کے ترتیب میں جہاں اٹکتا جس لفظ کے لیے مثال میں کوئی شعر نہ ملتا وہ استاد کی خدمت میں پہنچ جاتا۔

''قصور برا لگنا'' زیرِ غور ہے۔ مثال میں کوئی شعر موجود نہیں اگر کوئی شعر موزوں فرما دیں تو کمی پوری ہو جائے۔

فرمایئے ''لکھو''

معشوق سے شکایت جور و جفا ہے جرم
اس کو بری لگے تو خدا کو بری لگے

اسی ردیف میں ''بچت'' کا لفظ آیا۔ داغ نے شعر لکھوایا۔

سودے میں جنس دل کا دوالہ نکل گیا
بیوپار وہ کیا تھا کہ جس میں بچت نہ تھی
اس نے غیروں کو پلائی بزم میں
رشک سے ہم غصہ پی کر رہ گئے
کچھ کدورت جس سے تجھ کو ہو گئی
کردیا پیوند اس کو خاک کا
جاگا ہوا تھا رات کا زاہد تھا معتکف
جب صبح ہو گئی تو وہ پینک میں آگیا
خاکساری آدمی کو چاہیے
ہے یہ پتلا اور پیکر خاک کا

فصیح اللغات کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ ابتدا میں داغ نے دلچسپی نہ لی تھی لیکن وہ بھی اب اس کی افادیت کے قائل ہونے جا رہے تھے اور دلچسپی لینے لگے تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ لغت تیزی سے ترتیب ہو گی لیکن اچانک کام میں تعطل آگیا۔ مارہرہ سے خط آگیا۔ کام کی نوعیت ایسی تھی کہ جائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ وہ استاد کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

''میں جب یہاں آ رہا تھا اپنی آبائی جائیداد اپنے دادا سید برکات احسن کی نگرانی میں دے آیا تھا۔ پچھلے دنوں دادا کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد جائیداد کا جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے۔ میرا مارہرہ جانا ضروری ہو گیا ہے تاکہ میں اس جائیداد کا حق ثابت کر سکوں جو میں نے دادا کی نگرانی میں چھوڑی تھی۔ آپ سے مفارقت کو جی نہیں چاہتا لیکن یہ کام بھی ضروری ہے۔''

''جی تو نہیں چاہتا کہ تمہیں رخصت کروں لیکن یہ سوچ کر اجازت دے رہا ہوں کہ فصیح اللغات کا کام جاری رہنا چاہیے۔ یہ کام مارہرہ میں رہ کر بھی ہو سکتا ہے۔ الفاظ جمع کر کے بھیج دیا کرنا میں اشعار کو بھیج دیا کروں گا۔''

"جب تک مارہرہ میں رہا یہی طریقہ اختیار کروں گا امید ہے بہت جلد آپ کے قدموں میں ہوں گا۔"

اس نے مسودات سمیٹے، جو کام ہو گیا تھا اس کی نقول داغ کے سپرد کیں اور خود مارہرہ آ گیا۔ احباب نے جو کچھ خطوط میں اطلاعات فراہم کی تھیں وہ درست تھیں۔ دادا کی وفات کے بعد چچا نے اس کی جائیداد کا حصہ بھی اپنے حصے میں شامل کر لیا تھا۔ اس نے پہلے تو خاندان کے بزرگوں سے مدد لی لیکن چچا اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ اس کے پاس کوئی تحریری ثبوت تو تھا نہیں اور چچا نے اخلاقی دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً اسے چچا کے خلاف عدالت میں جانا پڑا۔ جائیدادوں کے مقدمے برسوں چلتے ہیں۔ یہ مقدمہ بھی دو برس چلتا رہا اور بالآخر فیصلہ چچا کے حق میں ہو گیا۔ دو برس کے مقدمے نے اسے مالی طور پر زیر بار کر دیا۔ جائیداد کے حصول کے لیے جائیداد کا کچھ حصہ فروخت کرنا پڑ گیا۔

یہ جھمیلے ایسے تھے کہ وہ لکھنے پڑھنے کے کام پر توجہ دے ہی نہیں سکتا تھا۔ جب فرصت ملتی داغ کے نام خط لکھ دیتا۔ اس طرف سے جواب آ جاتا لیکن لغات اس طرح مرتب نہیں ہوتیں۔ داغ اس کے حالات سے ناواقف یہی سمجھتا رہا کہ وہ مارہرہ جا کر سہل پسند ہو گیا ہے۔ لغت کے کام پر پوری توجہ نہیں دے رہا ہے۔ ہر خط کے بعد اس کی ناراضگی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ احسن، استاد کی ناراضی دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا لیکن ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ چاہنے کے باوجود حیدرآباد واپس نہ جا سکا۔

جس جوش و خروش اور لگن کے ساتھ "فصیح اللغات" کا کام شروع ہوا تھا اسی جذبے کے ساتھ اختتام تک نہ پہنچ سکا۔

☆......☆

داغ اب صرف مقبولیت کی داد ہی وصول نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دامن نظام کی نوازشات سے لبریز بھی تھا۔ اس کی دولت کے چرچے کلکتہ تک پہنچے۔ حجاب کی سوئی ہوئی محبت نے انگڑائی لی۔ نامہ شوق آیا کہ وہ آ رہی ہے۔

انتظار ختم ہوا۔ منی بائی حجاب آ گئی۔ عمر کی دھوپ ادھر بھی ڈھل چکی تھی۔ داغ کو اس کے آنے کی خبر کی گئی۔ داغ نے آنکھوں سے خیر مقدم کرنا چاہا لیکن وہ اس کے سامنے آنے سے گریزاں تھی۔

"جب تک نکاح نہیں کرو گے میرا تمہارا شرعی پردہ ہے۔"

وہ حیران تھا کہ یہ حجاب ہی ہے یا کوئی اور۔ معلوم ہوا پنج وقتہ نمازی بن چکی ہے۔ ایک طوائف کی ایسی دنیا بدلی ہے کہ کوئی وقت وظیفوں سے خالی نہیں۔

داغ کی بیوی کا کئی سال ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔ میدان صاف تھا لیکن ایک رکاوٹ بھی تھی۔ اس نے اپنی سالی کی بیٹی امراؤ بیگم کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ اس کا شوہر اور بچے داغ کے ساتھ ہی رہتے تھے لہٰذا وہ حجاب کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے حجاب کے لیے علیحدہ مکان کا انتظام کر دیا۔ سو روپے تنخواہ مقرر کی۔ جائے نماز اور تسبیح یہ کہہ کر بھجوائی۔

"جب تک تمہارے وظائف نہیں چھوٹیں گے تم انسان نہیں بن سکتیں اور جب تک انسان نہ بنا جاؤ میرے کام کی نہیں ہو سکتیں۔"

وہ نہ پردہ قائم رکھ سکی اور نہ یہ انسان بننے کا انتظار کر سکا۔

اب اس کا زیادہ تر وقت حجاب کے گھر گزرنے لگا۔ دوست بھی وہیں آنے لگے۔ شطرنج کی بازیاں بھی وہیں جمنے لگیں۔ حجاب کو وہ سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا کرتا تھا۔ وہ کوئی گھر میں بیٹھنے والی عورت تو تھی نہیں کہ گزارہ کر لیتی۔ یہ رقم اسے کم پڑنے لگی۔ وہ داغ کے نام پر قرض لیتی رہتی جسے داغ کو بھگتنا پڑتا۔ داغ کو محسوس ہونے لگا کہ جیسے وہ اس سے زیادہ اس کی دولت پر نظر رکھتی ہے۔ یہ شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب حجاب نے کلکتہ سے اپنے تمام رشتہ داروں کو بلا لیا۔ ان کے اخراجات کا بار بھی داغ کو اٹھانا پڑا۔ نکاح کے تقاضے الگ ہو رہے تھے۔

وہ جوانی تھی کہ داغ نے اس کے لیے سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا اور رام پور سے کلکتہ جا پہنچا تھا۔ اب بڑھاپا تھا۔ تجربے نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ حجاب اسے وبال لگنے لگی۔ اس نے پاؤں روک لیے۔ کئی کئی دن اس سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ جاتا بھی تو آنکھیں ماتھے پر رکھ کر، نکاح تو ہوا نہیں تھا کہ حجاب اپنا حق جتاتی۔ بس یہی ایک غلطی اس سے ہوئی تھی۔ نکاح ہونے دیتی اس کے بعد یہ ڈھنگ دکھاتی تو داغ مجبور تھا۔

وہ ایک گھاگ تھی۔ سمجھ گئی کہ داغ نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ یہ کلکتہ تو تھا نہیں، حیدرآباد تھا جہاں داغ کا طوطی بولتا تھا۔ دربار تک اس کی رسائی تھی۔ استاد شہر تھا۔ شہر بدر کرا سکتا

تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ذلیل ہو کر نکلنے کی بجائے عزت کے ساتھ حیدر آباد چھوڑ دے۔

وہ کلکتہ چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی جیسے وہ اندھیرے سے روشنی میں آ گیا۔ اس کے جاتے ہی اسے احسن کی یاد بھی آئی اور فصیح اللغات کا خیال بھی آیا۔ اس نے بہت دن بعد اسے خط لکھا اور گلہ کیا کہ وہ لغت کے کام سے غافل ہو گیا ہے۔

''تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ تمہارا ان شاگردوں میں شمار ہے جن کی سعادت بے لوث ہے مگر ایک شکایت مجھے تم سے ہمیشہ رہی اور وہ اب تک قائم ہے کہ تم میری بات پر کان نہیں دھرتے تم نے اپنی عقیدت کو اندھا کر لیا ہے۔ طبیعت میں عجلت بہت زیادہ ہے۔ سوچنے سے پہلے رائے دے دینا تمہاری عادت ہے اور اس طرح اپنے کام بگاڑ لیتے ہو۔ تم اپنے دل سے یہ وہم دور کر دو کہ میں کسی کے کہنے سننے سے تم سے ناراض ہوں میں درحقیقت تم سے ناراض تھا نہ ہوں۔ تم نے جو الفاظ بھیجے ہیں ان پر اشعار کہہ کر جلد بھیجتا ہوں۔ اب صحت ٹھیک نہیں رہتی۔

غزلیں بعد اصلاح واپس ہیں۔ ان غزلوں میں کوئی بات قابلِ اصلاح نہیں ملی۔''

احسن ابھی تک واقعتاً یہ سمجھے ہوئے تھا کہ استاد اس سے ناراض ہیں۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ حیدر آباد میں کیا ہو رہا ہے۔

اس خط نے اس کی ہمت بندھائی۔ ادھر مارہرہ میں بہت سے معاملات سلجھ گئے تھے۔ ان بکھیڑوں سے فرصت مل گئی تھی جو اسے مارہرہ میں روکے ہوئے تھے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ حیدر آباد چلا جائے گا اور اطمینان کی چھاؤں میں بیٹھ کر فصیح اللغات کو مکمل کرے گا۔ ایک دو مہینے سفر کی تیاری میں صرف ہو گئے۔ وہ رخت سفر باندھ چکا تھا کہ خبر آ گئی۔

آج راہی جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا

وہ تو داغ ہی کی وجہ سے حیدر آباد جا رہا تھا۔ جب داغ ہی نہ رہا تو حیدر آباد کیسا۔ وہ چار سال حیدر آباد میں رہ کر ریاست کے رنگ ڈھنگ دیکھ چکا تھا۔ وہاں سازشوں کا جال بچھا رہتا تھا۔ جب داغ ہی نہ رہا تو اسے کون وہاں ٹکنے دیتا۔ اس نے حیدر آباد کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

مارہرہ سے دل اکھڑ گیا تھا۔ اب وہ کہاں جائے۔ اس کی نظر لاہور پر پڑی۔ لاہور ان دنوں علم و ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اقبال کی شاعری اور انجمن کے مشاعروں نے لاہور کی فضا کو ادبی بنا دیا تھا۔ رسائل شائع ہو رہے تھے۔ ممتاز مطابع قائم تھے۔ اخبار کے دفاتر تھے۔ متعدد علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں۔ کئی ثقافتی ادارے قائم تھے جہاں پڑھے لکھے لوگ مل بیٹھتے تھے۔ کبھی تقریریں ہوتی تھیں کبھی طرحی اور غیر طرحی مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ وہ بھی اس باغ میں چہکنے کے لیے تیار ہو گیا۔

لاہور پہنچتے ہی اس کی ملاقات لالہ سری رام سے ہوئی جو ایک مطبع کے مالک تھے۔ وہ احسن کی علمیت سے بھی واقف تھے اور داغ سے اس کی قربت رہی ہے یہ بھی جانتے تھے۔ ''جلوۂ داغ'' بھی ان کی نظر سے گزر چکی تھی۔ وہ ان کے ''مطبع'' کے لیے نہایت مفید کام سرانجام دے سکتا تھا۔ انہوں نے احسن کو ملازمت کی پیش کش کی لیکن ہر کاروباری فرد کی طرح انہوں نے بھی اپنی کم آمدنی کا رونا رویا اور صرف تیس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔ یہ تنخواہ اس کے علمی تجربے اور لیاقت کے اعتبار سے بہت کم تھی لیکن احسن نے اس تھوڑے کو بہت سمجھا اور قدم جمانے کے لیے اس قلیل تنخواہ کو قبول کر لیا۔

مجبوری کے بندھن ڈھیلے ہی بندھتے ہیں۔ تین چار ماہ بعد ہی اس نے لالہ سری رام کو چھوڑ دیا اور لاہور کے ممتاز مطبع ''مطبع مفید عام'' میں نوکر ہو گیا۔

نوکری کی فکر سے قدرے آزادی ملی تو اسے ایک ادبی پرچہ نکالنے کا خیال آیا۔ وہ اس سے پہلے مارہرہ سے ایک پرچہ ''ریاض سخن'' نکال چکا تھا جس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے تھے اور نہایت مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس کے پاس تجربے کی کمی نہیں تھی۔ اس نے ایک ایسا پرچہ نکالنے کا ارادہ کیا جو استاد داغ کی یادگار بن جائے اس نے اس پرچے کا نام ''فصیح الملک'' رکھا کیوں کہ فصیح الملک مرزا داغ کا خطاب تھا۔

فصیح الملک کا پہلا شمارہ بازار میں آیا تو رسالے کی لوح پر یہ عبارت درج تھی۔

یہ یادگار ناظم جنگ، دبیر الدولہ، جہاں استاد، بلبل ہندوستان، نواب فصیح الملک بہادر، حضرت داغ دہلوی مرحوم۔

فصیح الملک تین حصوں پر مشتمل تھا۔ حصہ نثر، حصہ نظم

اور حصہ لغت۔ حصہ نثر میں مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ حصہ نظم میں غزلیں اور دوسری اصناف سخن اور حصہ لغت میں ''فصیح اللغات'' کو قسط وار شائع کیا جا رہا تھا تاکہ داغ کی موجودگی میں جتنے الفاظ مثالیہ اشعار کے ساتھ ترتیب پا چکے تھے وہ محفوظ ہو جائیں۔

فصیح الملک اپنے دور کا صف اوّل کا علمی و ادبی پرچہ تھا۔ اس میں ملک کے نامور عالم، ادیب اور محقق اپنی نگارشات شائع کراتے تھے۔ خود احسن نے نہایت اہم موضوعات پر بڑے معرکے کے مضامین شائع کیے۔ ان میں اکثر موضوعات لسانیات سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ اس کا لسانی شغف داغ کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ مثلاً ''ذال معجمہ کی تحقیق'' شائع ہوا۔ اس بحث میں مولوی ذکاء اللہ، جلال لکھنوی، سائل دہلوی وغیرہ نے حصہ لیا۔ اسی طرح ''ہائے ہوز'' اور ''چاہیے'' کے استعمال۔ عربی الفاظ کی تذکر و تانیث۔ اردو میں جدید الفاظ کا اضافہ اور اردو میں انگریزی الفاظ کے استعمال جیسے موضوعات پر بڑے معرکے کے مباحث ہوئے۔

فصیح الملک میں لکھنے والے تمام بزرگ اپنے وقت کے بلند پایا ادیب، ممتاز شاعر اور نامور اہل قلم تھے۔ ان حضرات کی جدت طبع نے فصیح الملک کو زبان کی کسوٹی بنا دیا۔

''فصیح اللغات'' کو وہ علیحدہ کتابی شکل میں شائع کرانے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا مگر یہ بھی چاہتا تھا کہ فصیح اللغات پردۂ اخفا سے نکل کر منظر عام پر آجائے اور استاد کا نام روشن ہو۔ اس کے لیے اس نے فصیح الملک کا ایک گوشہ مختص کر دیا تھا جس میں فصیح اللغات کے اجزا شائع ہوتے رہے لیکن پھر بھی پورے نہ ہوئے۔

اسی قیام لاہور کا ایک کارنامہ داغ کے آخری دیوان ''یادگار داغ'' کی ترتیب و اشاعت ہے۔ وہ جن دنوں حیدر آباد میں تھا یعنی 1898ء سے 1903ء تک۔ داغ ان چار برسوں میں اس پر بے انتہا اعتماد کرنے لگے تھے۔ ان کا کلام، اصلاح کے لیے آئی ہوئی لاتعداد غزلیں، غرض داغ کا تمام دفتر اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس زمانے میں جو کچھ کہتے تھے اسی کے حوالے کر دیتے تھے کہ وہ صاف کرے، اس کی نقلیں بنائے، رجسٹر پر اتارے جس طرح چاہے اسے محفوظ کر لے۔ وہ داغ کے آخری دور کے کلام کو جواب تک ان کے کسی دیوان میں نہ آسکا تھا، گھر لے آتے تھے اور اسے صاف کر کے ایک رجسٹر پر اتارتے تھے یا اس

انتخاب کلام

ہجر میں دل کا نہ ساتھی کوئی
درد اٹھ اٹھ کر شریکِ غم رہا
سایہ بھی شب ہجر کی ظلمت میں نہاں ہے
اب کس سے کریں بات سمجھ میں نہیں آتا
وصل میں بھی سوز فرقت کا اثر جاتا نہیں
شمع رو رو کر جلا کرتی ہے پروانوں کے پاس
ایک میری سخت جانی کب تک آڑے آئے گی
دل ترا پتھر کا خنجر ترا فولاد کا
کیا ہے دنیا میں نمود اور نمائش کے لیے
زندگی ہم کو تماشے کے لیے لائی ہے
آنکھ میں جب آنکھ ڈالی جائے گی
پھر طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

رباعی

عادی جو نہیں زیادہ خوش ہونے کے
اوقات عزیز وہ نہیں کھونے کے
عاشورہ و عیدین سے ثابت ہے یہ بات
دو دن ہنسنے کے ہیں دس دن رونے کے

کی نقلیں بناتے تھے کہ اگر کوئی غزل گم ہو جائے تو اس کی نقل مل جائے۔ داغ اس زمانے میں جب کوئی غزل کہتے اس کے حوالے کر دیتے۔ وہ جب حیدر آباد سے مارہرہ آیا تو آخری دور کا یہ کلام اور فصیح اللغات کے لیے کہے گئے مثال و سند کے اشعار اس کے سامان میں مارہرہ چلے آئے۔

اس نے جب ''فصیح الملک'' جاری کیا تو بعض احباب نے کہ جنہیں معلوم تھا کہ داغ کا آخری کلام احسن کے پاس ہے ان غزلوں کی اشاعت کی خواہش ظاہر کی۔ بعض احباب نے اخباروں کے ذریعے ان غزلوں کی اشاعت کی تمنا ظاہر کی۔ خواہش سب کر رہے تھے مالی معاونت پر کوئی تیار نہیں تھا۔ بہرحال پھر بھی اس نے مسودات نکالے اور غزلوں کو ردیف وار ترتیب دینا شروع کر دیا۔ اب جو بہ نظر غور دیکھا تو یہ غزلیں تعداد میں بہت کم تھیں۔ وہ جب حیدر آباد سے مارہرہ آیا اس کے بعد داغ تقریباً دو سال زندہ رہے۔ ان دو سالوں میں انہوں نے لاتعداد غزلیں کہی ہوں گی۔ اگر اوسط ہفتے میں دو غزلوں کا رکھ لیا جائے تو دو سال کی اچھی خاصی غزلیں بن جاتی تھیں

اور وہ احسن کے پاس نہیں تھیں۔ یہ غزلیں داغ کے انتقال کے بعد ان کے مکان میں مقفل پڑی تھیں۔ بہر حال احسن نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے جو غزلیں اس کے پاس تھیں انہیں ترتیب دیا پھر کوشش کر کے وہ غزلیں فراہم کیں جو گلدستوں، رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئی تھیں۔ داغ کے جن شاگردوں تک وہ بذریعہ مراسلت پہنچ سکتا تھا پہنچا اور ان سے وہ غزلیں مل گئیں جو اس کے پاس نہیں تھیں۔

داغ کے منتشر کلام کو اِدھر اُدھر سے حاصل کر کے یکجا کرنا بڑی دل سوزی اور عرق ریزی کا کام تھا جو احسن کے سوا شاید ہی کوئی کر سکتا تھا۔ وہ اگر اس مشکل کام میں ہاتھ نہ ڈالتا تو داغ کا یہ کلام یقیناً ضائع ہو جاتا۔ احسن نے اسے ضائع ہونے سے بچا لیا۔

غرض داغ کا جتنا کلام اسے دستیاب ہو سکا اسے ترتیب دے کر اس نے داغ کے چوتھے دیوان کی شکل میں ''یادگار داغ'' کے نام سے شائع کر دیا۔

یہ داغ کے آخری دور کا کلام تھا لیکن اسے مکمل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ احسن کو ان کا مکمل کلام میسر نہیں ہو سکا تھا۔ کیوں کہ آخری دو سالوں میں وہ ان کے پاس نہیں تھا۔ اس کا اظہار اس نے خود بھی مقدمہ یادگار داغ میں کر دیا۔

''ممکن ہے میری عدم حاضری کے زمانے میں ردیف وار غزلیں فرمائی ہوں مجھے اس کا علم نہیں۔''

اس نے اس دیوان کی ضخامت بڑھانے کے لیے سہرے..... قصیدے، قطعات غرض جو کچھ تھا سب شامل کر دیا۔

ادبی دنیا اس کے اس احسان کو ہمیشہ یاد رکھے گی کہ اس نے داغ کے آخری دور کے کلام کا معتدبہ حصہ محفوظ کر دیا۔ داغ کے سیکڑوں شاگرد تھے لیکن یہ خدمت اس کے حصے میں آئی۔

اس نے لاہور میں ایک سال گزارا۔ اس دوران دو اہم کام سرانجام دے لیے۔ فصیح الملک کا اجرا اور یادگار داغ کی ترتیب و اشاعت۔ وہ یہاں کے ادبی ماحول سے فائدہ اٹھا کر مزید علمی و ادبی کام انجام دے سکتا تھا لیکن گردش حالات نے ایک مرتبہ پھر اسے مارہرہ منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ اس کے کچھ گھریلو معاملات تھے جنہوں نے اس کے قدم لاہور سے اکھاڑ دیے۔ وہ مارہرہ آیا تو فصیح الملک کا دفتر بھی لاہور سے مارہرہ منتقل کر لیا اور یہاں رہ کر از سر نو ادبی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ لاہور میں تو قدم قدم پر مطبع خانے تھے۔ وہ اپنا رسالہ کہیں بھی چھپوا سکتا تھا لیکن مارہرہ میں یہ سہولت نہیں تھی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنا پریس قائم کرے گا جس میں نہ صرف فصیح الملک شائع ہو گا بلکہ دوسری کتابیں بھی شائع ہو سکیں گی اس پریس کو تجارتی بنیادوں پر بھی چلایا جا سکے گا جو آمدنی کا ذریعہ بن جائے گا۔ مطبع کا نام ''فصیح المطابع'' تجویز کر لیا گیا تھا لیکن کچھ ایسی مالی الجھنیں درپیش ہوئیں کہ مطبع کا قیام تو بڑی بات پرچے کی باقاعدہ اور بروقت اشاعت بھی کھٹائی میں پڑ گئی۔ وہ قرض لے لے کر پرچہ نکالتا رہا۔ آبائی جائیداد پہلے ہی شوق ادب کی نذر ہو گئی تھی اس پر قرض مستزاد۔ گھبرا کر پرچے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پانچ سال تک ادبی دنیا میں دھوم مچانے کے بعد ''فصیح الملک'' بند کرنا پڑا۔

اب اس ادبی سیاح کو کسی اور دنیا کی تلاش تھی۔

یہ دشواریاں اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ اس کو آئندہ کیا کرنا ہے۔ اپنے مسودات کی چھان بین میں مصروف ہو گیا۔ فرصت کے ان اوقات میں وہ شعر گوئی کی طرف پوری توجہ اور انہماک سے متوجہ ہوا۔ اس دور کے کلام میں مشق کی پختگی اور سنجیدگی روبہ ترقی نظر آنے لگی تھی۔ متانت اور تاثیر عروج پر تھی تاہم استاد کا رنگ اس دور میں بھی قائم رہا۔

مارہرہ میں ہونے والے مشاعروں میں اس کے یہ اشعار گونج رہے تھے۔

کیسی مطلب آشنا تھی چشم شوخ
دل اڑایا اور چمپت ہو گئی
ذوق ایذا طلبی درد کا درماں نکلا
تیر بیٹھا مرے پہلو میں تو ارماں نکلا
نہ سہی قبر میں آ کر مجھے راحت نہ سہی
تیرے چکر سے تو اے گردشِ دوراں نکلا
کسی کو بھیج کے خط ہائے یہ کیسا عتاب آیا
کہ ہر ایک پوچھتا ہے نامہ بر آیا جواب آیا

وہ داغ کے رنگ کی پیروی تو کر سکتا تھا لیکن وہ چونچلے کہاں سے لاتا جو داغ کی شوخ طبعی کا حصہ تھی۔ وہ پیرزادہ تھا، پاکیزہ زندگی گزار رہا تھا حسینوں سے چونچلے اس کی طبیعت کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔ یہ اس کا تجربہ نہیں تھا البتہ بڑے بڑے محاسن اس کی غزل میں بدرجہ اتم نظر آتے ہیں جو داغ کی شاعری کا خاصہ تھا۔

جبیں کعبے میں رکھ دی یا سر کوئے بتاں رکھ دی
غرض اب اٹھ نہیں سکتی جہاں رکھ دی وہاں رکھ دی

اس شعر میں سہل ممتنع کتنا داد طلب ہے۔ کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو نثر کی ترتیب سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ یہی داغ کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھا۔ کہیں کہیں تو اس کے شعر پر داغ کے شعر کا گمان ہونے لگتا تھا۔

خوش اعتمادِ عشق کا اللہ اے حسنِ ظن
وہ جھوٹ بولتے تھے مجھے اعتبار تھا
پھر گئیں بیمار غم کو دیکھ کر
اپنی آنکھوں کی مروت دیکھنا
میرا خط یہ کہہ کے غیروں کو دیا
اک ذرا اس کی عبارت دیکھنا
نہ جب تک ٹھوکریں کھائے سنبھلتا ہی نہیں انساں
اسے ہموار ہوتے راہِ ناہمواری میں دیکھنا
ٹھہر ٹھہر کے چل او جلد باز عمرِ رواں
رواروی میں قدم ڈگمگائے جاتے ہیں
احسن کی تمنا تھی خلوت میں کوئی ملتا
لیکن نہ ہوا ایسا ہوتا تو مزا ہوتا
بات کرنا کوئی کیا لب بھی ہلایا نہ گیا
آپ کو دیکھ کے پھر آپ میں آیا نہ گیا

روز مرہ اور محاوروں کا استعمال داغ کی شاعری کا خاص وصف تھا۔ استاد کی پیروی میں احسن نے بھی خوب کمال فراہم کیا۔

رسوائیوں کے ڈر سے کھڑے ہیں وہ دم بخود
کیسی بندھی ہوئی ہے ہوا میری آہ کی
قاتل ہماری سختی جاں سے ہوا خفیف
جب سر نہ کٹ سکا تو وہ دل ہی کٹ گیا
کلیاں زمیں پہ بچھ گئی غنچے بکھر گئے
وہ آج آ کے باغ میں کیا گل کتر گئے
کون تھا میرے سوا منہ کا نوالہ محسن
اور کھایا غمِ فرقت میں کلیجہ کس کا

اس نے داغ کی زبان، بیان، طرزِ اسلوب اور شعری سلیقے سے بھرپور فائدہ اٹھایا لیکن وہ محض مقلد بھی نہ رہا اس نے انفرادی رنگ بھی پیدا کیا۔ یہ انفرادیت اس کی علمیت نے پیدا کی جو داغ کو میسر نہیں تھی۔

حسن چاہے گا بہرحال نمایاں ہونا
تم سے پردے میں بھی ممکن نہیں پنہاں ہونا

طلسم عشق نظر بند کر گیا ہے مجھے
نگاہ کس پہ اٹھے گی ترے سوا میری
خستہ حالی کو نہ دیکھیں مری ارباب نظر
وہ یہ دیکھیں کہ میں ہوں دیکھنے والا کس کا
جلا کے طور کو زندانِ مصر میں رہ کر
خود اپنے حسن کے جلوے دکھائے جاتے ہیں

وہ جب حیدر آباد سے واپسی کے بعد لاہور گئے تھے تو یہاں کے قیام کے دوران ملتان کے ایک خاندان سے مراسم پیدا ہوگئے جس کے سربراہ سلیم اللہ تھے۔ جب مراسم بڑھے اور آنا جانا خوب ہوگیا تو ان کے خسر سلیم اللہ نے اپنی صاحبزادی کا عقد ان سے کردیا۔ یہ مولانا احسن کی دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی ان کی ماموں زاد سے ہوئی تھی اور ان سے بچے بھی تھے۔

مولانا کا خیال شاید یہ ہو کہ مستقل قیام لاہور ہی میں رہے گا۔ اسی لیے انہوں نے شادی کرلی لیکن حالات ایسے ہوگئے کہ انہیں مارہرہ واپس آنا پڑا۔ وہ اپنے ساتھ اپنی اہلیہ اور ان کے خاندان کو بھی ہمراہ لے آئے۔ خاندان والوں کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ احسن نے شادی کرلی ہے۔ اب جو سواریاں اتریں اور معلوم ہوا کہ جو خاتون ان کے ساتھ آئی ہیں ان کی نئی اہلیہ ہیں تو قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ زوجۂ اول کو ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ سوکن کے ساتھ رہیں۔ مولانا احسن کو ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ نئی اہلیہ کو چھوڑ دیں یا لاہور میں رہنے پر مجبور کریں۔ رہنا بھی ساتھ تھا اور اس جھگڑے کو بھی رفع کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی آبائی حویلی ''میاں کی بستی'' کے دو حصے کردیے۔ دوسرے حصے میں نئی اہلیہ اور اس کے اہل خاندان کو ٹھہرا دیا۔ اس حصے کا دروازہ بھی الگ نکال دیا۔

اپنے خسر کو درگاہ کا مجاور مقرر کردیا اور اپنے سالے علیم اللہ کو اپنی خدمت میں رکھ لیا۔ کئی مہینے تو انہی جھگڑوں کو نمٹانے میں خرچ ہوگئے تھے۔ پھر فصیح الملک کے اجرا اور اس پر ہونے والے اخراجات نے کمر توڑ دی۔ بالآخر پرچہ بند ہوگیا۔ اِدھر اُدھر کے مشاعروں سے ہونے والی آمدنی اخراجات کے لیے ناکافی تھی جب کہ اب دو دو گھروں کا بوجھ آن پڑا تھا۔ اس کے باوجود معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔

نمازِ فجر کے بعد تلاوت کلام پاک، ناشتے کے بعد آئی ہوئی ڈاک دیکھنا، مکان کے صحن میں مونڈھے اور کرسیاں

بچھی رہتیں۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک وہاں بیٹھ کر خطوط کے جواب لکھتے اور آنے والے حضرات سے ملاقات فرماتے۔ بارہ اور ایک کے درمیان کھانا کھانے زنانہ مکان میں چلے جاتے۔ کھانے میں نہایت تکلفات ہوتے، دستر خوان پر بریانی یا رائتہ دہی بالائی یا ربڑی۔ دو قسم کا گوشت یا اسٹو یا قورمہ یا کوفتے یا شامی کباب۔ کئی قسم کی چٹنی اچار وغیرہ ضرور ہوتے۔

آموں کے زمانے میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ کھانے کے بعد آم نہ کھائیں۔ مولانا کو انتہائی سرد پانی، چائے اور آم یہ تین چیزیں بے انتہا مرغوب تھیں۔ گلاس رکھا ہے۔ برف پڑا ہوا ہے۔ برف گھل گیا تو تھوڑا پانی پی لیا اور حکم ہوا علیم اللہ گلاس میں برف ڈال دے۔

موسم گرما میں صبح شام غسل فرما کر دونوں وقت کپڑے بدلتے تھے۔ موسم سرما میں صرف ایک وقت غسل فرماتے تھے اور ایک جوڑا روز بدلتے تھے۔ دوپہر کو یقینی طور پر قیلولہ فرماتے تھے۔

اس قدر شان و شوکت کے بعد ہاتھ تو تنگ ہونا ہی تھا۔ جب پریشانیاں بہت بڑھ گئیں اور مارہرہ میں رہتے رہتے اکتا بھی گئے تو قدم باہر نکالا۔ علیم اللہ خدمت گار کے طور پر ساتھ تھا۔ علی گڑھ پہنچے اور انٹرمیڈیٹ کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ اس وقت تک یونیورسٹی میں ایم اے کا درجہ قائم نہیں ہوا تھا۔ جب ایم اے کی کلاسیں شروع ہوئیں تو ایم اے کی کلاسیں بھی ان کے پاس آ گئیں۔

مولانا احسن علی گڑھ پہنچے تو اپنے علمی مرتبے، ادبی صلاحیت اور تہذیبی ورثے کے سبب ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ طلبہ نے تو سر آنکھوں پر بٹھایا ہی تھا کالج کے اساتذہ اور ان کے رفقائے کار نے بھی انہیں اپنے دل میں جگہ دی۔ رشید احمد صدیقی صدر شعبہ اردو تھے جو خود بڑی زبردست علمی و ادبی شخصیت تھے۔ مولانا کے مرتبے سے واقف تھے۔ حالیہ سے زیادہ انہوں نے اپنے استفادہ کے لیے مولانا کو گھیر لیا اور اپنے دفتر ہی میں ان کی چوکی ڈال دی۔ اب وہ اسٹاف روم سے زیادہ رشید احمد صدیقی کے دفتر میں موجود رہتے۔ علیم اللہ چائے بناتا رہتا اور ادب کی گتھیاں سلجھتی رہتیں۔

وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارے میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کیے جاتے تھے۔ شعبے میں بیٹھے ہوئے ہیں باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آ گیا جس پر اختلاف رائے ہو گیا۔ مولانا کو فیصل بنایا گیا۔

''حضرت آپ فرمایئے صحیح کیا ہے۔''

''میں اگر ایک کو صحیح کہوں گا تو دوسرا نہیں مانے گا۔ کوئی سند تحریری تلاش کر لوں تو اپنی رائے پر زور دوں گا۔''

پھر سب دیکھتے کہ مولانا مختلف کتابوں کی ورق گردانی کر رہے ہیں۔ کچھ دیر کھوئے کھوئے سے رہے پھر اٹھ کر لائبریری چلے گئے یا آخر بات واضح ہو گئی تو خوش ہو گئے۔ ہر ایک کو فرداً فرداً تحقیق کے نتائج بتائے۔ ایک لفظ کے لیے کئی کئی دن پریشان رہتے۔

ایسی محنت کرتے کسی کو نہیں دیکھا گیا۔ یہ تلاش و جستجو کسی میں نہیں دیکھی گئی۔

ابتدا میں وہ ''شاہ میاں'' تھے پھر احسن مارہروی سے پہچانے جانے لگے۔ علی گڑھ آ کر وہ مولانا ہو گئے۔ مولانا کا مطلب ہی احسن مارہروی تھا جو داغ کے بعد زباندانی کے آخری چراغ تھے۔

مولانا کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا تھا جو اپنے شاگردوں میں اپنے مضمون کا صحیح ذوق پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جامعہ کے طلبہ میں بھی شعر و سخن اور علم و ادب کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے۔ انہوں نے حدیقۃ الشعراء، انجمن خیابان اردو اور اورینٹل سوسائٹی جیسی انجمنیں قائم کیں۔ ان انجمنوں کا مقصد شعر و ادب کی گتھیاں سلجھانا اور سالانہ ادبی اجتماعات اور مشاعروں کے انعقاد کے ذریعے طلبہ میں شعر و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا تھا۔ وہ جب تک یونیورسٹی میں رہے نہایت معرکۃ الآرا مشاعرے منعقد کراتے رہے۔ ان کا شمار ایسے جید شعرا میں ہوتا تھا کہ ان کی دعوت پر بڑے بڑے شعرا ان مشاعروں میں شرکت کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتے تھے۔

مشاعرے تو ہر سال ہی ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایسی جدت اختیار کی جو کالج کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے یادگار بن گیا۔ یہ ایک تمثیلی مشاعرہ تھا۔ اسی مشاعرے میں کالج کے طلبہ نے حصہ لیا۔ کوئی داغ بنا، کوئی امیر مینائی کوئی منیر شکوہ آبادی تو کسی نے ریاض خیر آبادی کا روپ دھارا۔ مولانا نے اپنی نگرانی میں لباس تیار کروائے۔ اصل شاعروں کے حلیے کے مطابق ان طلبہ کا میک اپ کروایا اور جب یہ طلبہ اسٹیج پر نمودار ہوئے اور اپنا اپنا کلام سنایا تو نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا تھا۔ عرصے تک اس مشاعرے کے چرچے ہوتے رہے۔

تدریسی سرگرمیوں کے باوجود بیرون مشاعروں میں شرکت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مشاعروں کی روایتی بدانتظامیوں کی شکایتیں بڑے زور شور سے کرتے تھے۔ ہر مشاعرے سے بددل ہو کر واپس آتے تھے اور عہد کرتے تھے کہ اب وہ کسی مشاعرے میں نہیں جائیں گے لیکن غصہ رفع ہوتے ہی پھر کسی نہ کسی مشاعرے میں نظر آتے تھے۔ دراصل انہوں نے پرانے مشاعرے دیکھے ہوئے تھے اور اب مشاعروں میں وہ بات نہیں رہی تھی۔

ایک مرتبہ مارہرہ کے مارسین اسلامیہ اسکول میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ مولانا اس مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ حاضرین میں کثیر تعداد طلبہ کی تھی۔ مشاعرہ شروع ہی سے غیر سنجیدگی کا شکار تھا۔ مولانا احسن نے بہ حیثیت صدر اپنی نظم سنائی۔

حکام بلائیں تو اندھیرے ہی سے دوڑیں
اللہ بلائے تو سویرا نہیں ہوتا

مولانا کے پڑھنے کا انداز ایک خاص نوعیت کا تھا۔ لہٰذا اس وقت بھی بڑے پُرجوش لہجے میں لہک لہک کر پڑھ رہے تھے۔ لڑکے چیخ چیخ کر انہیں داد دے رہے تھے۔ مولانا جب ترنگ میں آتے تھے تو اپنی مسند سے نصف قد سے کھڑے ہو جاتے تھے۔ لڑکوں کے لیے تو یہ انداز شعر گوئی ایک تماشا ہو گیا۔ واہ واہ بے داد بن گئی۔ جب یہ طوفانِ بدتمیزی حد سے گزر گیا تو مولانا ناراض ہو گئے۔ شعر پڑھنا بند کر دیے اور مسند صدارت سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا جب جلال میں آجاتے تو کسی کے روکے نہ رکتے۔ انتظامیہ نے بہت خوشامد کی لیکن مولانا کا غصہ رفع نہ ہوا۔ ظاہر ہے اس کے بعد مشاعرہ ہی ختم ہو گیا۔ علی گڑھ پہنچے تو یہ غصہ کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ رشید احمد صدیقی سے ملاقات ہوئی تو اپنی ناراضی کی عجیب توضیح کی۔

''اس طرح کے مشاعروں میں شرکت کرنے کے بعد میں عہد کر لیتا ہوں کہ آئندہ بھی مشاعرے میں شرکت نہیں کروں گا مگر میرا یہ عہد بالکل اس حاملہ عورت کی طرح ہوتا ہے جو دردِ زہ میں مبتلا ہو کر عہد کرتی ہے کہ وہ آئندہ اولاد پیدا نہیں کرے گی مگر تکلیف رفع ہو جانے کے بعد اپنے عہد کو بھول جاتی ہے۔''

اس مثال کے بعد خود بھی بہت دیر تک ہنستے رہے اور فوراً ہی یہ مژدہ سنا دیا کہ ایک مشاعرے کا دعوت نامہ آیا ہوا ہے۔ جانا تو پڑے گا۔

انہی دنوں ماہنامہ ریاست، رام پور کے مدیر کا محبت نامہ آیا۔ ریاست کے مدیر نے ملک کے ممتاز شعرا سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے مشاغل نظم کر کے بھیجیں۔ احسن مارہروی نے یہ درخواست قبول کی اور نظم لکھنے بیٹھ گئے۔

کیوں پوچھ رہا ہے کوئی احسن کے مشاغل
کیا حسنِ عمل دفترِ عصیاں میں ملے گا
اوقات ہیں بے ضابطہ حالات ہیں بے ربط
ہر وقت وہ فکرِ غمِ دوراں میں ملے گا
اس پر بھی ہے اصرار کسی کو تو وہ سن لے
آوارہ دو رنگی کے بیاباں میں ملے گا
یا صبح کو ہو گا وہ مصلے پہ نمایاں
یا خفتہ کسی گوشہ پنہاں میں ملے گا
جب تک نہ ڈھلے دوپہر اس وقت تک اس کو
ڈھونڈو گے تو اطفالِ دبستان میں ملے گا
دیکھو گے اگر دو بجے سے چار بجے تک
سویا ہوا بیٹھا ہوا ایواں میں ملے گا!
پھر چار بجے شام سے چھ سات بجے تک
مشغول ملاقاتِ عزیزاں میں ملے گا
ہو گی پسِ مغرب جو تلاش اس کی تو اکثر
پڑھتا ہوا کچھ بزمِ شبستاں میں ملے گا
ہو گا انہی اوقات میں جو وقت میسر
سرگرمِ عمل شعر کے میداں میں ملے گا
جب تا بہ کمر زلف شب آئے گی تو اس کو
پہلوئے سکوں خوابِ پریشاں میں ملے گا
القصہ جو ہے آج یہاں محوِ تکلم
لب بستہ وہ کل شہر خموشاں میں ملے گا

☆......☆

معلم کی حیثیت سے بھی ان کی عجیب شان تھی۔ ان کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھتے تھے۔ اب حالات بدل گئے تھے۔ اب طلبہ سے یہ توقع رکھنا ہی فضول تھا۔ وہ اکثر ان طلبہ سے شاکی رہتے تھے لیکن ان کا رویہ کلاسوں کے ساتھ بھی وہی تھا جو مشاعروں کے بارے میں تھا۔ ہر مشاعرے کے بعد توبہ کرتے تھے اور پھر توبہ توڑ دیتے تھے۔ طلبہ سے شکایت بھی تھی اور ان پر جان بھی چھڑکتے تھے۔

ایک دن دیکھا کہ کلاس سے سخت آزردہ اور برہم چلے آرہے ہیں۔

"خیر تو ہے مولانا۔ ابھی کلاس کا وقت ختم تو نہیں ہوا۔آپ پہلے ہی چلے آئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"رشید صاحب! طلبہ پڑھنے نہیں آتے وقت گزاری اور تفریح کے لیے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہے کرلیں علم تو ان کو آنے کا نہیں۔"

"آپ بھی کن باتوں کو دل سے لگا کر بیٹھ گئے۔" رشید صاحب نے کہا۔"ان لڑکوں کا بھی کیا قصور۔اب دنیا کا یہی رنگ ہے۔اب آپ کے ہمارے زمانے کا ماحول نہیں رہا۔قدریں بدل گئی ہیں۔حفظ مراتب اٹھ چکا ہے۔ جو ہے وہی غنیمت ہے۔"

"جی نہیں! میں ان نالائقوں سے سروکار رکھنا نہیں چاہتا۔مجھے کوئی دوسری کلاس دے دیجیے۔"

"یہ لڑکے بقول آپ کے بڑے نالائق ہیں۔" رشید احمد صدیقی نے ان کی برہمی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔"ایک بات مجھے سمجھا دیجیے۔ہم چھوٹوں ہی کی نالائقی پر برہم کیوں ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی پر غور نہیں کرتے۔"

مولانا نے قدرے دھیمی آواز میں لاحول پڑھی اور دوسری باتوں میں لگ گئے۔ دوسرے دن دیکھا تو پھر اسی کلاس میں کھڑے ہیں۔

ادبی کام ملازمت کی مصروفیت کے باوجود جاری تھے۔ وہ بہت دن سے محسوس کررہے تھے کہ اردو ادب اور زبان کے سلسلے میں مضامین تو بہت لکھے گئے ہیں لیکن یہ سب انفرادی نوعیت کے ہیں۔کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جس کے مطالعے سے اردو نثر کے عہد بہ عہد ارتقاء کا ادراک ہو سکے۔ ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اردو نثر نے عہد بہ عہد کیا شکلیں اختیار کیں اور کیا کیا تبدیلیاں قبول کیں۔انہوں نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے نہایت عرق ریزی سے مواد جمع کرنا شروع کیا۔سیکڑوں کتابوں کے مطالعے کے بعد وہ "تاریخ نثر اردو" لکھنے بیٹھ گئے۔ اس کتاب میں مفید تاریخی حالات کے سوا اردو نثر کے مذہبی، اخلاقی، طبی، سیاسی، قانونی، دفتری، مکتوبی، اخباری، تقریری، اشتہاری غرض کہ وہ تمام نمونے جو ایک علمی اور زندہ زبان کو وقیع بنا سکتے ہیں اصل تصانیف اور تحریروں سے اخذ کر کے جمع کرنا مقصود تھا۔

ان کی تحقیق کے مطابق اردو کا کتابی دور حضرت امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے لیکن چونکہ اس عہد کی کوئی نثری کتاب اس عہد تک دریافت نہیں ہوئی تھی اس لیے انہوں نے آٹھویں صدی ہجری کو نظم کا ابتدائی دور تصور کرکے نثر کی ابتدا نویں صدی ہجری سے متعین کی۔ ہر صدی کے نمونے ترتیب سے درج کیے اور ہر نمونے کے تحت جتنے علوم وفنون کے مرقع انہیں دستیاب ہوئے وہ تفصیل کے ساتھ جمع کردیے۔

انہوں نے 809ء سے 1929ء تک تقریباً ساڑھے پانچ سو برس کے زمانے کو چھ ادوار میں تقسیم کیا۔ ان ادوار کے جتنے نمونے پیش کیے ان کی وضاحت ایک مخصوص نقشے کے ذریعے کی جس میں کتاب کا نمبر ترتیب کتاب کا نام مصنف کا نام اور اس کا عہد وغیرہ درج کیا اور بعد ازاں نمونے کے طور پر اتنی عبارت درج کردی کہ قاری کو اس زمانے کی زبان کا اچھی طرح اندازہ ہو سکے اس ترتیب میں ایک اور خصوصیت یہ رکھی کہ ہر دور کا سلسلہ صدی کے ساتھ اور نمونے کا سلسلہ فن کے ساتھ قائم کیا۔ مندرج نمونوں کی مدد سے اردو زبان کے تاریخی ارتقاء کو سمجھنے میں کافی مدد حاصل ہوجاتی تھی۔

اس عمل میں اسے جس جگر کاری کا سامنا ہوا اس کا ذکر اس نے خود کتاب کے آغاز میں کردیا۔"اس مجموعے میں جس قدر نمونے لکھے گئے ہیں ان میں اکثر غیر مطبوعہ بھی ہیں جن کو راقم نے مختلف کتب خانوں سے بلاواسطہ خود نقل کیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی ہے کہ کوئی حرف کوئی لفظ اپنی طرف سے بڑھایا نہ جائے البتہ پرانی کتابت کی روش کو جا بہ جا موجودہ طرز کتابت کے مطابق لکھا ہے یا پرانی ترکیب کے ساتھ نئی طرز املا کو قوسین میں ظاہر کردیا ہے تاکہ عہد حاضر کے ناظرین کو اجنبیت املا سے الجھن پیدا نہ ہو۔"

اس نے جس شرح وتفصیل سے کام لیا اس کی مثالیں پہلے کی تالیفات میں نظر نہیں آتی تھیں۔ صرف دریائے لطافت ایسی تصنیف تھی جس میں انشاء اللہ خان انشا نے بعض اسالیب بیان کے نمونے دکھائے تھے مگر وہ مثالیں محدود تھیں۔ مولانا نے سال ہا سال کی محنت وجستجو کے بعد ایک ایسا سرمایہ جمع کردیا جس میں ابتدائے ترویج اردو سے اپنے دور تک جس قدر انداز بیان اردو زبان نے پیدا کیے ان سب کے نمونے اصل کتاب سے اقتباس کرکے یکجا کردیے۔ ان میں مذہب، تراجم، تلفظ، تاریخ، تفسیر،

قانون، مراسلات، اخبارات، تجاویز، عدالت، فنون لطیفہ اور پھر ہر سوسائٹی اور طبقے کی تحریریں اور تقریریں شامل کر دیں۔

عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک اچھا ناقد اچھا شاعر نہیں ہوتا لیکن ایسے اشخاص جن میں دونوں خوبیاں ہوں بہت کم ہوتے ہیں۔ احسن مارہروی میں یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ ان کی تنقید حسرت موہانی کی طرح مختصر مگر جامع ہوتی تھی۔ اس کا ثبوت تاریخ، نثر اردو کی وہ عبارات ہیں جن میں انہوں نے مختلف انشا پردازوں کے متعلق محض تبصرہ کیا ہے لیکن وہ اتنا کافی ہے کہ مزید کی گنجائش نہیں رہتی۔

جب کتاب کا مسودہ پوری طرح تیار ہو گیا صرف اشاعت باقی تھی۔ احسن نے یہ مسودہ میر عثمان علی خان نظام دکن کے نام منسوب کرنی چاہی لیکن اس کے لیے ان کی اجازت کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ایک درخواست پر نظام علی خان کی خدمت میں پیش کی اور ان کے نام انتساب کی اجازت چاہی۔ نظام نے مولانا کی درخواست قبول کرتے ہوئے اسے اپنے نام منسوب کرنے کی اجازت دے دی اور ان کے لیے پچیس روپے ماہوار تاحیات وظیفہ جاری کرنے کے احکامات بھی صادر فرمائے۔

جامعہ کے نصاب میں بار بار تبدیلیاں کی جاتی رہی تھیں۔ اب یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ نصاب سے مکاتیب غالب کو خارج کر دیا جائے کیوں کہ ان سے بعض کا مفہوم بغیر ضروری سیاق و سباق طلبہ کی فہم سے بعید تھا مگر مولانا کی رائے تھی کہ مکاتیب کو کلی طور پر خارج نہ کیا جائے اسے سہل بنایا جائے۔ صرف وہ خطوط نکالے جائیں جو کلیتاً فارسی ادب سے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے غالب کے خطوط پر مبنی ایک نصابی انتخاب ''مکاتیب الغالب'' کے نام سے ترتیب دیا تھا کہ امتحانی پرچے اسی انتخاب سے بنائے جائیں اور طلبہ تیاری کے لیے اسی انتخاب کو پیشِ نظر رکھیں۔

اس مجموعے میں فارسی تلمیحات و کنایات پر مبنی خطوط نکالنے کے باوجود ایسے خطوط رہنے دیے جن میں ایسے فارسی مصرعے اور اشعار یا جملے ہیں جو تعلیم یافتہ افراد کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام ایسے مصرعوں شعروں جملوں اور الفاظ کے معنی بالتفصیل حاشیوں پر لکھ دیے جن کا جاننا طالب علم کے لیے ضروری ہے۔

خطوط میں اکثر ایسے واقعات پائے جاتے ہیں جن کا انداز بیان تو آسان ہے مگر بعض کنایات و اشارات کی وجہ سے تشریح طلب ہیں یا بعض قواعد شاعری اور ادبی مسائل و تلمیحات محتاج تفصیل ہیں۔ ایسی تمام مشکلات کی حتی الامکان وضاحت کر دی گئی۔

طلبہ کی واقفیت اور قابلیت بڑھانے کے لیے مرزا غالب کے حالات و کلام کی تحقیق و تنقید بھی ضروری چیز تھی جس کے بغیر امتحان دیتے وقت طلبہ اکثر سوالات کے جوابات نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے لیے احسن نے ''سوانح عمری'' کے عنوان سے غالب کے مختصر حالات بھی درج کر دیے۔ یہ حالات الطاف حسین حالی کی تصنیف ''یادگارِ غالب'' سے ماخوذ تھے۔

کلام غالب کی خصوصیات کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے مولانا ایک منفرد ناقد نظر آتے ہیں۔

مرزا کے کلام میں علاوہ جدت مضامین اور طرفگی خیالات کے اور بھی چند خصوصیات ہیں اولاً عام اور متبذل تشبیہوں کو جہاں تک ہو سکتا ہے استعمال نہیں کرتے، اگرچہ ان کے ابتدائی کلام میں ایسی تشبیہات دیکھی جا سکتی ہیں جو غرابت سے خالی نہیں لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اسی قدر تشبیہوں میں باوجود ندرت اور طرفگی کے سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی۔

احسن اس وقت بھی ایک اہم ناقد نظر آتے ہیں جب وہ مکاتیب غالب کی خصوصیات پر اپنی رائے دیتے ہیں۔

''مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت کے لیے یہ رنگ اختیار نہیں کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی۔''

کہنے کو مکاتیب الغالب ایک نصابی کتاب تھی لیکن اس کے مصنف کوئی اور نہیں مولانا احسن مارہروی تھے۔ انہوں نے اس خوبی سے اسے مرتب کیا کہ غالب شناسی کے سلسلے میں ایک اہم کتاب بن گئی۔

مرزا غالب کے مکاتیب کے نہایت اعلیٰ انتخاب شائع ہو چکے ہیں لیکن احسن مارہروی کے انتخاب ''مکاتیب الغالب'' کی افادیت و اہمیت مسلم ہے۔

مولانا احسن مارہروی کو ان کی علمیت، تصنیفات اور شاعری نے اتنا معتبر بنا دیا کہ ایک طرف ان سے استفادہ کرنے کے لیے احباب ان کے گھر پر جمع رہتے، دوسری

طرف اصلاحِ شعر کے امیدوار شعرائے کرام ان کے فیض سے فیض یاب ہونے کے لیے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوتے۔ اس معاملے میں ان کا حال بھی اپنے استاد داغ کی طرح تھا۔ جس نے بھی رجوع کیا آپ نے خدمت ادب سمجھ کر اس کی رہنمائی کی۔ علی گڑھ میں جہاں ان کا قیام تھا۔ ''تار والا بنگلا'' کہلاتا تھا۔ کرسیاں بچھی رہتی تھیں۔ اذنِ عام تھا۔ جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں۔'' ان آنے والوں میں شہر کے رئیس بھی تھے۔ نوجوان شعراء بھی اور عام طلبہ بھی جنھیں کلاسوں کے محدود اوقات سیراب نہیں کر پاتے تھے وہ یہاں آکر استفادۂ علم و ادب کرتے تھے۔ شاعری میں ان کے تلامذہ کی تعداد بلا مبالغہ سیکڑوں میں تھی لیکن اپنے استاد داغ کی طرح کبھی کوئی باقاعدہ رجسٹر نہیں بنایا جس میں تلامذہ کے نام پتے وغیرہ درج ہوتے۔ ان کا فیض تو سمندر کی لہروں کی طرح تھا بے نام مگر شاندار۔

☆......☆

سرکاری ملازمت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ جو ملازمت کا طوق گلے میں ڈالتا ہے اسے ایک روز یہ طوق اپنے گلے سے اتارنا ہوتا ہے۔ یعنی ریٹائر ہونا ہوتا ہے۔ پروفیسر بھی انہی قیدیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جب ان کا تجربہ عروج پر ہوتا ہے انہیں آزاد کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہی وقت ہوتا ہے جب وہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ مولانا بھی قیدیوں کی اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی مدتِ ملازمت مارچ 1932ء میں ختم ہوگئی لیکن ان کی ادبی شہرت اور ذاتی لیاقت کی بنیاد پر سفارش کی گئی کہ قیدی بڑے کام کا ہے اسے ابھی آزاد نہ کیا جائے۔ اچھی شہرت والے قیدیوں کی سزا معاف کر دی جاتی ہے انہیں مزید سزا سنا دی گئی۔ 1938ء تک عارضی توسیع مل گئی۔ یہ فیصلہ بھی سنا دیا گیا کہ مزید تصفیہ ایگزیکٹو کونسل کے اجلاس میں سنایا جائے گا۔

غلام مصطفیٰ خان ان کے قدیم اور سعادت مند شاگرد تھے۔ مولانا کی ان سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ انہوں نے غلام مصطفیٰ خان کو خط لکھا۔

''......اس کے علاوہ میری میعاد ملازمت دو برس سے ختم ہوگئی ہے اور ہر سال توسیع مل رہی ہے باقی کا حال آئندہ معلوم ہوگا۔ اگر یہاں کا تعلق رہا تو چھٹیوں کے بعد یہاں آنا ہوگا ورنہ یکم مئی سے ہمیشہ کے لیے رخصت اور پھر مئی کا مہینا مارہرہ میں گزرے گا۔''

ایگزیکٹو کونسل کا جو اجلاس ہونے والا تھا وہ ملتوی کر دیا گیا۔ معاملہ اگلے اجلاس تک چلا گیا۔ انہوں نے غلام مصطفیٰ خان کو لکھا۔

''میرا معاملہ ہنوز طے نہیں ہوا۔ دیکھیے کس کل اونٹ بیٹھے۔''

ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس 17 جولائی 1938ء کو منعقد ہوا۔ اس میں مولانا کو جامعہ کی خدمت سے آزاد کر دیا گیا۔

''میں 17 جولائی کی ایگزیکٹو کونسل کے فیصلے کے مطابق یونیورسٹی کی خدمت سے آزاد ہو گیا۔ اگر آپ خط لکھیں تو حکیم صاحب کو بھی اس کی اطلاع کر دیجیے گا کہ میرا خط لکھنا بے کار ہے جب کہ وہ جواب نہیں دیتے۔ اب مستقل کہاں رہوں گا کیا کروں گا یہ پھر لکھوں گا۔ دو تین روز بعد اسباب وغیرہ لانے کے لیے جاؤں گا اور وہاں سے غالباً یکم اگست تک دہلی وہاں دو چار روز رہ کر مارہرہ واپس آؤں گا۔''

ایک اور دوست جلیل قدوائی کو لکھا۔

''شاید آپ کو کسی اخبار سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں مسلم یونیورسٹی کی خدمت سے سبکدوش ہو گیا ہوں موجودہ وائس چانسلر نے یہ پابندی قواعد ساٹھ سال سے زیادہ کسی کو رکھنے کی منظوری نہیں دی۔ میں چونسٹھ سال کا ہو گیا ہوں بہر حال میں آزاد ہوں جہاں چاہوں آ جا سکتا ہوں۔''

یونیورسٹی کو برقی قمقموں سے سجا دیا گیا۔ جیسی چہل پہل اس رات تھی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ رات تھی جب احباب و تلامذہ نے ان کے اعزاز میں عشائیہ دیا تھا۔ یہ شب عجیب شب تھی۔ خوشی بھی تھی کہ ایک شخص باوقار انداز سے ریٹائر ہو رہا ہے اور افسوس بھی تھا کہ جس سے روز ملاقاتیں ہوتی تھیں اب کبھی کبھی ملا کرے گا۔ شعبہ اردو خاص طور پر اداس تھا کہ ادب کا خزانہ چوری ہو گیا۔ کوئی گتھی سلجھتی تھی تو مولانا سلجھا دیتے تھے۔ اب کتابوں کے اوراق الٹتے رہیے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مولانا کا حال بھی سب سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ وہ دوستوں کو تو یہ لکھ رہے تھے کہ اب میں آزاد ہوں جہاں چاہوں آ جا سکتا ہوں لیکن دل کی زبان سے کہہ رہے تھے یہ قید کتنی دلچسپ تھی۔ جب ان کی شان میں گل ہائے عقیدت پیش کیے جا چکے تو مولانا کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب لفظوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ انہوں نے جذبات کے اظہار کے لیے نظم کا سہارا لیا جو انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک کاغذ پر لکھ

لی تھی۔

اردو کا ڈپارٹمنٹ یکسر
میری خدمات کا تھا محور
صدر اس کے ہیں پاک سیرت
صدیقی و حاذق المووت
اور اس کے سوا جو لیکچرر ہیں
ایک ان میں سر درد خوش سیر ہیں
حاذق کا فراق ہے شاق
کہتا ہے یہ ان سے ان کا مشتاق
حاذق رخصت ظہیر رخصت
آخر میں میاں مشیر رخصت

یہ مختصری نظم پڑھتے پڑھتے ان کی آواز آنسوؤں میں کہیں گم ہو گئی۔ یہ یادگار تقریب اختتام کو پہنچی۔

مولانا علی گڑھ سے مارہرہ آ گئے۔ ان کے بدن میں ایک ایسی بے چین روح تھی جس نے انہیں زندگی بھر کہیں ٹک کر بیٹھنے نہیں دیا۔ اب جو پاؤں سن ہوئے تو سوچتے تھے کیا کریں۔ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ مارہرہ میں رہنا ہے یا کہیں اور۔ متین مچھلی شہری کے استفسار پر انہیں لکھا۔

"فی الحال وطن (مارہرہ) میں قیام رہے گا۔ دو چار ماہ بعد بتاؤں گا بہ شرط زندگی قیام یہیں رہے گا یا کہیں اور۔ ابھی ہاتھ پاؤں چلتے ہیں۔ جب تک یہ ہیں بے کار نہیں رہا جا سکتا۔ میرے بڑے فرزند جو مسلم یونیورسٹی میں اسسٹنٹ رجسٹرار ہیں وہ کئی سال سے علیل ہیں۔ مصدقہ تو اختلاج کا ہے مگر اس کے ساتھ معدہ و جگر وغیرہ بھی ماؤف سا ہے اگرچہ وہ کام کر رہے ہیں مگر بسا اوقات انتشاری حالت سے دورے کی سی غفلت ہو جاتی ہے۔ ان کی وجہ سے اکثر پریشانی رہتی ہے۔ اب وہ معہ اہل و عیال تنہا علی گڑھ میں ہیں۔ ان سے چھوٹے بھائی بھی علی گڑھ میں ہیں اور وہ ریلوے میں ہیڈ ٹی ٹی آئی ہیں مگر میرے آنے کے بعد ان کا قیام دوسرے مکان میں ہے۔ ان تعلقات سے علی گڑھ کی آمدورفت اکثر رہے گی مگر خط کتابت مارہرہ میں رہے گی۔"

دو چار ماہ بعد انہوں نے اپنے لیے ایک ادبی کام نکال ہی لیا۔ جب وہ حیدر آباد میں تھے تو انہیں یہ خیال آیا تھا کہ داغ کے شب و روز دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں۔ ان کے شعری کارناموں سے تو دنیا واقف ہے ان کی زندگی سے کم ہی لوگ واقف ہوں گے۔ اس کے لیے داغ کی سوانح مرتب کی جائے لہٰذا انہوں نے "جلوۂ داغ" کا ڈول ڈالا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اب مارہرہ کی تنہائی میں انہیں یہ خیال آیا کہ استاد کی باتوں کو قلم بند کیا جائے اور نظم کی طرح ان کے نثر کے نمونے بھی اہلِ علم کے سامنے پیش کیے جائیں۔ یہ بھی ان کی سوانح ہی کا ایک حصہ ہوگا۔ داغ کا نثری سرمایہ ان کے خطوط تک موجود تھا۔ انہوں نے "انشائے داغ" کو مرتب کرنے کے لیے کمر کس لی۔

اب ان خطوط کے حصول کا مسئلہ درپیش تھا۔ داغ نے جو خطوط انہیں لکھے تھے وہ تو ان کے پاس محفوظ تھے۔ مسئلہ ان خطوط کا تھا جو داغ نے دوسرے لوگوں کو لکھے تھے۔ انہوں نے داغ کے شاگردوں کو خطوط لکھے اور ان سے استدعا کی کہ اگر داغ نے انہیں کبھی کوئی خط لکھا تھا اور وہ ان کے پاس محفوظ ہے تو وہ اسے بھیج دیں تاکہ اسے "انشائے داغ" میں شامل کر لیا جائے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہے تھے۔ داغ کے شاگردوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ احسن کی ان سب تک رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن تھی۔ جن تک رسائی ہو بھی گئی ان میں سے بعض نے تو جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ بعض نے معذرت کا جواب دیا۔ ان کے پاس کوئی خط موجود نہیں تھا۔ بعض کی طرف سے کچھ خطوط کی نقلیں موصول ہوئیں۔

انہیں معلوم ہوا کہ داغ کے متعدد خطوط رام پور کے دارالانشا کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ وہاں سے ان خطوط کی نقلیں حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن اس کے لیے چیف منسٹر کی اجازت کی ضرورت تھی۔ ناظم کتب خانہ امتیاز علی خاں عرشی تھے۔ مولانا نے اس سلسلے میں انہیں خطوط لکھے اور ان کے ذریعے چیف منسٹر تک بات پہنچائی۔

چیف منسٹر نے اپنی مصروفیات کے سبب بظاہر اتنی معمولی درخواست کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ تو غالباً اس سے بھی واقف نہیں ہوں گے کہ مولانا احسن کس پائے کے محقق، ناقد اور شاعر ہیں اور داغ پر ان کا کتنا کام ہے اور یہ کام کتنا وقیع ہے جو وہ کرنے جا رہے ہیں۔

ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

مولانا نے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے پروفیسر سید ہادی حسن سے ایک سفارشی خط لکھوا کر اپنی درخواست کے ساتھ چیف منسٹر کو ارسال کیا۔ چیف منسٹر صاحب اس خط کو بھی پی گئے۔ ان کی طرف سے اس خط کا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

مولانا نے ایک مرتبہ پھر ناظم کتب خانہ امتیاز علی خان عرشی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ انہیں خط لکھا اور ان سے مشورہ چاہا کہ اب کیا صورت نکالی جائے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ خود چیف منسٹر سے ملیں گے اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے۔

عرشی صاحب خود نہایت بلند پایہ محقق و ناقد تھے۔ مولانا کی خوبیوں سے بھی واقف تھے اور ''انشائے داغ'' کی اہمیت کو بھی جانتے تھے۔ دل و جان سے چاہتے تھے کہ یہ کام جتنی جلد ہو جائے اچھا ہے۔ اگر مولانا احسن مایوس ہو کر اس کام سے دست بردار ہو گئے تو پھر یہ کام کوئی نہیں کر سکے گا چنانچہ انہوں نے خصوصی دلچسپی لی۔ برف پگھلی، چیف منسٹر نے مولانا کی درخواست کا جواب بھیج دیا اور چیف منسٹر کی طرف سے چوبیس پچیس خطوط کی نقول ملیں۔ مولانا کی مروت نے ضروری سمجھا کہ اس کی اطلاع عرشی صاحب کو کردیں۔

''......بحمد للہ احسان کہ اس وقت کی ڈاک سے عالی جناب چیف منسٹر صاحب بہادر کا عطیہ پہنچا جس میں 25،24 خطوط اور عرائض مرزا داغ مرحوم کے ہیں اور ایک قصیدہ اور ایک غزل میں نے اسی وقت ممدوح کی خدمت میں رسید کے طور پر عریضہ بھیج دیا ہے۔ اب یہ کارڈ خدمت گرامی میں اسی اطلاع کے سلسلے میں حاضر ہے۔''

اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد انہوں نے دیگر احباب کو خطوط لکھے اور کوشاں رہے کہ جتنے خطوط مل سکیں حاصل کرلیے جائیں۔

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام کل ہند اردو کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ مولانا کو بھی مدعو کیا گیا۔ وہ اتنے مصروف تھے کہ مارہرہ سے باہر قدم نہیں نکال رہے تھے لیکن یہ سوچ کر شرکت کے لیے تیار ہو گئے کہ وہاں کئی ایسے بزرگوں سے ملاقات ہوسکتی ہے جن کے پاس داغ کے خطوط محفوظ ہو سکتے ہیں۔

انہوں نے سامان تیار کیا اور دہلی پہنچ گئے۔

اس کانفرنس میں ان کی ملاقات ناطق گلاوٹھی سے ہوئی جو اعلیٰ پائے کے شاعر اور داغ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ناطق صاحب سے اپنا مدعا بیان کیا۔ گلاوٹھی صاحب کا جواب حوصلہ افزا تھا۔

''استاد مرحوم کے بہت سے تبرکات میرے پاس ہیں۔ میں پہلی فرصت میں ان کی نقلیں آپ کو فراہم کردوں گا۔''

کانفرنس ختم ہونے کے بعد بھی عرصہ گزر گیا۔ ناطق صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ مولانا نے انہیں یاد دہانی کے لیے خط لکھا تب جا کر ان کا جواب آیا لیکن نہایت مایوس کن، جو خطوط داغ نے ان کے نام لکھے تھے۔ حالات نے انہیں محفوظ نہیں رہنے دیا۔ صرف ایک خط تھا جو ان کے پاس محفوظ رہ سکا تھا۔ غالباً اس شرمندگی میں وہ خط کا جواب نہیں دے رہے تھے کہ ایک خط کیا روانہ کریں۔ مولانا کے لیے ایک ایک خط قیمتی تھا۔ انہوں نے نہ صرف اس خط کو قبول کیا بلکہ ناطق صاحب کو خط لکھ کر اس خط کی اہمیت جتلائی۔

''یہ ایک خط لاکھوں خطوں کے برابر ہے۔ پرانے کاغذات اور تبرکات کے ضائع ہو جانے کی وبا ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔''

اس ایک خط کو اس نے سینے سے لگایا اور متین مچھلی شہری کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔

''استاد مرحوم کے خطوط عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔ اگر اب بھی آپ کے پاس یا کسی اور کے پاس خط مرسلہ استاد مرحوم مل جائے تو خیال فرمایئے۔ آپ کے شناسا خواجہ تاشوں (شاگردوں میں آپس کا رشتہ خواجہ تاش کہلاتا ہے) میں سے کوئی ہو تو اس سے پوچھیے اور ضرور پوچھیے۔ اس طرف پوری توجہ سے مصروف ہوں۔''

دوسری سانس میں اس نے امین الدین فوق کاشمیری سے رابطہ کیا۔

''مجھے یاد ہے کہ میرے زمانہ قیام حیدر آباد میں آپ کے نام اکثر خطوط گئے ہیں اور اُمید ہے کہ آپ سے محتاط ادیب نے انہیں محفوظ رکھا ہوگا لہٰذا ان کی نقل یا اصل عنایت کیجیے اور جلد عنایت کیجیے۔''

نہایت تگ و دو کے بعد فوق کاشمیری کی جانب سے داغ کے صرف دو خطوط مل سکے۔ اسی طرح دوسرے احباب سے بھی چند خطوط ملے۔

مہینوں کی جان لیوا کوششوں کے بعد وہ ایک سو چالیس خطوط جمع کر سکے۔

ایک خط نبی جان طوائف الٰہ آباد والی کے نام بھی ملا۔ اس خط کی عبارت سے مرزا داغ کی زندگی کے اہم گوشے پر روشنی پڑتی تھی اور ان کے قلم کا بانکپن ایک عجیب انداز سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس لیے اسے بھی شامل کرلیا گیا۔

عبارت کی شوخی ان لفظوں سے ظاہر تھی۔

''......حور کی صورت نور کی مورت خوش رہو اور ہم سے ملو...... کیوں جی تم سے کیونکر ملیں تم کو کیونکر دیکھیں کیونکر سنیں اور نہ دیکھیں تو کیونکر جئیں۔ جو شخص ازلی عاشق مزاج ہو خیال کرو اس کا کیا حال ہوگا۔ تم سے یہ اُمید نہیں کہ خواب میں بھی آ ؤ۔ ہائے مجبوری وائے مجبوری......''

حسن نے ان خطوط کو بہ اعتبار مضمون تین فصلوں میں تقسیم کیے۔ فصل اول میں وہ خطوط درج کیے جو والیان ریاست حکام اور امرا کو لکھے گئے تھے۔ فصل دوم میں احباب کو لکھے گئے خطوط درج کیے۔ فصل سوم میں وہ خطوط شامل کیے جو بہ سلسلہ شاعری تلامذہ کو لکھے گئے تھے اور یوں انہوں نے ایک سو باسٹھ صفحات پر مشتمل مجموعہ تیار کرلیا۔ مسودے میں کچھ صفحات خالی بھی چھوڑ دیے تاکہ اگر اشاعت کے وقت تک کچھ خطوط اور مل جائیں تو وہ بھی شامل کر لیے جائیں۔

اس کے بعد وہ ''انشائے داغ'' کا مقدمہ لکھنے بیٹھ گئے۔

''اگر ہم کسی نامور کی ذاتی شوخی۔ سنجیدگی۔ متانت، ظرافت، ثقافت، خوش مزاجی، شگفتہ طبعی، برہمی، عجز و انکسار، غضب ناکی، خشونت اور دوسری حسیات کی جانچ پڑتال کرنا چاہیں اور اس کو دیکھے بغیر اس کی عادتوں اور خصلتوں اور میلان اور رجحان کو سمجھنا چاہیں تو اس کے لیے خطوط کے سوا کوئی دوسری تصنیف و تالیف کام نہیں آسکتی۔ دوسروں کی لکھی ہوئی لائف سے اس کے معمولات زندگی تو معلوم ہو جائیں گے مگر یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس موقع پر اس کا صحیح وجدان اور اصلی رجحان کیا ہے اگر یہ باتیں آئینے کی طرح صاف نظر آسکتی ہیں تو ان نجی تحریروں ہی میں نظر آسکتی ہیں جن کو ایک صاحب قلم نے اپنے بے تکلفانہ انداز رقم کے ساتھ سینے سے نکال کر سفینے میں رکھ دیا ہے۔

موجودہ حالت کو غنیمت جان کر جتنا ذخیرہ استاد مرحوم کے خطوط کا دست برد انقلاب اور غارت گری و غفلت سے بچ رہا ہے اس کو بجائے ضائع کرنے کے شائع کیا جاتا ہے۔ حتی الامکان اس وقت بھی بہت کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کے تلامذہ و احباب سے جس قدر خطوط مل سکیں اس مجموعے میں شائع ہو جائیں مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ باوجود سعی و کاوش کے اپنے بھائیوں سے خاطر خواہ سرمایہ بہم نہیں پہنچ سکا۔ خود میرے پاس بہترین خطوط تفرقہ اوقات کی وجہ سے ردیوں میں مل کر نیست و نابود ہو گئے۔ نیز تلامذہ قدیم کے نام جو خطوط تھے وہ اکثروں کے انتقال کی وجہ سے اور کتروں کی ناقدری یا بے پروائی کے سبب تلف ہو گئے بہر حال کچھ نہ ہونے سے کچھ بھی نہ ہونا بہتر ہے۔

انہوں نے یہ مجموعی خطوط مرتب کر کے اس کا مسودہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے حوالے کر دیا اور اشاعت کا انتظار کرنے لگے۔

شومئی قسمت وہ اسے اشاعت پذیر ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے۔ ''انشائے داغ'' ان کے انتقال کے بعد شائع ہو سکا۔

ہندوستان اب ایک ایسے موڑ پر پہنچ گیا تھا جہاں لسانی سیاست اور عام سیاست گھل مل کر ایک ہو گئے تھے۔ اردو ہندی کا جھگڑا قدیم سے چلا آرہا تھا لیکن اب اس میں سیاست کے پر لگ گئے۔ بعض دانش وروں نے یہ سوچا کہ اگر اردو کو فارسی الفاظ اور فارسی تراکیب سے بچالیا جائے تو معترفین کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اس طرح اردو ہندی کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

اس تحریک کو چلانے کے لیے بنگال میں اردو کے نام سے کلکتہ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ سید واجد علی بیرسٹرایٹ لا نے اپنے خطبے میں کہا۔

''ہمیں وہ زبان بولنی اور لکھنی چاہیے جسے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ لغات کی تلاش میں ہمیں بازاروں، سڑکوں اور منڈیوں کا چکر لگانا چاہیے نہ یہ کہ پرانی لغتوں اور فرہنگوں کا مطالعہ کر کے زبان کو چیستان بنا دیا جائے اگر ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے لکھنے والے اس بات کا خیال رکھیں تو اردو ہندی کا جھگڑا بہت جلد مٹ سکتا ہے۔''

اس تحریک کے پیش نظر مولانا احسن کو اپنے استاد داغ کی شاعری کا خیال آیا۔ داغ کی زبان صفائی اور آسانی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔ ان کی غزلوں میں سیکڑوں اشعار ایسے تھے جن میں فارسی رضافت و عطف نہیں۔ مولانا کے دعوے کے مطابق داغ کے چاروں دواوین میں صرف غزلوں کے سولہ ہزار ایک سو باسٹھ اشعار ہیں ان میں سے چھ ہزار دو سو چوالیس ایسے اشعار ہیں جن میں رضافت و عطف نہیں۔

وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ زبان کی جس اصلاح کے آج چرچے ہو رہے ہیں داغ یہ کارنامہ بہت پہلے انجام دے چکے اور اگر آج کے شعرا ان کی پیروی کرتے ہوئے

شاعری میں سادگی کو اپنائیں تو وہ مطالبہ پورا ہو سکتا ہے جس کا مطالبہ آج کیا جارہا ہے۔ ان لوگوں کو بھی جواب دیا جائے جو یہ کہتے نظر آتے تھے کہ فارسی کے بغیر اردو کا کام نہیں چل سکتا۔

انہی خیالات کے تحت وہ داغ کے دواوین کا مطالعہ کرنے بیٹھ گئے۔ جو شعر پسند آتا گیا اسے نشان زد کرتے گئے۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو انہوں نے اس انتخاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ کتاب کے پہلے حصے میں صرف وہ اشعار جمع کیے جن میں داغ نے اضافت اور علف کا استعمال نہیں کیا۔

اردو ہے جس کا نام ہمی جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ کی شاعری کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ غزل کی زبان کو جہاں تک ممکن ہو سادہ بنایا جائے۔ بعض دفعہ ان کی سادگی سادہ لوحی کی حد تک پہنچ جاتی تھی جس پر لوگ ہنستے تھے۔

ہمارا دل ہمارا دل کبھی تھا
تری صورت تری صورت کبھی تھی

انتخاب کے دوسرے حصے میں کسی خاص اسلوب بیان کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ جس غزل میں جو شعر اچھا معلوم ہوا اس کو درج کر دیا گیا۔

داغ کے چاروں دواوین ان کی زندگی کے مختلف ادوار میں ترتیب دیے گئے تھے۔ اس لیے کوئی ایک دیوان پڑھ کر داغ کی غزل گوئی کے ارتقا کو نہیں سمجھا جا سکتا لیکن چونکہ احسن نے اپنے انتخاب ''منتخب داغ'' میں داغ کے تمام دواوین کو یکجا کر دیا تو اصولاً تمام ادوار بھی یک جا ہو گئے۔ قاری ایک ہی کتاب میں داغ کی شعر گوئی کے مختلف زمانوں سے واقف ہو سکتا تھا۔

''منتخب داغ'' نے یہ خدمت بھی سرانجام دی۔

احسن کی اس کتاب کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ وہ اپنی زندگی میں اسے شائع ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔

اس انتخاب میں مولانا نے اس نظریے کو پیش نظر رکھا تھا کہ اگرچہ ادبی و علمی تصانیف کے لیے عموماً دوسری زبانوں اور خصوصاً عربی فارسی کے بغیر اردو کلاسیکل زبان نہیں بن سکتی پھر بھی عام بول چال کے لیے عام ملکی خیر خواہوں کی طرح خصوصیت سے ہر شاعر کا فرض ہونا چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے امکان میں ہو اپنی زبان کو سہل سے سہل اور آسان سے آسان ترکیبوں کے ساتھ استعمال کرے۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی کی وضاحتوں اور ترکیبوں سے اردو کی بندشوں میں چستی اور بیان ہی لطیف اختصار پیدا ہو جاتا ہے جس کی بدولت زبان کی دلکشی اور دل آویزی بڑھ جاتی ہے لیکن اردو کو فارسی ترکیبوں سے بچانے کی کوشش کی جائے اور عادت ڈالی جائے تو اس صورت میں بھی اردو اتنی کامیاب ہو سکتی ہے کہ فارسی ترکیبوں کا سہارا لیے بغیر اپنا مطلب پوری طرح ادا کر سکتی ہے۔

اپنے اس نظریے کے ثبوت کے لیے انہوں نے ''منتخب داغ'' پیش کر دیا کہ داغ نے سیکڑوں اشعار فارسی کا سہارا لیے بغیر کہہ ڈالے تو دوسرے ان کی پیروی کیوں نہیں کر سکتے۔

ایک طرف ان کا یہ علمی و ادبی کام تھا۔ دوسری جانب سیاسی دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ قائداعظم دو قومی نظریہ پیش کر چکے تھے اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ زور پکڑتا جارہا تھا۔ مولانا ایک ذی شعور ادیب اور پکے مسلمان کی حیثیت سے اس مطالبے کے حق میں تھے۔ انہوں نے ایک عمر مجلسی زندگی گزارتے ہوئے گزاری تھی۔ موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ علیحدہ وطن کے قیام کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ ہندوؤں کے تعصب سے اسی وقت نجات مل سکتی ہے جب مسلمان اپنا الگ وطن حاصل کر لیں۔ انہیں سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ مسلمان جس وطن کو حاصل کریں گے وہ اسلامی ملک ہوگا اور مسلمان اسلامی نظریات کے تحت زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوں گے۔

مسلمانوں میں اس وقت جوش و جذبہ نہایت بڑھ گیا جب مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی قرارداد پیش کرنے کے لیے لاہور میں تاریخی اجلاس کی تاریخ کا اعلان ہوا۔ مولانا پیرانہ سالی کے باوجود اس تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے بے چین ہو گئے۔

یہ جلسہ پہلے دسمبر 1939ء میں ہونا قرار پایا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا۔

''زندگی رہی تو شاید دسمبر میں مسلم لیگ کے جلسے میں لاہور آؤں گا۔ اگر ایسا ہوا تو تیس پینتیس برس بعد پھر ملاقات ہو سکے گی اُمید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا۔''

یہ جلسہ ملتوی ہو گیا تو اسی دوست کو پھر خط لکھا۔

''یہ جلسہ چونکہ دسمبر میں ملتوی کر دیا گیا اور اگلے برس مارچ 40ء میں ہونا قرار پایا لہٰذا اگر زندگی رہی تو ضرور آؤں گا اور جب آؤں گا تو آپ سے ملے بغیر نہ رہوں گا۔ میں بھی اب چھیاسٹھواں مرحلہ شروع کر چکا ہوں دیکھیے یہ منزل کب اور کہاں ختم ہوتی ہے۔''

جب ایک سال گزر گیا۔ صحت ٹھیک رہی اور مارچ 40ء کے مسلم لیگ کے جلسے میں جانے کا مکمل ارادہ کر لیا تو اسی دوست کو پھر خط لکھا۔

''خیال ہے کہ اس موقع پر لاہور آؤں اور 35 برس بعد لاہور کو بھی دیکھوں اور آپ سے بھی ملوں۔ فرمایئے اور بے تکلف فرمایئے۔ اگر ایسا ہوا تو میرے قیام کے متعلق آپ کی معرفت کوئی ایسا انتظام ممکن ہے کہ میں اور میرے ساتھ دو تین احباب کسی مکان میں بہ اطمینان ایک ہفتے ٹھہر سکیں گے۔ مکان تنہا اور باہمہ اور بے ہمہ چاہتا ہوں۔ مکان کے سوا دوسری تکلیف دہی منظور نہیں۔ اگر مکان کے لیے ہم سے چھ روپے بھی صرف ہو جائیں تو مضائقہ نہیں لیکن مکان ایسا ہو جس میں ضرورت کی سب چیزیں موجود ہوں۔ اگر ایسا بہ آسانی ہو سکتا ہے تو مطلع فرمایئے۔''

مکان کا بندوبست ہو گیا اور مولانا اس اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔

قائداعظم لاہور تشریف لائے۔ سر سکندر حیات نے ان کا شایانِ شان استقبال کیا۔ مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا اور نہایت کامیابی سے منعقد ہوا اور وہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی جس کو قرارداد پاکستان کہتے ہیں۔ قائداعظم اب تک لفظ پاکستان سے مانوس نہیں ہوئے تھے۔ سر سکندر کا تو یہ خیال تھا کہ سیاسی اسکیم پیش ہی ایسے الفاظ میں کرنی چاہیے جس کا مطلب صرف مسلمانوں کی حکومت ہو۔ پاکستان کے لفظ سے ہندو اور انگریز دونوں خوف زدہ ہیں۔ پاکستان کا نام ہی نہ آئے۔ ہمیں تو اپنے مقصد سے کام رکھنا چاہیے۔ قرارداد میں کوئی ایسا لفظ نہیں آئے جس سے قرارداد کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ قائداعظم بھی اس معاملے میں سکندر حیات کے ہم خیال ہو گئے چنانچہ قرارداد لاہور میں پاکستان کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا لیکن یہ باطن مطالبے کی شکل وہی تھی جس سے پاکستان کے سوا کچھ مقصد نہیں تھا۔

قرارداد پاکستان کا ذکر نہیں تھا لیکن ہندو اس اندرونی مطالبے کو سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے نام کو اتنا اچھالا کہ اس کے بعد قائداعظم نے بھی اسی کو اختیار کر لیا۔ چند تقریروں میں تو انہوں نے یہ کہا کہ قرارداد لاہور جسے ہندو، پاکستان ریزولیشن کہتے ہیں لیکن اس کے بعد وہ پاکستان کی اصلاح کو بے تکلف استعمال کرنے لگے۔

اجلاس سے پہلے لاہور کی فضا نہایت کشیدہ ہو گئی تھی۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ خاکسار تحریک کے بانی علامہ مشرقی سکندر حیات کی حکومت کے خلاف تھے اور اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ ہندو اور سکھ قرارداد لاہور کے اجلاس کو درہم برہم کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سکندر حیات نے اجلاس سے پہلے تمام جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کا ارادہ کر لیا تا کہ لاہور کا لا اینڈ آرڈر خراب نہ ہو۔ سکندر حیات کو اگر اندیشہ تھا تو علامہ مشرقی سے تھا۔ انہوں نے اپنی حکومت کے لوگوں سے کھل کر کہہ دیا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ ہندو اور سکھ فوراً حکم امتناع پر عمل کریں گے۔ مجھے اگر اندیشہ ہے تو اپنے شوریدہ سر اور گرم مزاج بھائی علامہ مشرقی سے ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مقابلے پر کھڑا ہو جائے اور مجھے اس سے متصادم ہونا پڑے۔''

انہوں نے علامہ کو چائے پر بلایا۔ علامہ چائے پر ملے اور انہوں نے حکم امتناعی پر عمل کرنے کا وعدہ کر لیا لیکن اس کے بعد وہ دہلی چلے گئے۔ ان کا ہفتہ وار اخبار ''الاصلاح'' نکلتا تھا۔ اس کے دو تین پرچوں میں نہایت اشتعال انگیز مضامین حکومتِ پنجاب اور سکندر حیات کے خلاف لکھے۔ ان مضامین میں خاکساروں سے کہا گیا تھا کہ ہزارہا کی تعداد میں لاہور میں جمع ہو جائیں اور سکندر کے بستر کے گرد لاشوں کے انبار لگا دیں۔ حکومت پنجاب سے ٹکراؤ ہو گا اور ضرور ہو گا۔ ان مضامین کا اثر یہ ہوا کہ اجلاس سے دو تین دن پہلے خاکساروں کا پولیس سے تصادم ہو گیا اور کوئی پچیس خاکسار مارے گئے۔ اجلاس میں دو دن رہ گئے تھے اور یہ واقعہ پیش آ گیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اجلاس ہو گا بھی یا نہیں لیکن قائداعظم کے تدبر اور سکندر حیات کی دردمندی نے تمام معاملہ سنبھال لیا۔

مولانا احسن مارہروی لاہور کے منٹو پارک (موجودہ مینار پاکستان) میں ہونے والے اس عظیم اجتماع میں شریک ہوئے اور یہ کہتے سنے گئے۔ ''خدا جانے یہ قرارداد کب پوری ہو اور پاکستان بنے۔ میری زندگی وفا کرے نہ کرے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آج پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنتے ہوئے دیکھ لیا۔''

وہ لاہور میں ایک ہفتے ٹھہرنے کے لیے آئے تھے

لیکن لاہور کی فضا کشیدہ تھی اور بارشوں کی آمد آمد تھی لہٰذا مولانا دو دن بعد ہی مارہرہ واپس چلے آئے لیکن بعد میں جو حالات پیش آئے اس کے بعد احباب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ کچھ ہونے والا تھا، کوئی گھبراہٹ تھی جو انہیں مارہرہ کھینچ لائی۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں لاہور میں زیادہ ٹھہرنے نہیں دیا، دوستوں سے یہ کہہ کر لاہور آئے تھے کہ پینتیس سال بعد ملاقات ہوگی۔ تقاضا تھا کہ دوستوں کے پاس کچھ دن ٹھہریں گے لیکن وہ دن بعد ہی دوستوں سے ملے بغیر لاہور کو خیرباد کہہ دیا۔

بریلی میں کل ہند اردو کانفرنس ہونے والی تھی۔ کچھ دن آرام کرنے کے بعد بریلی جانا تھا۔ پشت پر کثرت سے گرمی دانے نکلے ہوئے تھے۔ ان میں جلن تو بہت تھی لیکن یہ کوئی ایسی بیماری نہیں تھی کہ بریلی جانے میں مانع ہوتی۔ وہ بریلی چلے گئے۔ بریلی میں قیام کے دوران ہی ان گرمی دانوں میں سے ایک نے ''پھنسی'' کی شکل اختیار کرلی۔ مارہرہ واپس آتے آتے اس پھنسی نے ایک بڑے ''دنبل'' (پھوڑا) کی شکل اختیار کرلی۔ اس پھوڑے میں سوزش اس قدر تھی کہ کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔ مولانا کے صاحبزادے سید سعید احسن جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسسٹنٹ رجسٹرار تھے انہیں اپنے پاس علی گڑھ لے آئے۔ مرض بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مولانا صاحبِ فراش ہو گئے۔ لکھنے پڑھنے اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو گئے۔ رہ رہ کر پھوڑے سے ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ کروٹ لیے لیٹے رہتے تھے۔ ایک روز ان کے داماد سید الطاف ملنے آئے ہوئے تھے ان کے ذریعے اپنے شاگرد صغیر احسن کو خط لکھوایا۔

''میں اپنا کیا حال لکھوں۔ پشت پر کاربنکل نکلا ہے اور آج دس بارہ دن سے جو اذیت پا رہا ہوں دل ہی جانتا ہے۔ ایک علاج شروع کیا ہے، چھ روز ہو چکے ہیں، کچھ افاقہ تو ہے۔ دعا کرو اللہ تعالیٰ اس سے نجات دے تو پھر کچھ بات کروں۔ زیادہ نہ گھبرانا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں، کراہ اور آہ کی وجہ سے کہ ایک ایک حرف بھی لکھ سکوں مگر خلوص سے متاثر ہو کر یہ کارڈ لکھوا رہا ہوں۔''

اتنی سخت تکلیف میں بھی ادب و شعر سے ناتا نہیں ٹوٹا تھا۔ معلومات بھی سب تھیں آرزوئیں بھی تمام۔ رشید احمد صدیقی ان سے ملاقات کے لیے آئے تو سخت اذیت میں مبتلا تھے۔ رشید صاحب کو دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ رشید صاحب ابھی پورے طور پر مزاج پرسی بھی نہیں کر پائے تھے کہ مولانا بول پڑے۔

''کیوں حضور سنتا ہوں آپ کی کتاب ''خنداں'' شائع ہو گئی۔ میں انتظار ہی کر رہا ہوں۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ اب بھی آئے تو خالی ہاتھ۔''

رشید احمد صدیقی ہکا بکا رہ گئے۔ وہ اتنی تکلیف میں تھے کہ موت کی تکلیف یاد آتی تھی۔ ایسے مواقع پر اچھے اچھے مریض کسی ہمدرد کو دیکھ کر آہ و فغاں کرنے لگتے ہیں۔ اپنے مرض کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ انہیں سوجھی تو یہ کہ میرا نسخہ کہاں ہے۔ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرلیتے۔ ہلکی سی کراہ بھی نکل جاتی لیکن درد سے ذرا نجات ملتی تو ''خنداں'' کا تقاضا کرنے لگے۔ رشید صاحب اٹھنے لگے تو اس وقت بھی ''خنداں'' ہی کو یاد کر رہے تھے۔

''رشید صاحب خدارا کتاب بھیج دیجیے میں آدمی ساتھ کیے دیتا ہوں وہ لے آئے گا۔''

کتاب آئی تو پڑھنے کی تاب کس میں تھی لیکن اطمینان تھا کہ کتاب آگئی۔ سرہانے دھری ہے۔ تکلیف میں کمی آئی تو ضرور پڑھیں گے۔

ممتاز حکیم شبیر احمد کا علاج ہو رہا تھا لیکن افاقہ ناپید تھا۔ مجبوراً انہیں پٹنہ (بہار) پہنچا دیا گیا جہاں ان کے منجھلے صاحبزادے میڈیکل افسر تھے (ڈاکٹر سید انعام احسن) پٹنہ کے میڈیکل کالج میں 22 اگست 1940ء کو پھوڑے پر بجلی کے ذریعے عمل جراحی کیا گیا۔ ڈاکٹر مطمئن تھے لیکن 29 اگست کو یکایک گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ میڈیکل کالج کے قابل ترین ڈاکٹروں نے ہر ممکن تدبیر اختیار کر کے دیکھ لی۔

30 اگست 1940ء شام کے وقت ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ مرحوم کا جسد خاکی پٹنہ سے مارہرہ لایا گیا۔ 31 اگست گیارہ بجے رات خاندانی قبرستان درگاہ برکاتیہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ سرطان کا موذی مرض تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

گفت سیماب کتبۂ لحدش
روضۂ احسنِ علی احسن 1359ھ

ماخذات

مولانا احسن مارہروی آثار وافکار
از ڈاکٹر صابر حسین جلیسری
سرگزشت: عبدالمجید سالک

ابن کبیر

وہ نہ تو رئیس ابن رئیس تھا اور نہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ پھر بھی انسانیت کے نام پر اس نے ایک بہت بڑی ذمّہ داری کا بوجھ ڈھونے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے برسوں سے مصائب کے چنگل میں پھنسے ان افراد کی داد رسی کا بیڑا اٹھا لیا جو حب الوطنی کے جرم میں بدحال، پریشان، جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور ان کی تعداد بھی کم نہیں؛ کئی لاکھ ہیں، جنہیں محصور پاکستانی بھی کہا جاتا ہے۔

وہ ایک اداس شام تھی۔
امریکی ریاست انڈیانا پر حبس چھایا تھا۔ درخت چپ تھے اور ٹریفک معمول سے کم تھا۔

انوار بالکونی میں بیٹھا تھا۔ اُس کے چہرے پر ماضی کی لکیریں، آنکھوں میں غم کے سائے تھے۔ ہوا کا کوئی جھونکا آتا تو میز پر پڑے کاغذات پھڑ پھڑاتے۔ اُن میں ایک حزنیہ

تڑپ پنہاں تھی، کرب کی بے انت داستان درج تھی۔

کاغذوں میں سانس لیتی کہانی محمد اسماعیل نامی ایک شخص کے قلم سے نکلی تھی، جو امریکی ادارے ''ناسا'' سے منسلک تھا۔ اُسے کسی پراجیکٹ کے سلسلے میں بنگلہ دیش جانا پڑا تھا۔ قیام تو ڈھاکا میں تھا، مگر اتفاقات کا ایک سلسلہ اُسے شہر سے کچھ پرے، ایک تعفن زدہ کچی بستی میں لے گیا۔ وہ غیر بنگالیوں عرف عام میں بہاریوں کا کیمپ تھا۔ ایک بے وطن گروہ، جس کی زندگی کو دیمک لگ گئی تھی۔

وہاں کی ہولناکی نے اسماعیل کو کاٹ ڈالا۔ اس کا دل آنسوؤں سے بھر گیا۔ وہ امریکا لوٹ آیا، مگر آنسوؤں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ یہی آنسو الفاظ میں ڈھلے، تو ایک مضمون کی صورت اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا (ISNA) پہنچ گئے۔

اتفاقات کا پُراسرار سلسلہ جاری تھا۔

اُس ادارے میں ایک پاکستانی عورت بھی ملازم تھی۔

یہ تلخ مضمون اس کی میز تک پہنچا۔ عورت نے مضمون پڑھا تو دہل گئی۔ محرومیوں کی یہ کہانی وہ اپنے گھر اٹھا لائی کہ اُس کے شوہر نے اپنا بچپن اُسی خطے میں گزارا تھا جو کبھی مشرقی پاکستان کہلاتا تھا مگر 71ء میں اچانک... بنگلہ دیش میں تبدیل ہوگیا۔

لاکھوں زندگیاں کرب کی گھاٹی میں اتر گئیں۔ ''اِدھر ہم اُدھر تم'' کے نعرے نے لاکھوں انسانوں کا مستقبل تاریک کر دیا۔ اُن کے گلے میں اجنبیت کا طوق ڈال کر انہیں کیمپوں میں دھکیل دیا گیا۔

جب انوار کاغذ کا پلندہ لیے اپنی بالکونی میں آ کر بیٹھا تھا، اس نے شہر پر چھائی اداسی پر نگاہ ڈالی۔ آج سے قبل اس نے ایسا بے رنگ آسمان نہیں دیکھا تھا۔ اسے کچھ الجھن محسوس ہوئی۔

تحریر پڑھنی شروع کی تو ماضی کی تاریکیوں میں اترتا چلا گیا۔ ذہن میں دھماکے ہو رہے تھے۔ مضمون کے اختتام تک شہر پر چھائی اداسی غیر متعلقہ ہو چکی تھی۔ اس کے سامنے ایک جہنم تھا، جہاں انسانیت چیخ رہی تھی۔

اس کے سامنے ماضی تھا، اس کا اپنا ماضی!

☆☆☆

وہ رات خوف سے بوجھل تھی۔

چاند بجھ گیا، ستارے چھپ گئے اور تاریکی دبیز ہوگئی۔ کہیں فائرنگ کی کریہہ آواز گونجی۔ کتے زور سے بھونکے۔ گلیوں میں سائے حرکت کر رہے تھے۔ دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، پھر یکدم سناٹا چھا گیا۔

تھا۔ کہیں گولی چلی تھی۔ انوار نے بھاری کمبل خود پر ڈال لیا۔ اُسے ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ ذہن بار بار ان منحوس خبروں کی سمت چلا جاتا تھا، جو شکیب الحسین کے ذریعے اس تک پہنچی تھیں۔ خبریں، جن میں خون کی بو تھی۔ چیخیں تھیں، گریہ تھا۔ خبریں... جو ڈھاکا سے موصول ہو رہی تھیں، جہاں اس کی ماں اور بہنیں پھنسی ہوئی تھیں۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آج شہر پر آسیب کا سایہ تھا مگر یہ شہر ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ یہاں تو سبزے کی حکمرانی تھی۔ پرندے چہکا کرتے اور چشمے گیت گاتے۔

یہ مشرقی پاکستان کا علاقہ رنگ پور تھا، جہاں اس نے شعور کی آنکھ کھولی۔ اس کی پیدائش ہندوستانی ضلع اعظم گڑھ کی تھی۔ ننھیال وہیں تھا اور اس وقت رواج تھا کہ عورتیں بچے کی پیدائش کے وقت اپنی میکے چلی جاتیں۔

لڑکے کے اجداد کا تعلق مشرقی پاکستان سے نہیں تھا۔ یہاں آنے کا سبب اُس کے ابا ٹھہرے۔ پکے مسلم لیگی تھے۔ علی گڑھ یوتھ ونگ کے سرگرم کارکن۔ تقسیم کے بعد جب محمد علی جناح نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو پکارا، تو اپنے قائد کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے وہ مشرقی پاکستان چلے آئے۔ خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ نوزائیدہ ریاست کے کتنے ہی محکموں میں کام کیا۔ مختلف شہروں میں وقت گزارا۔ مرنے کے بعد یہیں دفن ہوئے۔

انوار اُن کی چوتھی اولاد تھا۔ بچپن ہی سے پُراعتماد اور ذہین۔ لوگوں میں گھل مل جانے والا۔ رنگ پور کے جس محلے میں وہ پروان چڑھا تھا، وہاں اُس کا خاندان اردو بولنے والا اکلوتا گھرانا تھا، مگر یہ امر کبھی پریشانی کا باعث نہیں بنا۔

انوار کی بنگالی نوجوانوں سے گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ نہر میں نہاتے۔ ساتھ درختوں پر چڑھتے۔ کھیتوں میں ایک دوسرے کا تعاقب کیا کرتے۔

شروع شروع میں تو سب ٹھیک تھا۔ ہر طرف امن شانتی سکون تھا مگر میٹرک میں قدم رکھنے کے بعد حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ اردگرد تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ چنگاریاں سی تھیں، جنھیں حکومت دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

بنگلہ اور اردو زبان دھیرے دھیرے دُور ہونے لگیں۔ سازشیں زوروں پر تھیں۔ احتجاج اور تصادم کی خبریں اڑتی اڑتی رنگ پور بھی پہنچیں۔ البتہ لسانی خلیج کے باوجود اُس کے محلے میں حالات بہتر تھے۔ آپریشن شروع ہونے کے بعد بھی

کسی نے میلی نگاہ سے ناریل کے درختوں والے اُس گھر کی سمت نہیں دیکھا۔ لوگ اُس کے مرحوم باپ کا احترام کرتے تھے۔ پھر جن لڑکوں کے ساتھ وہ بڑا ہوا تھا، وہ اُسے بھائیوں کی طرح چاہتے تھے۔

آپریشن تیز ہوگیا۔ نفرت کے شعلوں نے فصلیں جھلسا دیں۔ باغی قوت حاصل کرتے جا رہے تھے، انہیں ہندوستان کی پشت پناہی حاصل تھی۔ علیحدگی کا نعرہ لگ گیا۔

عوام متذبذب تھے۔ اردو بولنے والوں کی ہمدردی تو پاکستان کے ساتھ تھی ہی، بنگلہ بولنے والوں کا ایک بڑا طبقہ بھی علیحدگی کے خلاف تھا۔ مگر اب... بہت دیر ہوچکی تھی۔ دشمن کی چالیں کامیاب رہیں۔ 16 دسمبر کے روز... پاکستان اپنے ایک بازو سے محروم ہوگیا۔ لاکھوں لوگ یکدم بے گھر ہوگئے۔

تو وہ 16 دسمبر کی خوف سے بوجھل رات تھی۔

فائرنگ کی کریہہ آواز گونجی، دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی، پھر یکدم سناٹا چھا گیا۔

انوار کمبل میں دبکا بیٹھا تھا۔ ذہن میں اندیشے گردش کر رہے تھے۔ ماں اور بہنیں ڈھاکا شہر کی مضافاتی بستی میرپور سیکشن نمبر ایک کے علاقے میں پھنس چکی تھیں۔ اردو بولنے والوں کی اُس آبادی پر دہشت رقص کر رہی تھی۔ اسے گھیر لیا گیا تھا۔

اپنے اہل خانہ سے متعلق انوار کے اندیشے بے سبب نہیں تھے۔ بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ کئی بدن بے روح ہوئے۔ کئی بستیاں نذر آتش کی گئیں۔

اس رات... اس کے گھر کی عورتیں بھی ایک جہنم سے گزریں۔ ہاں، وہاں فائرنگ ہوئی تھی۔ شعلے لپکے تھے۔ ایک گولی اُس کی ماں کے سینے کے آرپار ہوگئی تھی۔

اُس دلیر عورت نے اپنی بیٹیوں کی سمت دیکھا۔ وہ واقعے سے لاعلم تھیں۔ اس نے چادر سے اپنا سینہ ڈھانپ لیا۔ کچھ لوگ وردی میں ملبوس، اسلحہ اٹھائے اُن کے گھر میں داخل ہوئے۔ عورتوں اور بچوں کو گھروں سے باہر نکالا اور ٹرکوں میں بھر لیا انہیں موراپاڑا کیمپ منتقل کیا جا رہا تھا کہ اب وہ پاکستانی تھے، ملک دشمن تھے۔ حکومت بنگلہ دیش کے باغی تھے۔ دشمن تھے۔

تاریک رات بے کسوں کے قافلے اس کیمپ کی سمت جا رہا تھا، جہاں سانحات کا طوفان منتظر تھا۔ اچانک لڑکی کی نظر اپنی ماں پر پڑی۔ اس کا دوپٹا خون سے تر تھا۔ اس کے سینے پر موت کا نشان تھا۔

لڑکیوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ روئیں، گڑگڑائیں۔ اسلحہ بند سپاہیوں کی منت کی۔ آدمیوں کے چہرے برف سے سرد تھے۔ وہ انسانی جذبات سے عاری معلوم ہوتے تھے لیکن ایسا نہیں تھا... ان میں بھی انسانیت تھی۔

''اس عورت کو اسپتال لے جانا پڑے گا۔'' ایک شخص نے بنگلہ میں کہا۔ کچھ دیر اس کی اپنے ساتھیوں سے بحث ہوئی۔ آخر عورت کو ایک جیپ میں ڈال دیا گیا۔ لڑکیاں اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ اس فوجی جیپ نے خون سے لتھڑی سڑکیں عبور کیں۔ وہ جلی ہوئی بستیوں سے گزری۔

اسپتال میں کچھ امید میسر تھی۔ ڈاکٹروں نے ابھی تعصب کا نقاب نہیں اوڑھا تھا۔ عورت کو فوری طبی امداد دی گئی۔ اس کا سانس بحال ہونے لگا۔

ادھر رنگ پور میں انوار اپنے گھر میں قید ہوگیا تھا۔ وہ ماسوائے دعا کے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اور دعائیں بے ثمر نہیں گئیں۔ وہ آسمان تک پہنچیں۔ قدرت حرکت میں آگئی۔

اس کی ماں کا زخم تیزی سے مندمل ہو رہا تھا۔ حالات کی شدت کچھ کم ہوئی تو ڈھاکا میں مقیم چند رشتے دار اسپتال پہنچ گئے۔

انوار کے لیے اب وہاں کچھ نہیں بچا تھا۔ پاکستان، اب بنگلہ دیش میں بدل چکا تھا۔ پرانے جذبات متروک ہوئے۔ نظریات کو کوڑے دان میں پھینک دیا گیا۔ نئے گیت تراشے گئے۔

بنگلہ دیش میں آبادی تقسیم ہوچکی تھی۔ ایک گروہ بہاری کہلایا تھا۔ وہ حقوق سے محروم طبقہ تھا، شودر تھے، جن کے لیے نئی ریاست میں زندگی پھیکی اور بے رنگ تھی۔

انوار اگلے دو برس وہاں رہا۔ وہ زمانہ انتہائی پُرآشوب تھا۔ کتنے ہی مصائب کا سامنا کیا۔ کتنی ہی مصیبتیں سہیں۔ آخر ماں کی دعائیں رنگ لائیں۔ اُنہیں پاکستان جانے کا پروانہ مل گیا۔

73ء میں اس کا خاندان کراچی پہنچا، جہاں نیا سورج اُس کا منتظر تھا۔

آگے کی کہانی طویل ہے، اس میں کٹھنایاں ہیں، معاشی جدوجہد ہے، درسگاہوں کا تذکرہ ہے، امریکا کا سفر ہے، مگر اس کا تذکرہ ضروری نہیں۔

انوار کی کہانی کا اگلا قابل ذکر حصہ تب شروع ہوتا ہے، جس روز اس کی بیوی ایک مضمون اٹھائے گھر میں داخل ہوئی۔ مضمون جو غیر بنگلہ دیشوں کے کیمپوں میں جنم لینے والی

ہیبت ناک کہانی سنانا تھا۔

انوار اپنی بالکونی میں بیٹھا سوچ رہا تھا، اگر قسمت نے ساتھ نہ دیا ہوتا، اگر قدرت نے میرا ہاتھ نہ تھاما ہوتا، تو شاید آج میں بھی اسی کیمپ میں ہوتا، شاید میری نسل بھی بے چہرہ ہوتی، شاید میں بھی حقوق سے محروم اقلیت کے طور پر جی رہا ہوتا۔

باہر حبس تھا۔ درخت چپ کھڑے تھے۔ وہ انوار کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔

انہیں زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑا۔ آدمی نے گہرا سانس لیا۔ آنکھوں کی نمی پونچھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہوا کا ایک جھونکا اس سے ٹکرایا۔

حبس ٹوٹ رہا تھا۔

☆☆☆☆

''اندازہ ہی نہیں تھا کہ جس سرسبز زمین پر میں نے شعور کی آنکھ کھولی، وہاں آج لاکھوں افراد اذیت ناک زندگی گزار رہے ہیں۔''

آواز میں کرب تھا۔ سامعین کی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ یہ انوار کے ڈرائنگ روم کا منظر ہے۔ اس نے اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو چائے پر مدعو کیا تھا، تاکہ ان کے سامنے دل کا حال کہہ سکے۔

''سوچتا ہوں، اگر قسمت مہربان نہیں ہوتی، تو شاید میں بھی کسی کیمپ میں سسک رہا ہوتا۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

کمرے میں یاسیت کا بسیرا تھا۔ اس کے ایک دوست نے آگے بڑھ کر کاندھا تھپکا۔ ''ڈاکٹر اسماعیل کا آرٹیکل تمہیں ماضی میں لے گیا برادر۔ ماضی، جو کرب ناک تھا۔''

''ہاں!'' اس نے آنسو پونچھے۔ ''ہاں، مگر اس نے محرک کا کام کیا۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔''

دوست ہمہ تن گوش تھے۔

''ہم ہزاروں خاندانوں کی قسمت تو نہیں بدل سکتے مگر کسی ایک خاندان کو تو بچا ہی سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کیمپ میں مقیم کسی ایک بدبخت خاندان کی کفالت کا ذمہ ہم اپنے سر لے لیں۔'' وہ ایک پل کو ٹھہرا۔ ''مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔''

یاسیت چھن سے ٹوٹ گئی۔ سب کے چہرے دمکنے لگے۔ انہیں یہ خیال بھا گیا تھا۔ لوگوں نے اپنے بٹوے کھول دیے۔ موقع ہی پر سترہ سو ڈالر اکٹھے ہو گئے۔

''یہ فقط آغاز ہے۔'' ایک ضعیف آدمی نے کہا۔ ''میں اپنی ماہانہ کمائی کا ایک حصہ اس نیک کام کے لیے مختص کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔''

''ہم آپ کے ساتھ ہیں انکل۔'' ایک نوجوان نے نعرہ لگایا۔

''شکریہ میرے بچے۔'' بوڑھا مسکرایا۔ ''لیکن یہ کافی نہیں۔ چندہ تو اکٹھا ہو جائے گا مگر اس بدقسمت خاندان کا انتخاب کون کرے گا؟ فلاحی تنظیموں پر بھروسا کرنے کا میں مشورہ نہیں دوں گا۔ ہم میں سے کسی ایک شخص کو بنگلہ دیش جانا ہوگا۔''

سب چپ ہو گئے۔ وہ گہری سوچ میں غلطاں تھے۔ واقعی رقم اکٹھی کرنا تو آسان تھا مگر اسے حقدار تک پہنچانا سہل نہیں تھا۔

اچانک انوار کھڑا ہوا۔ اس کا سر بلند تھا۔

''میں یہ کام اپنے ذمے لیتا ہوں۔'' آواز میں اعتماد تھا۔ ''اپنے بچپن کی سمت لوٹنے کا وقت آ گیا ہے۔''

اس میٹنگ کے کچھ ہفتوں بعد انوار اس ہوائی جہاز میں سوار ہوا، جو ڈھاکا کی سمت جا رہا تھا۔

یہ ایک طویل سفر تھا۔ جب وہ ڈھاکا ایئرپورٹ سے باہر آیا، تو ایک نئی دنیا اس کی منتظر تھی۔ موسم گرم تھا۔ شہر کی آبادی خاصی بڑھ گئی تھی۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ بازاروں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ وہ فضا، جس میں وہ کبھی سانس لیا کرتا تھا، کھو گئی تھی۔

کچھ پرانے دوستوں سے ملنے ملانے، ماحول سے تھوڑا ہم آہنگ ہونے کے بعد آخر وہ اس مشن پر نکلا جو اسے یہاں کھینچ لایا تھا۔

آغاز محمد پور کے جینوا کیمپ سے ہوا!

یہ ایک ہولناک تجربہ تھا۔ کیمپ میں تو وہ بعد میں داخل ہوا، پہلے تعفن نے اس کی روح کو جھنجھوڑا۔ سیوریج کی کھلی ہوئی لائنیں۔ گندگی کے ڈھیر۔ تنگ و تاریک سے بچے۔ چھوٹے چھوٹے تاریک چٹائیوں سے کھڑے جھونپڑے۔ وہاں رہنے والے بے چہرہ لوگ۔ بجھتی ہوئی زندگی۔

اس کیمپ میں آسیب گشت کرتا تھا۔ حالات اس کی توقع سے زیادہ خراب تھے۔ مسائل کا انبار لگا تھا۔ یوں لگتا، جیسے یہاں بسنے والوں کی بدبختی کا کوئی اختتام نہیں۔ کیمپ سے لوٹنے کے بعد بھی وہ کئی گھنٹے تک اس کے زیراثر رہا۔ اس سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ نیند بھی نہیں آئی۔

اگلے روز وہ میرپور کیمپ کی سمت روانہ ہوا۔ اس کے

ساتھ ایک مقامی سماجی کارکن تھا۔ سیکشن نمبر گیارہ کے وسیع میدان پر پھیلی وہ ایک تباہ حال بستی تھی۔ جسے کیمپ کا نام دیا گیا تھا۔ وہاں بھی وہی مناظر تھے جو اس نے جینوا کیمپ میں دیکھے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے مسائل کا سیلابی ریلا کیمپ میں داخل ہوگیا ہو۔ ہر طرف تباہی پھیلی تھی۔

انوار نے خود سے سوال کیا۔ ''میں ایک خاندان کی مدد کرنے آیا تھا، مگر یہاں تو ہر خاندان مدد کا طلب گار ہے۔ ہر گھرانا یاس کی تصویر بنا ہوا ہے۔ میں کس کا ہاتھ تھاموں کس کی مدد کروں؟''

اُس کا ذہن متذبذب تھا۔ مگر قدرت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ راستہ ظاہر ہونے کو تھا۔

ہوا یوں کہ اگلے روز انوار اور اس کا ساتھی رنگ پور کے اصفہانی کیمپ کی تنگ گلیوں سے گزر... رہے تھے کہ چند بچوں نے انہیں روک لیا۔ وہ اسے بچوں کی شرارت سمجھ کر دوسری طرف چلا گیا، مگر کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی چند بچے دیوار بنے کھڑے ہیں۔ تیسری گلی میں بھی یہی منظر۔

وہ بڑا سٹپٹایا۔ جب اس کا سبب پوچھا، تو ایک ایسی الم ناک کہانی سامنے آئی، جس نے اسے دہلا دیا۔

یہ محرومیوں کی ایسی بستی تھی، جہاں بنیادی انسانی سہولیات کا بھی فقدان تھا۔ وہاں کوئی غسل خانہ نہیں تھا۔ عورتوں کو کھلے آسمان تلے نہانا پڑتا۔ اور جب یہ مرحلہ آتا، محلے کے تمام مرد باہر چلے جاتے، عورتیں نل کے پاس اکٹھی ہوجاتیں اور معصوم بچوں کو گلی کے کونوں پر کھڑا کردیا جاتا۔

''خدایا۔'' انوار نے سر تھام لیا۔ اُسے چکر آرہے تھے۔ اس کا ساتھی ایک اسٹول لے آیا۔ ایک بچے نے مٹی کے گلاس میں پانی پیش کیا۔ پانی گدلا تھا اور اس سے سلفر کی بُو آرہی تھی۔

انوار بہت دیر تک آسمان کو تکتا رہا۔ اس کی جیب میں ستر سو ڈالر تھے۔ گو یہ رقم معمولی تھی، مگر یہ چند مظلوم عورتوں کی زندگی بدل سکتی تھی۔ سوچ بچار کے بعد اس نے یہ رقم غسل خانے کی تعمیر کے لیے وقف کرنے کا اعلان کردیا۔

امریکا سے آئے گندمی رنگت والے اُس شخص کے جذبے نے کیمپ والوں کا دل تشکر سے بھر دیا۔ ضعیف عورتوں کے جھری زدہ چہروں پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ جانے کتنے برس بعد انہوں نے حقیقی خوشی کا تجربہ کیا تھا۔ ان کے لبوں پر دعائیں تھیں۔

بنگلہ زبان کے کچھ نقش ذہن پر باقی تھے، مگر وہاں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کیمپوں کے باسی خود کو پاکستانی کہتے تھے اور اردو ہی میں باتیں کرتے تھے۔ بوڑھی عورتیں اِسی زبان میں اپنی کہانی سنا رہی تھیں۔ اور ہر کہانی میں کرب گندھا تھا۔ ہر کہانی ایک حزنیہ تھی۔

☆☆☆☆

''بیٹا، میں تجھے کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔''

یہ ایک بوڑھی آواز تھی، جس میں صدیوں کی تھکن تھی۔ جھریوں سے بھرے چہرے پر سناٹا تھا۔

وہ اسے کیمپ کے وسطی حصے میں لے گئی۔ اس نے تنگ اور تاریک گلیاں عبور کیں۔ گلیاں کیا تھیں، کچرا کنڈیاں تھیں۔ جوں جوں وہ آگے جارہے تھے، تعفن بڑھتا جارہا تھا۔ بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ انوار خود پر جبر کیے آگے بڑھتا رہا۔

بالآخر ایک جگہ پہنچ کر بوڑھی عورت رک گئی۔ فضا بوجھل تھی، سامنے ایک گڑھا تھا۔ پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔

''یہاں سے نالا گزرتا ہے۔'' عورت نے گمبھیر آواز میں کہا۔ آدمی نے دیکھا، سیوریج لائن کی سلیب ٹوٹی ہوئی تھی۔ اندر گہرائی میں تعفن زدہ شور تھا۔

''یہاں سے مین ڈرینج لائن گزرتی ہے۔'' اُس کے ساتھی نے بتایا۔

بوڑھی عورت نے بات کا سرا پکڑا۔ ''بیٹا، برسات میں نالا بھر جاتا ہے۔ گندا پانی ہمارے گھروں میں آجاتا ہے۔''

عورت تنگ سی کوٹھری کی سمت اشارہ کررہی تھی۔ انوار کا دل کٹ گیا۔ خود سے پوچھا۔ ''کیا اس کوٹھری کو گھر کہا جاسکتا ہے؟''

عورت کہتی رہی۔ ''میری بیٹی کا جہیز بھی اس ریلے میں بہہ گیا۔ کتنی تباہی ہوئی۔ دو بچے بھی ادھر ڈوب چکے ہیں۔ ہم چیخے چلائے۔ کتنی درخواستیں دیں، مگر کوئی ہماری فریاد نہیں سنتا۔ سب نے ہمیں بھلا دیا ہے۔''

وہ ہچکیاں لینے لگی۔ ''اگر تم اس کی مرمت کروا سکو...''

اُس کا دل بھینچ گیا۔ ''میں وعدہ تو نہیں کرتا اماں، مگر کوشش کروں گا۔ آپ دعا کریں۔''

لوٹتے سے اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ دل بجھا ہوا تھا۔ انڈیانا میں پیشہ ورانہ ذمے داریاں اس کی منتظر تھیں۔ زندگی مصروف تھی، مگر یہ گھمن گھیری اس کی توجہ نہیں بھٹکا سکی۔

اس نے پھر اپنے دوستوں کو اکٹھا کیا۔ پوری کہانی سنائی۔ ڈرائنگ روم میں کرب کی فضا تھی۔ ہر شخص خود کو جذبات کے طوفان میں گھرا محسوس کررہا تھا۔

''اس کام کے لیے پانچ ہزار ڈالر کی ضرورت پڑے گی۔'' انوار نے کہا۔

یہ بھاری رقم تھی، مگر قدرت اُس کے ساتھ کھڑی تھی۔ نیکی کا جذبہ جیون رتھ سنبھالے ہوئے تھا۔

اسی شام دو ہزار ڈالر اکٹھے ہو گئے۔ اب مزید تین ہزار ڈالر درکار تھے۔

ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اُسے اپنی یونیورسٹی کے ساتھیوں سے رابطہ کرنا چاہیے۔ انوار کا چہرہ کھل گیا۔

اُس نے کراچی کی این ای ڈی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا۔ اس درس گاہ کے قابل طلبا نے جہاں دنیا کے دیگر ممالک میں جھنڈے گاڑے، وہیں امریکا میں بھی خود کو منوایا۔ این ای ڈی سے فارغ التحصیل انجینئروں نے ایک چھوٹی سی تنظیم بنا رکھی تھی۔ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے وسیلے سے وہ رابطے میں رہتے تھے۔

انوار نے یہ تجویز اس پلیٹ فورم پر رکھی، تو ردِعمل حیران کن رہا۔ ضرورت تین ہزار ڈالر کی تھی، مگر ایک ماہ میں اٹھارہ ہزار ڈالر اکٹھے ہو گئے۔

خوش تو وہ بہت ہوا، مگر تھوڑی پریشانی بھی تھی۔ سیوریج لائن کی درستی کی تو صورت نکل آئی، مگر اضافی رقم کا کیا کیا جائے؟

انوار نے اپنے دوستوں کو ایک ای میل کی۔ ''عزیزو، سمجھ نہیں آرہا کس منہ سے میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔ اس نیک مقصد کے لیے تم نے دل کھول کر امداد کی، میرے پاس اٹھارہ ہزار ڈالر اکٹھے ہو گئے ہیں، جو ضرورت سے زیادہ ہیں۔ وہ رقم میں تمہیں واپس کرنا چاہتا ہوں۔''

ای میل روانہ کیے کچھ ہی منٹ گزرے تھے کہ ٹیلی فون بجا۔ دوسری طرف نیویارک میں بیٹھا ایک دوست فہیم شیخ تھا۔

''انوار صاحب، آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔'' لہجے میں تھوڑا شکوہ تھا۔ ''جناب، اگر اضافی رقم جمع ہو گئی ہے، تو اسے کسی اور نیک کام میں صرف کریں۔ شاید بنگلہ دیش کیمپ میں مقیم ہمارے بھائیوں کا کچھ بھلا ہو جائے۔''

بات اس کے دل کو لگی۔ واقعی وہاں تو مسائل کا انبار تھا، صرف سیوریج لائن کو مرمت درکار نہیں تھی، ضرورت تو اس امر کی تھی ان بدنصیبوں کی زندگی کو صحیح ڈگر پر لایا جائے۔ اس رقم کو پناہ گزینوں کی بہتری کے کسی اور منصوبے میں لگایا جا سکتا تھا۔

اسی شام انوار نے ایک تنظیم بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے گھر میں ہونے والی میٹنگ میں ''او بیٹ ہیلپرز'' کے نام پر اتفاق ہوا۔ لفظ OBAT اس کے والدین اور ساس سسر کے ناموں کا مخفف تھا۔

2004 میں انڈیانا میں یہ تنظیم رجسٹر ہوئی۔ جب انوار رجسٹریشن آفس سے گھر لوٹ رہا تھا، بارش کے بعد دھوپ نکل آئی تھی۔ آسمان پر قوس قزح تھا۔

ساٹھ سالہ انوار خان نے زندگی کا نیا مقصد پا لیا تھا۔

☆☆☆☆

''کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں''

عورت کی آواز نے انوار کے قدم پکڑ لیے۔ اس میں بے حد سوز تھا۔ لہجہ ٹھیٹ پنجابی۔ انوار حیران ہوا کہ اس کیمپ میں یہ پنجابی عورت کہاں سے آ گئی۔

اُس نے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک بوڑھی عورت پردہ کھسکا کر باہر آئی۔ اس کی گوری رنگت اور چوڑے کاندھوں کو وقت کے قہر نے نگل لیا تھا۔

''بہن آپ کا تعلق صوبہ پنجاب سے ہے؟''

عورت ایک ٹک اُسے دیکھتی رہی۔ اس روز موسم گرم تھا۔ محکمہ موسمیات نے ہلکی بوندا باندی کی پیش گوئی کی تھی۔

''بہن، آپ یہاں کیسے آئیں؟'' اس نے پوچھا۔

''بھائی، تو میری کہانی سن کر کیا کرے گا۔'' عورت کی آنکھیں جھلملائیں۔ ''اس میں بدبختی ہی بدبختی ہے۔''

عورت ٹھیک ہی کہتی تھی۔ وہ ایک المناک داستان تھی۔

یہ سقوط ڈھاکا سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ وہ ایک بنگالی فوجی افسر سے بیاہی گئی۔ وہ شخص پنجاب میں تعینات تھا۔ عورت آنکھوں میں خواب سجائے پیا گھر سدھار گئی۔ اگلے برس گھر میں قلقاریاں گونج رہی تھیں۔ خدا نے اُسے بیٹی سے نوازا تھا۔ زندگی اپنی ڈگر پر جا رہی تھی کہ اچانک قہر نازل ہوا۔ سقوطِ ڈھاکا کا سانحہ پیش آ گیا۔ اب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے قالب میں ڈھل چکا تھا۔

ایک روز اس کے شوہر نے کہا۔ ''میں اپنے دیس جانا چاہتا ہوں۔''

''اپنا دیس؟'' وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ ''یہ بھی تمہارا ہی دیس ہے۔''

اس نے بحث نہیں کی۔ ''اب میں یہاں اجنبی ہوں۔ مجھے جانا ہو گا۔ کیا تم ساتھ چلو گی؟''

''میں...'' وہ مسکرائی۔ ''تم میرے شوہر ہو، میری تقدیر اب تم سے جڑی ہے۔''

عورت کے ماں باپ اس فیصلے کے خلاف تھے۔ انہوں نے بہت سمجھایا، مگر وہ نہ مانی۔ محبت کی ڈور سے بندھی اپنے شوہر کے ساتھ بنگلہ دیش چلی آئی۔ یہاں اجنبیت کا

آسیب منتظر تھا۔ نئی زبان، نیا ماحول۔ سسرالیوں نے اُسے رد کر دیا۔ انہیں ایک ''پاکستانی'' بہو قبول نہیں تھی۔ اُس نے اپنے حق کے لیے جدوجہد کی، اس گھر میں جگہ بنانے کے جتن کیے، مگر قسمت روٹھ چکی تھی۔ کتنے ہی برس وہ اس مکان میں سانس لیتی رہی، جہاں اس کے لیے نفرت تیر رہی تھی۔ گھر والوں کے سامنے شوہر نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ وہ اُسے نظر انداز کرنے لگا۔

''تم اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے چلی جاؤ۔'' آخر ایک روز اس نے کہہ ہی دیا۔

''چلی جاؤں۔'' عورت کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''مگر کہاں؟''

''اپنے پاکستان۔'' لہجہ سخت تھا۔

''اب میرا وہاں کون ہے۔'' عورت کی آواز میں کرب تھا۔ ''کتنے برس گزر گئے۔ کوئی رابطہ ہی نہیں رہا ان لوگوں سے۔ ماں باپ تو کب کے مرکھپ گئے ہوں گے اور بہن بھائی...''

اس نے دیکھا، آدمی پیٹھ موڑ کر سو چکا تھا۔ وہ بدنصیب اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ ہر سمت تنہائی تھی۔

آخر کار اسی تنہائی کے عفریت نے اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بے کسی کی حالت میں اپنی بیٹی کو لیے غموں کی اُس بستی میں چلی آئی، جہاں اس جیسے لاکھوں محروم انسان زندگی کاٹ رہے تھے۔

''ساری زندگی اِدھر گزری۔ موت بھی یہیں آئے گی۔'' عورت کی آواز رندھ گئی۔ بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔

انوار چپ تھا۔ اس کے دل میں اداسی کی دھند چھائی تھی۔

آخر عورت نے آنسو پونچھے۔ ہاتھ کی اوٹ بنا کر دیکھا۔ ''تم یہاں کے تو نہیں لگتے بھائی۔ کون ہو تم؟''

انوار نے گہرا سانس لیا۔ ''میں... آپ کا بھائی ہوں۔''

عورت کے چہرے پر خوشی کا ظہور ہوا۔ انوار نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور آگے بڑھ گیا۔ امنگوں کا سمندر دل میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سیوریج لائن کی مرمت کے بعد جب وہ لوٹا، تو ذہن میں مستقبل کا خاکہ بن چکا تھا۔

نہ تو سرمائے کی کمی تھی، نہ ہی جذبے کی، لیکن ایک مسئلہ تھا۔ 9/11 کے بعد امریکا میں حالات خاصے بدل گئے تھے۔ یہاں سے بھیجی جانے والی رقم پر گہری نظر رکھی جاتی تھی کہ کہیں وہ دہشت گردی کی ترویج میں تو استعمال نہیں ہو رہی۔ اگر امریکی سرکار کو قائل کر بھی لیا جاتا، تب بھی مشکل حل نہیں ہوتی۔ بنگلہ دیش میں ہر پاکستانی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا

پورا نام انوار اللہ خان۔ اگست 1955 میں عبید اللہ خان کے گھر آنکھ کھولی۔ قابل طالب علم۔ 70ء میں رنگ پور سے میٹرک کیا۔ سقوط کے دو برس بعد خاندان نے کراچی کا رخ کیا۔ معاشی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ٹیوشن پڑھائی۔ ملیر اور لانڈھی کے نوجوانوں کی راہ نمائی کے ارادے سے ماڈل کالونی میں ''کیریر کوچنگ سینٹر'' نامی ٹریننگ اسکول کی بنیاد ڈالی۔ 81ء میں این ای ڈی یونیورسٹی سے مکینیکل انجینئرنگ میں ڈگری لی۔ ابتداً ملازمتیں کیں۔ پھر کاروبار کا تجربہ کیا۔ 84ء میں شادی ہوئی۔ 91ء میں گرین کارڈ مل گیا۔ انڈیانا کی ریاست میں رہائش اختیار کی۔ کچھ عرصے بے روزگاری کا کرب سہا۔ تلخ تجربات سے گزرے۔ پیٹرول پمپ پر کام کرنے کی نوبت آگئی تھی۔ ڈھنگ کی ملازمت ملی، تو تعلیمی سلسلہ پھر بحال ہوگیا۔ ایم بی اے کا مرحلہ طے ہوا۔ پھر جنرل موٹرز جیسے بڑے ادارے سے جڑ گئے۔

سماجی خدمت کے علاوہ ادبی سرگرمیوں نے بھی مصروف رکھا۔ کالج کے زمانے میں خود بھی افسانے لکھے۔ 2005 میں ''انڈیانا بزم ادب'' نامی تنظیم کی بنیاد رکھی، جس کے تحت مشاعروں اور ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کیا۔

تھا، وہاں فلاحی تنظیم چلانا سہل نہیں تھا۔

ایک دوست کے مشورے پر اس نے امریکی سینیٹر، رچرڈ لوگر سے رابطہ کیا۔ یہ وہ ہی صاحب تھے، جن کے ''لوگر بل'' کا ایک زمانے میں پاکستان میں چرچا رہا تھا۔

رچرڈ لوگر سے تو ملاقات نہیں ہو سکی، البتہ ڈھاکا میں تعینات امریکی سفیر سے میٹنگ کا اہتمام ہوگیا۔ یہ بڑی کامیابی تھی۔ انوار پوری تیاری سے گیا۔ وہ جانتا تھا، امریکی تعلیم اور صحت کو کلیدی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ ان شعبوں میں تبدیلی کے بغیر سماج میں بہتری نہیں آسکتی۔

اس نے اپنی پریزنٹیشن میں اس جانب خصوصی توجہ دی۔ اپنے منصوبے سے امریکیوں کو آگاہ کرتے وقت اُس کی آواز میں بجلی کی لپک تھی۔

''کیمپوں کے بچے پڑھنا تو چاہتے ہیں، مگر المیہ یہ ہے کہ محرومیوں کی طویل زندگی نے انہیں سماج سے کاٹ دیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اُن کی پرورش میں کئی خلا رہے ہیں، جس کے باعث وہ آج سرکاری اسکول کا داخلہ ٹیسٹ پاس

کرنے سے قاصر ہیں۔ تو ہمارے پراجیکٹ میں ''پری اسکول'' پہلا قدم ہے۔ایسی چھوٹی سی درس گاہ جہاں اُن بچوں کو داخلہ ٹیسٹ کے لیے تیار کیا جائے۔''

دوسری منزل تھی ٹیوشنگ سینٹرز۔ایک جانب ان سینٹرز کا مقصد ننھے طلبا کی رہنمائی کرنا تھا، وہیں ان بلند حوصلہ نوجوانوں کی بھی معاونت کی جاتی، جو کٹھن حالات کے باوجود کسی نہ کسی طرح بنگلہ دیش کے نظام تعلیم کا حصہ بن گئے تھے۔ انوار کا منصوبہ تھا کہ ان ہی نوجوانوں کو تربیت فراہم کر کے انہیں پری اسکول اور ٹیوشن سینٹرز کی ذمے داری سونپی جائے۔

کیمپوں کے بدقسمت مکینوں کے مالی مسائل پر بھی اس کی گہری نظر تھی۔مرد بے روزگار تھے۔نہ تو ان کے پاس تعلیم تھی، نہ ہی ہنر۔انہیں ہنر مند بنانا ایک طویل منصوبہ تھا، البتہ عورتوں کے سلسلے میں کچھ امکانات تھیں، انہیں سلائی کڑھائی سکھا کر یافت کی کچھ صورت پیدا کی جاسکتی تھی۔

''ان بدحالی بستیوں میں کوئی تعمیراتی معجزہ تو ممکن نہیں، مگر کچھ بیت الخلا تو تعمیر کیے ہی جاسکتے ہیں۔'' انوار نے اپنی تقریر کے اختتام پر کہا۔''اوبیٹ ہیلپرز فقط کمبل اور ادویہ بانٹنے میں دلچسپی نہیں رکھتی، ہمارا مقصد انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنا ہے۔''

امریکیوں نے اس منصوبے کو سراہا، مگر زمینی حقائق پر بھی اُن کی نظر تھی۔اسے براہِ راست کام کرنے کی بجائے کسی مقامی تنظیم سے اشتراک کا مشورہ دیا گیا۔ یوں انوار کا Integrated Services for Development of Children & Mothers (ISDCM) سے رابطہ ہوا، جو یونیسیف کے سابق ملازمین پر مشتمل تھی۔

وہ بھلے لوگ تھے اور تعصب سے بالاتر ہو کر کام کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ کیمپوں میں سدھار کے انہوں نے چھوٹے پیمانے پر کچھ کامیاب تجربات کیے تھے۔

اِس تنظیم کے صدر سے میٹنگ انتہائی خوشگوار رہی۔ انہوں نے اس امریکی انجینئر کو جی کھول کر سراہا، مگر جب معاہدے پر دستخط کے وقت اُس نے اپنی شرط ان کے سامنے رکھی، تو وہ حیران رہ گئے۔

''اوبیٹ ہیلپرز کے منصوبوں کے لیے آپ جو ٹیمیں تشکیل دیں گے، اُن کے لیے افرادی قوت ہم ہی فراہم کریں گے۔'' انوار نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، پھر صدر کی آواز گونجی۔

''کیوں نہیں جناب۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔البتہ یہ پوچھنے کا استحقاق رکھتے ہیں کہ ان ہنر مندوں کو آپ تلاش کہاں کریں گے، آپ تو یہاں اجنبی ہیں؟''

چہرے پر مسکراہٹ تھی۔''ان ہی بدحال بستیوں کے نوجوان آپ کی ٹیموں کا حصہ بنیں گے۔''

صدر آگے کو جھکا۔''میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مسٹر خان۔لیکن وہ نوجوان ہنر مند نہیں۔اس سے ہماری کوششوں کی اثر پذیری گھٹ جائے گی۔''

''بے شک وہ ہنر مند نہیں، مگر ان میں قابلیت کی کمی نہیں۔'' اس نے کرسی سے ٹیک لگا لیا۔''اور جناب، انہیں مرکزی دھارے میں شامل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔اگر آپ جیسے مخلص لوگ ان کی رہنمائی نہیں کریں گے، تو کون کرے گا۔ممکن ہے، شروع میں آپ کو کچھ پریشانی ہو، مگر وہ بہت جلد خود کو اس قابل بنالیں گے کہ آپ کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑے ہوسکیں۔یہی میرا خواب ہے۔''

''تو یہ آپ کا خواب ہے۔'' صدر نے پیپر ویٹ گھمایا۔''تو ٹھیک ہے، ہم آپ کے خواب کو تعبیر دیں گے۔ہاتھ ملائیں۔''

جب انوار ISDCM کے دفتر سے باہر آیا، وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

وہ چھوٹا سا بچہ تھا۔

اس کے ہاتھ میں سلیٹ تھی۔ ایک بوسیدہ سا بستہ کاندھے پر لٹکا تھا۔وہ ننگے پیر آیا تھا۔اس کے پاس جوتے نہیں تھے۔

وہ انوار کے اوّلین پری اسکول کا پہلا طالب علم تھا۔ بچہ متذبذب ضرور تھا، مگر چہرے پر خوشی بھی تھی۔وہ اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا۔عورت کھڑی اپنے لختِ جگر کو دیکھ رہی تھی۔

وہ پری اسکول کیمپ ہی کے ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل تھا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ یہ پردہ وقفے وقفے سے اُٹھتا کہ ننھے فرشتے ایک ایک کر کے اس درسگاہ کی سمت آرہے تھے۔ان کے لباس ان کی بدحال کہانی تو سناتے تھے مگر چہرے اجلے مستقبل کی خبر دیتے تھے۔

جب دوسرا پری اسکول کھلا، تب بھی یہی مناظر دہرائے گئے۔تیسری بار بھی یہی ہوا۔خوشی ننگے پاؤں آتی، ٹاٹ کا پردہ اُٹھتا اور ایک کمرے کے اس اسکول میں روشنی پھیل جاتی۔

ٹیوشن سینٹر کا معاملہ دیگر رہا۔ وہاں نوجوان ٹولوں کی شکل میں پہنچے۔ یہ وہ لڑکے لڑکیاں تھے، جنہوں نے حالات

کے ہاتھوں شکست کھانے سے انکار کر دیا تھا، انہوں نے تعلیم کا راستہ اختیار کیا، سرکاری اسکولوں میں داخلہ لے لیا۔ دورانِ تعلیم انہیں مقامی بچوں کے مقابلے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا کہ اُن کی بنیاد مضبوط نہیں تھی، مگر یہ بس کچھ روز کی بات تھی۔ انوار خان نامی ایک نیک صفت انسان نے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

لڑکے لڑکیاں ٹولے کی صورت آتے۔ ان کے بدن غذا کی کمی کا شکار تو تھے، مگر ان کے دماغ روشن تھے۔ انہوں نے آنکھوں میں سپنے سجا رکھے تھے۔

پری اسکول اور ٹیوشن سینٹرز کی تعداد بڑھتی گئی۔ نتائج حوصلہ افزا ہے۔ پہلی ہی کوشش میں سات بچوں نے پرائمری اسکول کا داخلہ ٹیسٹ پاس کرلیا۔ ٹیوشن سینٹر میں زیرِ تعلیم طلبا و طالبات کے گریڈز میں بھی بہتری آئی۔

جب زمین تیار ہوگئی، تو او بیٹ ہیلپرز کے تحت ایک اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ فنڈز کے لیے امریکا میں مقیم نیک دل مسلمانوں کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ انوار خان نے اپنی تنظیم کی ایک ویب سائٹ بنائی تھی، جہاں ان منصوبوں کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی جاتی۔

لوگوں نے جی کھول کر امداد کی۔ رمضان کے بابرکت مہینے میں اسکول کا افتتاح ہوا۔ کسی نے گرمی یا روزوں کی طوالت کا شکوہ نہیں کیا۔ بچے وہاں کھنچے چلے آئے۔ چاند رات تک وہاں خوشیاں دمکتی رہیں۔

وہ عید، انوار کی زندگی کی سب سے پُر مسرت عید تھی۔ اس نے اپنے طلبا کے ساتھ نماز ادا کی۔ سب سے گلے ملا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں بیٹھ کر گپ شپ کی۔ مقامی مٹھائیوں سے منہ کا ذائقہ بدلا۔

آدمی کا سپنا حقیقت کا روپ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ بھی اس نیک کام میں شریک ہو چکے تھے۔ پہل بیٹی نے کی، جو کیمپ کے نوجوانوں کی سیاسی بنیادوں پر رہنمائی کرنے کا منصوبہ ترتیب دے رہی تھی۔ وہ ایک ''تھنک ٹینک'' بنانا چاہتی تھی۔

نوجوان بڑے متحرک اور بلند حوصلہ ہوتے ہیں۔ ''تھنک ٹینک'' کے قیام کے بعد معروف امریکی اسکالر، جان کلارک سے رابطہ کیا گیا۔ وہ شریف النفس انسان اس منصوبے سے بڑا متاثر ہوا۔

''میرا اہتمام تر تجربہ تمہارے لیے حاضر ہے۔'' اُس کے اُن الفاظ میں بے پناہ خلوص تھا۔

ISDCM سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس نے بھی جلد حقیقت کا روپ اختیار کرلیا۔ کچھ ہی برس میں کیمپوں کے نوجوان اس قابل ہوگئے کہ اس تنظیم کا حصہ بن سکیں۔

پہلے مرحلے میں دس نوجوانوں کو ISDCM میں ملازمت دی گئی۔ ٹیسٹ اور انٹرویوز سے گزرنے والے ان بچوں کی قابلیت نے تنظیم کے صدر کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اس نے انوار کو فون کیا۔

''مسٹر خان، آپ بہت ضدی ہیں۔'' آواز میں شوخی تھی۔ ''جو سوچ لیں، اس پر اڑ جاتے ہیں۔ اور شاید اسی وجہ سے میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔''

''او بیٹ ہیلپرز'' کے کارنامے

بنگلہ دیش کیمپوں میں پھنسے پاکستانیوں کے لیے کام کرنے والی اس فلاحی تنظیم نے فقط کچھ برس میں حیران کن کامیابی حاصل کی، جو انوار خان اور اُن کے ساتھیوں کی مخلصانہ کوششوں اور لگن کا نتیجہ ہے۔

آج اس کے تحت اسکول، ٹیوشن سینٹرز، کمپیوٹر سینٹرز اور خواتین کے تربیتی مراکز سمیت بنگلہ دیش مختلف شہروں میں 60 ادارے کام کررہے ہیں۔ چھ پرائمری اور ایک مڈل اسکول ہے۔ ''پری اسکول'' کی تعداد پچیس ہے، جہاں کیمپوں کے بچوں کو پہلی جماعت کے امتحانات کی تیاری کروائی جاتی ہے۔

دو طبی مراکز بھی ہیں۔ ایک رنگ پور میں، دوسرا سید پور میں۔ اس تنظیم نے کیمپوں میں موتیا کے آپریشن کا سلسلہ بھی شروع کررکھا ہے۔ کچھ برس قبل ایک برطانوی تنظیم کے تعاون سے ایک ہزار آپریشنز کیے۔ گذشتہ برس کشیدہ حالات کے باعث فقط پانچ سو آپریشنز ہوسکے۔ مستقبل میں تنظیم کا اس منصوبے کی توسیع کا ارادہ ہے۔

کیمپوں میں پل کر جوان ہونے والی نسل کے لیے ''تھنک ٹینک'' کی بھی بنیاد رکھی، جس کی دیکھ ریکھ انوار خان کی بیٹی کرتی ہے۔ اس تنظیم کو معروف امریکی اسکالر، جان کلارک کی معاونت حاصل ہے۔ مائیکرو فنانس اسکیم بھی شروع کررکھی ہے۔ 2004 میں قائم ہونے والی اس تنظیم کا سالانہ بجٹ آج ساڑھے تین لاکھ ڈالر ہے، جس کا 90 فی صد حصہ امریکا میں مقیم پاکستانیوں کے عطیات سے پورا ہوتا ہے۔

انوار بھی ہنسا۔ ”مجھے اُمید ہے کہ یہ دس نوجوان آپ کی اُمیدوں پر پورے اتریں گے، مگر یاد رکھیں۔ یہ فقط آغاز ہے۔ یہ معاملہ دس پر نہیں رُکنے والا۔“

وہ درست تھا۔ یہ فقط شروعات تھیں۔ اگلے برس اس تنظیم کو جو درخواستیں موصول ہوئیں، اُن میں سے بیشتر کیمپ کے اُن نوجوانوں نے جمع کروائی تھیں، جنھوں نے بدبختی کو شکست دینے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆☆

”قرضہ؟ قطعی نہیں، یہ برا آئیڈیا ہے۔“

انڈیانا میں برسات کا موسم تھا۔ انوار اپنے دوست کے ساتھ بالکونی میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ یہ شخص اوائل سے اس کے ساتھ تھا۔ ہر مرحلے پر اس کی حوصلہ افزائی کی، مگر وہ اس نئی مائیکروفنانس اسکیم سے بالکل بھی متفق نہیں تھا۔

”اپنی بات کی وضاحت کرو۔“ انوار نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

آدمی نے ہاتھ ملے۔ ”دیکھو دوست۔ وہ اچھے لوگ ہیں، مخلص ہیں۔ مگر یاد رکھو کہ وہ ایک عرصے سے غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اور غربت انسان کو توڑ دیتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ قرضے کی رقم اپنی بھلائی کے لیے استعمال کرسکیں گے۔“

”ہم ان کی رہنمائی کریں گے۔ ہمارے پاس تم جیسے ماہر بینکار ہیں۔“ وہ ہنسا۔

”میری تعریف کا شکریہ۔“ اُس نے ایک مہذب آدمی کی مانند سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”مگر یہ آسان نہیں ہوگا۔ ٹھیک ہے، انھیں ہماری رہنمائی حاصل ہوگی، ممکن ہے وہ رقم کسی اچھے کاروبار میں لگانے میں کامیاب رہیں، مگر اس امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ بیس پچیس فیصد افراد کی رقم ڈوب جائے۔ وہ قرض لوٹا نہ سکیں۔ ہمارا تو نقصان ہوجائے گا ناں۔“

”ہم یہ کام فائدہ کے لیے تھوڑی کررہے ہیں۔“ انوار نے دھیرے سے کہا۔ ”اس کا مقصد ان بدحال انسانوں کی بھلائی ہے۔ اسی ملک میں محمد یونس جیسے شخص نے چھوٹے قرضوں کا تصور متعارف کروا کر لاکھوں افراد کی زندگی بدل دی۔ ہم ایک کوشش تو کرسکتے ہیں عزیز۔“

”ٹھیک ہے پیارے۔“ آدمی نے ہاتھ جھاڑے۔ ”خاکسار تمہارے ساتھ ہے۔“

اوبیٹ ہیلپرز نے 2007 کے وسط میں مائیکروفنانس اسکیم کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے طویل منصوبہ بندی کی گئی۔ اس کی ٹیم نے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ قرضے کی کم سے کم حد پانچ ہزار اور زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ ٹکا تھی۔

یہ تنظیم فقط قرض دینے تک محدود نہیں تھی۔ درخواست گزار کا پہلے انٹرویو کیا جاتا۔ جب اندازہ ہوجاتا کہ وہ رقم کس شعبے میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، تب متعلقہ شعبے کے ماہر اُس کی رہنمائی کرتا۔

کوشش کارگر رہی۔ جن لوگوں نے قرضہ لیا اور اوبیٹ ہیلپرز کے پلان پر عمل کیا، اُن کی زندگی میں واضح بہتری آئی۔ چھوٹے قرضوں سے شروع ہونے والے چھوٹے کاروبار نے انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کردیا۔

انوار مسرور تھا۔ اسے کیمپ کے باسیوں کی ذہانت پر پورا یقین تھا۔ انھوں نے نہ صرف سمجھ داری سے اس رقم کو استعمال کیا، بلکہ مقررہ وقت میں قرضہ لوٹا بھی دیا۔

یوں تو اس مائیکروفنانس اسکیم سے کئی دلوں کو چھو لینے والی کہانیاں جڑی ہیں، مگر ایک عورت نے انوار اور اس کی ٹیم کو حیران کردیا۔

نفیسہ بی بی کے شوہر کا کاروبار ٹھپ ہوچکا تھا۔ ادھار لے کر گزارہ ہورہا تھا۔ اُسے اوبیٹ ہیلپرز کی خبر ملی، تو اس نے بھی قرض کی درخواست جمع کروائی۔ ساری رقم شوہر کو سونپ دی۔ آدمی محنتی تھا۔ جلد حالات بہتر ہونے لگے۔

اس کا لڑکا رنگ ریز تھا۔ ہنرمند تو تھا، مگر معمولی تنخواہ پر اکتفا کرنا پڑتا۔ اپنی دکان کرنے کی استعداد نہیں تھی۔ عورت نے اگلی بار اپنے بیٹے کے لیے قرض لیا۔ لڑکا تیز تھا۔ کچھ روز میں دکان چل پڑی۔

کچھ ماہ بعد جب وہ قرض کی رقم لوٹانے گئی، تو ایک اور درخواست ہاتھ میں تھی۔ جب پوچھا گیا کہ بی بی اب کیا ارادہ ہے، تو کہنے لگی۔ ”بیٹے کا دھندا تو چل پڑا ہے، مگر اس کے پاس رنگ کرنے کی مشین نہیں۔ کرائے پر لیتا ہے۔ اپنی مشین آجائے گی، تو آرڈر بھی زیادہ ملیں گے۔ اسی لیے تیسری بار... آپ کو تکلیف دے رہی ہوں۔“

”ہمیں بھلا کیا تکلیف ہوگی۔“ مینیجر ہنسا۔ ”آپ وقت پر رقم لوٹا دیتی ہیں اور ہمیں کیا چاہیے۔“

بیٹے نے مشین خرید لی۔ کچھ روز گزر گئے۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے عورت کو سوجھا کہ ادھر تو رنگ کا کاروبار زوروں پر ہے، کتنی ہی دکانیں ہیں، مگر ہر رنگ ریز کے پاس مشین نہیں۔ کیوں ناں وہ قرضہ لے کر خود ایک مشین خرید لے۔ کرائے پر دیتی رہے گی۔ جلد ہی قرض اتر جائے گا اور پھر کھرا منافع۔

ترکیب اتنی کارگر ثابت ہوئی کہ عورت نے ایک نہیں.. دو مشینیں خریدلیں۔ اوروں کے مقابلہ میں کم کرایہ وصول کرتی، زیادہ تر دکان دار بڑی بی ہی سے مشین لے جاتے۔

جب انوار کیمپ کے دورے پر آیا، تو عورت ملنے آئی۔ ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا۔ انور کے گلے میں ہار ڈالے۔ دعائیں دیں۔ منہ میٹھا کروایا۔

جب انوار نے اس خوشی کا سبب پوچھا تو عورت نے پوری کہانی سنادی۔

''آپ نے تو کمال کردیا۔'' وہ حیران تھا۔

''کمال میں نے نہیں بیٹا۔'' عورت کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ ''کمال تو تم نے کیا ہے۔ خدا نے تمہیں فرشتہ بنا کر بھیجا ہے ہمارے لیے۔''

انوار کا دل تشکر سے لبریز تھا۔ آسمان پر سنہری کرنیں بکھری تھیں۔ مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ وہ سر جھکا کر مسجد کی سمت چل دیا۔ سجدے کے لیے اس سے بہتر لمحہ کون سے ہوسکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ ایک مخلص سماجی کارکن کے طور پر اپنی شناخت بنا چکا تھا۔ فقط کیمپوں میں محصور بدحال انسان اُس کے احسان مند نہیں تھے، ساتھ کام کرنے والے بنگالی بھی اُسے احترام کی نگاہ سے دیکھتے۔ گو عوامی لیگ کی حکومت نے تعصبات کو ہوا دی، ہمیشہ پاکستان کو تنقید کا نشانہ بنایا، تاہم عوام نے محصورین کے لیے کام کرنے والے اس پاکستانی مصلح کو ہر سطح پر سراہا۔ ہر معاشرے میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں اور انوار کو بنگلہ دیش میں اچھے لوگوں کا ساتھ مل گیا تھا۔

اس نیک انسان کی شہرت پاکستان بھی پہنچی۔ جب وہ اپنے دیس آیا، تو اردو کے ایک مؤقر روزنامے نے اس کا انٹرویو کیا۔ جب انٹرویو نگار نے پوچھا، بنگلہ دیشی عوام کا کیمپ کے محصورین سے متعلق کیا رویہ ہے؟ تو اس نے یوں جواب دیا:

''وہاں کے لوگ بھی اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر یہ قصوروار ہیں بھی، تو انہیں خاصی سزا مل چکی۔ ہمیں وہاں کام کرتے ہوئے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ مقامی افراد کا تعاون بھی حاصل رہا، مگر یہ مسئلہ بے حد حساس ہے۔ مثلاً اگر آپ خود کو پاکستانی کہتے ہیں، تو جو ہمدردی مقامی افراد سے آپ کو مل رہی ہے، آپ اُس سے محروم ہوجائیں گے۔ جماعت اسلامی کے قائدین کی پھانسی کی وجہ سے کشیدگی ضرور ہے، مگر کوئی

پُرتشدد واقعہ پیش نہیں آیا۔“

انٹرویو کے دوران محصورین کی تعداد بھی زیرِ بحث آئی۔ انوار خان کا کہنا تھا۔”حکومتِ بنگلہ دیش نے 92ء میں سروے کیا تھا، جس کے مطابق 65 کیمپوں میں دو لاکھ 56 ہزار افراد مقیم تھے۔ میرے اندازوں کے مطابق اس وقت کیمپوں کی تعداد سو کے قریب اور وہاں پھنسے ہوئے افراد ساڑھے تین لاکھ کے لگ بھگ ہیں، جو انتہائی کرب ناک زندگی گزار رہے ہیں۔ چار عشرے گزر جانے کے باوجود یہ لوگ خود کو پاکستانی کہتے ہیں۔ پاکستان سے محبت رکھتے ہیں، اسی وجہ سے انہیں مشکلات پیش آتی رہیں۔ البتہ نئی نسل بنگلہ دیشی معاشرے کا حصہ بننا چاہتی ہے۔“

انوار خان کا مؤقف ہے کہ اس معاملے میں پاکستانی حکومت کو سنجیدہ کردار ادا کرنا چاہیے، جذباتی بیانات کی بجائے حکمتِ عملی وضع کی جائے۔ محصورین فقط اُمید کے سہارے جی رہے ہیں۔ اگر حکومتِ پاکستان واضح موقف اختیار کرے، انہیں قائل کیا جائے کہ اب انہیں اپنی زندگی بنگلہ دیش میں گزارنی ہے، تو وہ مستقبل سے متعلق بہتر فیصلے کر سکتے ہیں۔ دیگر مسلم ممالک بھی اس مسئلے کو حل کرنے میں مدد کریں، کیونکہ زندگی سے کٹے ہوئے یہ غیر بنگالی، بنگلہ دیش کے لیے بھی پریشانی کا باعث ہیں۔

مشکلات کے باوجود انوار خان مایوس نہیں۔ اس کی ایک وجہ بنگلہ دیش کی بدلتی سیاسی ترجیحات بھی ہیں۔ اپنے انٹرویو میں اُس نے اِس پہلو کی بھی نشان دہی کی۔”دراصل وہاں کی سیاسی پارٹیاں خواہش رکھتی ہیں کہ بہاری یا غیر بنگالیوں کو ووٹ کا حق دیا جائے، کیونکہ اپنی تعداد کے باعث انتخابات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ 2008 میں بنگلہ دیش کے ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ 71ء کے بعد کیمپوں میں پیدا ہونے والے افراد اگر درخواست دیں، تو انہیں شہریت دی جائے۔ سیاسی جماعتوں نے اس ضمن میں کام کیا۔ کیمپوں میں جا کر ووٹرز رجسٹریشن کروائی۔ اِس سے کیمپ والوں کو فائدہ ہوا۔ البتہ جس شخص کا ایڈریس کیمپ کا ہے، اُس کا پاسپورٹ نہیں بنے گا۔ یعنی آپ اسے مکمل شہریت نہیں کہہ سکتے۔“

☆☆☆☆

تو یہ انوار کی کہانی ہے۔

ایک حیران کن کہانی، جس کا آغاز انڈیا نا پر اترنے والی سہ پہر ہوا، جب درخت چپ کھڑے تھے اور میز پر کاغذوں کا پلندہ دھرا تھا۔ اُن میں حزنیہ قید تھا۔

انوار اور اس کے ساتھی اپنے مشن کی تکمیل میں جُتے ہیں۔ اُن کی کہانی تو جاری ہے۔ البتہ اِس تحریر کو ختم کرنے کے لیے ابو قاسم کی کہانی ایک عمدہ انتخاب ہو سکتی ہے۔

ابو قاسم رنگ پور کیمپ کا باسی تھا۔ مصائب میں گھرے اس دبلے پتلے لڑکے کو ایک شام ادراک ہوا کہ فقط تعلیم ہی اُس کے مسائل حل کر سکتی ہے۔

اُس وقت او بیٹ ہیلپرز نے ٹیوشن سینٹروں کا سلسلہ کر دیا تھا، جہاں کیمپوں کے وہ لڑکے لڑکیاں تدریسی ذمّے داریاں نبھا رہے تھے، جو میٹرک کا مرحلہ طے کر چکے تھے۔

جب ابو قاسم نے رنگ پور کے ٹیوشن سینٹر میں قدم رکھا، وہ آٹھویں کا طالب علم تھا۔ انوار نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ دھان پان سا لڑکا بہت قابل ہے، بس تھوڑی اعتماد کی کمی ہے، اگر صحیح رہنمائی کی جائے، تو کئی کارنامے انجام دے سکتا۔ اس نے ٹیوشن سینٹر کے اساتذہ کو ہدایت کی کہ لڑکے کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا جائے۔

ابو قاسم ایک غریب آدمی کا بیٹا تھا۔ بھرا پُرا گھرانا۔ وہ اس کی فیس برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی صلاحیتیں دیکھتے ہوئے او بیٹ ہیلپرز نے اُسے اسکالرشپ دینے کا فیصلہ کیا۔ لڑکے نے مایوس نہیں کیا۔ اس نے زندگی کے تمام موسم کتابوں کو سونپ دیے۔ ہمہ وقت مطالعے میں غرق رہتا۔

کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ قدرت راستے کھولتی چلی گئی۔ اور پھر وہ دن آیا، جب کیمپ کا یہ مکین میڈیکل کالج کا داخلہ ٹیسٹ دینے روانہ ہوا۔ اس کی چال میں اعتماد تھا.... بادل اس پر سایہ کرتا تھا۔

پورا کیمپ اس کے لیے دعا گو تھا۔ محروم انسانوں کی پکار نے آسمان پر دستک دی، تو رحمت کا دروازہ کھل گیا۔

جب ٹیسٹ میں پاس ہونے والوں کی لسٹ لگی، تو اس میں ابو قاسم کا بھی نام بھی تھا۔

یہ ایک اَن ہونا واقعہ تھا۔ شہر میں ہلچل مچ گئی۔ خبر نے اخبارات کی توجہ حاصل کی۔ ابو قاسم کی کہانی گھر گھر پہنچ گئی۔

یہ توجہ اور شہرت بے سبب نہیں تھی۔ 42 برسوں میں پہلا موقع تھا، جب کیمپوں میں مقیم کوئی غیر بنگالی میڈیکل ڈاکٹر بننے جا رہا تھا... تبدیلی آ چکی تھی۔

جب ایک رپورٹر نے انوار کی رائے جاننی چاہی، تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔”یہ تو فقط آغاز ہے۔ کل اِن کیمپوں سے کئی ڈاکٹر اور انجینئر پیدا ہوں گے۔“

منی نہیں گیتا

اختر بلوچ

ایدھی سینٹر کراچی میں گیارہ سال قبل پناہ لینے آئی گونگی بچی اب شادی کی عمر تک پہنچ چکی ہے مگر واپس بھارت جانے کا خوب بھلا نہیں پائی ہے، غلطی سے پاکستان آنے والی ٹرین میں سوار ہو کر لاہور پہنچنے کے بعد سے وہ ماں باپ کو یاد کررہی ہے۔ عبدالستار ایدھی بھی اسے اپنوں سے ملا دینے کی سرتوڑ کوشش کررہے ہیں مگر بھارتی حکومت کی نااہلی کہ اس کی کہانی تو "لیک" کرا دی اور اس کہانی پر فلم بھی بن گئی لیکن گیتا اپنے والدین کے لیے اب بھی تڑپ رہی ہے۔

[illegible] گیتا کب گھر پہنچے گی

کراچی کے علاقے میٹھادر کو کاروباری علاقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہمہ وقت یہاں کھویا سے کھویا چلتا ہے لیکن تعطیل کے دن اس علاقے میں خاصا سکون ہوتا ہے۔ اس دن میٹھادر کے علاقے میں آپ خاصے آرام کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ عام دنوں میں کوئی باہر والا تو کیا ہے۔ علاقہ مکینوں کو بھی 11 بجے سے پہلے کہیں جانے کے لیے گھروں

سے روانہ ہونا پڑتا ہے اور گھر لوٹنے کے لیے رات 8 بجے یا اس کے بعد کا وقت مناسب سمجھا جاتا ہے۔ پھر بھی ہم یہاں چلے آئے تھے کیونکہ کام بہت اہم تھا۔ دراصل ہمیں میٹھادر میں ایک ایسے مندر کی تلاش تھی جو ایک مسلمان کے گھر میں ہے۔ وہاں نہ صرف مندر موجود ہے بلکہ اس کی رکشا (حفاظت) بھی کی جاتی ہے۔ مندر میں پوجا کرنے والی صرف ایک لڑکی ہے۔ گھر کے باقی سب مکین مسلمان ہیں۔ پکے نمازی ہیں۔ حج بھی کر چکے ہیں۔

اس علاقے میں ہم بھٹکتے ہوئے گلیوں میں پھرتے پھرتے ایک سڑک پر آ نکلے وہاں ہمیں ایک بزرگوار نظر آئے۔ ہم نے ان سے دریافت کیا کہ یہاں پر کسی مسلمان کے گھر میں کوئی مندر ہے؟ تو وہ جواباً بولے ”بھئی مسلمان کے گھر میں مندر کا تو مجھے کچھ پتا نہیں لیکن بمبے (بمبئی) بازار کے نکڑ پر ”اچھی قبر“ کے ساتھ ہنومان کا مندر ہے“۔ وہ مزید بولے ”ہاں ہاں یہ باجو والی گلی (بازو والی گلی) میں مولانا کا دفتر ہے۔ اُسی کو پتا ہوگا۔ اس کو اکھا ایلا کا (پورے علاقے) کا کھبر رکھتا ہے۔“

میں نے پوچھا کون سے مولانا؟

بزرگ نے میری جانب ناگوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ”ابھی تو میٹھادر آیا ہے تیرے کو مولانا کا نئیں معلوم؟ ارے بھائی ایدھی صاحب۔ ادھری تمہارے کو پتا چلے گا۔ ان کا اوفس (آفس) باجو والی گلی میں ہے۔“

ہم گلی میں پہنچے۔ مجھے مندر کی تلاش تھی۔ یہ ایک مختصر سی گلی تھی جس کے اختتام پر ایک سہ منزلہ عمارت تھی جس پر ایدھی فاؤنڈیشن لکھا ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جس کی شہرت پوری دنیا میں ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی بڑا واقعہ رونما ہوا ہو، یہیں سے امداد جاتی ہے۔ پاکستان بھر میں کوئی سانحہ ہو اسی بلڈنگ سے امداد روانہ ہوتی ہے۔ یہیں غریبوں، بے سہارا لوگوں کا مسیحا رہتا ہے۔

ہم عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ مولانا ایدھی کے سب سے چھوٹے بیٹے فیصل ایدھی اور ان کی والدہ بلقیس ایدھی اس عمارت کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ مولانا ایدھی، بلقیس ایدھی اور فیصل ایدھی اسی عمارت میں رہائش پذیر ہیں۔ اندر جاتے ہی ہم نے مندر کے بارے میں سوال کیا تو معلوم ہوا کہ ہم جس عمارت کو ڈھونڈ رہے تھے وہ یہی ہے اور یہیں وہ مندر ہے۔ مذکورہ مندر عمارت کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں ہے۔ لیکن گھر والے ہوں یا باہر والے، کوئی یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ مندر میں جوتوں سمیت اندر داخل ہو جائے۔ اگر کوئی نادانستگی میں بھی ایسا کرے تو گھر کی مالکن اسے فوراً یہ کہتی ہے کہ ”بھائی یہ جوتے اتارو۔ ہماری بیٹی بہت برا مانتی ہے“۔

یہ خاتون کوئی اور نہیں بلکہ سماجی خدمات میں اپنا آپ منوانے والے عبدالستار ایدھی کی اہلیہ بلقیس ایدھی ہیں۔ انہیں اگر سماجی خدمات کے حوالے سے خاتونِ اوّل کہا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ انہوں نے ایدھی صاحب کے ساتھ 70 کی دہائی میں بذریعہ سڑک حج کیا تھا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ انہیں اپنے گھر میں مندر بنانا پڑا۔ میرا سوال... سن کر بلقیس ایدھی مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”میں نے یہ مندر گیتا کے لیے بنوایا ہے۔ گیتا جو ہے نا وہ گیارہ سال پہلے ہمارے پاس آئی تھی، لاہور کے بارڈر سے۔ ابھی اس کی جو عمر تھی نا، وہ گیارہ سال کی تھی۔ یہ جو ہے نا ابھی گونگی ہے اور بہری بھی ہے۔ یہ جبھی آئی تھی نا تو اس کی حرکتوں سے پتا چلا کہ یہ مسلمان نہیں ہے۔ وہ اشارے سے ماتھے پر تلک لگاتی تھی۔ پھر آرتی اتارنے کا اشارہ بھی کرتی تھی۔ میں سمجھ گئی یہ مسلمان نہیں ہندو ہے۔ بس میں نے ایدھی فاؤنڈیشن کی تیسری منزل پر اس کو مندر بنا کے دیا۔“ بلقیس ایدھی اپنے مخصوص لہجے میں بتا رہی تھیں۔ پھر وہ سانس لینے کو رکیں اور دوبارہ سے سلسلۂ کلام کو جوڑا۔ ”ابھی یہ روز روز مندر میں جاتی ہے اور پوجا کرتی ہے۔ میرے ساتھ اشاروں میں بات بھی کرتی ہے۔ میں نے بہت سوچا کہ یہاں پر ہی اس کی شادی بھی ہو جائے۔ میں اس کے سامنے اشاروں میں ہاتھوں سے ماتھے پر سیندور لگانے کا اشارہ کرتی ہوں لیکن وہ اپنے بائیں ہاتھ سے ایک اشارہ کرتی ہے اور اپنے ہاتھ کو نیچے سے اوپر لے جاتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ہوائی جہاز۔ پھر وہ اشاروں میں اپنے ماتھے پر سیندور سجاتی ہے۔ پھر شادی کے پھیرے لگانے کا بھی اشارہ کرتی ہے۔“

بلقیس ایدھی بڑی دلچسپی سے اس گونگی بہری بچی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ ان کی باتوں سے ممتا جھلک رہی تھی۔ ایک انجان لڑکی جس کا وطن بھی دوسرا ہے جو مسلمان بھی نہیں ہے پھر بھی وہ رس محبت بھرے انداز میں بتا رہی تھیں جیسے وہ ان کی سگی بیٹی ہو۔ انہوں نے بتایا۔ ”انڈیا والوں سے بھی بات ہوئی ہے لیکن سفارت خانے والے کہتے ہیں کہ اگر یہ لڑکی دوبارہ انڈیا گئی تو فارن ایکٹ کے

تحت گرفتار ہو جائے گی۔ پہلے ہم تحقیق کریں گے کہ یہ واقعی ہندوستانی ہے بھی یا نہیں۔ اب پتا نہیں کب تحقیق مکمل ہو۔ میں ادھر رشتہ تو ڈھونڈ رہی ہوں لیکن یہ مانتی ہی نہیں۔ بس اشارہ کرتی ہے جہاز کا پھر اپنے اندازے کے مطابق انڈیا کا رُخ کرتی ہے، سیندور بھی لگاتی ہے اور شادی کے پھیروں کا اشارہ بھی کرتی ہے۔"

ابھی بلقیس ایدھی سے ہماری بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ فیصل ایدھی نے ہم سے کہا کہ "ارے اختر بھائی 2 بجے انڈیا کے پکڑے ہوئے ماہی گیروں کو واپس جانا ہے۔"

پھر انہوں نے ایک نوجوان کو کہا بھائی وہ 5 ہزار نی کس کے لفافے جلدی بنوالیں۔

ہم نے فیصل سے کہا کہ یار ابھی تو 12.30 ہیں۔ دو بجنے میں ابھی دیر ہے۔

فیصل بولے بھائی 163 لوگ ہیں اور سب کو پیسے دینے ہیں۔ اگر ایک منٹ ایک بندے پر لگاؤ تو پورے دو گھنٹے لگتے ہیں۔

ہم نے کہا 'چلو پھر آئیں گے۔'

فیصل نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بتایا کہ یہ جو فلم بجرنگی بھائی جان بنی ہے وہ اسی بچی گیتا کی کہانی پر بنی ہے۔

ہم نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو انہوں نے بتایا کہ وہ گزشتہ ایک طویل عرصے سے انڈین حکومت اور انڈیا کی غیر سرکاری تنظیموں سے رابطے میں ہیں۔ لیکن اب تک کچھ نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسٹوری آہستہ آہستہ لیک ہوئی اور ان تک پہنچ گئی۔ پھر اس پر فلم بن گئی۔ ہمارے یہاں تو یہ اصل شکل میں گیتا کی صورت میں موجود ہے۔ اب گیتا کی اسٹوری کو کیش کرانے بھی کچھ سماجی کارکن میدان میں آگئے ہیں لیکن ان کا مقصد صرف نام کمانا ہے۔

ہم باہر نکل رہے تھے کہ بلقیس ایدھی نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا کہ گیتا نماز بھی پڑھتی ہے۔

ہمارا اگلا سوال یہ تھا کہ نماز اس نے کیسے سیکھی؟

بلقیس ایدھی نے بتایا۔ "بچوں کی ایدھی فاؤنڈیشن میں رہائش پذیر بچیوں اور خواتین کارکن کی اکثریت مسلمان ہے اور فاؤنڈیشن میں نماز کے اوقات میں نماز بھی ادا کرتی ہیں تو ان کو دیکھتے دیکھتے گیتا نے بھی نماز شروع کر دی۔ لیکن نماز کے بعد وہ اپنے چھوٹے سے مندر میں پوجا بھی ضرور کرتی ہے۔ فاؤنڈیشن میں رہنے والی تمام بچیاں اس کے مندر کا احترام کرتی ہیں۔" پھر بلقیس ایدھی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اب یہ جوان ہوگئی ہے۔ میں تو چاہتی ہوں ادھر ہی اس کی شادی ہو جائے۔ لیکن کیا کروں اس کی زبان تو صرف میں ہی سمجھتی ہوں۔ اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہاں انڈیا میں اس کا باپ بہت امیر ہے۔ اس لیے وہ اشارے سے مجھے کہتی ہے کہ وہ جہاز پر انڈیا جائے گی۔ ابھی انڈیا والوں سے بات ہو رہی ہے۔ میری بچی یہاں رہے گی یا وہاں اس کا فیصلہ کیسے ہوگا۔ میں بس یہی سوچتی رہتی ہوں۔"

ہم شکستہ دل کے ساتھ ایدھی فاؤنڈیشن کی تیسری منزل سے اتر آئے۔

مجھے گیتا کی کہانی بہت مزیدار لگی۔ لیکن پھر میں سوچنے لگا کہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں تو بلقیس ایدھی نے اپنے گھر میں مندر بنایا، ایک گونگی اور بہری بچی کے لیے۔ پھر اس کے لیے اشاروں کی زبان سیکھی۔ ہوسکتا ہے کہ انڈیا میں بھی کچھ ایسے لوگ ہوں جن کے سینے میں ایدھی اور بلقیس ایدھی جیسا ممتا کے جذبے سے لبریز دل ہو۔ سرحد کے اس پار اور اس پار بے شمار گیتائیں اور منّی ہیں جو کہ کسی بلقیس ایدھی، فیصل ایدھی اور ایسی ہی کسی اور شخصیت کا انتظار کرتی ہوں جو ان کی اسٹوری پر فلم بنانے

ملک ملک کے دلچسپ قوانین

☆ کیرولینا میں عدالت کی سیڑھیوں پر اتوار کے دن اپنی بیوی کو مارنا جائز ہے۔ یہ کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا (میرا خیال ہے کہ بہت سے دل جلے شوہر اتوار کے دن کا انتظار کر کے کسی نہ کسی بہانے بیوی کو عدالت کی سیڑھیوں تک لے جاتے ہوں گے)

☆ ڈمنی سی میں گہری نیند کے عالم میں گاڑی چلانا جرم ہے۔ (ان سے پوچھنا پڑے گا کہ نیند کے عالم میں گاڑی چلانے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟)

☆ نیویارک میں بلند عمارت سے کودنا جرم ہے۔ اس پر جرمانہ ہوجاتا ہے۔ (اگر وہ زندہ رہا تب تو)۔

☆ پنسلوانیا ہی کا ایک دلچسپ قانون۔ ہم میں اکثر نے اپنے بچپن میں یہ کھیل کھیلا ہوگا۔ نوٹ کو دھاگے سے باندھ کر سڑک پر ڈال دیتے ہیں اور دھاگے کا دوسرا سرا لے کر کہیں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص نوٹ کو دیکھ کر اس کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھے تو دھاگے کو کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ یاد آیا؟ تو وہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اگر آپ نے نوٹ کو کھینچنا شروع کیا تو یہ جرم ہے۔ اس کو اٹھانے دیں کیوں کہ یہ اس کا حق ہے۔

☆ نیویارک کے ریسٹوران میں اگر سینڈوچ چکن، میونیز کا بنا ہوا ہے تو آپ اسے بیف سینڈوچ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک جرم ہے۔ (شاید یہ دھوکا دہی میں آتا ہو)۔

☆ سان فرانسسکو میں آپ اپنی گاڑی کے شیشے اس انڈرویر سے صاف نہیں کرسکتے جس کو آپ استعمال کر چکے ہیں۔

☆ فرانس میں غیر انسانی چہروں کی گڑیائیں اور گڈے فروخت کرنا جرم ہے۔ جیسے ای ٹی ڈول، وغیرہ۔

☆ لوسیانا میں اگر جھگڑے کے دوران میں آپ نے اگر کسی کو اپنے فطری یعنی پیدائشی دانتوں سے کاٹ لیا تو یہ کوئی اتنا بڑا جرم تصور نہیں کیا جاتا لیکن اگر آپ نے مصنوعی دانتوں سے کاٹا ہے تو یہ ایک بڑا جرم ہے۔ (انتباہ۔ نقلی دانتوں والے لوسیانا جا کر جھگڑا نہ کریں)۔

☆ سوئٹزرلینڈ میں رات دس کے بعد کسی شخص کا کسی جگہ اپنے آپ کو ریلیکس کرنا منع ہے۔

☆ نکوریڈا میں شام چھ بجے کے بعد کسی عوامی مقام پر جماہی لینا منع ہے۔ سوائے جمعرات کے۔

☆ میساچوسٹس میں اگر کوئی شخص نہائے بغیر بستر پر لیٹ جائے تو کوئی بھی پولیس کو فون کر کے اس کو گرفتار کرواسکتا ہے۔

مرسلہ: فہیم الدین عطاری۔ فیصل آباد

کے لیے نہیں بلکہ بچھڑے ہوؤں کے ملانے کا کام کرتے ہوں۔

ہم یہ تحریر مکمل کرنے سے کچھ دن پہلے بھی فیصل ایدھی سے ملنے کے لیے ایدھی فاؤنڈیشن گئے تھے۔ وہیں گیتا سے ہماری ایک سرسری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اس وقت ہم نے سوچا کہ گیتا کی کہانی لکھنے اور سمجھنے کے لیے ایک طویل وقت درکار ہے۔ خیر چند روز بعد ہم جب گیتا کا انٹرویو کرنے پہنچے تو اس نے مسکراتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے ایک دائرہ سا بنایا اور پیشانی پر ہلکا سا ہاتھ مارتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑی ایک بلوچ لڑکی کی طرف دیکھا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ میرے متعلق کچھ کہہ رہی ہے۔ میں نے اس لڑکی سے پوچھا کہ گیتا کیا کہہ رہی ہے؟

اس نے ہنستے ہوئے بتایا کہ گیتا کہہ رہی ہے ''یہ پھر آگیا''۔ اس کے بعد گیتا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پنڈلیاں دبا کر بھی ایک مخصوص اشارہ کیا۔

میں نے پھر بلوچ لڑکی سے پوچھا اب کیا کہا ہے؟ تو اس نے بتایا کہ گیتا کہہ رہی ہے کہ وہ سیڑھیاں چڑھتے اترتے تھک گئی ہے اور اس کے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔

بلوچ لڑکی کے مطابق جب سے گیتا کی کہانی منظرِ عام پر آئی ہے تو ٹی وی چینلز اور صحافیوں کی آمد و رفت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے جس کی وجہ سے اسے بار بار تیسری منزل سے گراؤنڈ فلور پر آنا پڑتا ہے۔ اس موقعے پر عبدالستار ایدھی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ گوکہ ان دنوں وہ سخت علیل ہیں پھر بھی وہ خاصے ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ ہم نے ان کی خیریت دریافت کی تو انہوں نے مسکرا کر کہا ''سو سال کا ہوگیا ہوں۔ بس سب ٹھیک ہے۔''

اس عمارت سے باہر آنے کے بعد بھی میں گیتا کے بارے میں سوچتا رہا کہ پتا نہیں اس ''منی'' کو کب اس کے والدین ملیں گے۔ کب یہ اپنوں کے درمیان پہنچے گی۔ سلمان خان نے تو اپنی ''منی'' کی کہانی پر فلم بنا کر کروڑوں روپے کما لیے، کیا اسی ''منی'' کی ڈولتی کشتی کو بھی کنارا ملے گا یا پھر یہ اسی طرح ایدھی سینٹر میں زندگی گزارتی رہ جائے گی۔

ستمبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

عیسوی سن کے اس نویں مہینے میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوئے جو کئی معنوں میں اہم ہیں۔ ان میں سے چند اہم واقعات، اس ماہ سے جڑی چند اہم شخصیات کا مختصر مختصر تعارف تاکہ معلومات جمع کرنے والے باذوق قارئین کی تشنگی مٹ سکے۔

قائداعظم محمد علی جناح

تاریخ کا دھارا بدلنے کی صلاحیت بہت کم انسانوں میں ہوتی ہے، کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی جدوجہد نقشہ تبدیل کر ڈالتی ہے اور ایسے انسان کمیاب ہیں جن کی عظمت ایک نئی ریاست کو جنم دے، ایک نئی قوم وجود میں آئے۔ قائداعظم محمد علی جناح ایسی ہی شخصیت تھے۔

بیسویں صدی کے چوٹی کے سیاست دانوں کا تذکرہ ہو تو محمد علی جناح کا نام سرفہرست ہوگا۔ اس معتبر رہنما نے برصغیر کے مسلمانوں کو غلامی کی زنجیر سے نجات دلائی۔ پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ایک خودمختار ریاست ابھری، جس نے اپنے قائد کے رہنما اصولوں پر عمل کرتے ہوئے جلد ہی خطے کی سیاست میں نمایاں مقام حاصل کرلیا۔ قائداعظم نے نہ صرف پاک و ہند کے مسلمانوں، بلکہ پوری مسلم امہ کو اپنے افکار سے متاثر کیا۔ نہ صرف اپنوں، بلکہ غیروں نے بھی اُنہیں شان دار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے 25 دسمبر 1876ء کو کراچی کے ایک تاجر پونجا جناح کے گھر آنکھ کھولی۔ وہ ایک قابل طالب علم تھے۔ سندھ مدرستہ الاسلام سمیت مختلف درس گاہوں میں زیرِ تعلیم رہے۔ 16 برس کی عمر میں میٹرک کرنے کے بعد وہ ملازمت کے سلسلے میں برطانیہ چلے گئے۔ وہاں حصول علم کی خواہش نے زور مارا تو ملازمت چھوڑ کر Lincoln's Inn میں داخلہ لے لیا اور برطانیہ سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے والے کم عمر ترین ہندوستانی کا اعزاز اپنے نام کیا۔ اسی زمانے میں سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی۔ ہندوستانیوں، بالخصوص مسلمانوں سے برطانوی سرکار کے امتیازی سلوک کے باعث اُن کے ذہن میں ایک آئین ساز خودمختار ریاست کا تصور پنپنے لگا۔
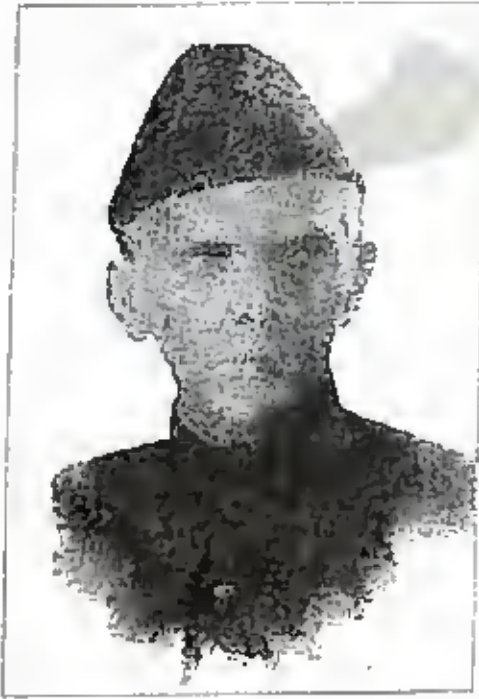
لوٹنے کے بعد انہوں نے بمبئی میں پریکٹس شروع کی۔ جلد ان کا شمار شہر کے نمایاں وکلا میں ہونے لگا۔ 1896ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس میں

شمولیت اختیار کرلی، تاہم گاندھی جی کی ہندو پرست سوچ نے انہیں کچھ عشروں بعد کانگریس چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

اوائل میں انہوں نے 1906ء میں قائم ہونے والی مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنے سے اجتناب برتا، ان کے ذہن میں آزاد ہندوستان کا تصور تھا، مگر معروضی حالات کا تجزیہ انہیں اس جماعت کے قریب لے آیا۔ 1916ء میں انہیں مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ہونے والے میثاق لکھنؤ کے معمار تھے۔ انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا گیا۔ 1929ء میں انہوں نے نہرو رپورٹ کے جواب میں اپنے تاریخ ساز چودہ نکات پیش کیے، جنہیں چند مورخین تحریک پاکستان کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

کچھ عرصے وہ سیاست سے کنارہ کش ہو کر برطانیہ میں پریکٹس کرتے رہے، مگر پھر مسلم راہ نماؤں کی درخواست، خصوصاً علامہ اقبال کی کوششوں کے بعد ہندوستان لوٹ آئے۔ ان کی آمد نے پارٹی میں نئی روح پھونکی۔ گو 1937ء کے انتخاب میں مسلم لیگ بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکی، مگر اس نے وہ راہ پالی تھی جو اسے عظیم منزل کی سمت لے جانے والی تھی۔

انہوں نے 1940ء کی قرارداد پاکستان (قرارداد لاہور) کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کی جدوجہد شروع کی۔ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے مسلمان اکثریتی علاقوں کی بیش تر نشستوں پر کامیابی حاصل کی اور قیام پاکستان کے لیے براہ راست جدوجہد کی مہم کا آغاز کردیا گیا۔ آخر کار برطانیہ کو آزادی کے مطالبے کو تسلیم کرنا پڑا۔

اُن کے اعتماد اور قابلیت نے نہ صرف برصغیر کو برطانیہ سے آزادی دلانے میں کلیدی کردار ادا کیا، بلکہ مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست بھی ان ہی کی مخلصانہ کوششوں کا ثمر تھی۔ محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔ بیماری کے باوجود لاکھوں پناہ گزینوں کی آبادکاری، ملک کی داخلی و خارجی پالیسی، تحفظ اور معاشی ترقی کے لیے انہوں نے دن رات ایک کردیا۔ پاکستانی عوام نے انہیں قائد اعظم اور بابائے قوم قرار دیا۔ 11 ستمبر 1948ء کو اس نابغۂ روزگار شخص کا کراچی میں انتقال ہوا۔

سرفراز احمد رفیقی

ستارۂ جرأت اور ہلال جرأت سے نوازے جانے

والے 1965ء کی جنگ کے ہیرو اسکوڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی ایک دلیر اور قابل تقلید انسان تھے۔

وہ 18 جولائی 1935ء کو راج شاہی، مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئے۔

انہوں نے لاہور سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کا مرحلہ گورنمنٹ ہائی اسکول، ملتان سے طے کیا۔ والد کے تبادلے کے باعث وہ کراچی آگئے اور ڈی جے سائنس کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہیں پرواز کا شوق پروان چڑھا۔ تربیتی زمانے میں ان کی کارکردگی شان دار رہی۔ انہوں نے 1953ء میں رسالپور کے RPAF کالج سے گریجویشن کیا اور اس دوران بہترین پائلٹ کا اعزاز اپنے نام کیا۔ امریکا سے بھی پرواز کے خصوصی کورسز کیے۔ برطانیہ میں تربیتی زمانہ گزرا۔ 1962ء میں پاکستان آنے کے بعد وہ ڈھاکا میں تعینات 14 اسکوڈرن کا حصہ بنے۔ 1965ء کی جنگ میں انہوں نے اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ یکم ستمبر کو جب دشمن کے چار لڑاکا طیاروں نے پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کی، تو انہوں نے انتہائی پھرتی اور چابک دستی سے انہیں نجم کانے لگا دیا۔ 6 ستمبر کے فضائی معرکے کے دوران انہوں نے ڈٹ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اس دوران ان کے طیارے میں آگ لگ گئی، مگر جام شہادت نوش کرنے سے قبل یہ بہادر سپاہی کئی دشمنوں کو واصل جہنم کرچکا تھا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ایسی علمی شخصیات شاذ ہی جنم لیتی ہیں جو نہ صرف مقبول اور قابل احترام ٹھہریں، بلکہ اپنے افکار سے پورے ایک عہد کو متاثر کریں۔ 25 ستمبر 1903ء کو اورنگ آباد، دکن میں خواجہ قطب الدین مودود چشتی کے خانوادے میں ایسا ہی ایک فرد پیدا ہوا جسے دنیا جماعت اسلامی کے بانی کے طور پر جانتی ہے۔ یہ تھے بیسویں صدی کے مؤثر ترین اسلامی مفکرین میں سے ایک مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، جن کی فکر اور تصانیف نے برصغیر سمیت پوری مسلم دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ کچھ حلقے ان کا موازنہ اخوان المسلمون کے بانی شیخ حسن البنا سے

کرتے ہیں۔

مودودی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن سے حاصل کی۔ انہوں نے قلم کو اظہار کے ساتھ روزگار کا بھی ذریعہ بنایا۔ صحافت کے پیشے کا انتخاب کیا۔ مدینہ (بجنور)، تاج (جبل پور) اور جمعیت علمائے ہند کے روزنامے ''الجمعیت'' کی ادارت سنبھالی۔ 1925ء میں جب جمعیت علمائے ہند نے کانگریس کے ساتھ اشتراک کا فیصلہ کیا تو سید مودودی .... بطور احتجاج اس اخبار سے علیحدہ ہو گئے۔

شدھی تحریک کی وجہ سے ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے اور اسلامی ... تصورِ جہاد پر تنقید کی جانے لگی، تو 24 سالہ سید مودودی نے ''الجہاد فی الاسلام'' نامی کتاب لکھ کر اس تنقید کا مدلل جواب دیا۔ اس کتاب نے جن افراد کو متاثر کیا، ان میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ 1932ء میں انہوں نے حیدرآباد دکن سے اپنا رسالہ ''ترجمان القرآن'' شروع کیا۔

ہندوستان کے کئی علما متحدہ قومیت کی تحریک سے متاثر ہو کر کانگریس کے ساتھ جا کھڑے ہوئے تو انہوں نے اس نظریے کے خلاف مضامین لکھے۔ کانگریس پر کڑی تنقید کرتے ہوئے مسلمانوں کو خبردار کیا۔ یہ مضامین ''مسئلہ قومیت'' اور ''مسلمان اور موجودہ کشمکش'' کے زیرِ عنوان کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

کچھ محققین کے مطابق مولانا مودودی علامہ اقبال کی دعوت پر حیدرآباد چھوڑ کر 1938ء میں پنجاب چلے آئے اور اس خطے کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ مسلم لیگ، یوپی نے اسلامی نظام مملکت کا خاکہ تیار کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی، وہ اس میں شامل تھے۔

1941ء میں لاہور میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی، وہ اس کے پہلے سربراہ منتخب ہوئے۔ تقسیم کے بعد انہوں نے پاکستان میں قیام کیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کا پاکستانی سیاست میں کلیدی کردار تھا۔ اکتوبر 1948ء میں انہیں اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبے پر پہلی بار گرفتار کیا گیا۔ ڈیڑھ برس بعد وہ رہا ہوئے۔ قید کے دوران بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔

انہیں قادیانی فرقے کو غیر مسلم قرار دینے پر پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ اس فیصلے پر امت مسلمہ کی جانب سے شدید ردعمل آیا۔ بالآخر عالمی دباؤ پر ان کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی۔ انہوں نے فتنہ انکار حدیث کے خلاف مؤثر تحریک چلائی۔ ایوب دور میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ جماعت پر پابندی عاید کی گئی، مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔

انہوں نے کمیونسٹ نظریات کے بڑھتے اثرات سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنے قلم کو اسلام کی عظمت بیان کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ سید مودودی کو ان کی دینی خدمات کے پیشِ نظر پہلے شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آپ کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے نام سے مشہور ہے۔ وہ نومبر 1972ء میں جماعت کی امارت سے الگ ہوئے۔ 22 ستمبر 1979ء کو ان کا انتقال ہوا۔

اشفاق احمد

کچھ قلم کے مزدور ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اپنے الفاظ میں روشنی بھر دیتے ہیں۔ اُن کی تحریریں شفاف پانی کی طرح بہتی ہوئی دلوں میں اتر جاتی ہیں۔ اشفاق احمد بھی ایسی ہی شخصیت تھے۔ وہ ہمہ جہت انسان تھے۔ فکشن کے میدان میں جھنڈے گاڑے، پی ٹی وی کے لیے متعدد یادگار ڈرامے لکھے، بطور براڈکاسٹر تلقین شاہ جیسا یادگار کردار تخلیق کیا۔

اشفاق احمد 22 اگست 1925ء کو ایک پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بھارت کا شہر ہوشیار پور ان کا آبائی وطن تھا۔ ان کے والد ڈاکٹر محمد خان ایک سخت مزاج باپ تھے۔ ابتدائی تعلیم فیروز پور سے حاصل کی۔ 1943ء میں میٹرک کا مرحلہ طے ہوا۔ کالج رام سکھ داس سے ایف اے کرنے کے بعد امتیازی نمبروں کے ساتھ فیروز پور سے گریجویشن کی سند حاصل کی۔ تقسیم کے بعد خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اردو کا حصہ بن گئے۔ اپنے زمانے کے معروف اساتذہ سے اکتساب فیض کیا۔ وہیں

بانو قدسیہ سے اُن کی ملاقات ہوئی، جن سے شادی کرنے کے لیے انہوں نے پورے خاندان کی مخالفت مول لی۔ بعد میں بانو قدسیہ نے بھی ادب کے میدان میں اپنا سکہ جمایا۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے اٹلی کی روم یونیورسٹی اور گرے نوبلے یونیورسٹی، فرانس سے اطالوی اور فرانسیسی زبان میں ڈپلومے کیے۔ نیویارک یونیورسٹی سے براڈکاسٹنگ کی خصوصی تربیت حاصل کی۔

دیال سنگھ کالج، لاہور سے بطور مدرس پیشہ ورانہ سفر کا آغاز کیا۔ پھر روم یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہوگئے۔ وطن لوٹ کر ادبی رسالہ ''داستان گو'' جاری کیا۔ کچھ برس ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کی ادارت بھی کی۔

1967ء میں وہ مرکزی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، جو بعد میں اردو سائنس بورڈ میں تبدیل ہوگیا۔ 1989ء تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔ وہ ضیا دور میں وفاقی وزارتِ تعلیم کے مشیر بھی رہے۔

1953ء میں شائع ہونے والا افسانہ ''گڈریا'' ادبی دنیا میں ان کی پہچان بنا۔ ''ایک محبت سو افسانے'' اور ''اجلے پھول'' ان کے ابتدائی افسانوی مجموعے ہیں۔ دیگر نمایاں تصانیف میں ''سفردرسفر''، ''کھیل تماشا''، ''ایک محبت سو ڈرامے'' اور ''توتا کہانی'' شامل ہیں۔ معروف پروگرام تلقین شاہ کا آغاز 1965ء میں ریڈیو پاکستان، لاہور سے ہوا جو اپنی مقبولیت کے باعث اگلے تیس برس تک چلتا رہا۔

ڈراما نگاری نے انہیں ملک گیر شہرت بخشی۔ ستر کی دہائی میں انہوں نے معاشرتی اور رومانی موضوعات پر ''ایک محبت سو افسانے'' نامی سیریز لکھی، جس نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ وہ تصوف کی جانب رجحان رکھتے تھے جس کا عکس ان کے ڈراموں ''توتا کہانی'' اور ''من چلے کا سودا'' میں غالب نظر آیا۔ کچھ عرصہ تک وہ پاکستان ٹیلی وژن پر ''زاویہ'' کے نام سے ایک پروگرام کرتے رہے، جس میں وہ اپنے مخصوص انداز میں سبق آموز قصے کہانیاں سناتے۔

انہوں نے ''دھوپ اور سائے'' نامی فلم بھی بنائی۔ فلم کی موسیقی بہت مقبول ہوئی، ناقدین نے بھی سراہا مگر وہ باکس آفس پر کوئی کمال نہیں دکھا سکی۔ 7 ستمبر 2004ء کو اس جید ادیب کا انتقال ہوا۔

مرتضیٰ بھٹو

پاکستانی سیاست میں شاید ہی مرتضیٰ بھٹو جیسا سیاست داں گزرا ہو۔ تنازعات سے بھرپور زندگی گزارنے والے ذوالفقار علی بھٹو کے اس بیٹے کی موت نے ایک معمے کو جنم دیا۔

18 ستمبر 1954ء کو کراچی میں آنکھ کھولنے والے مرتضیٰ بھٹو نے ابتدائی تعلیم سینٹ میری اکیڈمی، راولپنڈی سے حاصل کی۔ کراچی گرامر اسکول سے 1971 میں اولیول کیا۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے بیچلرز کی ڈگری حاصل کی۔ وہ کرائسٹ چرچ کالج، آکسفورڈ میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔

اس وقت پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ 77ء میں مارشل لا لگ گیا اور ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس واقعے کے بعد وہ پاکستان لوٹ آئے مگر حالات اور والد کی ہدایت پر جلد بیرونِ ملک چلے گئے تاکہ ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کے لیے بین الاقوامی سطح پر مہم چلا سکیں۔
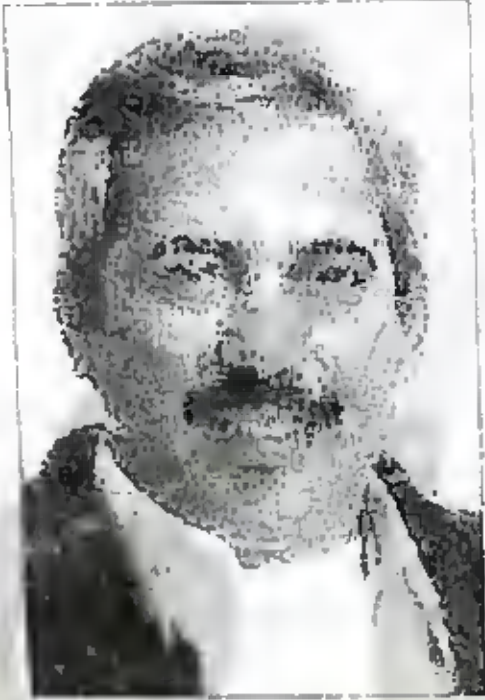
اس مہم میں ان کے چھوٹے بھائی شاہنواز بھٹو نے بھرپور کردار ادا کیا۔ انہوں نے شام اور لیبیا کے حکمرانوں کی حمایت حاصل کی، تاہم یہ کوششیں ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کو نہیں ٹال سکیں۔ اس واقعے کے بعد انہوں نے خود کو والد کا انتقام لینے کے لیے وقف کردیا۔

اپنی بہن بے نظیر بھٹو کے برعکس انہوں نے مسلح جدوجہد کو ترجیح دی۔ ان کی عسکری تنظیم الذوالفقار کہلائی۔ افغانستان اس کا مرکز تھا اور اس کا مقصد ضیا حکومت سے بھٹو کی موت کا بدلہ لینا تھا۔ اس واقعے نے مرتضیٰ بھٹو کو تنازعات کی راہ پر ڈال دیا۔

مارچ 1981ء میں کراچی سے پشاور جانے والی پرواز کو سلام اللہ ٹیپو اور اس کے کچھ ساتھی اغوا کرکے کابل لے گئے۔ الذوالفقار نے اس کی ذمے داری قبول کی اور اغوا کاروں کے بدلے حکومتِ پاکستان سے اپنے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اس جہاز میں سوار ایک مسافر میجر طارق رحمان کو قتل کردیا گیا۔ باقی مسافر تو رہا ہوگئے مگر مرتضیٰ بھٹو پر دہشت گرد کا لیبل لگ گیا۔ گو بعد میں ان کے قریبی ساتھیوں نے مؤقف اختیار کیا کہ انہیں جہاز کے کابل ایئرپورٹ پر اترنے تک مرتضیٰ بھٹو کو اس واقعے کا علم نہیں تھا۔ اسی برس چوہدری ظہور الٰہی کا قتل

ہوا۔ اس کا الزام بھی ان ہی پر عائد کیا گیا۔
1993ء میں پاکستان لوٹنے کے بعد انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ اُن کے اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے علیحدہ جماعت کی بنیادی رکھی۔ محترمہ کے دوسرے دورِ حکومت میں 20 ستمبر 1996ء کو انہیں 70 کلفٹن کے سامنے قتل کردیا گیا۔ ان کی جماعت پیپلز پارٹی شہید بھٹو گروپ کی ذمے داری ان کی بیگم غنویٰ بھٹو نے سنبھالی ہوئی ہے۔

ملک غلام محمد

پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل ملک غلام محمد 25 اپریل 1895ء کو لاہور کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاہور سے حاصل کی۔ علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ سول سرونٹ کی حیثیت سے اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ پہلی گول میز کانفرنس میں نواب آف بہاولپور کے نمائندے کے طور پر کام کیا۔ نظام حیدرآباد کے مشیر خزانہ رہے۔ بٹوارے سے قبل لیاقت علی خان کے معاون کی ذمے داری سنبھالی۔ بجٹ کی تیاری میں ان کا کردار کلیدی رہا۔
قیام پاکستان کے بعد وہ ریاست کے پہلے وزیر خزانہ بنے۔ نومبر 1949ء میں پاکستان نے بین الاقوامی اسلامی معاشی کانفرنس کا انعقاد کیا تو انہوں نے اسلامی ممالک کا معاشی بلاک قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

بعد کے برسوں میں انہیں صحت کے مسائل درپیش رہے۔ مورخین کے مطابق گرتی صحت کے باعث لیاقت علی خان انہیں سبکدوش کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، مگر ان کی شہادت کی وجہ سے معاملہ ٹل گیا۔ خواجہ ناظم الدین نے وزارت عظمیٰ کی ذمے داری سنبھالی۔ غلام محمد کو گورنر جنرل کا عہدہ دیا گیا۔ اُن کے دور میں بیوروکریسی کی سازشوں کا آغاز ہوا۔ انہوں نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کرکے مشرقی پاکستان کے عوام میں بداعتمادی کا بیج بویا۔ حالانکہ انہوں نے دو ہفتے قبل ہی پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لیا تھا۔
گورنر جنرل کے اختیارات میں کمی کرنے کے لیے 1954ء میں اسمبلی نے قانون میں ترمیم کی کوشش کی تو انہوں نے دستور ساز اسمبلی کو برخاست کردیا۔ اسپیکر مولوی تمیزالدین نے اس اقدام کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کردیا۔ عدالت نے فیصلہ غیر آئینی قرار دیا تو حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل کردی۔ یوں جسٹس منیر کا وہ متنازع فیصلہ آیا جس میں گورنر جنرل کے فیصلے کو نظریہ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا۔ اس فیصلے نے پاکستانی سیاست میں سازشوں کا ایک نہ رکنے والا باب کھول دیا۔ عوام کی جانب سے بھی اس فیصلے کو سخت پسند کیا گیا۔
غلام محمد بلڈ پریشر، لقوہ اور فالج کے مریض تھے۔ شدید علالت کی وجہ سے انہیں دو ماہ کی رخصت پر بھیجا گیا۔ ان کی جگہ اسکندر مرزا کو قائم مقام گورنر جنرل کی ذمے داریاں دی گئیں۔ انہوں نے 12 ستمبر 1956ء کو لاہور میں وفات پائی۔

نواب زادہ نصراللہ خان

اگر کسی سیاست دان کی زندگی کو پاکستان کی سیاسی تاریخ قرار دیا جائے، تو وہ نواب زادہ نصراللہ خان ہی ہوں گے، جنہوں نے سات عشروں پر پھیلی اپنی سیاسی زندگی میں آمریتوں کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ اس دوران کئی صعوبتیں سہیں، لالچ بھی دیا گیا، مگر کوئی قوت انہیں جھکا نہ سکی۔ وہ ایک سادہ اور پُرخلوص انسان تھے۔ انہیں ایک قابلِ احترام اور غیر متنازع شخص کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ یہ ان کی مدبرانہ قیادت تھی جس نے شدید نظری اختلاف رکھنے والی سیاسی جماعتوں کو ایک پلیٹ فورم پر اکٹھا کردیا۔
نواب زادہ نصراللہ خان 1918ء میں خان گڑھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایچ سی کالج، لاہور میں زیرِ تعلیم رہے۔ 30 کی دہائی کے اوائل میں وہ ایک اسٹوڈنٹ لیڈر کے طور پر شناخت بنا چکے تھے۔ اوائل میں مجلس احرار کے پلیٹ فورم سے سیاست میں حصہ لیا۔ 1940ء کے اس تاریخی جلسے میں موجود تھے جس میں قرارداد لاہور پیش کی گئی۔ آنے والے برسوں میں وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فورم سے متحرک رہے۔ 1952ء میں صوبائی اور 1962ء میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ بعد میں وہ جناح عوامی لیگ کا حصہ بنے جو عوامی لیگ کے نام

سے معروف ہوئی۔ حسین شہید سہروردی کے زمانے میں وہ اس کے نائب صدر رہے۔ وہ ایوب خان کے ناقد تھے۔ آمریت کے خلاف سیاسی جماعتوں کو متحد کرنے میں اُن کا اہم کردار رہا۔ صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی بھرپور حمایت کی۔ 1969ء میں پاکستانی جمہوری پارٹی کے نام سے نئی جماعت کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے جمہوری حکومتوں کے آمرانہ اقدامات کو بھی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ بھٹو سرکار کے خلاف بننے والے الائنس ''پاکستان قومی اتحاد'' کے مرکزی رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ 1977ء کے انتخابات میں وہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے مگر پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات کو غیر شفاف قرار دیتے ہوئے احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ حکومت مذاکرات پر مجبور ہوگئی۔ وہ مذاکراتی کمیٹی کا حصہ تھے۔ مذاکرات کامیاب ہو چکے تھے مگر ضیاالحق نے ملک میں مارشل لا لگا دیا۔

نواب زادہ نصر اللہ خان نے اپنی روایت کے عین مطابق اس مارشل لا کی شدید مخالفت کی۔ تحریک بحالی جمہوریت کے پرچم تلے پیپلز پارٹی کے ساتھ ان جماعتوں کو بھی اکٹھا کرلیا جو بھٹو مخالف تصور کی جاتی تھیں۔ 1983ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی۔ حکومت نے اس کے خلاف بھرپور قوت اختیار کی۔ کئی رہنما گرفتار ہوئے۔ نواب زادہ صاحب کو بھی پانچ برس نظر بند رکھا گیا۔ اس دوران انہیں جھکانے کی کئی کوششیں کی گئیں، مگر وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹے۔

1988ء میں انہوں نے غلام اسحاق خان کے خلاف صدارتی الیکشن لڑا۔ 1993ء کے انتخابات میں وہ رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے انہیں کشمیر کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا۔ انہوں نے اس ایشو کو عالمی برادری کے سامنے اٹھایا۔ ان کی کوششوں کے طفیل برطانیہ کی لیبر پارٹی نے اسے اپنے منشور میں شامل کیا۔

اس ہردلعزیز سیاست دان نے لمبی عمر پائی۔ 27 ستمبر 2003ء کو ان کا انتقال ہوا۔

حضرت بابا جان

تصوف نے برصغیر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ صوفیاء نے انسانیت کی سربلندی کے لیے اَن گنت خدمات انجام دیں۔ اس میدان میں مردوں کے ساتھ خواتین نے بھی روشن مثال قائم کیں۔ حضرت بابا جان ایسی ہی ایک صاحب کرامت خاتون تھیں۔

اندازوں کے مطابق انہوں نے 21 ستمبر 1806ء کو بلوچستان کے ایک نامی گرامی پشتون گھرانے میں آنکھ کھولی۔ انہیں گل رخ کا نام دیا گیا۔ روایات کے مطابق گھر میں تعلیم حاصل کی۔ قرآن پاک حفظ کیا۔ وہ عربی، فارسی اور اردو روانی سے بولتی تھیں۔ زیادہ وقت عبادات میں گزرتا۔ 18 برس کی عمر میں وہ حق کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں۔ چہرے پر نقاب ڈالے پہلے پشاور پہنچیں۔ پھر ان کی تلاش انہیں راولپنڈی لے گئی۔ اس دوران انہوں نے مسلم صوفیاء کے علاوہ دیگر مذاہب کے اساتذہ سے بھی اکتساب فیض کیا۔ پہاڑوں میں ریاضت کی۔ پھر انہوں نے پنجاب کا رخ کیا۔ وہاں انہوں نے مولا شاہ نامی ایک صوفی بزرگ کی زیرنگرانی عرفان کی منازل طے کیں۔ مؤرخین کے مطابق انہیں 37 برس کی عمر میں عرفان ملا۔ اس تجربے نے ان پر جذب کی کیفیت طاری کر دی۔

انہوں نے مشرق وسطیٰ کا بھی سفر کیا۔ مؤرخین کے مطابق وہ مکہ بھی گئیں۔ واپسی کے سفر میں پنجاب سے ہوتی ہوئی ناسک پہنچیں۔ وہیں پہلے پہل انہیں بطور صوفی شناخت کیا گیا۔ انہوں نے اجمیر کی درگاہ پر بھی کچھ وقت گزارا۔ پھر پونا کا رخ کیا۔

اس وقت تک وہ خاصی بوڑھی ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کچی بستی میں ڈیرا ڈال لیا۔ دھیرے دھیرے ان سے جڑے قصے مشہور ہونے لگے اور عقیدت مند اکٹھے ہونے لگے۔

ان عقیدت مندوں میں ڈھاکا کالج کا میروان ایرانی نامی ایک پارسی نوجوان بھی شامل تھا۔ بابا جان کی توجہ نے اس نوجوان کو تلاش حق کی راہ پر ڈال دیا۔ بعد میں یہ نوجوان مہربابا

کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہوا۔

21 ستمبر 1931ء کو وہ طویل علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ اندازوں کے مطابق ان کی عمر 125 برس تھی۔ ان کے جنازے میں مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذاہب کے ماننے والوں نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔ انہیں اس نیم کے درخت کے پہلو میں دفنایا گیا جہاں وہ برسوں سے بیٹھا کرتی تھیں۔

بھگت سنگھ

یہ اُس انقلابی کی بے پناہ مقبولیت اور اثر پذیری ہی تھی کہ اُس کی پھانسی کے معاملے پر کانگریس دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ محققین کے مطابق قائداعظم نے بھی اس حریت پسند کے حق میں آواز اٹھائی۔ مسلح جدوجہد آزادی کا ہیرو تصور کیا جانے والا بھگت سنگھ 27 ستمبر 1907ء کو موجودہ پاکستان کے علاقے لائل پور (فیصل آباد) میں پیدا ہوا۔ وہ سوشلسٹ انقلاب کا حامی تھا اور طبقات سے پاک معاشرے کا سپنا دیکھا کرتا تھا۔ یہ جلیانوالہ باغ کا واقعہ اور عدم تعاون کی تحریک کے دوران ہونے والے خونیں واقعات تھے، جنہوں نے اس بچے کو شدید متاثر کیا۔ زمانہ طالب علمی میں اس کا انقلابیوں سے تعلق قائم ہوا۔ وہ ان سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ 1927ء میں دسہرہ بم کیس میں اسے گرفتار کرلیا گیا اور شاہی قلعے میں اذیتیں دی گئیں۔ ضمانت پر رہائی کے بعد اس نے بھارت سبھا بنائی۔ انگریزوں کے متعصبانہ رویے کے باعث وہ عسکریت پسندی کی راہ پر چل پڑا۔ دہلی میں مرکزی اسمبلی کے اجلاس کے دوران اس نے بم سے حملہ کیا۔ اس کا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں، بلکہ بہروں تک اپنی آواز پہنچانی تھی۔ اسے گرفتار کرلیا گیا۔ عدالت نے عمر قید کی سزا سنائی۔

سائمن کمیشن کی آمد پر لاہور ریلوے اسٹیشن پر ایک احتجاجی مظاہرہ ہوا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا، جس میں معروف لیڈر لالہ لاجپت رائے زخمی ہوگئے۔ اس واقعے کے بعد انقلابیوں نے اعلیٰ پولیس افسران سے بدلہ لینے کا منصوبہ بنایا۔ بھگت سنگھ اور راج گرو نے اسسٹنٹ سپرٹینڈنٹ پولیس، لاہور مسٹر سانڈرس کو دفتر کے باہر گولی ماردی۔ انہیں اپنے تعاقب میں آنے والے حوالدار کو بھی قتل کرنا پڑا۔ واقعے کے کچھ عرصے بعد انہیں کشمیر بلڈنگ لاہور سے گرفتار کرلیا۔ سینٹرل جیل میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ تین سال تک چلتا رہا۔ بھگت سنگھ کو موت کی سزا سنائی گئی۔

جیل کے زمانے سے بھگت سنگھ کی دلیری کی کئی کہانیاں جڑی ہیں۔ آزادی کے اس متوالے نے اپنے حقوق کے لیے طویل بھوک ہڑتال کی۔ اس دوران صعوبتیں تھیں مگر گھٹنے نہیں ٹیکے۔ اس کی مقبولیت پھیلتی چلی گئی۔ سزائے موت معاف کروانے کے لیے تحریک شروع ہوئی۔ ہندوستان کے کئی سیاست دانوں نے اس کی تائید کی مگر گاندھی جی کے کمزور مؤقف کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوسکا۔

23 مارچ 1931ء کو آزادی کے نغمے گاتے ہوئے بھگت سنگھ پھانسی پر چڑھ گیا۔ حکومت کو شدید عوامی ردِعمل کی توقع تھی، اس لیے لاش لواحقین کے حوالے کرنے کی بجائے دریائے ستلج کے کنارے جلادی گئی۔

جنید جمشید

پاکستان کی پاپ موسیقی میں بہت کم فنکاروں کو وہ شہرت ملی جو جنید جمشید کے حصے میں آئی۔ نازیہ اور زوہیب حسن کے شروع کردہ سلسلے کو جنید جمشید ہی کے گروپ نے آگے بڑھایا۔ ان کے بینڈ وائٹل سائنز نے 1987ء ''دل دل پاکستان'' کے ذریعے کروڑوں عوام کو گرویدہ بنالیا۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے ایک کے بعد ایک ہٹ گانے پیش کیے۔ شعیب منصور جیسے ہدایت کار کا ساتھ ملا تو میوزک ویڈیوز کے نئے دور کا آغاز ہوا جس نے اس انڈسٹری پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔

3 ستمبر 1964ء کو راولپنڈی میں پیدا ہونے والے جنید جمشید پاک فضائیہ کے ایک اعلیٰ افسر کے صاحب زادے ہیں۔ انہوں نے یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور سے تعلیم حاصل کی۔

موسیقی کی دنیا میں قدم رکھتے ہی تہلکہ مچا دیا۔ وائٹل سائنز کے پرچم تلے چار البم کیے جن کے گیتوں نے نوجوان نسل کو گرویدہ بنالیا۔ پھر وہ بینڈ سے الگ ہوگئے اور سولو آرٹسٹ کے طور پر چار البم ''تمہارا اور میرا نام''، ''اس راہ پر''،

''دل کی بات'' اور ''بیسٹ آف جنید جمشید'' پیش کیے۔ اس بار ان کی شہرت سرحدوں کے پار بھی پہنچی۔ انہوں نے فیشن ڈیزائننگ کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ کراچی سمیت ملک بھر میں ان کے بوتیک کھلے۔ وقت کے ساتھ ان کا دین کی جانب رجحان بڑھنے لگا۔ وہ گائیکی سے کنارہ کش ہوگئے۔ آنے والے برسوں میں نعت خوانی کے میدان میں مصروف نظر آئے۔ ماضی کی شہرت کے طفیل اس شعبے میں بھی ان کی بہت پزیرائی ہوئی۔

انہوں نے مذہب کے موضوع پر لیکچرز بھی دیے۔ انہیں سامعین کی ایک بڑی تعداد میسر تھی۔ خیالات کے اظہار میں غیر محتاط ہونے کی وجہ سے وہ تنازعات کا شکار ہوگئے۔ عوام کی جانب سے ان کے خلاف شدید ردِعمل سامنے آیا جس کے بعد انہیں اپنے بیان پر معافی مانگنی پڑی۔

نور جہاں

برصغیر کی موسیقی کی تاریخ مرتب کرنے والا شاید کئی مقبول گلوکاروں کو نظر انداز کردے، مگر ملکۂ ترنم کا خطاب پانے والی میڈم نور جہاں کو نظر انداز کرنا کسی بھی مؤرخ کے لیے ممکن نہیں۔ موسیقی کی اُس تاریخ کو غیر مستند تصور کیا جائے گا جس میں اس عظیم فن کارہ کا نام نہ ہو۔ کچھ ناقدین کے مطابق پاکستانی فلمی صنعت کے آدھے گیت تو میڈم نور جہاں نے گائے ہیں۔

ہفت زبان گلوکارہ کہلانے والی میڈم نور جہاں نے دس ہزار کے قریب گانے گائے۔ فلمی گائیکی میں ایک زمانے میں ان کا سکہ چلتا تھا۔

وہ 21 ستمبر 1928ء کو قصور کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئیں، موسیقی جس کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ انہوں نے استاد بابا غلام محمد سے موسیقی کی تربیت حاصل کی۔ ٹھمری، دھروپد، خیال اور دیگر اصناف پر اوائل عمری میں عبور حاصل کر لیا۔ اسی زمانے میں اسٹیج پر اداکاری اور گلوکاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر وہ اہلِ خانہ کے ساتھ کلکتہ چلی گئیں۔ 1935ء میں بننے والی فلم ''پنجاب میل'' میں وہ بطور اداکارہ اور گلوکارہ نظر آئیں۔ کلکتہ میں ان کی ملاقات معروف فن کارہ مختار بیگم سے ہوئی۔ انہوں نے ان کا نام نور جہاں تجویز کیا اور اپنے شوہر آغا حشر کاشمیری سے سفارش کی کہ وہ نور جہاں کو اپنے تھیٹر گروپ کا حصہ بنالیں۔ مختار بیگم کی سرپرستی میں ان کا فن نکھر کر سامنے آیا۔

لاہور لوٹ کر انہوں نے اپنی گائیکی پر توجہ مرکوز کی۔ 1942ء میں پران کے مدمقابل فلم ''خاندان'' میں پہلی بار مرکزی کردار نبھایا۔ پھر انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بمبئی میں ان کی ملاقات اداکار اور ہدایت کار سید شوکت حسین رضوی سے ہوئی۔ ان کے درمیان جلد انسیت در آئی۔ خاندان کی مخالفت کے باوجود انہوں نے شادی کر لی۔ ان کی آواز میں ریکارڈ ہونے والی قوالی ''آہیں نہ بھریں نہ شکوہ کیا'' بہت مقبول ہوئی۔ 1932ء سے 1947ء تک انہوں نے 127 گانے گائے اور 69 فلموں میں کام کیا۔ ''مرزا صاحباں'' ان کی تقسیم سے قبل ریلیز ہونے والی آخری فلم تھی۔

آنے والے برسوں میں انہوں نے چن وے، دوپٹا، گلنار سمیت کئی یادگار فلمیں کیں۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت'' جیسے لازوال گیت گائے۔ پہلے شوہر سے طلاق کے بعد انہوں نے اداکار اعجاز درانی سے شادی کر لی تھی مگر یہ شادی بھی اختلافات کا شکار رہی۔ شوہر کے دباؤ کی وجہ سے انہوں نے اداکاری چھوڑ دی تھی۔ آخری بار 1961ء میں فلم ''مرزا غالب'' میں دکھائی دیں۔ البتہ گائیکی کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رکھا۔ 1986ء میں بیماری کے حملے نے انہیں تھوڑا محدود کر دیا۔ 2000ء میں انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ اسی برس 23 دسمبر کو یہ عظیم فن کارہ جہان فانی سے کوچ کرگئی۔

بلاول بھٹو زرداری

پاکستانی سیاست کا مستقبل تصور کیے جانے والے پیپلز پارٹی کے سربراہ بلاول بھٹو زرداری 21 ستمبر 1988ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ سیاست ان کی گھٹی میں تھی۔ وہ

محترمہ بے نظیر بھٹو کے بیٹے اور پارٹی کے بانی، ذوالفقار علی بھٹو کے نواسے ہیں۔

انہوں نے کراچی گرامر اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد کے برسوں میں دبئی کی معروف درس گاہ راشد پبلک اسکول کا حصہ رہے۔ وہاں وہ اسٹوڈنٹ کونسل کے نائب چیئرمین تھے۔ بعد کے مراحل آکسفورڈ سے طے کیے۔ ان کے نانا اور والدہ نے بھی اس درس گاہ سے اپنی تعلیم حاصل کی تھی۔

بلاول محترمہ کی شہادت کے بعد 30 دسمبر 2007 کو پاکستان پیپلز پارٹی کے سربراہ نامزد ہوئے۔ نام کے ساتھ بھٹو کا لاحقہ لگا دیا گیا۔ کچھ حلقوں نے ان کے چیئرمین نامزد ہونے پر اعتراضات اٹھائے اور اسے غیر جمہوری فعل ٹھہرایا۔ پیپلز پارٹی نے مؤقف اختیار کیا کہ یہ فیصلہ بے نظیر بھٹو کی وصیت اور پارٹی قیادت کی خواہشات کے عین مطابق ہے۔ تعلیم مکمل نہ ہونے کے باعث ان کے والد آصف علی زرداری شریک چیئرمین کی حیثیت سے پارٹی کو چلاتے رہے۔

حالیہ برسوں میں مختلف جلسوں کے ذریعے بلاول بھٹو کو عملی سیاست میں متعارف کروایا گیا مگر جلد ہی پس منظر میں چلے گئے۔ ان کے حامی پاکستانی سیاست میں اُن کی بھرپور شرکت اور پارٹی کی باگ ڈور سنبھالنے کے منتظر ہیں مگر وہ گاہے بہ گاہے نظر آہی جاتے ہیں۔

الطاف حسین

الطاف حسین کا شمار پاکستان کے نمایاں سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ وہ کراچی کی سب سے بڑی جماعت ایم کیو ایم کے بانی سربراہ ہیں۔ ان کے ساتھی اور حامی انہیں قائد تحریک کہہ کر پکارتے ہیں۔

وہ 17 ستمبر 1953ء کو کراچی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا، مولانا مفتی رمضان حسین آگرہ کے جید عالم تھے۔ والد برطانوی انڈیا میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ 1969ء میں انہوں نے جیل روڈ کے ایک سرکاری اسکول سے میٹرک کیا پھر سٹی کالج کا رخ کیا۔ 1970ء میں یحییٰ خان حکومت نے لازمی فوجی سروس کا منصوبہ نیشنل کیڈٹ سروس اسکیم شروع کیا۔ الطاف حسین بھی اس اسکیم کے لیے بطور کیڈٹ منتخب ہوئے۔ تربیت کراچی اور حیدرآباد کینٹ میں حاصل کی۔ دوران جنگ نیشنل کیڈٹ سروس کو 57 بلوچ رجمنٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1974ء میں جامعہ کراچی سے بی فارمیسی کرنے کے بعد ماسٹرز میں داخلہ لیا مگر بگڑتے سیاسی حالات کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ عملی سیاست کا آغاز جامعہ کراچی سے بطور اسٹوڈنٹ لیڈر کیا۔ 11 جون 1978ء کو آل پاکستان مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی۔ یہ تنظیم فوراً ہی مقبول ہوگئی، تاہم اس مقبولیت نے مخالفین بھی پیدا کیے۔ درس گاہوں میں تشدد کی لہر آچکی تھی۔ 1979ء میں بنگلا دیش میں محصور پاکستانیوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے پر انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ نو ماہ بعد رہائی ملی۔ اب انہوں نے مہاجر طلبا تنظیم کو پورے کراچی میں متعارف و منظم کرنے کا فیصلہ کیا۔ رفقائے کار کے ساتھ مل کر چندہ اکٹھا کیا۔ کتابچے شائع کیے۔ لوگ ان کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ 18 مارچ 1984ء میں ایم کیو ایم کے قیام کا اعلان ہوا۔ جلد ہی کراچی میں اس جماعت کا طوطی بولنے لگا۔ اس نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا، شہر کی سیاست میں کلیدی حیثیت حاصل کر لی۔ اس جماعت نے کئی نشیب و فراز دیکھے۔ جہاں اسے اوج ملا، اس کے ارکان صوبائی اور قومی اسمبلی میں پہنچے، وہیں یہ تنازعات کا بھی شکار ہوئی۔ ایک جانب یہ حکومت میں شامل ہوتی، اور پھر اس پر غداری کے الزامات لگتے، اس کے خلاف آپریشنز ہوتے۔ دسمبر 1991 میں قاتلانہ حملے کے بعد الطاف حسین برطانیہ چلے گئے۔ پارٹی قیادت کی خود ساختہ جلاوطنی کے باوجود ایم کیو ایم کا سیاسی سفر زور شور سے جاری رہا۔ مشرف دور میں یہ جماعت آپریشن کے زخموں سے نکل آئی۔ ایم کیو ایم کے میئر کے زمانے میں شہر میں خاصی ترقی ہوئی۔ بعد میں یہ پیپلز پارٹی کی اتحادی رہی مگر تنازعات اور الزامات نے پارٹی اور ایم کیو ایم کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

سعید انور

بائیں بازو کے اسٹائلش بلے بازوں کا ذکر ہو تو پاکستانی اوپنر سعید انور کا تذکرہ ضرور آئے گا جنہوں نے متعدد سنچریوں کے ساتھ انڈیا کے خلاف 194 رنز کی ایک ناقابلِ فراموش اننگز کھیلی۔ یہ باصلاحیت کھلاڑی 6 ستمبر 1968ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ انہوں نے 1989ء تا 2003ء پاکستان کی نمایندگی کی۔ اس دوران انہوں نے 55 ٹیسٹ میچز میں 4052 رنز بنائے جن میں گیارہ سنچریاں شامل تھیں۔ ون ڈے کرکٹ ان کا اصل میدان تھا۔ انہوں نے 247 میچز میں 8824 رنز داغے اور بیس سنچریاں بنائیں۔ آج تک کوئی پاکستانی بلے باز اس سنگ میل کو عبور نہیں کر سکا ہے۔ وہ تیسرے پاکستانی کھلاڑی ہیں، جس نے ٹیسٹ میچ میں بیٹ کیری کیا۔ 1997ء میں وزڈن نے انہیں سال کا بہترین کھلاڑی قرار دیا۔ ایک زمانے میں ان کا موازنہ سچن ٹنڈولکر سے ہوتا تھا۔

انہوں نے 1990ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ شارجہ ان کا من پسند گراؤنڈ تھا جہاں انہوں نے چار سنچریاں اسکور کیں، جن میں تین سنچریاں لگاتار بنائیں۔ انہوں نے تین بار لگاتار دو سنچریاں بنا کر اپنی مہارت اور قابلیت ثابت کی۔ 1997ء میں چنائے میں انڈیا کے خلاف کھیلی جانے والی 194 رنز کی اننگز کو ایک شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے تین ورلڈ کپ مقابلوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ انہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہا کہ وہ پاکستان کو کامیابی سے ہم کنار نہیں کر سکے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ 96ء کے ورلڈ کپ کوارٹر فائنل میں ہندوستان کے ہاتھوں شکست ان کی زندگی کا سب سے کرب ناک لمحہ تھا۔ وہ کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔

پاکستانی کرکٹ کی روایت کے مطابق انہیں آخر کے زمانے میں بورڈ سے کئی شکایات رہیں۔ دل برداشتہ ہو کر 2003ء میں انہوں نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ ان کی عامر سہیل کے ساتھ اوپننگ جوڑی بہت مشہور ہوئی۔ دونوں اپنے منفرد انداز کی وجہ سے مخالف ٹیم کے لیے وبال جان بنے رہتے۔ سعید انور کے جانے کے بعد پاکستان کو ایک عرصے تک اچھے اوپنر کے لیے انتظار کرنا پڑا۔

آخر کے برسوں میں ان کا مذہبی رجحان خاصا بڑھ گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ پس منظر میں چلے گئے۔ دیگر کرکٹرز کے مانند وہ کومینٹری یا تجزیہ کاری کی طرف نہیں گئے۔ انہوں نے تبلیغی سلسلہ کو جاری رکھا۔

آفتاب اقبال

طنز و مزاح کو ایک نئے انداز میں، پنجابی زبان کے تڑکے کے ساتھ پیش کرنے والے آفتاب اقبال ایک مقبول اینکر پرسن اور کالم نگار ہیں۔ اردو اور پنجابی زبان پر گرفت اور ثقافتوں کے بارے میں معلومات کے لیے مشہور یہ صاحب ممتاز شاعر، ظفر اقبال کے صاحب زادے ہیں۔

آفتاب اقبال 19 ستمبر 1961ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ماسٹرز کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے کیلیفورنیا چلے گئے۔ انہوں نے 1994ء-1995ء میں وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے میڈیا ایڈوائزر کے طور پر فرائض انجام دیے۔ وہ نیوز ویک، دی نیوز، نوائے وقت، جنگ اور ایکسپریس میں کالم نگاری کرتے رہے۔ آفتاب اقبال نے حسب حال اور خبرناک جیسے مقبول پروگراموں کی میزبانی کی۔ کچھ حلقے انہیں اس میدان میں رجحان ساز قرار دیتے ہیں۔

اعتزاز احسن

سیاست اور وکالت کا چولی دامن کا ساتھ ہے، مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کسی قانون دان کو دانشور کا درجہ حاصل ہو جائے۔ ان کمیاب لوگوں میں ایک نام 27 ستمبر 1945ء کو مری میں پیدا ہونے والے چوہدری اعتزاز احسن کا بھی ہے۔

انہوں نے تعلیم ایچی سن کالج، لاہور سے حاصل کی۔

پھر برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کا رخ کیا۔ پاکستان لوٹنے کے بعد انہوں نے مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی مگر ایوب خان کے ناقد ہونے کی وجہ سے ملازمت قبول نہیں کی۔ سیاسی کیریئر کا آغاز 70 کی دہائی میں کیا۔ مارچ 1975ء کے ضمنی انتخابات میں کامیابی کے بعد صوبائی کابینہ کا حصہ بنے۔

1977ء میں پاکستان قومی اتحاد نے احتجاجی تحریک شروع کی۔ لاہور میں وکلا کی ایک ریلی پر پولیس فائرنگ کا واقعہ ہوا تو اعتزاز احسن نے احتجاجاً وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ نتیجتاً انہیں پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی پر برخاست کردیا گیا۔ البتہ ضیا دور میں تحریک بحالی جمہوریت میں انہوں نے فعال کردار ادا کیا۔ اس دوران متعدد بار

گرفتار ہوئے۔ 1988ء اور 1990ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے وہ قومی اسمبلی میں پہنچے۔ وہ بےنظیر بھٹو کی کابینہ میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ 1996ء سے 1997ء تک قائد حزب اختلاف رہے۔ 2002ء کے انتخابات میں ایک بار پھر کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ ان کا شمار پاکستان کے اہم وکلا میں ہوتا ہے۔ وہ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ انہوں نے بےنظیر بھٹو اور میاں محمد نواز شریف کے ہائی پروفائل مقدمات لڑے۔ 9 مارچ 2007ء کو پرویز مشرف نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار چودھری کو برطرف کیا تو اعتزاز احسن نے اس فیصلے کو چیلنج کیا۔ یوں وکلا تحریک شروع ہوئی جس کے اوّل دستے میں وہ شامل رہے۔ سپریم کورٹ کے 13 رکنی فل بینچ کے سامنے اپنے دلائل ثابت کیے، اس اقدام کو غیر آئینی قرار دیتے ہوئے چیف جسٹس کو بحال کرادیا۔

ایمرجنسی نافذ ہونے کے بعد افتخار چوہدری کو پھر برطرف کردیا گیا۔ وکلا سڑکوں پر نکل آئے۔ اعتزاز احسن کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ امریکی سینیٹ کے 33 ارکان نے جنرل پرویز مشرف کو خط لکھا اور اعتزاز احسن کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا۔ بعد میں انہیں گھر پر نظر بند کردیا۔ گیا انہوں نے 2008ء کے عام انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تھا، تاہم وکلا کے قومی کنونشن کی طرف سے انتخابی بائیکاٹ کے فیصلے کے بعد کاغذات نامزدگی واپس لے لیے۔ وکلا تحریک کے دوران اپنی ہی پارٹی کے غیر آئینی اقدامات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کی کتاب ''سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان'' سماجی اور سیاسی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔

سجاد ظہیر

5 نومبر 1905ء کو لکھنؤ میں آنکھ کھولنے والے سجاد ظہیر کو پاکستان میں طبقاتی جدوجہد اور کمیونسٹ تحریک کا سرخیل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی فکر نے پوری ایک نسل کو متاثر کیا۔ ادب میں بھی ان کا ایک اہم حوالہ۔ اس میدان میں بھی رجحان ساز ٹھہرے۔

بنے بھائی کے نام سے معروف سجاد ظہیر نے ریاست اودھ کے چیف جسٹس سر وزیر خان کے گھر میں آنکھ کھولی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور بیرسٹر بن کر لوٹے۔ قانون کے ساتھ سیاست اور ادب میں بھی انہیں یکساں دلچسپی تھی۔ انہوں نے طبقاتی جدوجہد کا راستہ چنا۔ سجاد ظہیر کا شمار کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانی ارکان میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ادب کو اس نظریے کی ترویج کا ذریعہ بنایا گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل میں بھی ان کا کردار کلیدی رہا۔ 1932ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعہ ''انگارے'' نے ہندوستان میں تہلکہ مچا دیا۔ کتاب کو پابندی کا

سامنا کرنا پڑا۔ اس رجحان ساز کتاب میں علی احمد، رشید خان، محمد الظفر اور سید سجاد ظہیر کے افسانے شامل تھے۔

تقسیم کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے فیصلے کے مطابق پاکستان چلے آئے۔ 1948ء میں فیض احمد فیض کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی بنیاد رکھی۔ آنے والے دن سرگرمیوں سے بھرپور تھے۔ انہوں نے طبقاتی جدوجہد کرنے والے تمام گروہوں کو اکٹھا کیا۔ جلد ہی وہ حکومت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے۔ انہیں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کرلیا

گیا۔ محمد حسین عطا اور ظفر اللہ پوشنی سمیت چند فوجی افسر بھی اس مقدمے میں گرفتار ہوئے۔ میجر جنرل اکبر خان اس سازش کے مبینہ سرغنہ قرار پائے۔ 1954ء میں انہیں جلاوطن کر دیا گیا، مگر ملک سے دور رہتے ہوئے بھی انہوں نے فکری محاذ سنبھالے رکھا۔ انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین، انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن اور افرو ایشین رائٹرز ایسوسی ایشن کے پرچم تلے جدوجہد کی۔ وہ مذکورہ تنظیموں کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔

''لندن کی ایک رات'' کے نام سے ان کا ناول شائع ہوا۔ ''روشنی'' کے زیرعنوان ترقی پسند ادب اور تحریک کا احاطہ کرتے مضامین منظرعام پر آئے۔ ''پگھلا نیلم'' ان کا شعری مجموعہ تھا جسے کچھ ناقدین ... اردو میں نثری نظم کی ابتدائی شکل قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے حافظ پر بھی کام کیا۔ ساتھ ہی شیکسپیئر کے اوتھیلو، ٹیگور کی کتاب گورا اور خلیل جبران کی کتاب پیغمبر کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ ان کی اہلیہ رضیہ سجاد ظہیر بھی اردو کی جانی پہچانی ناول نگار ہیں۔ سجاد ظہیر نے 13 ستمبر 1973ء کو الماتے (قازقستان)، جو اس وقت سوویت یونین کا حصہ تھا، میں افرو ایشیائی مصنفین کی تنظیم کے ایک اجلاس کے دوران وفات پائی۔ 2005ء کو دنیا بھر کے بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طبقات کی طرف سے سجاد ظہیر کے صد سالہ جشن کے طور پر منایا گیا۔

چوہدری ظہور الٰہی

پنجاب کی نمایاں سیاسی شخصیات میں ایک نام گجرات میں آنکھ کھولنے والے چوہدری ظہور الٰہی کا بھی ہے۔ اُن کی جدوجہد اور کوششوں ہی کے طفیل گجرات نے ملکی سیاست میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ملک کے سابق وزیراعظم، چوہدری شجاعت حسین ان کے ہی بیٹے ہیں۔

نوجوانی میں پولیس فورس کا حصہ بننے والے چوہدری ظہور الٰہی نے تقسیم کے بعد ذاتی کاروبار کو ترجیح دی اور اپنے بھائی کے ساتھ ٹیکسٹائل انڈسٹری میں آگئے۔ جلد ان کا شمار مستحکم کاروباری شخصیات میں ہونے لگا۔ پورے پنجاب میں ان کی ملز لگ گئیں۔ 50 کی دہائی میں انہوں نے سیاست کی دنیا میں قدم رکھا۔ 1958ء میں گجرات ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ اسی برس انہیں نیشنل بینک کا ڈائریکٹر چنا گیا۔ اس ادارے سے ان کی طویل وابستگی رہی۔ مارشل لا لگنے کے بعد انہوں نے ایوب خان کے غیر جمہوری اقدامات

کے خلاف آواز اٹھائی۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی سہیں۔ 62ء میں وہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے مرکزی سیکریٹری جنرل کا عہدہ سنبھالا۔ اس جماعت کو مضبوط کیا۔ 70 کے انتخابات میں بھی انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ سقوط ڈھاکا کے بعد حالات بدل گئے۔ بھٹو صاحب نے قومیانے کی پالیسی کا اطلاق کیا، تو انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ چپقلش بڑھتی گئی۔ پیپلز پارٹی کے دور میں انہیں سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا گیا حکومت مخالف تقریر کرنے کی پاداش میں پانچ برس کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہ پی این اے کے مرکزی رہنماؤں میں شامل تھے۔

25 ستمبر 1981ء کو انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس کا الزام الذوالفقار پر عاید کیا جاتا ہے، جو مرتضیٰ بھٹو کی سربراہی میں کام کر رہی تھی۔ ان کی سیاسی وراثت چوہدری شجاعت حسین اور چوہدری پرویز الٰہی کے حصے میں آئی۔

بابا گرونانک

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر سکھ مت کے بانی بابا گرونانک کو خراج تحسین پیش کرتا ہے، جنہیں وحدانیت پرستی اور امن و اخوت پر مبنی تعلیمات کی وجہ سے خطۂ پنجاب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ صوفیا سی زندگی گزارنے والے اس گیانی کو دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی عقیدت و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ سکھوں کے دس گروؤں میں پہلے گرو تھے۔

وہ وسطی پنجاب کے علاقے تلونڈی (موجودہ ننکانہ) میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے سرسبز میدانوں نے ان کی پرورش کی۔ اندازوں کے مطابق انہوں نے کلیان داس کے گھر اپریل 1469ء میں آنکھ کھولی۔ ان کی کہانی کچھ کچھ گوتم بدھ سے مشابہ ہے۔ وہ بھی ایک آسودہ گھرانے میں پیدا ہوئے مگر حق کی تلاش میں گھر بار چھوڑ دیا۔

روایت کے مطابق جو جوتشی ان کا زائچہ بنانے آیا تھا، وہ ان کا روشن ماتھا دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ گیارہ برس کی عمر میں ہندو رسومات کے مطابق انہیں سوت کا بنا ہوا ڈورا جنیو پہنایا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے پنڈت سے کہا، ایسی نشانیوں کے ذریعے انسانوں میں تمیز کرنا درست نہیں۔ انسان اپنے اعمال کی وجہ سے بلند یا پست ہوتا ہے۔ میں ایسی کوئی نشانی نہیں پہنوں گا۔ ایک روز دریا میں نہاتے ہوئے ہستی نے خود کو ان پر آشکار کیا۔ اس روحانی تجربے کے بعد انہوں نے سب کچھ تج دیا اور اپنی تعلیمات عام کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہندوستان کے کئی گاؤں اور قصبوں کا رخ کیا۔ وہ پورب بھی گئے اور بہار کے اس شہر ''گیا'' میں قیام کیا جہاں گوتم بدھ کو نروان ملا تھا۔

ان کی شاعری گیتوں اور کہانیوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچی۔ ان کا کلام خدا کے تصور اور انسانی فرائض سے متعلق ہے۔ مؤرخین کے مطابق ان کا نقطۂ نظر مسلم صوفیا کے قریب تر تھا۔ وہ ذات پات کے خلاف تھے، مساوات اور برابری کا درس دیتے اور ایک خدا تک رسائی پر زور دیا کرتے۔ وہ ان اوّلین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے ستی کی ظالمانہ رسم کی مخالفت کی۔ ان کے نو جانشین گزرے۔ یوں ان کی تعلیمات کا تسلسل 1708 تک پہنچتا ہے۔ سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ چھے ہزار کے لگ بھگ منظوم حمدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں بابا گرو نانک کا کلام بھی شامل ہے۔

ان کے حالات پہلے پہل جنم ساکھیوں کے نام سے لکھے گئے۔ یہ پنجابی زبان میں ابتدائی نثری نمونے تصور کیے جاتے ہیں، جن کا رسم الخط گورمکھی تھا۔ فارسی کی ایک نایاب کتاب ''دبستان مذاہب'' میں، جس کا مصنف ایک پارسی سیاح تھا، گرو نانک کا اوّلین تذکرہ ملتا ہے۔ کچھ محققین کے مطابق انہوں نے بغداد کا سفر بھی کیا اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملاقات کی۔

22 ستمبر 1539ء کو کرتار پور، ہندوستان میں ان کا انتقال ہوا۔ پاکستان کا علاقہ ننکانہ صاحب ان کا جنم استھان ہے۔ ان کے جنم دن کی تقریبات پر دنیا بھر کے سکھ اس علاقے کا رخ کرتے ہیں۔

بائیکاٹ

کسی تجارتی یا معاشرتی جرم کی بنا پر کسی فرد یا جماعت سے قطع تعلق کر لینا۔ اردو میں اس کو حقہ پانی بند کرنا کہتے ہیں۔ سیاسی طور پر یہ ایک کامیاب حربہ ہے۔ 1765ء میں انگریزوں نے امریکا میں اسٹمپ ایکٹ نافذ کیا تو یہاں کے آبادکاروں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے انگریزی مال کا بائیکاٹ کر دیا۔ 1905ء میں چینیوں نے امریکا میں مقیم چینیوں سے ناروا سلوک کرنے پر امریکی مال کا بائیکاٹ کر دیا۔ برصغیر کی تحریک آزادی میں انگریزی مال کا بائیکاٹ بھی کیا گیا اور انگریزوں کی ملازمت کرنے سے بھی انکار کر دیا گیا۔ 1948ء میں عرب لیگ نے ان تمام کمپنیوں کے مال کا بائیکاٹ کر دیا، جن کا تعلق اسرائیلی حکومت سے تھا۔

مرسلہ: اریبہ شکیل۔ سیالکوٹ

حسین شہید سہروردی

انگریز دور میں متحدہ بنگال کے وزیراعلیٰ کا منصب سنبھالنے والے حسین شہید سہروردی کو برصغیر کی سیاست میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ پاکستان کے پانچویں وزیرِ اعظم رہے۔

حسین شہید سہروردی 8 ستمبر 1893ء کو بنگال کے شہر مدنا پور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے آکسفورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وطن لوٹنے کے بعد انہوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا۔ وہ کلکتہ کے میئر رہے۔ وہ ایک ذہین انسان تھے۔ قائداعظم کی خواہش پر وہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور صوبۂ بنگال میں اس کی قیادت سنبھالی۔ تحریک پاکستان کے دوران وہ مسلم لیگ بنگال کے جنرل سیکریٹری رہے۔ 16 اگست 1946ء کا راست اقدام بھی اُن کی وجۂ شہرت بنا۔

متحدہ بنگال میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹے تو انہوں نے مسلمانوں کی حفاظت اور بحالی کی ہر ممکن کوشش کی جس کی وجہ سے وہاں کے ہندو اُن سے ناراض ہو گئے۔ ناقدین الزام

عاید کرتے ہیں کہ فسادات کے دوران انہوں نے گاندھی جی سے ہاتھ ملایا اور کلکتہ میں گاندھی کے ساتھ رہائش اختیار کی، البتہ سنجیدہ مؤرخین اور خود حسین شہید سہروردی نے اُس کا مدلل جواب دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کا یہ سینئر لیڈر کئی تنازعات کا شکار رہا۔ ایک گروہ اُن کے خلاف سرگرم ہوگیا۔ انہیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ غداری کا الزام عائد کیا گیا۔ 1949ء میں انہوں نے جناح عوامی لیگ کی بنیاد ڈالی جو بعد میں عوامی لیگ کے نام سے معروف ہوئی۔ 50 کی دہائی کے اوائل میں انہوں نے قائدِ حزبِ اختلاف کا اہم منصب سنبھالا۔ 1956ء میں جب آئین منظور ہوا تو وہ ان چند افراد میں شامل تھے جنہوں نے بعض اصولوں کی بنیاد پر اس پر دستخط نہیں کیے۔ 12 ستمبر 1956ء کو وہ ملک کے وزیرِ اعظم مقرر کیے گئے، تاہم جلد ہی عہدہ ان سے چھین لیا گیا۔

1958ء میں جب ایوب خان نے ملک میں مارشل لا نافذ کیا، تو سہروردی حزبِ اختلاف کی آواز بن گئے۔ حکومت نے انہیں نااہل قرار دینے کی قانونی کوشش کی، مگر انہوں نے عدالت میں اپنا پُرزور اور مدلل انداز میں دفاع کیا۔ وہ ایک ماہر قانون دان تھے۔ ایبڈو کے تحت قائم ہونے والے مقدمات میں انہوں نے خود اپنی پیروی کی۔ ادب سے گہرا شغف تھا۔ دورانِ مقدمات دلائل کے ساتھ اشعار کا بھی برمحل استعمال کرتے۔

سیاسی محاذ پر وہ خاصے فعال رہے۔ انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے طوفانی دورے کیے اور عوام کو آمریت کے خلاف یکجا کیا۔ بدقسمتی سے بیشتر سیاست دانوں نے موقع پرستی کا ثبوت دیا اور اس سیاسی جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

1963ء میں انہیں دل کا دورہ پڑا۔ انہیں علاج کی غرض سے یورپ لے جایا گیا۔ وہ آرام کی غرض سے بیروت میں مقیم تھے کہ 5 دسمبر 1963ء کی رات ان کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ اس سے قبل کہ انہیں کوئی طبی امداد پہنچائی جاتی، وہ انتقال کر گئے۔ حکومت نے اسے طبعی موت قرار دیا، مگر ان کے اہلِ خانہ نے ان کی موت کو قتل قرار دیتے ہوئے الزامات نوکر شاہی پر عاید کیا۔ سہروردی کی میت وطن واپس لائی گئی۔ 8 دسمبر 1963ء کو انہیں شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

بہت کم ایسی شخصیات ہوتی ہیں، جو اپنی علمیت اور اثر انگیزی کے باعث کسی شہر کی پہچان بن جائیں، شہر حیدرآباد کو جو نابغۂ روزگار ملے، اُن میں ایک نام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا بھی ہے۔

انہوں نے 23 ستمبر 1912ء کو جبل پور میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا حصہ بن گئے۔ وہاں سے اعلیٰ مدارج طے کیے۔ ایل ایل بی کے بعد اردو اور فارسی میں ماسٹرز کی سند حاصل کی۔ 1959ء میں انہیں ناگپور یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعلیٰ ترین ڈگری عطا کی۔

انہوں نے تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ہجرت کے بعد وہ اردو کالج، کراچی کا حصہ بن گئے۔ سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ رہے۔ دو نسلوں نے اس جید استاد سے اکتساب فیض کیا۔ ابن انشا، جمیل جالبی، ابوالیث صدیقی اور ڈاکٹر وقار رضوی جیسی شخصیات کے اساتذہ میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے انہیں ستارۂ امتیاز سے نوازا۔ ان کی کتب، مقالات اور تراجم کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے۔ علامہ اقبال پر انہوں نے خاصا کام کیا۔ کتاب ''اقبال اور قرآن'' کو اس موضوع پر تحریر کردہ اہم ترین کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ وہ روحانیت کا بھی درک رکھتے تھے۔ انہوں نے مذہب اور تصوف کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ اس محقق نے 25 ستمبر 2005ء میں جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

آدم خور

انجم فاروق ساحلی

شیر کا شکار ایک سنسنی پیدا کرنے والا شوق ہے اور اگر شیر آدم خور ہو تو پھر سنسنی خیزی سوا ہو جاتی ہے۔ برسوں پہلے جب ہند پر سنات سمندر پار کے حاکموں کا راج تھا اور یہاں کا علاقہ پسماندگی کی پستی مین تھا اس وقت ایک مسلمان شکازی نے خوب شہرت حاصل کی تھی۔ اسی سید مقصود علی کی داستان شکار آپ کی نذر ہے۔

شکاریات پڑھنے کے شائقین کی مدارات

اگر آپ سطح بحر سے 4000 فٹ بلند دو متوازی کوہستانی سلسلوں اور ان کے درمیان گھنے جنگلوں پر مشتمل پھیلی ہوئی پانچ میل چوڑی وادی کو اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں تو اس صورت میں میری کہانی کا پس منظر بخوبی سمجھ سکیں گے۔ یہ علاقہ جنوبی ہند میں صوبہ مدراس کے ضلع سالم میں واقع ہے۔ یہ کوہستانی سلسلے شمال سے جنوب کی سمت پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرقی کوہستانی سلسلہ دوسرے سلسلے کی بہ نسبت قدرے بلند ہے۔ یہ سلسلہ گوتھران کے مقام پر

ختم ہو جاتا ہے اور وہاں اس کی آخری چوٹی ساڑھے چار ہزار فٹ بلند ہے۔ اس ڈھلوان پر ایک خوب صورت فارسٹ بنگلا ہے جس کا نام کوڈاکاری بنگلا ہے۔ اس بنگلے کے گرد و پیش کے مناظر دنیا کے چند بہترین مناظر میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ گول پہاڑیاں اور نوکیلی چٹانیں ہر سمت دکھائی دیتی ہیں۔ صبح کی دھند کے بادلوں کے عقب سے جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کا رنگ آتشیں گلابی محسوس ہوتا ہے اور مغربی پہاڑیوں پر اس کی دھوپ نارنجی روپ دھار لیتی ہے۔ جب چاند طلوع ہوتا ہے تو اس کی چاندنی ساری وادی میں سفید پھول بکھیر دیتی ہے۔ یہ چاندنی جنگل میں کئی ایسے دیکھتی ہے۔ کسی بھوکے شیر کے پنجے کے نیچے کسی معصوم سامبر یا کسی بے خبر ہرن کی چیخ لحہ بھر کے لیے گہرے سکون کو مرتعش کر کے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتی ہے۔ ڈاکاری بنگلے میں مجھے یعنی سید مقصود علی کو افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان کے بھائی سے بھی عرصہ قبل ملنے کا اتفاق ہوا تھا جو وہاں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

مغربی کوہستانی سلسلے کی ڈھلوان پر واقع کمپا کارائے کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کے ارد گرد تھوڑے سے کھیت ہیں اور کھیتوں سے پرے گھنے بانسوں کا جنگل۔ اس وادی کے درمیان ایک ندی بہتی ہے۔ اس وادی میں مکڑیوں کی بہتات ہے۔ اسی لیے میں نے اس وادی کا نام مکڑیوں کی وادی رکھا ہے۔ انچ انچ پر شکاریوں کو مکڑیوں کے جالے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے یہ سارا پس منظر اس لیے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ قاری اس کہانی کے ولولہ انگیز اور حیرت انگیز واقعات میں پوری دلچسپی لے سکیں اور تصور ہی تصور میں اس وادی کے حسن کا نظارہ کر سکیں۔ اب میں اپنی کہانی کا آغاز کرتا ہوں۔

کمپا کارائے ایک زبردست خوف و ہراس کے عالم میں تھا۔ ایک آدم خور شیر وہاں آنکلا تھا اور میرے وہاں پہنچنے سے پہلے تین باشندوں کو اپنے پیٹ کا ایندھن بنا چکا تھا۔ اس کا پہلا شکار ایک بوڑھا پجاری تھا جو ایک ماہ پہلے موضع موتر سے کمپا کارائے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ان دونوں دیہاتوں کا درمیانی فاصلہ گیارہ میل ہے۔ مگر وہ اپنی منزل تک پہنچ نہ سکا پتا ہی نہ چلا کہ وہ گیا کہاں۔ اگرچہ اس علاقے میں ہاتھی بھی ہیں مگر انہوں نے شاذ ہی کبھی کسی آدمی کو ہلاک کیا ہوگا۔ لہٰذا جب پجاری کمپا کارائے نہ پہنچا تو اس کی تلاش کے لیے ایک جتھا جنگل کی طرف روانہ ہوا۔

کمپا کارائے سے پانچ میل دور انہیں شیر کے پنجوں کے نشان دکھائی دیے۔ پگڈنڈی کے کنارے تھوڑا سا خون، ایک چھتری اور ایک دھوتی انہیں نظر آئی۔ ان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ مایوس واپس لوٹ آئے۔

کوئی دس دن بعد ایک عورت غروب آفتاب کے وقت گاؤں سے باہر کنویں سے پانی بھرنے گئی۔ اسے دوبارہ واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ رات کے آٹھ بجے کے قریب اس کا شوہر اور دوسرے لوگ لالٹین وغیرہ لے کر اس کی تلاش میں نکلے۔ کنویں سے بیس فٹ دور اس کا گھڑا اوندھا پڑا تھا۔ یہ گھڑا کنویں سے واپسی پر وہاں گرا تھا۔ آس پاس پانی بکھرا ہوا تھا۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ اگلی صبح آدمیوں کی جماعت تیار ہوگئی۔ عورت کی تلاش کے دوران میں سب سے پہلے انہیں اس کی ساڑھی، پھر اس کا گلوبند اور آخر میں اس کے جسم کے بچے کھچے حصے دکھائی دیے۔ ہڈیوں کا جائزہ لینے سے پتا چلتا تھا کہ شیر بے حد بھوکا تھا اور اس نے اپنے شکار سے پورا پورا انصاف کیا تھا۔

ایک ماہ گزر گیا۔ کمپا کارائے ایک محصور قلعہ بن کر رہ گیا نہ کوئی وہاں آتا اور نہ کوئی باہر نکلتا۔ گندگی سے گھروں کی حالت غیر ہونے لگی۔ لوگوں کو ہر وقت یہی خوف دامن گیر رہتا کہ وہ رفع حاجت کے لیے باہر نکلے تو گھات میں بیٹھا ہوا آدم خور انہیں دبوچ لے گا۔ رات کے وقت تو صورت حال اور بھی نازک ہو جاتی۔ انسانوں اور مویشیوں کو اکثر ایک ہی جگہ رات بسر کرنی پڑتی۔ لوگوں کے گھر روز بروز غلاظت کے ڈھیر میں تبدیل ہو رہے تھے اور آدم خور کے خوف نے ان کا لہو خشک کر رکھا تھا۔ اس خوف کا بنیادی سبب بستی کے چوکیدار کی گمشدگی تھی۔ جو خون کی ایک لمبی لکیر چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا۔ اس کی بیٹی اسے تلاش کرتی رہ گئی تھی۔ اس نے شیر کے خوف کو دل سے نکال دیا تھا۔ وہ اب تک زندہ تھی لیکن بستی پر ویرانی، اداسی اور سستی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے اکٹھے ہو کر نکلتے اور گھروں کے قریب قریب رہ کر پھر واپس مکانوں میں چلے جاتے وہ بھی اشد ضرورت کے وقت۔

میرا ایک پرانا دوست راجو بھی مائل بر بغاوت ہوا اور اس نے خوف کو جھٹک کر باہر نکلنا شروع کر دیا۔ وہ مزید غلاظت اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ رفع حاجت کے لیے چپکے چپکے رات کو باہر جاتا اور کھیتوں سے ہو

کر واپس لوٹ آتا۔ پھر ایک رات ایسا ہوا کہ وہ واپس نہ لوٹا اس کی بیوی جو بڑی بے صبری اور پریشانی کے عالم میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بعد میں بتایا کہ اس نے فقط ایک بوجھل سی آواز سنی تھی۔ جیسے کوئی چیز زمین پر گری ہو۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہ سنا تھا۔ پندرہ منٹ ہوا اس نے شور مچانا شروع کر دیا لیکن کوئی بھی اس کی مدد کے لیے نہ آیا۔ اتنی جرأت کون کر سکتا تھا۔ گھروں میں محصور لوگ مدد کے لیے اس کی چیخ و پکار سن رہے تھے مگر وہ جانتے تھے کہ راجو اس وقت تک انسانی مدد سے بے نیاز ہو چکا ہوگا۔ اب مفت میں باہر نکل کر موت سے آنکھیں چار کرنے کا کیا فائدہ لہٰذا وہ کان دبائے گھروں میں پڑے رہے اور اس دکھیا عورت کی فریادیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتے رہے۔ اگلی صبح راجو کی بیوی نے باہر نکل کر آہ و بکا کی۔ تب ایک نیم دلانہ کوشش شروع اور لوگوں نے دیکھا کہ آدم خور شیر نے گاؤں سے فقط دو سو گز دور ایک جھاڑی کے پیچھے راجو کو کھایا تھا۔ کنویں والی عورت کی طرح شیر نے راجو کے جسم پر بھی ایک بوٹی تک نہ چھوڑی تھی لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ اس کا سر ابھی تک اس کے جسم کے استخوان سے جڑا ہوا تھا۔

چونکہ یہ حادثہ میرے پرانے دوست کے ساتھ پیش آیا تھا اس لیے اس کی بیوی اگلے دن اٹھارہ میل طے کر کے موضع نیا گرام آئی۔ یہ سفر اس نے تن تنہا طے کیا تھا۔ کوئی بھی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔ راستے بھر میں اسے آدم خور کی موجودگی کی کوئی علامت دکھائی نہ دی۔ نیا گرام میں اس نے اپنے بھائی کو ساتھ لیا اور دونوں بس میں سوار ہو کر جنگل کی طرف چل پڑے۔ رات کے نو بجے مجھے اپنے مکان کے بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ اپنے پرانے دوست کی بیوی اور اس کے بھائی کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔

تازہ دم ہونے کے بعد راجو کی بیوی رانی نے مجھے ساری داستان سنائی۔ اس کا بھائی پُرجوش نوجوان تھا اور اپنے بہنوئی کا انتقام لینے کے لیے پوری طرح تلا ہوا تھا اور اس سلسلے میں اسے میری مدد درکار تھی۔ مجھ پر اسے جو اندھا دھند اعتقاد تھا اس نے مجھے کوئی عذر پیش کرنے کا موقع نہ دیا۔ تین دن بعد میں نیا گرام جانے والی سڑک پر رواں دواں تھا۔ نیا گرام جا کر میں نے اپنی کار وہاں چھوڑی اور ضروری سامان خریدنے کے بعد ہم کمپا کارائے کے سفر پر چل نکلے۔ کار فقط نیا گرام تک آسکتی تھی۔

کمپا کارائے سے کوئی دو میل ادھر ہمیں ایک شیر کے تازہ پنجوں کے نشان دکھائی دیے۔ کوئی بھی انسان کئی روز سے اُدھر سے نہ گزرا تھا اس کے سبب پنجوں کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ پنجوں کے نشانوں کی پیمائش کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ایک متوسط جسامت کا شیر تھا۔ اس سے یہ بات معلوم نہ ہو سکتی تھی کہ وہ نشان بوڑھے شیر کے تھے یا بالغ۔ اس بات کا سراغ لگانا بھی محال تھا کہ وہ آدم خور تھا یا کوئی دوسرا شیر۔ کمپا کارائے کے چند باسی ان اطلاعات میں مزید اضافہ نہ کر سکے جو رانی کی زبانی مجھے بنگلور میں معلوم ہو چکی تھیں۔ وہ آدم خور کو ایک دیو سے کم نہ سمجھتے تھے۔ مصیبت میں ہر شخص آفت برپا کرنے والے کو فوق البشر ہستی سمجھنے لگتا۔ وہ تو پھر سادہ لوح دیہاتی تھے۔ جو کئی روز سے خوف و ہراس کے عالم میں اپنے گھروں کے اندر محبوس تھے۔ ان کے نزدیک ایک آدم خور شیر کسی دیو سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ کون سی راہِ عمل اختیار کی جائے۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ آدم خور کے کسی تازہ شکار کا انتظار کیا جائے یا کوئی بیل وغیرہ باندھ کر اسے شکار کی ترغیب دی جائے۔ اس شیر میں یہ خاص بات دیکھنے میں آئی تھی کہ اس نے اب تک گاؤں کا کوئی مویشی ہلاک نہ کیا تھا۔ اب تک اس نے فقط انسانوں پر حملہ کیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر جنگل میں کوئی بیل وغیرہ باندھا گیا تو کیا وہ اسے ہلاک کرے گا یا پھر کسی شخص کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ جنگل میں جا کر شیر کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ اسے سامنے لائے۔

میرے سوا یہ قدم کون اٹھا سکتا تھا لیکن میں بھی ابھی سوچ رہا تھا۔ آخر کار اصلاح مشورہ کے بعد دو بیل خریدے گئے کیوں کہ وہاں کوئی بھینسا دستیاب نہ ہو سکا۔ ایک بیل تو اس جگہ باندھا گیا جہاں ہم نے شیر کے پنجوں کے نشانات دیکھے تھے اور دوسرا بیل گاؤں کے قریب ندی کی خشک تہ میں۔ میں خود کنویں کی منڈیر پر جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کنویں سے تازہ پانی نکال کے تین چار گھونٹ بھرے۔ بوتل کے پانی کی نسبت تازہ پانی ہمیشہ فرحت بخش اور مزیدار ہوتا ہے۔ کنویں سے پچاس گز پرے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ کنویں سے چند گز کے فاصلے پر کسی نے شیشم کے درخت اُگا رکھے تھے۔ کنویں سے وقتاً فوقتاً پانی ملنے سے ان درختوں کے نیچے لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ دن کے وقت تو وہ گھاس عموماً محسوس نہ ہوتی۔ لیکن رات کی بڑھتی ہوئی

تاریکی کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہونے لگا کہ آدم خور شیر اس گھاس کی آڑ لے کر مجھ تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے اور مجھے کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کنویں کی منڈیر سے اپنی پوزیشن بدل لی اور منہ شیشم کے درختوں کی طرف کرلیا۔ خود کو شیر پر ظاہر کرنے کا خطرہ میں نے اس لیے مول لیا تھا کہ ان دنوں چاندنی راتیں تھیں۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی چاند طلوع ہو جاتا تھا لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ چاند کو مشرقی پہاڑیوں کے اوپر آنے کے لیے ابھی کچھ وقت لگے گا۔ کم از کم آٹھ بجے تک میرے گرد و پیش اندھیرا رہتا تھا۔ اندھیرے میں ڈیڑھ گھنٹا جو مجھے طلوعِ مہتاب کا انتظار کرنا پڑا اس کا شمار میری زندگی کے پُر خطر لمحات میں ہوتا ہے۔ میں چاند کی پہلی کرن کا منتظر تھا۔

تاریکی موت کی طرح خاموش تھی۔ جنگل میں ہر طرف سناٹا مسلط تھا۔ چند چمگادڑیں کنویں کے اندر پھڑ پھڑائیں اور اپنی پیاس بجھا کر جنگل میں غائب ہو گئیں۔ میں شیشم کے درختوں ہی کی طرف غور سے نہ صرف دیکھ رہا تھا بلکہ میری نظریں چاروں سمت بار بار اٹھتی تھیں۔ رانی کا بھائی رانگا پیٹ کے بل رینگتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس حالت میں، میں بڑا چوکنا ہو کر اپنی 405 رائفل ہاتھوں میں تھامے اور ٹارچ کے بٹن پر انگلی رکھے بیٹھا رہا۔

آٹھ بجے کے فوراً بعد مشرقی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ افق کا خطہ قدرے نمایاں ہونے لگا۔ ایک زرد روشنی آسمان کے ساتھ گھل مل گئی جس سے ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ چاند نے مشرقی پہاڑیوں کے اوپر سر اٹھایا اور اس کی روشنی ساری وادی اور میرے گرد و پیش پھیل گئی۔ جوں جوں چاند بلند ہوتا گیا گرد و پیش کے مناظر زیادہ نکھرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ مجھے شیشم کے درختوں کا ایک ایک پتا صاف دکھائی دینے لگا۔ پہلی نصف شب میں کسی آواز نے میری توجہ اپنی سمت مبذول نہ کی۔

گیارہ بجے کے فوراً بعد ندی کی اس سمت سے مجھے ایک سامبر کی آواز سنائی دی۔ جہاں میں نے ایک بیل باندھ رکھا تھا۔ اس کی آواز چوکنی ہونے کے علاوہ پُر خوف بھی تھی۔ یہ آواز آہستہ آہستہ دوری کی خلیج میں گم ہو گئی۔

پھر ہر طرف سکوت مسلط ہو گیا۔ اب رات کا آخری پہر تھا۔ تب اچانک مجھے خیال آیا کہ شیر کہیں گرد و نواح میں موجود ہے تو اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی جا سکتی ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کنویں کے چوبی چکر (چوکھڑی) کو زور زور سے گھمانے لگا۔ رسے کے ساتھ بندھا ہوا ڈول جب کنویں کے پانی سے ٹکراتا تو آواز کی گونج رات کی خاموشی میں دور دور تک پھیل جاتی۔ چوکھڑی گھماتے وقت میں اپنے اردگرد بھی دیکھ لیتا تھا۔ خاص طور پر جھاڑیوں کے گہرے سایوں کی سمت لیکن کوئی چیز متحرک نہ ہوئی۔ خاموش جنگل میں درختوں کے پتے تک چپ سادے ہوئے تھے۔

تین بجے کے بعد چاند مغربی پہاڑیوں کے عقب میں غروب ہونے لگا اور حالات پھر ویسے نظر آنے لگے جو گزشتہ شام طلوعِ ماہتاب سے پہلے تھے۔ اندھیرا لحہ بہ لحہ کثیف ہونے لگا اور آخر میں چند گز سے زیادہ دور نہ دیکھ سکتا تھا لیکن چاند کے غروب ہونے کے ساتھ ہی ستاروں کی روشنی میں قدرے تیزی آگئی تھی۔ پو پھٹنے میں فقط ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ نیند سے میری بری حالت ہو رہی تھی لیکن اب تو مجھے اپنی حفاظت کی زیادہ ضرورت تھی۔ گزشتہ دو گھنٹوں سے میں خود شیر کو اپنی سمت آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اگر وہ رات بھر اس سمت سے نہیں گزرا تھا تو اب اس بات کا امکان تھا۔ اس کے علاوہ اچانک حملے کے لیے حالات اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اب شیشم کے درخت بھی سیاہ دھبوں میں بدل گئے تھے اور ان کے نیچے کی گھاس تو مجھے بالکل بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔

مجھے احساس ہونے لگا کہ میں مکمل طور پر آدم خور کے رحم و کرم پر ہوں۔ اگر اسی وقت وہ حملہ کر دیتا تو میں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا اگر وہ گرج کر حملہ آور ہوتا تو میں اندھا دھند اس پر گولی چلانے کے سوا کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ اس کے برعکس اگر وہ خاموشی سے اٹیک کرتا تو میرے بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے وہ تمام چوہے اور خرگوش جو رات بھر دم سادھے پڑے ہوئے تھے، کنویں کے قریب ایک دوسرے سے مل رہے تھے خشک پتوں پر ان کے دوڑنے کی آواز میری پریشانی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ اس آواز پر میرے دل میں کوئی بول اٹھتا۔ ''آدم خور آ رہا ہے۔'' اور مجھے جھرجھری سی آجاتی۔ پہاڑیوں سے گھری ہوئی اس وادی میں پو بھی دیر سے پھٹتی تھی۔ اب تک میری ذہنی حالت خراب ہو چکی تھی۔ پونے چھ بجے کے قریب سورج کی روشنی سے پہاڑیوں کے افق کی لکیر روشن ہونے لگی۔ میرا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ سات بجے کے بعد کہیں سورج پہاڑیوں کے اوپر نمودار ہوا۔ میں کنویں کی منڈیر پر سے اٹھا اور بوجھل جسم اور نیند سے بھاری آنکھیں لیے گاؤں

کے جنوبی حصے کی سمت چل پڑا۔ جہاں میرا خیمہ نصب تھا۔
گرم چائے پینے کے بعد میں ساڑھے دس بجے تک سویا رہا۔
پھر راجو اور رانی کے ہمراہ میں نے وہ بیل دیکھا جسے ہم نے ندی میں باندھا تھا۔ وہ زندہ اور ٹھیک ٹھاک تھا۔ گرد و پیش کا معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ شیر اس سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر اسے تھوڑی دیر گھورنے کے بعد واپس لوٹ گیا تھا۔

رات کے وقت مجھے سامبر کی آواز سنائی دی تھی اس نے یقیناً اس شیر کو دیکھا تھا۔ نرم ریت پر شیر کے پنجوں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے لیکن میں یہ اندازہ کرنے سے قاصر رہا کہ کیا یہ اس شیر کے پنجوں کے نشان تھے جو کمپا کارائے آتے ہوئے راستے میں، میں نے دیکھے تھے۔

کچھ دیر کے بعد ہم دوسرے بیل کو دیکھنے چل پڑے۔ وہاں ایک غیر متوقع واقعہ ہمارا منتظر تھا اس بیل کو کسی شیر نے ہلاک کر دیا تھا اور اس شیر کے پنجوں کے نشان پہلے شیر کے نشانات سے بالکل مشابہ تھے۔ حالات سے یہ شبہ بھی مستحکم ہوا کہ عین ممکن ہے اس علاقے میں دو شیر سرگرم عمل ہوں۔

پروگرام کے مطابق شام کے پانچ بجے میں جب جائے حادثے پر واپس آیا تو مچان تیار تھا۔ رات بھر جاگنے کے لیے میں مچان پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی چاند نے مشرقی پہاڑیوں کی اوٹ سے جھانکنا شروع کر دیا۔ آٹھ بجے تک کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا۔ تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ شیر عین میرے نیچے کھڑا ہے۔ وہ کس طرح اور کہاں سے آ گیا تھا۔ مجھے بعد میں بھی اس کا پتا نہ چل سکا۔ راستے پر سے تو وہ آیا نہیں تھا کیونکہ راستہ دونوں جانب سے میرے سامنے تھا۔ جب شیر نے اپنا نرم جسم درخت کے ساتھ رگڑا تو اس لمحے مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا وہ اب اوپر دیکھ رہا تھا جس سے صاف پتا چلتا تھا کہ اسے میری موجودگی کا علم تھا۔ پھر واقعات بڑی تیزی سے وقوع پذیر ہونے لگے۔ ایک نفرت آمیز غراہٹ کے ساتھ شیر نے پنجوں کے بل درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے میں نے ایک ایسا درخت منتخب کیا تھا جس کا تنا بالکل سیدھا تھا اور اس کا پہلا دوشاخہ پندرہ فٹ اونچا تھا۔ اس دوشاخے میں، میں اپنی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ یہی شیر آدم خور ہے کیوں کہ اگر کوئی دوسرا شیر ہوتا تو میری موجودگی کے احساس سے بھاگ جاتا۔

میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے بڑی پھرتی سے بائیں سمت جھکتے ہوئے جس قدر مجھ سے ہو سکا اپنی ٹانگیں اوپر اٹھا

جُلُف

ایک سابقہ ریاست کا نام۔ یہ ریاست تیرہویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک قائم تھی جو اب سینگال کا حصہ ہے۔ اس میں دالو، کایور، باؤل، سین، سلوم، دار اور بمبوک کا ایک حصہ بھی شامل تھا۔ موجودہ دور میں یہ علاقہ جمہوریہ سینگال کے ایک خطے کا نام ہے اس کے شمال میں والو، ومار اور فوشہ تورو، مشرق میں فوتہ ومغا اور فرلو، جنوب میں نیانی ولی اور باؤل۔ مغرب میں کایور اور نیانی ویمبور واقع ہیں۔ ایک روایت کے مطابق آنحضورؐ کے خاندان کے ایک متقی انسان جن کا نام ابوبکر بن عمر تھا جو ابو درواہی کے نام سے بھی مشہور تھے مکہ معظمہ سے سینگال میں جاکر آباد ہوئے اور اس علاقے میں اسلام کی اشاعت کی۔ اسی طرح کی ایک اور روایت کے مطابق ایک اور شخص نے جو آنحضورؐ کی آل میں سے تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں جُلُف کو تکرور کے تسلط سے آزاد کرایا اور مختلف علاقوں مثلاً والو، باؤل، سین اور سلوم کا باری باری الحاق کر لیا۔ ان حکمرانوں نے بوربہ جلف کا لقب اختیار کیا۔ یہ حکمران سولہویں صدی عیسوی تک حکمرانی کرتے رہے۔ موجودہ زمانے میں یہ پورے کا پورا علاقہ اسلام قبول کر چکا ہے۔ ہر ایک گاؤں میں جامع مسجد اور ایک یا اس سے زائد مرابطی بزرگوں اور درویشوں کی خانقاہیں موجود ہیں۔ یہ لوگ صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند ہیں۔ یہاں کے باشندے تصوف میں سلسلہ قادریہ کے متبعین میں سے ہیں۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی۔ مانسہرہ

لیں۔ اس پوزیشن میں اس پر گولی چلانا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے میں غلط سمت پر جھک گیا تھا۔ کیوں کہ شیر میری دائیں سمت سے درخت پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی پوزیشن درست کی لیکن اب مجھے رائفل اپنے بائیں کندھے پر رکھنی پڑی تھی۔

ایک عام شیر ناک سے لے کر دم تک نو فٹ لمبا ہوتا ہے۔ چلیے ہم اس کی دُم چھوڑ دیتے ہیں اور اس کی جگہ شیر کے پھیلے ہوئے پنجے کی تھوڑی بہت لمبائی شامل کر لیتے ہیں اگر شیر آٹھ فٹ لمبا تھا تو اسے مجھ تک پہنچنے کے لیے مزید سات فٹ کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ یہ فاصلہ اس نے چشم زدن میں طے کر لیا۔ جونہی شیر نے مجھے پکڑنے کے لیے اپنا اگلا ایک پنجہ کرسی کے گدے میں پیوست کیا اس کا توازن بگڑ گیا ادھر میرے ہاتھ پر ایک جنگلی کیڑے نے کاٹ لیا میں ٹرائیگر نہ دبا سکا اور سسکی دبا کر رائفل سنبھالنے لگا۔

آدم خور شیروں اور چیتوں میں یہ خاص بات پائی جاتی ہے کہ وہ بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بھوک کی وجہ سے وہ انسانوں پر غضبناک ہو کر حملہ کر کے انہیں کھا جاتے ہیں مگر اکثر ایسے حملے عقب سے کیے جاتے ہیں جب انسان اپنے حملہ آور کی موجودگی سے بے خبر ہوتا ہے۔

لہٰذا زمین پر گرنے کے ساتھ ہی شیر کو پتا چل گیا کہ وہ ناکام ہو چکا ہے اس لیے وہ ایک غراہٹ کے ساتھ گھاس میں گھس کر جنگل میں غائب ہو گیا میں نے ہاتھ پر کاٹنے والے کیڑے کی تکلیف کو دوسرے ہاتھ سے دباتے ہوئے رائفل سے دو تین فائر کیے لیکن شیر زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ فائرنگ کے نتیجے میں دو چھوٹی چھوٹی چیخیں سی گونجیں اور سبز گھاس میں ایک موٹا سا جنگلی چوہا اور ایک خرگوش تڑپتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ چوہا تو پھٹ ہی گیا تھا سرخ لوتھڑے بکھرے دکھائی دے رہے تھے۔ خرگوش بھی چند لمحے جان کنی میں مبتلا رہ کر دم توڑ گیا۔ دو ننھی منی جانوں کے بلاوجہ جانے کا مجھے افسوس ہوا لیکن میرا بھی کوئی قصور نہیں تھا میں نے نشانہ آدم خور شیر کو بنایا تھا لیکن وہ ایک لمحے کی تاخیر سے بچ نکلا اور ننھے جانور ہلاک ہو گئے۔ کہیں دور سے شیر کی غراہٹ سنائی دی میں نے پھر آواز کی سمت اندازے سے فائر کیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ صرف جنگل کے ایک دو فٹ کے فاصلے سے کچھ لکڑی کے پرخچے اڑے اور پھر ماحول پہلے جیسا ہی دکھائی دینے لگا۔

شیر کو میری موجودگی کا علم ہو گیا تھا۔ لہٰذا اب خاموش بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کرسی کے گدے کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ شیر کے تین ناخنوں نے پانچ انچ لمبی جگہ پھاڑ دی تھی۔ دو ناخن تو میری پتلون میں گھس گئے تھے اور انہوں نے ایک حد تک میری داہنی ران زخمی کر دی تھی۔ شیر چونکہ گوشت کھاتا ہے اس لیے اس کے ناخن بڑے زہریلے ہوتے ہیں۔ زخم کا احساس ہوتے ہی مجھے فکر دامن گیر ہو گئی کہ کہیں اس کے ذریعے زہر میرے سارے جسم میں نہ پھیل جائے۔ میں اپنے ہمراہ کئی قسم کی دوائیاں لایا تھا مگر وہ سب کی سب اس وقت خیمے میں پڑی تھیں۔ اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا فوراً کیمپ میں لوٹ جاؤں یا رات بھر مچان پر بیٹھا رہوں۔ سورج طلوع ہونے میں ابھی دس گھنٹے باقی تھے اور اس وقت تک زہر میرے سارے جسم میں پھیل سکتا تھا لیکن اگر میں درخت سے اتر کر گاؤں کی طرف چل پڑتا تو آدم خور شیر کے حملہ آور ہونے کا خطرہ تھا۔ گاؤں یہاں سے دو میل دور تھا۔ راستے میں شیر کہیں بھی عقب سے حملہ کر سکتا تھا۔

آخر تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد میں نے شیر کے حملے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ایک رسی کے ذریعے رائفل زمین پر اتاری اور پھر خود بھی درخت پر سے اترنے لگا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی میں درخت سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا اور رسی سے بندھی رائفل کھولنے لگا۔ اس سارے عرصے میں موت جیسی خاموشی ہر طرف مسلط رہی۔ چمکیلی چاندنی اس وقت سارے جنگل میں پھیلی ہوئی تھی اور چاروں طرف رات کی نرم ہوا کے ہلکوروں میں ہر درخت کا پتا پتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے دو میل لمبے سفر پر گاؤں کی سمت روانہ ہو گیا۔ وہ راستہ زمین کی بناوٹ کے لحاظ سے کہیں سے تنگ اور کہیں سے کشادہ تھا اور اس کے کنارے ایک فٹ سے لے کر پندرہ فٹ اونچی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ مجھے چند چھوٹے چھوٹے نالے بھی عبور کرنے تھے جن کے کناروں پر بانس کے گھنے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ہوا میں جھومتے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں کے سائے زمین پر عجیب و غریب نقش و نگار بنا رہے تھے۔

ایسے حالات میں آپ کا دل سینے سے نکل کر کانوں میں تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ آپ کی رگیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ بس ایک ہی فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ تیز تیز قدم اٹھائے جائیں۔ آپ کی نظریں چاروں طرف بے چینی سے

گھومتی رہتی ہیں لیکن ایسے تمام جذبات پر کڑی نگرانی رکھنی چاہیے۔ ان کے آگے ہتھیار ڈال دینے کا نتیجہ گھبراہٹ اور افراتفری ہوتا ہے۔ افراتفری میں انسان کے حواس درست نہیں رہتے۔

ان حالات میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ شیر آپ کے سامنے کسی جھاڑی وغیرہ میں گھات لگائے تو نہیں بیٹھا۔ عقب سے حملہ کرتے وقت اسے تھوڑا بہت فاصلہ ضرور طے کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اس کے قدموں کی چاپ سے انسان چوکنا ہو جاتا ہے۔

میں احتیاط سے راستہ طے کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ کمپا کارائے سے کوئی نصف میل ادھر ندی کے کنارے بہت سے بڑے بڑے گول پتھر پڑے ہوئے تھے۔ وہ سب سے زیادہ خطرناک جگہ تھی۔ شیر کسی بڑے پتھر کے عقب میں آسانی سے چھپ سکتا تھا۔ چونکہ درخت سے گرنے پر وہ مخالف سمت میں بھاگا تھا لہٰذا مجھے ایک طرح کا یقین تھا کہ وہ اتنی جلدی واپس نہیں آسکتا۔ اس یقین کے تحت میں ان پتھروں سے گزرنے لگا اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنے کیمپ میں پہنچ گیا۔

میری عدم موجودگی میں رانی اور رانگا ہمیشہ جاگتے رہتے تھے کہ کہیں مجھے اچانک ان کی ضرورت نہ پڑ جائے۔ انہیں پانی گرم کرنے کے لیے کہہ کر میں کافی پینے لگا۔ پانی گرم ہونے پر میں نے پہلے پوٹاشیم سے زخم صاف کیا اور پھر اس پر دوا لگا کر اسے باندھ دیا۔ بعد میں، پینسلین کا ایک ٹیکا بھی لگا لیا۔ دو راتوں کے رت جگے سے میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ لہٰذا بستر پر لیٹتے ہی سو گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو گھڑی نو بجا رہی تھی۔ جنگل میں یہ بہت دیر سے بیدار ہونے کا وقت ہے۔ کیوں کہ ایسے موقعوں پر انسان سورج طلوع ہونے سے قبل ہی جاگ اٹھتا ہے جہاں تک پنڈلی اور ہاتھ کے زخم کا تعلق تھا یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب ویسی تکلیف نہیں تھی۔ میں نے چار لاکھ پینسلین کا ایک انجکشن لگایا اور زخم پر دوبارہ دوا لگانے کے بعد ناشتا کرنے بیٹھ گیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں ندی کی طرف چل پڑا۔ جہاں ہم نے بیل باندھ رکھا تھا۔ وہ بیل بدستور زندہ تھا۔ پھر میں گزشتہ شب والی جگہ پر آیا۔ شیر دوبارہ واپس نہیں آیا تھا کیونکہ اس نے بیل کو مزید نہیں کھایا تھا۔ درخت کے قریب اس کے پنجوں کے نشانات سے معلوم ہو گیا کہ یہ وہی شیر ہے جس کے پنجوں کے نشان میں نے کمپا کارائے آتے

ہوائی جہاز کے پر کے اجزاء

ہوائی جہاز کے پر کئی حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پر کا بنیادی ڈھانچا اسپار اور ریب (پسلی) کو جوڑ کر بنایا جاتا ہے۔ بعض پروں میں اسٹرنگر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اسپار اور اسٹرنگر دائیں بائیں رخ ہوتے ہیں جبکہ ریب آگے پیچھے رخ پر ہوتے ہیں۔ آگے والے اسپار کے آگے سلیٹ لگائے جاتے ہیں جبکہ سب سے پچھلے اسپار کے ساتھ فلیپ اور ایلیرون جوڑے جاتے ہیں۔ فلیپ فیوزلاج کے ان بورڈ (اندرون) کی طرف اور ایلیرون آؤٹ بورڈ (بیرون) کی طرف لگائے جاتے ہیں۔ پر کے بنیادی ڈھانچے پر ڈیورالیومن کی چادر چڑھائی جاتی ہے۔ ڈھانچے کے اوپر سامنے کی طرف اسپائیلر لگائے جاتے ہیں۔ پروں کے ان تمام حصوں کے مخصوص کام ہوتے ہیں۔

بنیادی ڈھانچا جہاز کو لفٹ مہیا کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایندھن کی ٹنکیاں بھی اسی بنیادی ڈھانچے میں بنائی جاتی ہیں۔ سلیٹ اگلے اسپار کے آگے کی طرف اور فلیپ پچھلے اسپار کی پچھلی طرف سرکائے جا سکتے ہیں۔ فلیپ اور سلیٹ جہاز کے ٹیک آف اور لینڈنگ کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ ان کو استعمال کر کے جہاز کی کم رفتار کی حالت میں بھی، پر کا رقبہ بڑھا کر، جہاز کی لفٹ میں اضافہ ہو جاتا ہے جو جہاز کی پرواز کی چڑھائی کے دوران اور اترتے وقت درکار ہوتی ہے۔ اسپائیلر پرواز کے دوران (اٹھا کر) جہاز موڑنے میں مدد دیتے ہیں گو کہ جہاز کو موڑنے کے لیے ایلیرون استعمال ہوتے ہیں۔ جب سیدھے ہاتھ کا ایلیرون اوپر کی طرف اٹھایا جاتا ہے اور الٹے ہاتھ کا نیچے کی طرف جھکایا جاتا ہے تو جہاز سیدھے ہاتھ کی طرف ڈول جاتا ہے۔ اس ڈولنے کی وجہ سے جہاز سیدھے ہاتھ مڑ جاتا ہے۔ زمین پر اترنے کے بعد اسپائیلر جہاز کی رفتار کم کرنے کے استعمال میں آتے ہیں۔

ہوئے پہلے دن دیکھے تھے۔ اب تک میں جن حقائق سے واقف ہو چکا تھا ان سے پتا چلتا تھا کہ آدم خور ایک متوسط درجے کا نر شیر تھا۔ وہ مغربی پہاڑیوں کے راستے آیا جایا کرتا تھا۔ وہ بیل کے گوشت میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ ابھی تک ہمیں یہ یقین نہ ہو سکا تھا کہ دوسرا شیر اس علاقے میں موجود ہے کہ نہیں۔

آخر سوچ بچار کے بعد ہم تینوں کے ذہن میں ایک بڑی اچھی تجویز آئی ان حالات میں ہم اسے اچھی ترکیب ہی کہہ سکتے تھے۔ میں ابھی آپ کے سامنے وضاحت کیے دیتا ہوں۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ اس علاقے میں کئی چھوٹے چھوٹے ندی نالے تھے اور ان کے کناروں پر بانسوں کے گھنے جھنڈ اگے ہوئے تھے۔ ان ندی نالوں کے بستر پتھریلے تھے اور ہمارے مقصد کے لیے بے حد موزوں۔

جس درخت پر شیر نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اس کے قریب ہی ایک قدرے کشادہ نالہ تھا اور اس کے بیڈ میں بہت سے گول پتھر پڑے ہوئے تھے۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ اس نالے کے خشک پہلو میں ایک چار فٹ گہرا اور چار فٹ چوڑا گڑھا کھود کر اس کے منہ پر کسی بیل گاڑی کا ایک پہیا رکھ دیا جائے اور اس پہیے کو اپنی جگہ سے سرکنے سے بچانے کی خاطر اس کے اوپر بڑے بڑے پتھر جما دیے اور پھر اس پہیے کو مکمل طور پر چھپانے کے لیے پتھروں کے اوپر خشک پتے بکھیر دیے جائیں۔ اس کے علاوہ مجھے ایک انسانی ڈمی بھی بنانا پڑی تھی اور اسے اسی راستے پر رکھ دینا تھا جہاں راستے میں سے نالا گزرتا تھا۔ بیل گاڑی کا پہیا انسانی ڈمی والی سمت سے قدرے اونچا تھا تاکہ پہیے کے نیچے گڑھے میں چھپا ہوا انسان وہ ڈمی بخوبی دیکھ سکے اور جب شیر وہاں سے گزرے یا اس ڈمی پر حملہ کرے تو اس پر گولی چلائی جا سکے۔

اس دن خاصی دیر ہو چکی تھی اور یہ منصوبہ مکمل نہ کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا سارے گاؤں بھر سے پرانے کپڑے وغیرہ اکٹھے کر کے انسانی ڈمی بنانے میں مصروف رہے۔ شیروں میں سونگھنے کی حس نہیں ہوتی۔ وہ ڈمی بالکل انسان جیسی دکھائی دیتی تھی اور شیر بلاشبہ اس پر حملہ کر سکتا تھا لیکن یہ شرط ضرور تھی کہ آدم خور اسے دیر تک دیکھتا نہ رہے اور اس بات پر حیران نہ ہو کہ یہ کیسا انسان ہے جو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا۔

صبح آٹھ بجے تک ہم چند آدمیوں کی مدد سے بیل گاڑی کا پہیا ندی تک لے گئے پھر وہاں ہمیں اپنے منصوبے کے مطابق گڑھا کھودنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ کیوں کہ ریتیلی زمین کھدائی میں ہماری مدد کر رہی تھی۔ پھر نمناک زمین کی نمی جذب کرنے کے لیے تھوڑی سی گھاس کاٹ کر گڑھے میں ڈالی گئی۔

گڑھے میں اتر کر مجھے پتا چلا کہ میں وہاں فقط نیم دراز حالت میں لیٹ سکتا ہوں۔ یہ بڑی بے آرام پوزیشن تھی اور میں اس میں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکتا تھا۔ بہرحال بیٹھنے کی پوزیشن کی نسبت یہ پوزیشن پھر بھی قدرے بہتر تھی جیسا کہ میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں۔ بیٹھنے سے میرا زخم دوبارہ کھل جاتا۔ گڑھے سے پندرہ فٹ دور ایک درخت کے سہارے انسانی ڈمی کھڑی کر دی گئی۔ یہ درخت کمپا کارائے جانے والے راستے کے کنارے پر کھڑا تھا اور ندی کے بالکل قریب تھا۔ اسے 45 ڈگری کے زاویے پر کھڑا کیا گیا تھا کہ شیر گرد و نواح میں جہاں کہیں بھی ہو اسے دیکھ سکے۔ جب میں گڑھے کے اندر داخل ہو گیا تو رانی اور رانگا نے گڑھے کے منہ پر پہیا جما کر اس کے اوپر بڑے بڑے پتھر رکھ دیے تاکہ اگر شیر کسی طرح مجھے دیکھ بھی لے تو پہیے کو ہٹا کر حملہ آور نہ ہو سکے۔ پھر انہوں نے اس جگہ کو مزید فطری بنانے کے لیے وہاں گھاس اور خشک پتے بکھیر دیے۔ ڈمی کی سمت پہیے اور زمین کی سطح کے درمیان چھ انچ چوڑی جگہ رکھی گئی تھی جہاں سے مجھے رائفل کی نال نکال کر آدم خور پر گولی چلانا تھی۔

حفاظتی اقدام کے طور پر میں نے آدمیوں سے کہا تھا کہ وہ گروہ کی شکل میں گاؤں جائیں اور صبح گروہ کی شکل میں آئیں۔ مجھے ساری رات گڑھے کے اندر محبوس رہنا تھا کیوں کہ اگر میں چاہتا بھی تو زور لگا کر اپنے اوپر سے پہیا نہ ہٹا سکتا تھا۔ گڑھے کے اندر خاصی گرمی تھی میں نے اپنا کوٹ اور قمیص اتار دی۔ باقی کپڑے میں نے اس خیال کے تحت نہ اتارے کہ کہیں ریت زخم میں نہ گھس جائے۔ گڑھے میں سے اوپر جھانک کر میں ڈمی کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ اتنے میں ڈمی کے عقب میں مجھے کوئی متحرک شے دکھائی دی۔ وہ ایک ہرن نکلا جو بڑے تجسس سے ساکن ڈمی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اس عجیب سی شے میں دلچسپی لینا بند کر دی اور ایک ہلکی سی حیرت بھری آواز منہ سے خارج کرتا ہوا راستہ عبور کر کے جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ ہرن اور ڈمی کے درمیان فقط بیس فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگر ڈمی کی جگہ اصل

انسان ہوتا اور وہ اپنی آنکھ بھی جھپکتا تو ہرن کو پوری تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگل میں چھپ جاتا تھا۔ اب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ میں جانتا تھا اس جگہ چاند کی روشنی دس بجے سے پہلے نہ پہنچے گی۔ اتنے میں مجھے ایک جنگلی ریچھ کی آواز سنائی دی۔ وہ ندی کی خشک تہ میں سے ہوتا ہوا میری سمت آرہا تھا۔ پتھروں کو ایک جگہ جمع دیکھ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ کالے کالے بالوں کے پیچھے چھپا اس کا ذہن کیا سوچنے میں مصروف ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ان پتھروں کے نیچے کوئی شہد کا چھتا ہو اس کا کھوج لگانے پر اس کی عید ہو جائے گی۔ اس خیال کے تحت اس نے پتھر ہٹانے شروع کردیے۔ ''احمق کہیں کے، بھاگ جاؤ۔'' میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ریچھ میری آواز سن کر رک گیا۔ یہ آواز کہاں سے آئی تھی؟ وہ سوچ رہا تھا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی اور اس کے بعد وہ پھر پتھر ہٹانے لگا۔

''دفع ہو جاؤ۔'' میں نے قدرے تیز لہجے میں سرگوشی کی۔ ریچھ رک گیا اور پتھروں کے اوپر چڑھ کر پیپے کی چوبی سلاخوں میں سے مجھے گھورنے لگا۔ مجھے دیکھ کر وہ غرایا۔

''دفع ہو بھی جاؤ احمق۔'' میں نے بندوق کی نال سیدھی کرلی۔ ریچھ کے منہ سے ایک غصیلی غراہٹ نکلی لیکن پھر وہ رائفل کو گھورتا ہوا پتھروں پر سے اتر کر خشک بانسوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔

ریچھ کو گئے ہوئے ابھی دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ مجھے مانوس قسم کے قدموں کی بھاری بھاری آواز سنائی دی۔ اس آواز کو تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ میں اس آواز کی وضاحت اس تشبیہ کے ذریعے کرسکتا ہوں جیسے کوئی نرم گدی کو صوفے کے اوپر پھینکے۔ شیر آگیا تھا اور بڑے پُراسرار انداز میں ہماری بکھیری ہوئی گھاس پر چل رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ کیا وہ ڈمی پر حملہ آور ہوگا؟ کیا وہ میرے سامنے سے گزرے گا۔ میرے ذہن میں اس قسم کے سوالات گردش کرنے لگے۔ میں اپنے اعصاب پر ایک قسم کا بوجھ محسوس کرنے لگا۔

چاند اگرچہ طلوع ہو چکا تھا مگر اس کی روشنی ابھی تک زمین پر نہ پڑ رہی تھی انسانی ڈمی مجھے دکھائی نہ دیتی تھی مگر میں جانتا تھا کہ شیر اسے باآسانی دیکھ سکتا تھا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر ایک چھوٹا سا کنکر لڑھکتا ہوا میری سمت آیا اس سمت سے کوئی بھی حملے کی توقع نہ کرسکتا تھا لیکن میرے پہلے ملاقاتی ریچھ نے ظاہر کردیا تھا کہ غیر متوقع بات بھی وقوع پذیر ہوسکتی ہے۔ اب میرے اوپر شیر کی موجودگی دوبارہ اس حقیقت کی غمازی کررہی تھی کہ غیر متوقع بات بار بار ہوسکتی ہے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ وہ ڈمی کو نظرانداز کرکے سیدھا میری طرف آیا تھا۔ ممکن ہے شیر نے ریچھ کو دیکھ لیا ہو اور اس کے عجیب وغریب طرز عمل نے اسے شک میں ڈال دیا ہو کہ کہیں پتھروں کے نیچے کوئی انسان نہ چھپا ہو اور اب وہ خود اس امر کی تحقیق کرنے آیا تھا۔ خواہ بات کچھ بھی تھی۔ اب فقط شیر مجھ سے دو گز دور تھا۔ میرے عین اوپر جب یہ خیالات میرے ذہن میں چکر لگارہے تھے تو مجھے شیر کے سانس لینے کی مبہم آواز سنائی دی۔ پھر وہ پیپے پر پڑے ہوئے پتھر پر چڑھ کر پیپے کے چوبی ڈنڈوں میں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس سارے عرصے میں، میں بیکار نہ بیٹھا رہا تھا جہاں تک مجھ سے ہوسکا سکڑ کر اور پشت کے بل گڑھے میں لیٹ گیا اور نظریں شیر پر جمادیں۔ رائفل کو بل دے کر میں اس کی نال چھ انچ چوڑے سوراخ کے پاس لے آیا تھا میں آپ سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ گڑھا چار فٹ گہرا اور چار فٹ چوڑا تھا۔

اس صورت حال میں میرے لیے رائفل کو مکمل طور پر سیدھا کھڑا کرنا ناممکن تھا زیادہ سے زیادہ میں اسے گڑھے کے پیندے سے 60 ڈگری کے زاویے پر لاسکتا تھا۔ بدقسمتی سے شیر اس کی طرف نہیں آیا تھا۔ جدھر رائفل کا رخ تھا۔ بلکہ رائفل کے چوبی دستے کے اوپر۔ پھر واقعات تیزی سے وقوع پذیر ہونے لگے۔ ریچھ کی طرح بھاگنے میں شیر نے جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا۔ ایک نفرت آمیز مسکراہٹ نے اس کے چہرے کے خدوخال مسخ کردیے تھے۔ وہ بار بار غصے سے غرا رہا تھا۔ پھر وہ پیپے کے اوپر لیٹ گیا اور اپنا پنجہ اس کے چوبی ڈنڈوں کے اندر ڈال کر مجھے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ اگر شیر کا پنجہ مجھ تک پہنچ گیا تو میرے چہرے کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ لہٰذا جہاں تک ہوسکا میں گڑھے کے نیچے دبک گیا اور ساتھ ہی ساتھ رائفل کی نال کا منہ شیر کی طرف پھیرنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہوا۔ شیر گرجا اور حرکت کرکے پیپے کی دوسری سمت آگیا۔ اب اس کا کندھا میری رائفل کی نال کو چھو رہا تھا۔ جونہی دونوں آپس میں ملے میں نے رائفل کا گھوڑا دبا دیا۔ اس چھوٹی سی جگہ میں گولی کی آواز کان کے پردے پھاڑ دینے کے لیے کافی تھی۔ شیر نے پیچھے کی

طرف چھلانگ لگائی اور اپنی مکروہ آواز میں گرجا۔ اگلے تیس سیکنڈ وہ پہیے کے اوپر پڑے ہوئے پتھر چباتا رہا اور غصے سے گرجتا رہا۔ میں نے اسے گرتے اور اٹھتے دیکھا اور آخر وہ ندی کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ میں پھر غائب ہو گیا۔ پندرہ منٹ بعد تک مجھے اس کی گرج سنائی دیتی رہی۔

اس مختصر ڈرامے کے بعد خاموشی پھر سے جنگل پر مسلط ہو گئی۔ خوف کے مارے درختوں پر ہر پرندہ اور زمین پر ہر جانور دم سادھے پڑا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ صبح کے وقت پہاڑیوں کی سمت سے تیز ہوا چلنے لگی۔ گہرے کالے بادل آسمان پر امڈ آئے۔ چاند مکمل طور پر ان کی زد میں آ گیا۔ چند منٹ بعد مجھے دور پہاڑیوں پر بارش برسنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ دوسرے ہی لمحے پہیے کے چوبی ڈنڈوں میں سے بارش کے موٹے موٹے قطرے مجھ پر گرنے لگے۔ پھر ایسی موسلادھار بارش ہوئی جو منطقہ حارہ کے جنگلوں کا خاصا ہے۔ میں بالکل بھیگ گیا اور پانی گڑھے کے کنارے پر سے گڑھے میں گرنے لگا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اب تو خشک ندی میں پانی آ جائے گا اور اگر میں گڑھے میں سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو ایک چوہے کی طرح ڈوب کر مر جاؤں گا۔

میں ایک دم عمل کے لیے مستعد ہو گیا۔ میں نے اپنے پاؤں اور ہاتھ گڑھے کے نیچے رکھے اور پشت پہیے کے ساتھ جما کر پورے زور سے اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرکا۔ میرے مددگاروں نے مجھے شیر سے بچانے کے لیے کام بڑی سنجیدگی اور خلوص سے انجام دیا تھا۔ انہوں نے پہیے پر نہایت بھاری پتھر رکھ دیے تھے اور انہیں اپنی جگہ سے ہلانا میرے بس سے باہر تھا۔ اب میرے بچاؤ کی فقط ایک صورت تھی اور وہ یہ کہ میں چھ انچ چوڑے اس سوراخ کو کھودنا شروع کر دوں جو میں نے رائفل کی نال باہر نکالنے کے لیے رکھا تھا۔ میں جلدی جلدی دونوں ہاتھوں سے ریت کھرچنے لگا۔ گڑھا اب تک پانی اور ریت سے نصف بھر چکا تھا۔ پانی سے گیلی ریت تیزی سے گرنے لگی اور مجھے اُمید بندھ گئی کہ اگلے چند منٹ میں، میں باہر نکلنے کے لیے جگہ بنا سکوں گا لیکن ریت کھرچنے کے ساتھ ساتھ یہ احتیاط بھی برت رہا تھا کہ کہیں گڑھے کا کنارہ نہ ٹوٹ جائے اور پہیا اور پتھر میرے اوپر نہ آ پڑے۔ جب سوراخ میں سے نکلنے کے لیے جگہ بن گئی تو میں نے رائفل کو پہیے کے چوبی ڈنڈوں سے گزار کر پہیے کے اوپر رکھ دیا اور خود سکڑ کر سوراخ سے باہر نکل آیا۔ بارش مسلسل برس رہی تھی۔ مجھے بالکل معلوم نہ تھا شیر کس سمت میں جا چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے ڈی کونڈی میں سے اٹھایا اور اسے ایک اونچی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر میں ندی کو عبور کر کے کمپا کارائے کی سمت چلنے کا ارادہ کرنے لگا۔

جونہی میں نے ندی عبور کی مجھے کچھ فاصلے پر ندی میں بارش کے پانی کے تیز دھارے کی آواز سنائی دی۔ یہ دھارا گرجتا ہوا پہاڑوں کی سمت سے آ رہا تھا۔ چند منٹ بعد پانی کی تین فٹ اونچی دیوار شور مچاتی اپنے سینے پر درختوں کے تنے اور پتھر اٹھائے اس جگہ پہنچ گئی جہاں کچھ دیر پہلے میں سوراخ میں مقید بیٹھا تھا۔ جب پانی کی دیوار پہیے کے قریب آئی تو کئی پتھروں کو پہیے سمیت بہا کر لے گئی۔

خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میں کمپا کارائے کی سمت میں چل پڑا۔ بارش کے قطروں کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ اندھیرا بہت کثیف تھا اور میری ٹارچ کی روشنی میرے سامنے روشنی کا دائرہ بنا رہی تھی۔ میں نے ربڑ کے جوتے پہن رکھے تھے۔ لہٰذا پھسلنے کے ڈر سے بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ ابھی میں نے نصف فاصلہ طے کیا تھا کہ تھوڑی دور مجھے ایک روشنی اپنی سمت حرکت کرتی دکھائی دی۔ رانی، رانگا اور گاؤں کے چند لوگ میری طرف آ رہے تھے۔ میں جس خطرے میں تھا انہیں اس کا احساس ہو گیا تھا اور وہ میری مدد کی غرض سے چلے آ رہے تھے۔

☆......☆

دوسرے دن سورج پوری آب و تاب کے ساتھ نکلا۔ ہم تینوں رات دوسری جگہ پر پہنچے۔ تمام ندیاں تیزی سے بہہ رہی تھیں مگر اب ان میں پانی کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ بیل گاڑی کے پہیے کا وہاں کوئی نام و نشان موجود نہ تھا۔ پانی کی روانی اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئی تھی۔ ندی کے کنارے ہم نے شیر کے پنجوں کے خون آلود نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی تو اس میں بھی ناکام رہے۔ رات کی بارش نے انہیں دھو ڈالا تھا۔ میں تین دن مزید کمپا کارائے میں رہا مگر اس دوران میں مجھے آدم خور کے بارے میں کوئی واضح خبر نہ مل سکی۔ رانی اور رانگا کا خیال تھا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر مر چکا ہو گا مگر مجھے اس میں شک تھا۔ کیوں کہ میں جانتا تھا کہ میری گولی شیر کو کسی ایسی جگہ پر نہ لگی تھی کہ وار کارگر ہوتا۔

میری چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں نے رانی اور رانگا کو بتایا کہ جب بھی آدم خور کے بارے میں کوئی اہم اطلاع

ملے فوراً نیا گرام چلے آئیں اور وہاں سے دھوم پوری کے تار گھر سے مجھے وہ تار دے دیں اور میرے جواب کا انتظار کریں۔ دس دن بعد مجھے رانگا کا ایک تار ملا۔ اس نے لکھا تھا کہ کوڈی کارائے کے فارسٹ بنگلے کے ایک نگراں کا ایک گدھا شیر نے ہلاک کردیا ہے۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ وہ واپس کپا کارائے چلے جائیں اور کسی نئے واقعے کا انتظار کریں اور اس عرصے اس کی اطلاع تار کے ذریعے مجھ تک پہنچادیں۔

چھ دن کے بعد مجھے ایک اور تار ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ ایک شیر نے دریائے چنار کے کنارے مورا پور سے سوپاتھے جانے والے راستے پر ایک گاڑی بان پر حملہ کردیا تھا۔ بیل گاڑیوں کا ایک قافلہ سوپاتھے جارہا تھا اور اس گاڑی بان کی بیل گاڑی سب سے آخر میں تھی۔ یہ کارروائی یقیناً آدم خور شیر کی تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میں کار میں بیٹھ کر دھوم پوری کی سمت چل پڑا اور وہاں سے رانی اور رانگا کو ساتھ لے کر نیا گرام پہنچا۔ کار وہیں چھوڑ کر ہم موراپور کی سمت روانہ ہوگئے۔ راستے میں ہمیں سوپاتھے اور دریائے چنار میں سے گزرنا تھا۔ اس دوران میں مجھے پتا چل چکا تھا کہ جس گاڑی بان پر شیر حملہ آور ہوا تھا وہ گاڑی پر سے چھلانگ لگا کر دونوں بیلوں کے درمیان آگیا اور شور مچا کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ دوسرے گاڑی بانوں کا شور سن کر شیر بھاگ گیا تھا۔

موراپور میں، میں اس گاڑی بان سے ملا۔ اس نے بتایا کہ شیر بالکل اچانک اس کی گاڑی کے عقب میں نمودار ہوا تھا اور اس نے پیچھے سے چھلانگ لگا کر گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کی تھی مگر اس نے اپنے بیلوں کے درمیان کود کر اپنی جان بچائی تھی جب میں نے اس سے پوچھا کہ شیر چھلانگ لگا کر گاڑی پر سوار ہونے کا آسان کام کیوں نہ کر سکا۔ تو گاڑی بان نے جواب دیا کہ شیر تقریباً گاڑی پر سوار ہو چکا تھا۔ مزید کچھ دیکھنے کے لیے اس نے انتظار نہ کیا تھا۔

اس دوران میں دیہاتیوں کی ایک پارٹی جو سوپاتھے سے موراپور آئی تھی ہمارے لیے یہ خبر لائی کہ انہوں نے دریائے چنار کے کنارے کچے راستے پر شیر کے پنجوں کے تازہ نشانات دیکھے ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی ہم تیزی سے سوپاتھے کی سمت چل پڑے۔ شیر کے پنجوں کے نشان تلاش کرنے میں ہمیں دیر نہ لگی۔ چنار میں شفاف پانی پابندی کی طرح موج در موج بہہ رہا تھا۔ ہموار ریت پر جس شیر کے پنجوں کے نشان ہمیں دکھائی دیے وہ ایک لنگڑا شیر تھا۔ وہ اپنے بدن کا سارا بوجھ اگلے بائیں پنجے پر ڈال کر چلتا تھا اور داہنے پنجے کو آہستہ سے زمین پر رکھتا تھا۔

میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ اس جگہ دریائے چنار اور مکڑیوں کی وادی ایک دوسرے سے مل کر آگے بڑھتے ہیں۔ نصف میل دریا کے بہاؤ کی سمت جدھر شیر گیا تھا وہاں دریا کے درمیان میں ایک لمبی سی چٹان تھی۔ میں نے وہ رات اس چٹان پر بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ جب شیر واپس آئے تو اس نمایاں جگہ پر مجھے دیکھنے میں اسے دقت نہ ہوگی۔ رانگا کی پگڑی، کوٹ اور دھوتی لے کر میں نے انہیں اپنے کپڑوں کے اوپر پہن لیا اور شام کے ساڑھے پانچ بجے اس چٹان پر جا بیٹھا۔ چونکہ رانگا اور رانی موراپور جانے سے خوف زدہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے دریا کے کنارے آرام دہ درختوں پر رات بسر کرنے کو ترجیح دی۔

وہ اندھیری راتیں تھیں لیکن میں قدرے بلند جگہ پر بیٹھا تھا اور دریا کا پاٹ وہاں کوئی سو گز چوڑا تھا۔ اس لیے اندھیری رات میں کسی چیز کو دیکھنے کے لیے فقط سفید ریت کا سہارا لینا تھا جسے ستاروں کی روشنی منعکس کر کے گردو پیش میں اتنی روشنی پھیلا دیتی تھی کہ میں شیر کو آتا ہوا دیکھ سکوں۔ لنگڑا ہونے کے علاوہ میں جانتا تھا کہ شیر اپنے شکار پر پچاس گز کے فاصلے سے حملہ نہ کرے گا بلکہ زیادہ سے زیادہ نزدیک آکر حملہ آور ہونے کی کوشش کرے گا۔

ٹارچ کا بغور معائنہ کرنے کے بعد میں نے اپنی 405 رائفل کو بھرا اور اس کے منہ پر کارک لگا کر اسے اپنی دائیں طرف رکھ لیا۔ اس جگہ سے شیر اسے ہرگز نہ دیکھ سکتا تھا۔ میں احتیاط کے طور پر اپنے ساتھ 12 ڈبل بیرل رائفل بھی لے آیا تھا۔ چائے اور ڈبل روٹی کے علاوہ میرا اوورکوٹ بھی میرے پاس تھا۔ اس وقت میں اسے بطور تکیہ استعمال کر رہا تھا اور خیال تھا کہ اگر رات زیادہ سرد ہوگئی تو اسے پہن لوں گا۔

جنگل میں حسب معمول پرندوں اور جانوروں نے اپنی اپنی آوازیں نکالتے ہوئے ڈوبتے سورج کو الوداع کہا اور تھوڑی دیر بعد چاروں طرف رات کے سائے گہرے ہونے لگے۔ ساڑھے سات بجے ہر طرف کثیف اندھیرا مسلط تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں دریائے چنار کی ریت چمک رہی تھی۔ نو بجے کے قریب مجھے دریا کے کنارے اونچی آوازیں سنائی دیں۔ ایک ہاتھی اپنی پیاس بجھانے کے لیے

دریا کی طرف جا رہا تھا۔ ہوا میں اس نے میری موجودگی کی بو پالی تھی۔ اس نے اپنی سونڈ اوپر اٹھائی۔ ایک خاص قسم کی آواز نکالی۔ جیسے کوئی تانبے کی چادر کو مروڑ رہا ہو۔ گیارہ بجے تک میں ہر سمت میں کڑی نگرانی کرتا رہا۔ غروب آفتاب سے اب تک آنکھوں پر بوجھ ڈالنے سے پپوٹے دکھنے لگے تھے۔ پھر میرے عقب میں بائیں سمت ہلکی سی جنبش محسوس ہوئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر چند لمحوں بعد مجھے سفید ریت پر سیاہ دھبا سا نظر آیا۔ میں نے نظریں وہاں سے ہٹا کر دوسری سمت دیکھنا شروع کردیا مگر پھر جب اس جگہ نظر ڈالی تو دھبا وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔

''عجیب بات ہے۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ''کہیں میری آنکھیں مجھے فریب تو نہیں دے رہی ہیں۔ میرے خیال میں یہ تھکاوٹ کا اثر ہے۔'' غور سے دیکھنے پر مجھے وہ دھبا پھر نظر آیا۔ اس مرتبہ وہ پہلے کی نسبت میرے زیادہ قریب تھا۔ اب میں کسی دوسری سمت دیکھنے کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ تیسری مرتبہ بغور دیکھنے پر مجھے پتا چلا کہ وہ چیز ریت پر پھیلی ہوئی تھی اور نہایت خاموشی سے رینگتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ تب اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ تو آدم خور شیر ہے۔ شیر پیٹ کے بل چپ چاپ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد میری سمت بڑھ رہا تھا اور اس مقام پر آنا چاہتا تھا جہاں سے وہ مجھ پر حملہ کرسکے۔

میری گردن اور چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ پھر خوف اور ولولہ انگیزی کی ملی جلی کیفیت میں مجھے جھرجھری سی آ گئی لیکن ایسی حالت تو میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ لہٰذا میں نے ایک گہرا سانس لے کر اپنی شکاریات والی قوت کو پیدا کیا اور میرے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ میں رائفل پکڑے قریب آنے والی بلا کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ شیر اب مجھ سے بیس گز دور تھا۔ میرا بازو ہلتا دیکھ کر اس نے اندازہ کرلیا کہ مجھے اس کی موجودگی کا پتا چل گیا ہے۔ وہ مجھ پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ میری ٹارچ کی روشنی نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ پھر میری رائفل اپنی آتشی زبان بولی اور گردوپیش کی خاموشی تھرتھرا گئی۔ میری گولی کے ساتھ ہی وہ چھلانگ لگا کر آگے کی سمت بڑھا۔ میری زندگی فقط اس لیے بچ گئی کہ ٹارچ کی روشنی میرا ساتھ دیتی رہی اور میں شیر پر دوسری گولی چلانے میں کامیاب ہوگیا۔ اب تک وہ چٹان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ پہلے زخم یا حالیہ گولیوں کی بدولت میں اندازہ کررہا تھا کہ وہ چٹان پر چڑھنے میں ناکام ہو جائے گا۔ میری تیسری گولی اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑاتی آگے نکل گئی اور ایک خوفناک دھاڑ کے ساتھ شیر کی پیش قدمی رک گئی۔ وہ لڑکھڑا کر ریت پر گر پڑا۔ ذرا سا تڑپا، مچلا اور پھر اپنے بہتے ہوئے سرخ خون میں ساکت ہوگیا۔ منظر کافی دہشت ناک تھا۔

سویا تھے واپس جاتے ہوئے میں نے رانگا اور رانی کو اپنے ساتھ لیا۔ گولیوں کی آواز سن کر انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ میں آدم خور کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ اگلی صبح ہم نے اسے دیکھا تو وہ ایک متوسط درجے کا شیر تھا۔ سترہ روز پہلے گاڑی کے پہیے کے نیچے سے چلائی ہوئی گولی نے اسے توقع سے زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ گولی اس کے داہنے کندھے کی ہڈی توڑ کر نکل گئی تھی۔ زخم اچھی حالت میں تھا اور اسے چند روز میں مندمل ہو جانا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ شیر ہمیشہ کے لیے لنگڑا ہو جاتا۔ میری پہلی گولی اس کے منہ سے گزر گئی تھی اور اس نے شیر کی گردن میں سوراخ کردیا تھا۔ اس کے باوجود وہ آگے بڑھتا رہا۔ دوسری گولی اس کے بائیں کندھے پر لگی تھی اور اس کے پھیپھڑوں کے قریب سے گزر گئی تھی۔ یہ تیسری گولی تھی جس نے اس کا بھیجا ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی ناقابلِ تسخیر روح کو کچل دیا تھا۔

یہ شیر آدم خور کس طرح بنا تھا؟ یہ معما ہر شکاری آدم خور کو ہلاک کرنے کے بعد حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اطلاع اسے اپنے لیے نہیں بلکہ عوام الناس کی خاطر حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ انسانی نسل ہی کسی شیر یا چیتے کو آدم خور بننے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ شیر بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ اس کے دائیں بازو میں کسی پرانی گولی کا نشان موجود تھا۔ یہ زخم کسی خود ساختہ رائفل کی گولی کا تھا۔ بعد میں جب میں نے شیر کی وہ ٹانگ چیری تو اس میں سے سکہ نکلا۔

اس زخم نے شیر کو ایک مسلسل اذیت میں گرفتار کررکھا تھا اور اس کے سبب وہ اپنا فطری شکار کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اپنا داہنا بازو زیادہ استعمال نہ کرسکتا تھا اور شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ شیر شکار کرتے وقت اپنے داہنے بازو پر زیادہ بھروسا کرتا ہے۔ اس لیے بھوک مٹانے کے لیے وہ شیر آدم خور بن گیا تھا۔

تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بُو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بِگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

© © National Geographic Society/Corbis

ہم تاریخ عالم پر نظر دوڑاتے ہوئے 1500 بی سی تک آچکے ہیں۔ وہ بھی ان ممالک کے جن کی تہذیبوں نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے جیسے ایران، چین اور بھارت۔

اب بھی دورانیہ وہی ہے یعنی 7000 بی سی سے 1500 بی سی تک۔ لیکن اب ہم دوسرے ممالک اور تہذیبوں کی طرف آتے ہیں۔

آپ نے یہ تو دیکھ لیا کہ بھارت، چین اور ایران میں 1500 بی سی تک کیا کچھ ہوتا رہا۔ اب ذرا عراق کی

طرف آجائیں۔

دنیا کی قدیم، مضبوط اور ترقی یافتہ تہذیب۔ میسو پوٹامیہ (بابل)

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ ہم جب مشرق وسطیٰ لکھتے ہیں تو موجودہ عہد کے کئی ممالک اس لسٹ میں آجاتے ہیں

جیسے خلیجی ریاستیں، ایران، عراق، اسرائیل، لبنان، اومان، سعودی عرب، شام، فلسطین اور ترکی وغیرہ۔

یہ ایک بہت وسیع علاقہ ہے اور ہر ملک کی اپنی اپنی تہذیب اور اس کا دائرہ اثر رہا ہے۔ لیکن عراق ایک مضبوط تہذیب کے طور پر سامنے آیا ہے۔

7000 بی سی، ہاسنا کلچر۔ یہ تہذیب شمالی عراق میں تھی۔ انہوں نے ظروف سازی میں جدتیں پیدا کیں اور جیومیٹری کے اشکال پر زور دیا۔

6500 بی سی۔ اناج کی فصلیں، گودام اور مرغیوں کی فارمنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

6200 بی سی۔ یہ عہد سمیریوں کا ہے۔ انہوں نے بہت خوب صورت اوزار بنائے۔ فارمنگ کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اپنی آبادیاں منظم کیں۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے میسوپوٹامیہ تہذیب کی بنیاد رکھی۔ یہ بہت دور دور تک پھیل چکے تھے۔

6000 بی سی ایبیہ کلچر۔ ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی نیا بادشاہ آتا تو تہذیب تو وہی رہتی تھی لیکن وہ اپنا اثر استعمال کر کے کچھ جدتیں پیدا کردیتا۔

5500 بی سی۔ تیل زیدان کلچر۔

5100۔ کسی بھی انسانی تہذیب کی پہلی عبادت گاہ کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہ عبادت گاہ جنوبی میسوپوٹامیہ میں تھی۔

5000 بی سی۔ سمیرین نے جنوبی میوپوٹامیہ سے اپنی جڑیں مضبوط کرلیں۔

5000 سے 4900 بی سی۔ سمیریوں نے اپنے کلچر کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ یہ لوگ ہر قسم کے دھاتوں کے استعمال سے واقف تھے۔

4800 بی سی۔ ایدوہ کلچر۔ انہوں نے منظم آبادیاں قائم کیں۔ مقابر اور عمارتیں بنوائیں۔

4100 بی سی۔ وسطی عراق میں بداریون کلچر کی بنیاد پڑی۔

4000 بی سی۔ (ار) شہر کا نام۔ ار میں سمیریوں کی آمد ہوئی۔

4000 بی سی۔ میسوپوٹامیہ میں ایک ایسی ایجاد جس نے پوری دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ اس ایجاد کے بغیر ترقی کا تصور تک نہیں ہوتا اور وہ ایجاد تھی پہیے کی۔ کہا جاتا ہے کہ پہیا انسان کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔

4900 بی سی۔ کیش میسوپوٹامیہ کا پہلا با قاعدہ شہر تعمیر ہوا۔ اس کے بعد اور کئی شہر وجود میں آئے جیسے ارک (Uruk) وغیرہ۔

3600 بی سی۔ عکادی تہذیب کے لوگوں نے شام سے میسوپوٹامیہ کی طرف ہجرت کی۔

3500 بی سی۔ سمیریوں نے کئی شہروں کے نظم ونسق سنبھال لیے جیسے ارک، گھاش وغیرہ۔

3450 بی سی۔ دنیا کے پہلے باضابطہ شہروں کی تعمیر خلیج ایران کے ساتھ ساتھ ہوئی۔

3300 بی سی۔ تحریر کا آغاز ہوا۔ سمیریوں نے مٹی کی تختیوں پر تحریر کا آغاز کیا۔

3100 بی سی۔ سمیریوں نے تحریر کو باضابطہ شکل دی۔

3000 بی سی۔ سمیریوں نے ریاضی میں 360 ڈگری کا اصول وضع کیا۔ ایک گھنٹے کے 60 منٹ بنائے۔ اس کے علاوہ اور ایسے کارنامے انجام دیے۔ جن کی وجہ سے اس تہذیب کو انتہائی ترقی یافتہ تہذیب کا نام دیا گیا جیسے ٹن اور کاپر کو ملا کر کانسی بنایا۔

میسوپوٹامیہ میں سواری کے لیے گھوڑوں کو جوڑ کر رتھوں کا استعمال۔ یہ رتھ جنگ میں بھی کام آیا کرتے۔

تاریخ میں پہلی بار خراب دانتوں کی فلنگ کا سلسلہ شروع کیا۔

سمیریوں نے دن کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کیا۔

سمیریوں ہی نے ایک منٹ کو 60 سیکنڈ میں تقسیم کیا تھا۔

2900 بی سی۔ یورک نے زراعت کا سسٹم وضع کیا اور یہ حکم دیا کہ کھیتی باڑی شہر سے باہر کی جائے۔

2700 بی سی۔ سمیریوں کے بادشاہ گل گاشی کا "یورک" پر حکومت۔

2700 بی سی۔ با قاعدہ فوجی بھرتی کیے جانے لگے۔

2700 بی سی۔ تاریخ کی پہلی معلوم باقاعدہ جنگ سمیریوں (عراق) اور ایلاسوں (ایران) کے درمیان ہوئی۔

2600 بی سی۔ میسوپوٹامیہ میں ایڈوانس ملٹری ٹریننگ دی جانے لگی۔

2600 بی سی۔ سمیریوں نے تاریخ میں پہلی دفعہ فوجی جوانوں کو شہروں کی حفاظت کے لیے مامور کیا (آج کے رینجرز سمجھ لیں)۔

2525 بی سی۔ تاریخ میں پہلی بار کسی بھی جنگ کی مکمل تفصیلات سامنے آئیں۔ یہ جنگ گھاش اور اوماریاستوں کے

درمیان ہوئی تھی۔ (دونوں عراق میں ہیں)۔
2500 بی سی۔ سمیریوں نے فوجیوں کے لیے ہیلمٹ (خود) بنائے۔
2500 بی سی۔ میسوپوٹامیہ میں ناپ تول کا نظام جاری ہوا۔
2350 بی سی۔ سمریوں کے دو شہر جل کر تباہ ہو گئے۔
2350 بی سی۔ عکادیوں نے سوسا کو فتح کر لیا۔
2340 بی سی۔ عکادیوں کے سارگان اول نے ایک نیا شہر عکاد یا اگاد بنوایا۔ بعد میں یہی تہذیب بابلی تہذیب کہلائی۔ اس نے سمیریوں کی زبان کی بجائے عکادی زبان اختیار کی۔
2330 بی سی۔ سارگان کی ایک بیٹی کی پیدائش۔ یہ اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ سمیریوں کی بہت بڑی شاعرہ تھی۔
2278 بی سی۔ سارگان کی موت۔ بیٹا جانشین ہوا۔
2250 بی سی۔ ایسے تیر استعمال ہونے لگے جو زرہ بکتر میں بھی گھس جایا کرتے۔
2200 بی سی۔ بابلیوں کی ملکہ سیمی۔ راس نے دنیا کو پہلی ایسی سرنگ دی جو دریا کے نیچے تھی۔ پانی کے اندر سرنگ پہلی بار بنائی گئی۔
1900 بی سی۔ آساریوں نے میسوپوٹامیہ کو متحد کیا۔
1800 بی سی۔ بابلیوں نے ریاضی میں ضرب کا اصول دیا۔
1792۔ حمورابی کی بابل پر حکومت۔
حمورابی انسانی تاریخ کا ایک اہم شخص ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس کے بارے میں کچھ بتا دیا جائے۔
حمورابی قدیم بابل کے پہلے شاہی خاندان کا چھٹا اور سب سے مشہور بادشاہ۔ اس نے سمیر اور عکاد کی ریاستوں کو اپنی قلم رو میں شامل کیا ارسا کے ایلس بادشاہ کو شکست دے کر اس کے علاقے پر قبضہ کیا۔
مگر حمورابی اپنی فتوحات سے زیادہ اپنے ضابطہ قوانین کے لیے مشہور ہے۔ حمورابی کا قانونی، آئینی اور اخلاقی ضابطہ دنیا کا سب سے قدیم ضابطہ ہے۔
کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ضوابط اس سے ماخوذ ہیں۔ اس کا ذکر انجیل میں بھی ہے۔
اس کے ضابطہ قوانین میں عدالت، کھیتی باڑی، آبپاشی، جہاز رانی، غلاموں کی خرید و فروخت، آقا اور غلام کے تعلقات، شادی بیاہ، وراثت، ڈاکا چوری وغیرہ سے متعلق قانون کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔
یہ ضابطے پتھر کی تختیوں پر کندہ ہیں اور برٹش میوزیم لائبریری میں محفوظ ہیں۔

اس کے چند اصول یہ ہیں۔
آنکھ کے بدلے آنکھ۔
کسی نے کسی پر الزام لگایا اور ثابت نہیں کر پایا تو الزام لگانے والے کو مار دیا جائے گا۔
اگر کوئی بیٹا اپنے باپ پر ہاتھ اٹھائے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں گے۔
عراق کے جائزے کے بعد ہم آجاتے ہیں یونان کی طرف۔
یونان 8000 بی سے 1600 بی سی تک۔
8300 بی سی سے 7000 بی سی تک۔ یونان میں Mesoli Thic عہد رہا ہے۔
7250 بی سی۔ یونان میں مُردوں کو دفن کرنے کے پہلے آثار ملے ہیں۔ یہ آثار آرگولڈ کے غاروں میں ملے تھے۔
7000 بی سی۔ غلہ پیدا کرنے اور ان کو اسٹور کرنے کے آثار ملے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے لوگوں کو بھی آنے والے کل کی فکر ہوتی تھی۔
یہ رجحان ابتدائی دور کے انسانوں کے رجحان سے بالکل مختلف ہے۔ اس زمانے میں رہنے کے لیے جو گھر بنائے گئے تھے وہ بہت سادہ سے ہوتے تھے۔
5700 بی سی۔ سیلو میں پہلے پختہ مکان کے آثار ملے ہیں۔
3400 بی سی۔ پہلی بار قلعہ بندی کے آثار ملے ہیں۔ یعنی اس دور کے انسانوں کو بھی باہری حملوں کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لیے اس نے قلعے بنانے شروع کر دیے تھے۔ یہ آثار ڈی مینی کے مقام پر پائے گئے ہیں۔
300 بی سی۔ ابتدائی کانسی کا عہد۔ اور پتھر کے مکانات۔
2600 بی سی۔ مائی نوان عہد۔
2000 بی سی۔ مائی نوان کے 3 عہد۔
1700 بی سی۔ مائی نوان کلچر کی تباہی۔
1627 بی سی۔ آتش فشاں پھٹ پڑا۔ جس سے بہت تباہی ہوئی۔
1600 بی سی۔ یہ وہ عہد ہے جب یونانی اساطیری کردار سامنے آئے۔ جیسے ہرکولیس اور اوڈی میں۔
چونکہ یہ دونوں کردار تاریخ میں مشہور ہیں اس لیے بہتر سمجھتا ہوں کہ ان کے بارے میں کچھ لکھ دوں۔
ہرکولیس۔
یونانی روایت کا ایک اہم کردار ہے۔ آپ اسے سپر ہیرو سمجھ لیں۔ روایت کے مطابق ہرکولیس زیوس دیوتا کا بیٹا تھا۔

اس کے طاقت ور ہونے کا اندازہ اس وقت ہو گیا تھا جب اس نے ایک بہت بڑے اژدھے کا سر کچل دیا تھا۔ اس وقت وہ چھوٹا سا بچہ تھا۔

روم اور یونان وغیرہ میں بچہ ہرکولیس کے بے شمار مجسمے ہیں۔ جن میں اسے اژدھے کا سر کچلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

وہ غیر معمولی طور پر طاقت ور انسان تھا۔ اس کا معبد گاہ اگری جنڈ میں ہے۔ ہرکولیس کے کردار پر بے شمار فلمیں بنائی گئی ہیں۔

اوڈی پس۔

یونانی دیو مالا کا ایک المیہ کردار۔

روایت کے مطابق اس کی پیدائش سے پہلے ستارہ شناسوں نے اس کے باپ بادشاہ تھیبس کو یہ بتا دیا تھا کہ اس کی موت اس کے بیٹے کے ہاتھوں ہوگی۔ لہٰذا جب اوڈی پس چھوٹا سا تھا تو اس کے پیروں میں زنجیریں باندھ کر اسے ایک پہاڑ پر چھوڑ دیا گیا۔

اس کی زندگی باقی تھی۔ اسے دیوتاؤں نے بچا لیا۔ ان ہی پہاڑوں میں اس کی پرورش ہوتی رہی۔

جب جوان ہوا تو اتفاقاً اس کی مڈبھیڑ اپنے باپ تھیبس سے ہوگئی۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے نہیں تھے۔

کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور تھیبس اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا۔ ستارہ شناسوں کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔

اب ہم آتے ہیں اس عہد کے ایک اور مضبوط کلچر کی طرف یعنی مصر کی طرف۔

مصر۔ 7500 بی سی سے 1500 بی سی تک۔

مصر شروع سے پراسرار رہا ہے۔

اس سرزمین سے سینکڑوں کہانیاں وابستہ ہیں۔ ان کہانیوں کا مرکز دریائے نیل ہے۔ قدیم اور تاریخی دریا۔ جس نے نہ جانے کتنے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔

7000 بی سی۔ انسان اس زمانے سے وادیٔ نیل میں آباد ہونے لگا تھا۔ اس نے کھیتی باڑی شروع کر دی تھی۔ اس کے علاوہ غلہ بانی بھی کرنے لگا تھا۔ یہ سلسلہ 3100 تک چلا۔ یعنی اس دوران کوئی بڑا واقعہ سامنے نہیں آیا۔ لیکن 3200 میں مصر کی قدیم تحریر Hairagly اسکرپٹ سامنے آ گئی۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے سمیریوں کی تحریر سامنے آ چکی تھی۔

پامر (بادشاہ) نے مصر کے زیریں اور بالائی حصوں کو متحد کیا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اس نے پہلی بار فرعون کا لقب استعمال کیا تھا۔ یعنی یہ تاریخ کا پہلا فرعون تھا۔

2700 بی سی۔ پتھروں کا پہلا اہرام تعمیر ہوا۔ پامر کے بعد سارے بادشاہ اپنے آپ کو فرعون کہلانے لگے تھے۔

2500 میں سب سے بڑا اہرام

اس کی تعمیر فرعون خوفو نے کروائی تھی۔ یہ اہرام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اہرام 147 میٹر بلند اور 65 لاکھ ٹن وزنی ہے۔ آج کے انسان کو بھی وہ ٹیکنالوجی حیران کرتی رہتی ہے۔

میں نے پتھروں کے پہلے اہرام کا ذکر کیا ہے۔ تو یہ اہرام فرعون پامر نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ اہرام ساگارا میں بنایا گیا تھا۔

یہ ایک سیڑھی دار اہرام ہے اور ہر منزل رقبہ اور انداز میں دوسرے کے برابر ہے۔

2200 میں بہت سے بادشاہوں کی حکومتیں تھیں۔

جن کے درمیان جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔

2055 بی سی۔ Menhotop نے پورے مصر پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

kamak کماک کی عبادت گاہ۔

اس کا پہلا حصہ درمیانی عہد میں بنایا گیا تھا۔ ہر عہد کے فراعین اس کی توسیع کرتے چلے گئے۔

1700 بی سی سے 1600 بی سی۔ Hyksos۔ ڈیلٹا کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ یہ وہ لوگ تھے جو باہر سے آئے تھے۔ یہ اپنے ساتھ نئی ٹیکنالوجی لے کر آئے تھے۔ یعنی رتھ۔ مصریوں میں رتھوں کو انہوں نے ہی متعارف کروایا تھا۔

1500 بی سی۔ فرعون Haishepsut کی حکومت۔

یہ تھا مصر کا 1500 بی سی تک کا جائزہ۔ اس کے بعد کے برسوں میں نصرت موسیٰ اور دریائے نیل وغیرہ کے واقعات ہیں۔

اب ذرا یورپ کا جائزہ لے لیتے ہیں۔

یورپ کے جائزے سے مراد یورپی ممالک ہیں۔ جیسے فرانس، بیلجیئم، اٹلی، یونان وغیرہ۔ چونکہ یونان کی ثقافت مضبوط تھی اور اس کا تاریخی پس منظر موجود ہے۔ اس لیے اس ملک کو ہم نے کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مجموعی طور پر یورپ کی صورت حال کچھ یوں تھی۔

8000 بی سی۔ یونانی دور کے آخری عہد کا خاتمہ۔

اب زمین کی سطح پر تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اسکاٹ لینڈ کے گلیشیئر غائب ہو گئے۔ انسانوں اور جانوروں نے برفانی عہد کے خاتمے کے بعد نئے سرے سے زندگی کا آغاز کیا۔

8 ہزار بی سی سے 7 ہزار بی سی۔ اب ہر طرف جنگل میں شکار کی افراط ہے۔ اس لیے انسانوں کے وہ گروہ پیدا ہوئے جو شکار پر گزارا کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایسے اوزار

استعمال کیے جو شکار کے لیے مفید ثابت ہوں ایسے اوزار آج بھی میوزیم میں موجود ہیں۔

برفانی عہد کے خاتمے اور زمینوں کی الٹ پھیر کے بعد بہت سی تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ وہ راستہ جو یورپ کے دوسرے ملکوں کو انگلینڈ سے ملاتا تھا۔ وہ غائب ہوگیا تھا۔

بہت سے جانوروں کی نسلیں بھی معدوم ہوگئی تھیں۔

6 ہزار بی سی سے یورپ میں بے پناہ گرمی کا آغاز ہوا۔ سمندروں میں طوفانی لہریں اٹھنے لگیں۔ گرمی کی وجہ سے جنگلوں میں آگ لگ گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے سارے درخت جل گئے تھے۔

4000 بی سی۔ فن لینڈ کے باشندے روس کی طرف ہجرت کرنے لگے۔

3000 بی سی۔ فن لینڈ کے لوگ کئی تہذیبوں میں تقسیم ہوتے گئے۔ یہ لوگ فن لینڈ سے روس تک پھیلے ہوئے تھے اور ہر ایک نے اپنی الگ شناخت بنائی تھی۔

3000 بی سی۔ جرمن کے باشندے اسکنڈے نیوین ممالک کے آباؤ اجداد ٹھہرائے گئے۔ موجودہ جرمنی کے علاقے میں زیادہ ہجرت ہوئی۔

2700 بی سی سے 1500 بی سی تک۔ ایک انتہائی طاقت ور معاشرے نے اپنے اثرات ڈالنے شروع کردیے۔ یہ لوگ کریٹ کے جزیرے میں تھے اور مختلف شعبوں میں کام کررہے تھے۔ جیسے صنعتیں، تجارت، وسائل کی تقسیم، عورتوں کے مساوی حقوق وغیرہ۔

ان پر 1450 بی سی میں یونانیوں نے فتح حاصل کرلی۔

میں ایک بار پھر واضح کردوں کہ میں نے دنیا کے بے شمار ممالک میں سے صرف ان کا انتخاب کیا ہے۔ جن کی تہذیبوں نے پوری دنیا پر اپنے اثرات ڈالے ہیں۔

زمانے کی تقسیم اس لیے کی گئی ہے کہ آپ تاریخ کے اس سفر میں جانتے چلے جائیں کہ ایک زمانے میں دنیا کے اور علاقوں میں کیا ہورہا تھا۔

ہمارا یہ سفر 1500 بی سی تک آچکا ہے۔

دراصل اس عہد کے بعد دنیا بہت تیزی سے تبدیل ہوئی۔ تہذیبیں وجود میں آنے لگیں۔ مذاہب اپنے اثرات مرتب کرنے لگے۔ کیوں کہ اس سے پہلے کا انسان عام طور پر یا تو شکاری تھا یا کھیتی باڑی کیا کرتا۔

اب ہمارا یہ سفر 1600 بی سی سے ایک بی سی تک کا ہے۔ اس سفر سے آپ بہت کچھ جان لیں گے۔ چونکہ ہم نے ابتدا برصغیر سے کی تھی۔ لہٰذا ہم یہ سفر بھی برصغیر سے ہی کررہے ہیں۔

ہندوستان 1500 بی سی سے ایک صدی تک۔ ہم آریاؤں کی آمد کے بارے میں بتا چکے ہیں۔ اب آریاؤں کے بارے میں کچھ اور باتیں۔ تاکہ آپ یہاں کے پورے پس منظر کو سمجھ سکیں۔

1500 بی سی۔ ہندوؤں کی مذہبی اور مقدس کتاب ویدانت لکھی گئی۔ لیکن ویدانت کے ذکر سے پہلے بہتر ہوگا کہ آریاؤں کے مذہب کا ایک مختصر جائزہ لے لیا جائے۔ اس کے بعد ویدانت کے حوالے سے بات ہوگی۔ یہ ایک دلچسپ اور اہم موضوع ہے۔ اس لیے اس کا ذکر اگر تفصیل سے ہو جائے تو بہتر ہوگا۔

آریاؤں کا رہن سہن کچھ یوں تھا۔

مؤرخین کا خیال ہے کہ آریہ کا سماج پدری تھا (یعنی مردانہ) یہ قوم کئی قبائل میں تقسیم تھی۔ جس کا سردار خاندان کا بزرگ ہوتا تھا اور راجا کہلاتا تھا۔

پنجاب، سندھ اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں آباد ہونے کے بعد ان کی معاشرتی درجہ بندی اس طرح سے تھی کہ راجاؤں کے نیچے شرفا اور امرا کا طبقہ تھا۔

پروہیت یعنی مذہبی رسمیں ادا کرنے والوں کی ایک جماعت الگ تھی۔ عام لوگ، کسان دست کار اور تاجر ہوتے تھے۔

آبپاشی کے لیے انہوں نے کنویں کھودنے اور رہٹ لگانے کا طریقہ بھی ایجاد کیا۔ یہ آریہ کانسی کے اوزار استعمال کرتے تھے۔ ان کی رسموں میں سونے کی خیرات کا ذکر بھی آتا ہے۔ راجے اور امرا برہموں کو سونے اور گائیوں کی شکل میں خیرات دیا کرتے۔

یہ لوگ مظاہر قوت کی منفی قوتوں آگ، بارش، بجلی، آسمان، طوفان، ہوا اور بہت سی دیگر قوتوں کی پرستش کرتے تھے۔

اس دور میں دریائے سندھ کے زیادہ تر لوگ دھرتی ماتا کی پرستش کرتے تھے۔ وادی سندھ کے لوگوں کے دیوتا دری یعنی زمین تھے۔

جب کہ آریاؤں کے دیوتا پدری یا مذکر ہوا کرتے۔

آریاؤں کے اندر دیوتا جنگ اور طوفان کا دیوتا تھا اور وہ سب سے بڑا سمجھا جاتا۔ آریا اپنے آگ کے دیوتا کو ''اگن دیوتا'' کہا کرتے اور اس کے سامنے بھینٹ چڑھایا کرتے۔ ورون دیوتا کو آسمانی دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اس دیوتا سے لوگ اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرتے۔

سورج کے دیوتا کو ''متھر'' دیوتا کہتے تھے۔ ایک اوشا دیوی بھی تھی۔ طلوع سحر کی اور حسن و جمال کی دیوی۔

غرض یہ کہ اس طرح کے بہت سے دیوتا اور دیویاں

تھیں۔ پھر چار ویدانت کے آنے کے بعد ان کے اس بے ترتیب مذہب کا رخ اور سمت متعین ہو گیا۔

ویدانت کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ بہت سے مفکرین اور تحقیق کرنے والوں کا خیال ہے کہ یہ "وید" اچھا ہی ہیں۔

پڑھنے والوں کی دل چسپی کے لیے بہتر ہے کہ اس موضوع کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ پہلے تو یہ جان لیں کہ ویدانت کی تعداد چار ہے۔

رگ وید۔

سام وید۔

یجر وید۔

اور اتھر وید۔

رگ وید کے اشلوک پڑھے جاتے تھے۔ سام وید کے بھجن گائے جاتے۔ یجر وید میں مذہبی رسوم کی ادائیگی کے طریقے درج تھے اور اتھر وید میں ایسے منتر ہیں جو جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکوں کے کام آتے ہیں۔

ہندو قوم رامائن اور مہا بھارت کی انسان کی لکھی ہوئی کتابیں تسلیم کرتی ہے لیکن ویدوں کے بارے میں ان کا نظریہ ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔

اس کے باوجود وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ وید کس رسول کے ذریعے دنیا میں آئے۔ اپنے نبی کو انہوں نے دیو مالاؤں میں گم کر دیا ہے۔

ویسے بھی وید کے دھرم دنیا کے تمام مذاہب میں متفقہ طور پر سب سے پرانا مذہب ہے اور حضرت نوحؑ دنیا کے سب سے پہلے صاحب شریعت رسول تھے۔

اب یہ دیکھیں کہ ہندو قوم وید کو کلام الٰہی مانتی ہے۔ پھر وہ اپنا نبی کس کو بتاتی ہے؟

اب اس سلسلے میں ایک فکر انگیز اقتباس پڑھیں۔

مشہور فرانسیسی مصنف A-5-Dubois نے چالیس سال تک ہندو مذہب اور ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ کیا۔

ہندو مذہبی رسم و رواج پر آج تک کی سب سے مستند اور ضخیم کتاب لکھی۔

Hindus Manwers Costom and Caremonics

اس نے اپنی کتاب میں جو حقائق بیان کیے ہیں، وہ قارئین کی دل چسپی کا سبب بنے بغیر نہیں رہیں گے۔

وہ لکھتا ہے:

مختصر یہ کہ ایک بہت مشہور شخصیت جس سے ہندوؤں کو بہت عقیدت ہے اور جسے وہ مہانوح یا مانو کے نام سے جانتے ہیں۔ (مانو کی اولاد مانوش یعنی آدمی کہلائی) سیلاب کی تباہی سے ایک کشتی کے ذریعے بچ نکلی۔ جس میں ساتھ مشہور وحشی جانور بھی سوار تھے۔

مہانوح دو الفاظ کا مرکب۔ مہا کے معنی عظیم اور نوح ظاہر ہے نوح ہیں۔

عملاً یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندوستان اس سیلاب عظیم کے بعد آباد ہوا تھا۔ جس نے پوری دنیا کو ویران کر دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس حیرت انگیز موضوع کو آگے بڑھاؤں ایک اور حیران کن امر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

ہندو اپنی زندگی کے تمام اہم اور مشہور واقعات و معمولات اور اپنی تمام عوامی یادگاروں کی تاریخ یا سن کو ایک سیلاب کے خاتمے سے شمار کرتے ہیں۔

بہر حال ہم ہندوستان کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے 1400 بی سی تک آ چکے ہیں۔ جب ویدانت کا ظہور ہوا۔

اس سلسلے کو اگر پسند کیا جائے تو ویدانت کے حوالے سے بہت کچھ اور بھی ہے۔ فی الحال تو ہم 1400 بی سی میں ہیں۔

اگلی قسط میں ہندوستان کے علاوہ ایران، چین، مصر، یونان وغیرہ تفصیل سے شامل ہوں گے۔ کیوں کہ انسانی تاریخ کا عروج شروع ہو چکا ہے۔

☆......☆

ہم انسانی تاریخ اور تہذیب کا مطالعہ کرتے ہوئے پندرہویں صدی قبل از مسیح تک آ چکے ہیں۔ دراصل انسان نے اس دورانیے میں زمینی ارتقاء حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے زندگی اپنے خاص لگے بندھے راستوں پر چل رہی تھی۔ سوائے چند تہذیبوں کے۔

انسان نے شعور 7500 یا 7000 قبل از مسیح ہی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا۔ بستیاں بسانے لگا تھا۔ ایک تہذیب کی نشو و نما کھلنے لگا تھا۔

آپ نے ان مضامین میں ایک لفظ کا استعمال بہت زیادہ دیکھا ہو گا اور وہ ہے تہذیب۔ سوال یہ ہے کہ تہذیب کیا ہے۔

یہ پورا موضوع ہی بہت دل چسپ اور وسیع ہے۔ کیونکہ انسان بھی اپنی تاریخ، فطرت اور کردار میں ہمہ گیریت رکھتا ہے۔

چلیں، تاریخ کے اگلے سفر پر جانے سے پہلے اگر کچھ باتیں تہذیبوں کے حوالے سے ہو جائیں تو انسانی تاریخ کو سمجھنے میں اور مدد مل سکتی ہے۔

جب انسان اس دھرتی پر وارد ہوا تو تہذیبوں کے درمیان تعلقات وجود ہی نہیں رکھتے تھے یا جزوی ہوا کرتے

تھے۔

نوع انسان کی تاریخ تہذیبوں کی تاریخ ہے۔ انسان کے ارتقاء کو کسی دوسرے زاویے سے سوچنا ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ کہانی مختلف تہذیبوں کی مختلف نسلوں کا احاطہ بھی ہے۔

دیکھا جائے تو انسان کی شعوری تاریخ۔ قدیم ہندوستان، سومیری، سطوی اور چینی تہذیبیں بنیاد ہیں انسانی تاریخ اور تہذیب کی۔

تہذیب کی ایک تعریف کچھ یوں بھی کی گئی کہ ”بربریت کی ضد تہذیب ہے۔ اس جملے کو اب کچھ یوں سمجھ لیں۔

جہاں قدیم انسان نے اوزاروں کا استعمال کیا۔ زراعت شروع کی۔ شہروں کی بنیادیں رکھیں۔ خاندان کی صورت میں ساتھ رہنے لگا۔ ظروف سازی اور دیگر چیزیں بنانے کی ابتدا کی۔ تاریخ وہیں سے شروع ہوتی ہے اور وہیں سے وہ کسی تہذیب کی بنیاد رکھتا ہے۔

اس کے برعکس ایک دوسری تصویر بھی ہے۔

وہ تصویر ہے جنگلوں میں بھٹکتے انسان کی۔ جس کا بدن لباس سے عاری ہے۔ جس کے ہاتھ میں شکار کرنے کے لیے صرف تیر ہے۔ جو خاندان یا گروپوں کی صورت میں نہیں رہتا۔ کوئی مہذب معاشرہ کسی قدیم معاشرے سے اس لیے مختلف ہوتا ہے کہ اس کے اندر نظم وضبط ہوتا ہے۔ یہ معاشرہ شہری ہوتا ہے اور اس کے شہری باشعور ہوتے ہیں۔ مہذب ہونا خیر، تو نا مہذب ہونا شر۔

اب تہذیب کے ساتھ ایک اور اصطلاح ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ ہے ”ثقافت“ ان دونوں میں فرق کیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ان سطور کو پڑھتے ہوئے آپ یہ سوچ رہے ہوں کہ تاریخ اپنا سفر طے کرتی ہوئی تہذیبوں کی بحث میں کیوں الجھ گئی۔

لیکن میرا خیال ہے کہ یہ گفتگو بھی اس لیے ضروری ہے کہ یہ واضح ہوسکے کہ جنگیں صرف زر، زمین اور زن ہی کے لیے نہیں لڑی گئیں بلکہ تہذیبوں کے تحفظ کے لیے بھی ہوئی ہیں۔

(یہ بہت پرانی بات ہے۔ زر، زمین اور زن والی۔ اس میں بے چاری زن خوامخواہ شامل کردی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ جنگیں زن کے لیے بھی ہوئی ہوں لیکن ننانوے فی صد جنگوں کا سبب زمین اور تہذیبوں کا تسلط تھا۔)

تو تہذیب اور ثقافت کے درمیان کیا فرق ہے۔

انیسویں صدی کے جرمن فلاسفرز نے تہذیب اور ثقافت کا فرق کچھ یوں واضح کیا تھا کہ تہذیب وہ ہوتی ہے جو میکانیات، ٹیکنالوجی اور مادی طاقت پر محیط ہوتی ہے۔ جب کہ ثقافت کسی معاشرے کی اقدار، آئیڈیلز اور اعلیٰ ترین فلسفیانہ، ذہنی اور اخلاقی صفات پر مشتمل ہوتی ہے۔

اس فرق کو جرمن فلاسفرز کے علاوہ اور کسی نے قبول نہیں کیا بلکہ چند ماہرین نے تو اس نسبت کو برعکس کر کے تہذیب اور ثقافت کا فرق اس طرح واضح کیا۔

ثقافت، قدیم، جامد، غیر شہری معاشروں کی خصوصیات ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس ترقی یافتہ، شہری اور حرکت پذیر معاشرے تہذیب کہلاتے ہیں۔

تہذیب ہو یا ثقافت دونوں ہی افراد کے اجتماعی اندازِ زیست کی ترجمانی کرتی ہیں۔ تہذیب وسیع، تناظر میں ثقافت ہی ہوتی ہے۔ تہذیب وثقافت میں اقدار، ادارے اور سوچ پر اقسام شامل ہوتے ہیں۔ جن کو ایک معاشرے کی کئی نسلیں مسلسل اہمیت دیتی چلی آرہی ہیں۔

براڈل کے خیال میں کوئی تہذیب ایک ثقافتی علاقہ ہے۔ ثقافتی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔

ویلر اسٹائن تہذیب کی تعریف اس طرح بیان کرتا ہے۔ ”تہذیب دنیا کے بارے میں نقطۂ نظر، رسوم ورواج اور مادی ثقافت واعلیٰ ثقافت کا ایک مخصوص سلسلہ ہے۔ اینگلز کے خیال میں تہذیب ثقافت کی اگلی منزل ہے۔

مختصر یہ کہ تہذیب کی تمام تعریفوں میں ثقافت شامل ہے۔

تہذیب کی تعریف طے کرنے والے بنیادی ثقافتی عوامل وہی ہیں جنہیں ایتھنز کے لوگوں نے کلاسیکی صورت میں تخلیق کیا تھا۔

خون، زبان، مذہب اور اندازِ زیست ایسی خصوصیات ہیں جو کہ تمام یونانی لوگوں میں مشترک تھیں اور انہیں اہل فارس اور دوسرے غیر یونانی لوگوں سے منفرد بناتی تھیں۔ تاہم تہذیب کی تعریف کرنے والے تمام معروضی عوامل میں مذہب سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔

چونکہ ہم انسانی تاریخ کا مطالعہ کررہے ہیں۔ لہٰذا انسان کے ساتھ قوموں کی اصطلاح بھی وابستہ ہے اور اس کے ساتھ ان تہذیبوں کی جو مختلف ادوار میں پوری دنیا پر حکمرانی کرتی رہی ہیں۔

آپ نے انسانی تاریخ کے حوالے سے ان تہذیبوں کے حوالے سے کچھ نہ کچھ تو جان لیا ہوگا۔ اب ذرا ان بڑی تہذیبوں کا جائزہ لیتے ہوئے تاریخ کے سفر پر پھر سے روانہ ہوتے ہیں۔

چینی تہذیب:

تمام علماء اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ کم از کم 2 ہزار قبل از مسیح سے چینی تہذیب موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تہذیب اس سے بھی ہزار سال پہلے سے موجود ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو چینی تہذیبیں ہوں۔ جس میں سے ایک نے عیسوی دور کی پہلی صدی میں دوسری کی جگہ لے لی ہو۔ کنفیوشس مت چینی تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے۔

لیکن چین کی تہذیب کنفیوشس مت کے علاوہ بھی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ چینی تہذیب کی اصطلاح اس مشترک ثقافت کی ترجمانی کرتی ہے جو چین کے علاوہ جنوبی مشرقی ایشیا کی چینی برادریوں اور چین سے باہر یکساں ثقافت کے حامل افراد والے ملکوں مثلاً ویت نام اور کوریا پر محیط ہے۔

جاپانی تہذیب:

چند اسکالرز جاپانی اور چینی تہذیب کو مشرق بعید کی تہذیب کے نام سے اکٹھا کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر اسکالرز جاپان کو ایک علیحدہ تہذیب قرار دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ جاپانی تہذیب چینی تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہ تہذیب 100ء سے 400ء کے درمیانی عرصے میں وجود میں آئی تھی۔

ہندو تہذیب:

یہ بات متفقہ طور پر مانی جاتی ہے کہ برصغیر میں کم از کم ایک یا ایک سے زیادہ تہذیبیں مسلسل موجود ہیں۔

ان تہذیبوں کو عام طور پر انڈین، انڈک (Indic) یا ہندو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دو ہزار قبل از مسیح سے ہندومت کسی نہ کسی صورت میں برصغیر کی ثقافت میں بنیادی حیثیت کا حامل رہا ہے۔

ہندومت مذہب یا سماجی نظام نہیں بلکہ انڈین تہذیب کی روح ہے۔ یہ موجودہ دور میں بھی اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

حالانکہ ہندوستان میں دوسری ثقافتی اقلیتوں کے علاوہ مسلمان بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہ اصطلاح ہندو بالکل اس طرح تہذیب کے نام کو اس کی مرکزی ریاست کے نام سے جدا کرتی ہے جس طرح کہ اصطلاح "چینی" ہے۔ اس اصطلاح کو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ اس تہذیب کی ثقافت مرکزی ریاست کے بنا پر بھی وسعت اختیار کر گئی ہے۔

اسلامی تہذیب:

تمام نمایاں اسکالر تو اس حوالے سے متفقہ رائے رکھتے ہیں کہ دنیا میں ایک علیحدہ اسلامی تہذیب موجود ہے۔

اسلام ساتویں صدی میں جزیرہ نمائے عرب میں ظہور میں آیا اور تیزی کے ساتھ شمالی افریقا اور جزیرہ نمائے آئبیریا تک پھیل گیا۔ پھر بعد میں یہ وسطی ایشیا، برصغیر اور جنوبی مشرقی ایشیا تک وسعت اختیار کر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اسلام کے اندر بہت سی منفرد ثقافتیں اور ذیلی ثقافتیں موجود ہیں۔ جن میں عرب، ترک، فارس اور ملائی ثقافتیں ہیں۔

آرتھوڈوکس تہذیب:

اکثر بیشتر اس کا طرز الگ آرتھوڈوکس تہذیب کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں جس کا مرکز روس ہے۔

آرتھوڈوکس تہذیب بازنطینی سلسلۂ نسب، متعدد مذہب، دو سو سالوں پر محیط تاتاریوں کی حکومت، بیورو کریٹک، اقربا پروری، نشاۃ الثانیہ، اصطلاح روشن خیالی اور دوسرے اہم مغربی تجربوں سے محدود استفادے کی وجہ سے مغربی عیسائیت سے ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

مغربی تہذیب:

عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب 1700 یا 800 عیسوی کے لگ بھگ وجود میں آئی۔

اسکالرز کا تصور ہے کہ اس کے تین اجزا ہیں یعنی کہ یورپ، شمالی امریکا اور لاطینی امریکا۔

لاطینی امریکی تہذیب:

لاطینی امریکا ایک ممتاز شناخت رکھتا ہے۔ جو اسے مغرب سے مختلف قرار دلواتا ہے۔

لاطینی امریکی تہذیب یورپی تہذیب کی پیداوار ہے۔ تاہم لاطینی امریکا نے ہر حوالے سے یورپ اور شمالی امریکا سے اپنی راہیں الگ اختیار کی ہیں۔

اس کی ثقافت کا مزاج اجتماعی اور آمرانہ ہے۔

یورپ اور شمالی امریکا پر "اصطلاح" کے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور دونوں نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ثقافتوں کو ملا کر یک جان کر لیا ہے۔ اس کے برعکس لاطینی امریکا تاریخی اعتبار سے کیتھولک ہی رہا ہے۔

لاطینی امریکی تہذیب میں وہ ثقافتیں شامل ہیں جن کا یورپ میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ ثقافتیں میکسیکو وسطی امریکا، پیرو بولیویا، ارجنٹائن اور چلی میں الگ الگ خصوصیات کے ساتھ رائج ہیں۔

لاطینی امریکا کا سیاسی اور اقتصادی ارتقا شمالی امریکا سے مختلف ہے۔

لاطینی امریکا کے لوگ اپنے تشخص کے سوال پر تقسیم ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم مغرب کا حصہ ہیں اور کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی علیحدہ ثقافت رکھتے ہیں۔

اب آجائیں افریقی تہذیب کی طرف:

براڈل (ماہر معاشریات) کے سوا تہذیبوں کے اکثر د

پیشتر اسکالرز جدا افریقی تہذیب کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔

جہاں تک براعظم افریقا کا تعلق ہے تو اس کے مشرقی ساحلی علاقے اور شمالی افریقا اسلامی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایتھوپیا تاریخی اعتبار سے اپنی الگ تہذیب کا حامل رہا ہے۔

تہذیبوں کو تشکیل دینے والا مرکزی عامل مذہب ہوتا ہے۔ کرسٹوفر ڈاسن کے بقول "عظیم مذہب وہ بنیاد ہوتے ہیں جن پر عظیم تہذیبیں استوار ہوتی ہیں۔"

ویبر نے جن پانچ عالمی مذاہب کا ذکر کیا ہے ان میں سے چار مذہب یعنی کہ عیسائیت، اسلام، ہندومت اور کنفیوشس مت عظیم تہذیبوں کی بنیاد ہیں۔

پانچواں مذہب بدھ مت کسی بڑی تہذیب کی بنیاد نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام اور عیسائیت کی طرح بدھ مت ابتدا میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور عیسائیت کی مانند اپنی پیدائش کے مقام پر باقی نہیں رہا ہے۔

بدھ مت پہلی صدی عیسوی میں چین اور پھر کوریا، ویت نام اور جاپان میں رائج ہو گیا۔ ان معاشروں میں بدھ مت مقامی ثقافتوں میں جذب ہو گیا (مثلاً چین میں بدھ مت کنفیوشس مت اور تاؤ مت کے ساتھ ضم ہو گیا) اور اس کے زیر تسلط ہو گیا۔ اس لیے بدھ مت ان ملکوں کی ثقافتوں کا ایک اہم حصہ تو ہے لیکن ان کے معاشرے بدھ مت کی بنیاد پر صورت پذیر نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ خود کو بدھ مت کا جز قرار دیتے ہیں۔

سری لنکا، برما، تھائی لینڈ، لاؤس، کمبوڈیا، تبت، منگولیا اور بھوٹان میں بدھ مت رائج ہونے کے باوجود بدھ تہذیب وجود نہیں رکھتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ مت ایک بڑا مذہب تو یقیناً ہے لیکن یہ کسی عظیم تہذیب کی اساس نہیں بن سکا ہے۔

یہ تھا تہذیبوں کا جائزہ اور ان کے حوالے سے کچھ باتیں۔ اس حوالے سے یہ ساری گفتگو Semail P.wating Tan کی مشہور کتاب Clash of Civilization سے لی گئی ہے۔

اب ہم پھر تاریخ کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔

لیکن ایک نظر جائزہ لے لیا جائے کہ ہم نے کہاں تک سفر کیا ہے۔

ہم نے اپنا سفر قبل از مسیح تک کر لیا ہے (ہندوستان اور ایران کا۔ جب کہ ابھی دوسری تہذیبوں کے ذکر باقی ہیں۔ پھر بھی بہتر ہے کہ آپ تاریخ وار انسانی ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے چلیں۔)

قبل مسیح

3500۔ سمیریوں نے فن تحریر ایجاد کیا۔ مینز نے مصر کو متحد کیا۔

3000۔ مشرق وسطیٰ میں کانسی کے دور کا آغاز ہوا۔ خوفو کا عظیم اہرام مصر میں تعمیر ہوا۔

2500۔ عسکا قوم کے سارگون نے سمیر کو فتح کیا۔

2000۔ اوّلین حروف تہجی تشکیل ہوئے۔ حمورابی نے ضابطۂ اخلاق وضع کیا۔

1500۔ اخناتون کا دور۔ مصر سے حضرت موسیٰ کی ہجرت۔ مشرق وسطیٰ میں لوہے کا استعمال عام ہوا۔ ٹروجن کی جنگ ہوئی۔

1000۔ یروشلم میں حضرت داؤد کی حکومت۔

600۔ چین میں لوہے کے دور کا آغاز۔ ایران میں زرتشت کا دور۔ بابلیوں نے یہودیوں کو مسخر کیا اور معبد سلیمان کو تباہ کر دیا۔

گوتم بدھ کا دور سائرس اعظم بابل کو فتح کرتا ہے۔

500۔ کنفیوشس کا دور میراتھن کی جنگ ہوئی اور اعلیٰ اسلحہ سازی کا چلن ہوا۔

سوفوکلیز۔ پریکلز۔ ہیروڈوٹس کا دور۔

ہپوکریٹس۔

400۔ سقراط کی موت۔ افلاطون۔ ارسطو۔ سکندر اعظم۔ مائی۔ لاؤتسو۔

300۔ اقلیدس۔ مہاراجا اشوک۔ اسٹارکس آن ساموس۔ آرشمیدس کا دور۔ شی یانگ تی چین کو یکجا کرتا ہے۔

200۔ دوسری پیونک جنگ میں روم نے کارتھیج کو شکست دی۔ یویانگ نے ہانگ خاندان کی بنیاد رکھی۔ روم یونان پر قبضہ کرتا ہے۔

100۔ جولیس سیزر نے گاؤلی قوم پر فتح پائی۔ اوّلین رومی شہنشاہ آگسٹس سیزر کا دور۔

یہ ایک مختصر جائزہ تھا۔

اب ہم پھر تاریخ کو مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے حوالے سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے 1500 قبل مسیح تک ہندوستان اور ایران کے حوالے سے بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہ سفر کرتے ہوئے پہلی صدی تک آ چکے ہیں۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ 1500 قبل از مسیح کے بعد چین کی کیا صورت حال تھی۔ یہ یاد رہے کہ چینی تہذیب دنیا کی عظیم اور قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ چین سے ہمارے ملک کا رشتہ بھی مضبوط ہے۔ اس لیے اس ملک کی عظیم تاریخ کے بارے میں کچھ جان لیا جائے تو

بہتر ہوگا۔

ہم 1500 قبل مسیح تک کے حالات جان چکے ہیں۔

اب اس سے آگے دیکھیں کہ چین میں کیا ہوا تھا؟ 1590 قبل از مسیح۔ ینگ جی کی حکومت تھی۔ یہ سکا تنگ سلسلے کا آٹھواں بادشاہ تھا۔ اس نے بارہ برسوں تک ایک مضبوط حکومت کی اور چین کی تاریخ میں اپنے نقوش ثبت کر دیے۔

1503 قبل مسیح۔ ژوان ڈنگ کی حکومت تھی۔ 1492 میں دائی ران کی حکومت تھی۔ 1477 میں میڈ ان جی کی حکومت رہی۔ 1400 میں زوڈینگ کی حکومت آئی۔

اس عہد میں چین میں شہری حکومتیں بننی شروع ہو گئی تھیں اور کانسی کا استعمال ہونے لگا تھا۔ اس عہد کے آثار چین کے ہینان صوبے میں 1951ء میں دریافت ہوئے۔ حکومتوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔

1290 قبل مسیح میں پانگ ینگ کی حکومت۔ اس کے عہد میں دارالحکومت کی منتقلی ہوئی تھی۔

1250۔ دو ڈنگ کی حکومت۔ اس عہد کی قدیم تحریریں ہڈیوں پر لکھی ہوئی ملی ہیں۔

1192 سے 1101 تک۔ کئی بادشاہوں کی حکومتیں رہیں۔ جیسے زوجیا۔ زرمیا۔ لن ژن۔ جنگ ڈنگ۔ دوای۔ دین ڈنگ ڈی ای وغیرہ۔

1075 سے 1046 تک۔ زان کا عہد۔ اس عہد میں ناپ کا سسٹم متعارف کروایا گیا۔ مایو کی جنگ ہوئی۔ یہ جنگ شانگ اور زان کے درمیان ہوئی تھی۔

پھر زان کی موت۔ لوگ اتنے بپھرے ہوئے تھے کہ اس کا محل تک جلا دیا گیا۔

1074۔ کنگ وڈ۔ اس عہد میں تختیوں پر لکھنے کا عمل شروع ہوا۔

1020 سے 1000 قبل از مسیح۔

بادشاہ گا تنگ کی حکومت۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس عہد میں چینی شاعری اور گیتوں کی کتاب مرتب ہوئی۔ جس کو کلاسینک کا درجہ دیا گیا ہے۔

976 سے 885۔

بادشاہ مو کی حکومت۔ اس کے عہد میں رانگ لوگوں سے ایک خونی جنگ ہوئی۔ اس جنگ پر بہت اعتراضات اٹھائے گئے۔

771 تک اس طرح مختلف بادشاہ آتے رہے۔

770 سے 722 قبل مسیح۔ کنگ پی کی حکومت۔ اس کے عہد میں خزاں اور بہار کے دنوں کی تقسیم کی گئی۔

اس کے بعد 720 سے 606 تک کی ترتیب کچھ اس طرح ہے۔

ثیوآن۔ ژوِ وانگ۔ ژی۔ ژیانگ (قدیم چین کا مضبوط حکومتوں میں سے ایک)۔

606 سے 695۔ کنگ ڈنگ۔ اس عہد میں سن شو پیدا ہوا۔ اس شخص کو چین کے پہلے ہائیڈرالک انجینئر کا اعزاز حاصل ہے۔ پھر 571 سے 551۔ کنگ لنگ کی حکومت۔ یہ عہد کنفیوشس کا تھا۔

چین کا ذکر کنفیوشس کے ذکر کے ... بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ چین کی پوری تاریخ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا یہی فلاسفر ہے۔

عظیم چینی فلسفی کنفیوشس پہلا آدمی تھا جس نے چینی عوام کے بنیادی اعتقادات کو ملا کر عقائد کا ایک نظام وضع کیا۔

اس کا فلسفہ شخصی اخلاقیات اور ایک خاص حکومت کے تصور پر مبنی ہے جو عوام کی خدمت کرتی اور اپنی اخلاقی مثال کی بنیاد پر حکومت کرتی ہے۔

اس فلسفے نے چینی زندگی اور تہذیب کو دو ہزار سے زائد برسوں تک اپنے سحر میں رکھا اور دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصے پر گہرے نقوش مرتب کیے۔

کنفیوشس یو کی مختصر ریاست میں 551 قبل مسیح پیدا ہوا۔ یہ شمالی چین میں شان تنگ کے موجودہ قصبے میں واقع تھی۔

بچپن ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گیا۔ اس نے ایک معمولی سرکاری عہدیدار کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ چند ہی برسوں میں اس نے اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اگلے سولہ برس اس نے تبلیغ و تدریس میں گزار دیے۔ اس کی حیثیت خانہ بدوش استاد جیسی تھی۔

کنفیوشس کے دور میں چین پر چار خاندان کی حکومت تھی۔ یہ چین میں عظیم لفظی جوش و خروش کا دور تھا۔ اس کے پیروکاروں پر برے دور میں آتے رہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کی تمام کتابیں جلا دی گئی تھیں۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ کنفیوشس مت کو چین نے سرکاری فلسفے کے طور پر اپنا لیا گیا تھا۔ اس عہد میں ایک قدیم بورڈ گیم بھی ایجاد ہوا تھا۔

کنفیوشس کے مختصر تعارف کے بعد ہم آگے بڑھتے ہیں۔

544 سے 543۔ جنگ کی حکومت۔ اس عہد کی خاص بات یہ ہے کہ سلطنت کے قوانین مرتب ہوئے۔ کاسٹ آئرن سامنے آیا۔ لوہے کا ایک پل بنایا گیا۔ اس کے علاوہ چین میں ایک طویل نہر تعمیر کی گئی۔

475 سے 474 کنگ یوآن کی حکومت۔

اس کے دور میں موزی کی پیدائش ہوئی جو چین کا ایک بڑا فلاسفر تھا اس کی تحریک کو موشی ازم کا نام دیا گیا۔

401 سے 381 کنگ ان۔ اس کے عہد میں ایک بہت بڑا استارہ شناس سامنے آیا۔ اس کے عہد میں تیار ہونے والا چین کا قدیم ترین نقشہ دستیاب ہوا ہے۔

381 قبل از مسیح۔ ووکی موت۔ اس کی موت پر فلاسفر اور شاعروں ۔۔ نے جو کتاب لکھی اسے چین کے سات عظیم المیوں میں سے ایک قرار دیا گیا ہے۔

368 سے 342۔ کنگ ژیان۔ اس کے عہد میں لڑائیوں میں خمیدہ کمانیں استعمال ہوئیں۔ 314 سے 268 کنگ ژان۔

اس کے عہد میں ژویان کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک بڑا فلاسفر تھا۔ اس نے پانچ عناصر کی تھیوری پیش کی۔

300 قبل از مسیح۔ چین کی قدیم ترین ڈکشنری مرتب ہوئی۔ کیویوان نے ایک شاندار نظم لکھی جو چینی زبان کی کلاسک میں ہے۔ زرعی نظام نافذ ہوا۔

371۔ چین میں کین عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ چین کا سب سے طویل اور مضبوط عہد۔ اس دور میں پورا چین متحد ہوا تھا اور اسی دور میں عظیم دیوار چین کی تعمیر شروع ہوئی۔

213۔ کنفیوشس مکتبہ فکر کے خلاف ہنگامہ، بے شمار کتابیں جلا دی گئیں۔ حکومت کا سرکاری فلسفہ Legalilism نافذ کر دیا گیا۔

209 قبل از مسیح۔ ویت نام پر چین کا قبضہ ہوا۔

206۔ کن عہد کا خاتمہ۔

190۔ بادشاہ ہوئی کی حکومت قائم ہوئی۔ چین کو یورپ سے ملانے کے لیے شاہراہ ریشم کی تعمیر ہوئی۔

اس کے بعد سو قبل از مسیح تک چین میں بادشاہ آتے اور جاتے رہے۔ کنفیوشس ازم جو معتوب ہو گیا تھا دوبارہ سرکاری فلسفہ بن گیا۔

فلسفہ کے میدان میں کئی اہم کتابیں سامنے آئیں۔

اس عہد میں کئی ملکوں کو وفود روانہ کیے گئے۔ جیسے عراق، فرغانہ وغیرہ۔

100 قبل از مسیح میں لوہے کا استعمال ہوا۔

37 قبل از مسیح میں چین کی موسیقی کی کتاب مرتب ہوئی۔

یہ تھا 1500 قبل از مسیح سے پہلی قبل از مسیح تک چین کا جائزہ۔

ہم نے اس قسط میں تہذیبوں پر ہی بحث کی ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی تاریخ پر یہ تہذیبیں کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔

ہم نے اس قسط میں اب تک ہندوستان، ایران اور چین کا جائزہ لیا ہے۔

اس جائزے کے بعد اس کے بعد والی قسط میں دنیا کی اور بڑی تہذیبوں جیسے یونان، مصر، مشرقِ وسطی اور امریکا وغیرہ کا جائزہ لیا جائے گا۔

☆......☆

اب ہمارے پاس جو عہد ہے وہ 15 سو یا 16 سو بی سی کے بعد کا ہے۔

ہندوستان کا جائزہ ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ ہم 14 سو بی سی تک پہنچ چکے ہیں۔ جب وید ہمارے سامنے آئے۔

(ویدوں کا مختصر تعارف ہو چکا ہے)

اب ہم اس عہد سے آگے کا سفر کرتے ہیں۔

1500 بی سی میں آریاؤں نے دراوڑوں پر مکمل فتح حاصل کر لی تھی۔

1100 بی سی۔ آریاؤں نے لوہے کے اوزار استعمال کرنے شروع کر دیے۔

1000 بی سی۔ رگ وید مکمل ہو گئی۔ واضح ہو کہ وید کے اشوک لکھے نہیں جاتے تھے بلکہ سینہ بہ سینہ ایک دوسرے تک منتقل کیے جاتے اور یہ کام برہمن پنڈتوں کا تھا۔

موجودہ دور میں ویدوں پر سب سے پہلے تحقیق کرنے والا میکس مولر تھا۔ بیس سال تک بے تکان محنت کرنے اور بے اندازہ خرچ کرنے کے بعد اسے صرف سائن آچاریہ کی تفسیر ہی مکمل حالت میں حاصل ہو سکی تھی۔

اس کی مدد سے اس نے سینکڑوں ہندوستانی پنڈتوں کی مدد سے کثیر تعداد میں کھوئے ہوئے ویدوں کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

900 بی سی۔ آریاؤں نے راوی و گنگا پر حکومت قائم کر لی۔

876 بی سی۔ ہندوؤں نے زیرو یعنی صفر کا استعمال شروع کیا (اس پر اختلاف ہے کچھ کے خیال میں صفر عربوں کی ایجاد ہے)۔

750 بی سی۔ ہندوستان (پاکستان) پر بے شمار مہاراجاؤں کی حکومت رہی۔

700 بی سی میں برہمنوں نے کاسٹ سسٹم شروع کیا۔

اس ہندو سماج کے معاشرتی قوانین منو (Monno) کے دھرم شاستر میں تفصیل سے درج ہیں۔

اس دھرم شاستر نے ہندو سماج کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔

ان سبھوں کے الگ الگ فرائض ہیں۔

600 بی سی۔ اپنشد سنسکرت میں مکمل ہوئی جو ہندو فلاسفی اور میتھالوجی کی زبردست تصنیف ہے۔

اس دور میں ہندو فلاسفر فکری لحاظ سے اپنے عروج پر

تھے۔ کئی ایسے فلسفیانہ اسکول پیدا ہو رہے تھے جو اپنے اپنے اندازِ فکر کے مطابق کائنات اور انسان کی زندگی پر غور کر کے نتائج مرتب کر رہے تھے۔

اس ضمن میں کپل کا سانکھ شاستر، پتن جلی کا یوگ شاستر اور گوتم کا اپنا نے شاستر قابلِ ذکر ہیں۔

ان شاستروں میں فلسفیانہ فکر کی پروازیں بہت بلند نظر آرہی ہیں۔ ویدانت یعنی تصوف کے حوالے سے بھی اس دور میں بہت سالٹریچر سامنے آیا۔

543 بی سی۔ بہار کے بھیم نے مگدھ پر قبضہ کر کے راج گڑھ کو دارالسلطنت بنالیا۔

500 بی سی۔ مہاتما بدھ کا دور۔

527 بی سی۔ شہزادہ سدھارتھ (مہاتما بدھ) کو نروان حاصل ہوا۔

مہاتما بدھ کے حوالے سے کچھ تفصیل بھی بیان کردوں۔

گوتم بدھ کا زمانہ 483 تا 563 بی سی بتایا جاتا ہے۔

اصل نام شہزادہ سدارتھ تھا جو بدھ مت کے بانی ہیں۔ جو دنیا کے عظیم مذاہب میں سے ایک ہے۔ سدارتھ کپل وستو کے راجا کے بیٹے تھے جو شمالی ہندوستان کا ایک شہر ہے۔

سولہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہم عمر ہم زاد سے ہو گئی۔ شاہی محل کے پرتعیش ماحول میں پرورش ہوئی۔ تاہم وہ اس ماحول کے عادی نہیں ہوسکے۔ انہوں نے مشاہدہ کیا کہ زیادہ تر لوگ غریب ہیں اور اس محرومی کے سبب مستقل ابتلاؤں میں گھرے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ دولت مند بھی اکثر مایوس اور ناخوش رہتے ہیں۔ نیز ہر شخص بیماری کا شکار ہوتا اور آخر کار مرجاتا ہے۔

قدرتی طور پر سدارتھ نے غور کیا کہ کیا کوئی ایسی کیفیت بھی ہے جوان عارضی مسرتوں سے جو بالآخر موت اور بیماری پر منتج ہے۔

انتیس برس کی عمر میں جب ان کے بچے کی پیدائش ہوئی تو گوتم نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرلیں اور خود کو سچ کی تلاش کے لیے وقف کردیں۔

دنیا کی ساری آسائش کو چھوڑ کر بالآخر ایک برگد کے درخت کے نیچے انہیں نروان حاصل ہوگیا۔

بدھ کی بنیادی تعلیمات کو بدھوں کے الفاظ میں چار اعلیٰ سچائیوں کے عنوان سے سمیٹا جاسکتا ہے۔ اول: انسانی زندگی اپنی جبلی حیثیت میں دکھوں کا مسکن ہے۔ دوم: اس ناخوشی کا سبب انسان کی خودغرضی اور خواہش ہے۔ سوم: اس انفرادی خودغرضی اور خواہش کو ختم کیا جاسکتا ہے اور ایسی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے جس میں خواہشات اور آرزوئیں فنا ہو جاتی ہیں۔

اسے اصطلاحاً نروان کہا جاتا ہے۔

(نروان کے لغوی معنی پھٹ پڑنے یا تنسیخ کرنے کے ہیں) چہارم: اس خودغرضی اور خواہش سے فرار کا ذریعہ آٹھ راست راہیں ہیں۔

1۔ راست نقطۂ نظر۔ 2۔ راست سوچ۔ 3۔ راست گوئی۔ 4۔ راست بازی۔ 5۔ رات طرز بود و باش۔ 6۔ راستا سعی۔ 7۔ راستا ذہن اور راست تفکر۔

بدھ مدت ہر کسی کے لیے آغوش وا کیے ہوئے تھا۔ خوشی کا مسئلہ تھا اور نہ ہندوؤں کی طرح ذات اور برادری کی اہمیت تھی۔

521 بی سی۔ ایران کے دریوزوں نے اپنی سلطنت کو پنجاب اور سندھ تک وسیع کردیا۔

500 بی سی۔ مہاویر نے جین ازم کا آغاز کیا۔

ہندوستان میں جن دنوں بدھ مت کی تعلیمات پھیلائی جارہی تھیں اور انسان کی روحانی اور فکری سرگرمیوں کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان کے اندر کئی قسم کے فلسفیانہ افکار پیدا ہو رہے تھے۔ ان ہی دنوں بدھ مت کی طرح۔ جین مت کا بھی ظہور ہوا۔ جس نے اپنے پیروں کی خاصی تعداد اکٹھی کرلی۔ جو آج بھی ہے۔

جین مت کا بانی مگدھ دیش (بہار) کے ایک کشتری رئیس کا بیٹا مہاویر تھا۔

مہاویر نے تیس سال کی عمر میں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر دنیا تیاگ دی اور چالیس سال کی عمر میں اپنے دین کا پرچار شروع کردیا۔

(گوتم بدھ اور مہاویر کی زندگی کے واقعات میں کتنی مماثلت ہے)

مہاویر کی تعلیم مختصراً کچھ یوں ہے۔

انسان کو نیک اعمال، خیرات اور سخاوت سے موکشا کا درجہ حاصل کرنا چاہیے جو انسان کی روح کو آواگون کے چکر سے نجات دلاتا ہے۔

جین مت کے پیروکار دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دنیا تیاگ کر جوگی بن جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو گرو کو مانتے بھی ہیں اور دنیا کے کاروبار میں بھی مصروف رہتے ہیں۔

493 بی سی۔ بھیم جسارا کی موت اور اباشاسترو کی حکومت۔

461 بی سی۔ اباشاسترو کی موت۔

400 بی سی۔ سنسکرت زبان کی گرامر مرتب کی گئی۔

327 بی سی۔ سکندر اعظم کی سندھ میں آمد۔

سکندر اعظم چونکہ تاریخ کا ایک اہم کردار ہے۔ اس

لیے اگر اس کے حوالے سے کچھ لکھ دیا جائے تو نامناسب نہیں ہوگا۔

دنیائے قدیم کا عظیم فاتح سکندر اعظم مقدونیہ کے شہر پیلا میں 356 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بادشاہ فلپ دوئم صحیح معنوں میں غیر معمولی قابلیت اور بصیرت کا حامل انسان تھا۔

فلپ نے مقدونیہ کی فوج میں توسیع اور تنظیم پیدا کی اور اسے ایک انتہا درجہ کی جنگ جو طاقت میں تبدیل کر دیا۔

اس نے ایران پر یورش کی تیاریاں کر لی تھیں لیکن اسے قتل کر دیا گیا۔ اس وقت وہ صرف بیالیس برس کا تھا۔

باپ کی موت کے وقت سکندر صرف انیس برس کا تھا لیکن اس نے کسی دشواری کے بغیر حکومت سنبھال لی۔

فلپ نے اپنے بیٹے کے لیے راہیں ہموار کر دی تھیں اور نوجوان سکندر کو اعلیٰ عسکری تربیت دلا دی تھی۔ اس کی ذہنی تربیت کے لیے اس نے ارسطو جیسے عظیم عالم کو اس کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔

دو سو سالوں سے ایرانیوں نے ایک بہت بڑی سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ 334 قبل مسیح سکندر ایران پر صرف پینتیس ہزار فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ ایران کو فتح کرنے کے بعد وہ کوہ ہندوکش کے راستے سندھ اور پنجاب میں داخل ہوا تھا۔

323 بی سی میں سکندر اعظم کی موت ہوئی اور میلیوکس کی پنجاب میں حکومت بنی۔

324 بی سی۔ چندر گپت موریہ کا عہد۔ وسطی ہندوستان سے لے کر افغانستان تک پھیلا ہوا ملک۔

304 بی سی۔ چندر گپت موریہ نے 500 ہاتھیوں کے عوض میلیوکس نے وادیٔ سندھ خرید لی اور بہار کے شہر پٹنہ کو دارالحکومت بنا دیا۔

300 بی سی۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب رامائن لکھی گئی۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے رامائن کا مختصر سا تعارف کروا دیتا ہوں۔

یہ ہندوؤں کے اوتار رام کی کہانی ہے اسے والمیک نے لکھا تھا۔

ایودھیا کا راجا دسرتھ بے اولاد تھا۔ وہ بہت پریشان رہتا تھا۔ اس نے دیوتاؤں سے درخواست کی۔ دیوتاؤں نے اسے ایک مشروب دیا کہ وہ بیویوں کو پلا دے۔

اس کی تین بیویاں تھیں۔ اس نے تینوں کو پلا دی۔

تینوں نے چار راج کماروں کو جنم دیا۔

رام۔ لچھمن اور شترو گھن۔ یہ دونوں جڑواں تھے۔ اور بھرت۔

رام سب سے بڑے تھے۔ لہٰذا ولی عہد کے طور پر پرورش ہونے لگی۔ سب بھائیوں میں بہت محبت تھی۔ رام جب بڑے ہوئے تو ان کی شادی ویدہ کی راج کماری سیتا سے ہوگئی۔

دسرتھ جب بیمار ہوا تو اس نے سوچا کہ اب تاج و تخت رام کے حوالے کر دیا جائے لیکن اس وقت سب چھوٹی رانی کیکئی (بھرت کی ماں) نے یاد دلایا کہ دسرتھ نے ایک بار اسے وچن دیا تھا کہ وہ اس کی دو خواہش پوری کرے گا۔ پہلی خواہش تو یہ تھی کہ رام کو چودہ سال کے لیے جنگل بھیج دیا جائے اور اس کی جگہ بھرت کو راجا بنا دیا جائے۔

بہرحال رام سیتا اور لچھمن کے ساتھ بن باس کو چلے گئے۔ یہ بہت طویل کہانی ہے کہ کس طرح انہیں وہاں راون ملا جو سیتا کو اٹھا کر لے گیا۔ 14 سال بعد رام واپس آیا تو حکومت اسے مل گئی یہاں صرف ہلکا سا تعارف مقصود تھا اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔

2400 بی سی۔ چندر گپت موریا کے بیٹے بندوسار نے سلطنت کی حدود دکن تک وسیع کر دی۔

259 بی سی۔ اشوک کا زمانہ۔ اشوک بھی چونکہ ہندوستان کی تاریخ اور دنیا کی تاریخ کا ایک اہم کردار ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ لکھ دینا نامناسب نہیں ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ میں غالباً سب سے اہم مہاراجا اشوک، موریہ خاندان کا تیسرا فرمانروا اور اس سلسلے کے بانی چندر گپت موریہ کا پوتا تھا (جس نے سکندر اعظم کی یورش کے بعد کے برسوں میں شمالی ہندوستان کا بیشتر علاقہ فتح کیا اور ہندوستانی تاریخ میں پہلی بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی)۔

اشوک 273 قبل مسیح مسند اقتدار پر آیا۔ اپنے اقتدار کے آٹھویں برس اس نے ہندوستان کی مشرقی سرحدوں پر واقع ریاست کلنگا کو گھمسان کی جنگ کے بعد جیتا۔

آج اس ریاست کو اڑیسہ کہا جاتا ہے۔ لیکن جب اسے اپنی فتح کے بعد انسانی جانوں کی قربانیوں کا احساس ہوا تو وہ خوفزدہ ہوگیا۔ اس جنگ میں ایک لاکھ انسان مارے گئے تھے۔

اس پشیمانی میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی فوجی مہمات ترک کر دے گا۔ اس نے بدھ مت کو مذہبی فلسفہ کے طور پر اپنا لیا جو راست، رحم اور عدم تشدد کی تھیں۔

اشوک اعظم نے بدھ مت کے اچھے اصولوں کو عام کرنے کے لیے اپنی مملکت میں جابجا کتبے نصب کرائے جو خیبر کی پہاڑیوں سے لے کر جنوبی دکن تک اور بلوچستان سے لے کر بنگال تک ملے ہیں۔

اس کی کوششوں سے بدھ مت دور دراز تک پھیل گیا تھا۔

251 بی سی۔ اشوک کے بیٹے مانیدار نے بدھ مت کو سری لنکا میں متعارف کروایا۔

250 بی سی۔ بدھوں نے پہلی مرتبہ عبادت گاہ بنائی۔

232 بی سی۔ اشوک کی موت۔

220 بی سی۔ موریاؤں کی حکومت تقریباً پورے ہندوستان میں ہوگئی۔

206 بی سی۔ انسٹی اوچس نے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔

2000 بی سی۔ مہابھارت لکھی گئی۔

مہابھارت۔ دنیا کی تاریخ کی طویل ترین نظم ہے۔ اس میں نوے ہزار اشعار ہیں، جو سب کے سب رہنما اصولوں پر مبنی ہیں اور کروچھیتر میں چھتری جنگ کے احوال ہیں جو کہ کوروونگ اور پانڈوؤں کے درمیان ہوئی تھی۔

مہابھارت کو لکھنے والا کوئی ایک شاعر نہیں ہے بلکہ بہت سے ہیں جو اس سلسلے کو آگے بڑھاتے چلے گئے۔

1840 بی سی میں موریاؤں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ہندوؤں نے پھر زور پکڑ لیا اور بے شمار بدھ راہبوں کو ہلاک کر ڈالا۔

170 بی سی میں۔ سنوے قوانین لکھے گئے۔ نوسرتی، اس میں ہندو دھرم کے قوانین ہیں۔

ہندوستان کی قدیم مذہبی کتاب ہے۔ پہلی بار ہندوستانیوں کے سامنے ایک نظامِ زندگی ترتیب دیا گیا۔ ذات پات کی تقسیم اس کتاب میں اپنی انتہا پر ہے۔

جیسے سب سے اعلیٰ ذات برہمن کی ہے۔ اس کو ہر طرح کی مراعات اور خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بعد چھتری یا کھتری۔ امورِ سلطنت چلانے والا، لڑنے والا اور دنیا کے دیگر کام کاج انجام دینے والا۔

ویش۔ یہ وہ ذات ہے جو تجارت اور زراعت کی ذمے دار ہے اور سب سے آخر میں بے چارہ شودر (اچھوت)۔

یہ چونکہ پاؤں سے پیدا ہوا ہے اس لیے ذلیل ترین ہے۔ وہ کتنا ہی ذہین اور باصلاحیت ہو، وہ دولت جمع نہیں کر سکتا۔ شودر کو تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت ہے۔ برہمن جب چاہے اس کی دولت چھین سکتا ہے وغیرہ۔

155 بی سی۔ مہاراجا چندرا نے جنوبی ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔

150 بی سی۔ پاتن جلی لکھی گئی۔، اس میں یوگا کے 192 قوانین بتائے گئے ہیں۔

150 بی سی ہی میں بادشاہ کرشنا نے پاٹن کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔

150 بی سی میں کام شاسترا لکھی گئی۔ یہ جنس کے موضوع پر شاید دنیا کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔

100 بی سی۔ ہندوستان کئی راجاؤں میں تقسیم ہوگیا۔

78 بی سی۔ سنگم عہد کا خاتمہ۔

ہندوستان کی تاریخ 1500 سے ہوتی ہوئی 78 بی سی تک آچکی ہے۔ اس کے بعد 80 یعنی بعد از مسیح کا دور شروع ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کو اتنی تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش اس لیے کی گئی کہ ایک تو ہمارا تعلق اس سرزمین (برصغیر) سے ہے دوسرے یہ کہ اس سرزمین نے قدیم تہذیب کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ اہم واقعات اور کچھ اہم شخصیات رہ گئی ہوں۔ لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ آپ کو اس مطالعے سے اس خطے کے بارے میں بہت کچھ اندازہ ہو چکا ہوگا۔

متوازی تاریخ کے طور پر ہم نے ان تہذیبوں کو لیا ہے جو تہذیبیں پوری دنیا پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔

ہندوستان کے بعد ہم ایران کی طرف آتے ہیں۔

1500 قبل از مسیح۔ زرتشت کا مذہب پھیلنے لگا تھا۔

600 قبل از مسیح۔ زرتشت کے مذہب کا مزید پھیلاؤ۔

600 قبل از مسیح تاریخ کا پہلا پولو کا کھیل شمالی ایران میں کھیلا گیا۔

600 قبل از مسیح سائرس اوّل کی حکومت۔

چونکہ ایران اور دنیا کی تاریخ میں سائرس نے اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس لیے اس کے بارے میں کچھ بتا دینا ضروری ہے۔

سائرس اوّل کو سائرس اعظم بھی کہا گیا ہے۔

سائرس اعظم ایرانی سلطنت کا بانی تھا۔ اس نے جنوبی مغربی ایران کے ایک ماتحت فرمانروا کے طور پر اپنی زندگی کا آغاز کیا اور غیر معمولی فتوحات حاصل کرتے ہوئے 3 بڑی سلطنتوں کو تباہ برباد کردیا۔

ان میں میڈیوں، لیڈیوں اور بابلیوں کی حکومتیں تھیں۔ بعدازاں قدیم مشرقِ وسطیٰ کے ایک بڑے حصے کو ایک ہی ریاست کی صورت میں متحد کیا جو ہندوستان سے بحیرہ روم تک پھیلی ہوئی تھی۔

سائرس کا اصل ایرانی نام ''کروش'' تھا۔

وہ ایک بے پایاں فوجی اہلیت کا حامل شخص تھا۔ تاہم یہ اس کی شخصیت کا صرف ایک پہلو تھا۔ زیادہ اہم بات اس کی خلیق اور نرم خو فرماں روائی تھی۔

مقامی مذاہب اور رسوم و رواج کے حوالے سے اس کا رویہ بہت معتدل تھا۔ وہ اپنے دور کا ایک غیر معمولی انسان دوست فرماں روا تھا۔

اس کی موت کے بعد بھی ایرانی سلطنت کا پھیلاؤ جاری رہا۔حتیٰ کہ سکندراعظم نے اسے فتح کیا۔

521 قبل از مسیح۔ ایران کے بادشاہ (سائرس کے بیٹے) نے فرعون اماسیس کی موت کے فوراً بعد مصر پر حملہ کردیا اور مصر پر حکومت کی۔

522 میں بادشاہ کی موت کے بعد بغاوت پھوٹ پڑی لیکن جنوبی داریوش نے بغاوت ختم کردی۔داریوش بھی ایران کے بڑے بادشاہوں میں سے ایک تھا۔اس نے ایرانی سلطنت کو عروج تک پہنچا دیا تھا۔ بلخ، غزنی، جلال آباد، گندھارا، پشاور سب اس کے کنٹرول میں آچکے تھے۔

521 بی سی۔داریوش نے سوسا کو دارالحکومت کا درجہ دیا۔

521 بی سی۔ اس نے پہلی بار ایران سے باہر کی طاقتوں کے لیے آرمینین کا لقب استعمال کیا۔

520 بی سی۔داریوش نے یہودیوں کو وہ عبادت گاہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی جو تباہ ہوچکی تھی۔

520 بی سی۔داریوش نے مصر پر حکومت کے دوران دریائے نیل سے بحیرۂ احمر تک ایک نہر بنوائی۔

517 بی سی۔ایرانیوں کا وادیٔ سندھ پر مکمل قبضہ ہوچکا تھا۔

500 بی سی۔کامردں پائی ایران کا وزیراعظم مقرر ہوا۔وہ ایک یہودی تھا۔

490 بی سی۔ایرانیوں کا یونان پر حملہ۔

485 بی سی۔داریوش کی وفات۔

480 بی سی۔یونانیوں نے ایرانیوں پر فتح حاصل کی۔

465 بی سی۔اردشیر اول ایران کا بادشاہ بنا۔تاریخ میں اس کا ذکر بھی بڑے فاتحین میں کیا گیا ہے۔

425 بی سی۔اردشیر دوم کی حکومت۔

404 بی سی۔اردشیر سوم۔ یہ کچھ کمزور جنرل واقع ہوا اس لیے مصر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

334 بی سی۔سکندر نے شکست دی۔

244 بی سی۔شاپور کی حکومت۔

250 بی سی۔شاپور نے ایک زبردست لائبریری قائم کی۔

241 بی سی۔میں مانی ازم سامنے آیا۔

مانی کا زمانہ 216 سے 276 ہے۔ 241 میں اس کے نظریات سامنے آئے۔

مانی میسوپوٹا میں پیدا ہوا۔ جو اس وقت ایرانی سلطنت ہی کا حصہ تھا۔

وہ خود فارس النسل تھا۔ بیشتر ایرانی زرتشت مت کے پیروکار تھے۔تاہم مانی کی تربیت عیسائیت سے متاثرہ مذہبی فرقے کے مطابق ہوئی۔

اس کے بیان کے مطابق بارہ برس کی عمر میں اس پر وحی نازل ہوئی۔ وہ بیس برس کا تھا جب اس نے ایک نئے عقیدے کا پرچار شروع کردیا۔

اپنے آبائی وطن میں ابتدا میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ شمال مغربی ہندوستان چلا گیا جہاں وہ ایک مقامی حکمران کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوگیا۔

242 بی سی میں وہ ایران واپس آیا۔جہاں اسے بادشاہ شاپور کی ہمراہی میں سننے والوں کی ایک بڑی تعداد میسر آگئی۔ اگرچہ بادشاہ نے اس کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا۔لیکن وہ اس سے متاثر ضرور ہوا تھا۔

بادشاہ نے اسے ایرانی سلطنت میں تبلیغ کی اجازت دے دی۔

اگلے تیس برسوں میں شاپور اوّل اور ہرمزد اوّل کی زیر حکومت مانی نے کسی رکاوٹ کے بغیر پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد جمع کرلی۔

تاہم مانی کی کامیابی نے زرتشت مت کے پیروکاروں کو ناراض کردیا۔وہ اس سے نفرت کرنے لگے (اس دور میں ایران کا سرکاری مذہب زرتشت مت ہی تھا)۔

276 کے قریب ایک نئے بادشاہ بیرام اوّل کی تخت نشینی کے بعد مانی کو گرفتار کرکے قید کردیا گیا۔ جہاں بیس روز تک صبر آزما مصیبتوں کو برداشت کرتا ہوا وہ مرگیا۔

اپنی زندگی میں مانی نے کئی کتابیں لکھیں۔ان میں ایک فارسی زبان میں ہے اور بقیہ سریانی زبان میں۔

یہ کتابیں مانی مت کے مذہب صحائف قرار پائے۔

یہ مذہب بہت تیزی سے دور دور تک پھیل گیا تھا۔

اسپین، چین، ایران، عراق، منگولیا، تائیوان ہر جگہ یہ پھیلتا چلا گیا تھا۔

تاہم ساتویں صدی میں اسلام کے فروغ کے بعد یہ بالکل ہی ختم ہوگیا۔

اس کے بعد بھی ایران کی سرزمین پر بادشاہ آتے رہے اور تاریخ میں اپنے نام درج کراتے چلے گئے۔

بے شمار خاندانوں کی حکومتیں رہیں۔ ترقی کا سفر طے ہوتا رہا۔ کیوں کہ وقت کو تو اپنی رفتار برقرار رکھنا پڑتی ہے۔

ہم نے 1500 قبل از مسیح سے پہلی قبل از مسیح تک ایران کا جائزہ لے لیا ہے۔اس کے بعد اس دوران اور بھی کئی طاقتیں ور تہذیبیں ہیں جن کا ذکر اگلی قسط میں ہوگا۔ ان تہذیبوں میں چین، مصر، اٹلی، یونان، امریکا وغیرہ ہیں۔

اُمید ہے کہ یہ سلسلہ آپ کو پسند آرہا ہوگا۔ آپ ایک نظر میں یہ جان سکتے ہیں کہ دنیا کا سفر کہاں سے ہوتا ہوا کہاں تک آیا ہے۔

(جاری ہے)

سلمیٰ اعوان

وادی کیلاش، پاکستان کی حسین وادیوں میں سے ایک وادی جسے کافرستان بھی کہتے ہیں۔ وہاں کے مقامی باشندے جو صدیوں سے اپنی مذہبی روایات اور رسوم کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اسی سرزمین سے ابھرنے والی ایک دلچسپ کتھا جسے لفظوں کا خوب صورت پیرہن دیا گیا ہے۔

سیر پاکستان کے حوالے سے تحفۂ خاص

دیواریں دھوئیں کی سیاہی سے لتھڑی پڑی تھیں۔ کمرے کو تین حصوں میں تقسیم کرتے کندہ کاری سے مزین چوبی ستون مگر وہ بھی اس سیاہی سے نہال یوں لشکارے مارتے تھے جیسے ابھی ان پر کالے رنگ کے روغن کا کوٹ پھیرا گیا ہو۔ کمرے کے وسط میں جلتی آگ، اس میں سے زبانیں لہراتے شعلوں کی روشنی اور اس روشنی میں نظر آنے والا سازو سامان۔ غربی دیوار سے ٹنگی تار پر گدے اور بدرنگ رضائیاں، بے ترتیبی سے لٹکے ہوئے کچھ دوسرے

کپڑے۔ مشرقی دیوار میں بنی الماری، الماری میں سستے ایلومینیم اور پلاسٹک کے مختصر سے برتن، چند دیگچیوں اور پتیلوں کی صورت میں پڑے تھے۔ بارہ تیرہ سال کی صبیح چہرے والی ایک لڑکی جو چپ چاپ بیٹھی کسی مورت کی مانند دکھتی تھی۔ چند بوریاں اور ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی کرسی۔

سیاہ پرانے لبادے میں لپٹی پوشن بی بی جس کے چہرے پر پھیلی جھریوں میں موسموں اور غالباً حالات کی بھی سختیاں تحریر تھیں۔ آگ کی زرد روشنی میں چمکتا ہوا اس کا گلا اور گلے میں سیروں کے حساب سے رنگ برنگے موتیوں کے ہار سر پر سفید کوڑیوں کی ٹوپی دھری تھی جو پشت سے بالشت بھر چوڑی پٹی کی صورت اس کی کمر تک جاتی تھی۔ کمر میں بندھی پٹی پر پھول بوٹیاں اور اس کے ساتھ گھنگرو بھی لٹک رہے تھے۔ کبھی اس چہرے کی رنگت سیندور ملے میدے جیسی ہوگی مگر اب، سفیدی تو اب بھی تھی پر سرخی کہیں نہیں تھی۔

"کیتھرائن یہیں اسی کمرے میں میرے ساتھ دو سال رہی تھی۔ وہ جرمن تھی۔ بہت خوب صورت تھی۔ پر جتنی خوب صورت تم ہو وہ اتنی نہیں تھی۔ تمہاری طرح وہ بھی ہم پر کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں کام کرنے آئی تھی۔ تمہاری طرح وہ بھی بہت محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے بیٹے آژور کے ساتھ خوب باتیں کیا کرتی تھی۔ میرا بیٹا میرا آژور جو دنیا کی اس بھیڑ میں جانے کہاں ہے؟ تم اسے دیکھتی تو بہت پسند کرتیں۔ وہ ایسا ہی تھا چاہنے اور پسند کیے جانے کے قابل۔"

وہ کمرے میں اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی، دھیمے دھیمے بولتی جاتی جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔ دکھی اور افسردہ سی۔

خستہ حال اُدھڑے پدھڑے سے نمدے پر دھرے اپنے وجود کو اس خوب صورت لڑکی نے جو خدیجہ تھی۔ ایک لمبی سی سانس اس کے اندر سے نکل کر باہر آئی تھی۔ کبھی شعلوں اور کبھی اپنے عین سامنے بیٹھی پوشن کو جو اب آگ میں مکئی کا بھٹا بھون رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے خدیجہ کا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ پر اس نے بڑے ضبط اور حوصلے سے آنکھوں میں امنڈ آئے پانی کو روکا تھا جو اس کی گھنیری پلکوں میں موتیوں کی صورت اکٹھا ہو رہے تھے۔

"کیتھرائن نے جب رہنے کے لیے میرے گھر کو پسند کیا تو جانتی ہو آژور نے یہاں نیا نمدہ بچھایا تھا۔ اس نے کمرے میں اور بہت سی چیزیں بدلنے کے لیے بھی کہا۔ پر میں نہیں مانی تھی۔ ہمارے پاس اتنے پیسے کب تھے۔ میری اور آژور کی لڑائی صفائی پر بھی ہوتی تھی۔"

"اردو اچھا بول اور سمجھ لیتی ہیں آپ۔ ورنہ بڑی دشواری ہوتی مجھے۔"

"آنکھ کھولی تو سیاحوں کی صورتیں دیکھیں۔ ان سے باتیں کرنا بھی ضروری ٹھہرا۔ کیتھرائن تو مجھے جرمن بھی خاصی سکھا گئی تھی۔ پر اردو تو مجھے اسماعیل شاہ کی بیوی نے سکھائی تھی۔" وہ بولتے بولتے رکی پھر سانس لے کر بولی۔ "جب ہم بریر میں رہتے تھے وہ بریر کے پرائمری اسکول کا ٹیچر بن کر آیا تھا۔ اپنی نئی نویلی دلہن کو بھی ساتھ لایا تھا۔ وہ بہت اچھا اردو بولتی تھی اس کا باپ فوج میں تھا اور وہ پنجاب کے کسی اسکول سے چار جماعتیں پاس تھی۔"

اس نے بھٹے بھون کر اسے ہاتھوں سے جھاڑا کہ اس پر لگی ہوئی فالتو راکھ اتر جائے، لڑکی سے کلاشوار (کلاشی) میں کچھ کہا۔ لڑکی نے بوری میں سے چند اخروٹ نکالے، انہیں توڑا اور ان کا مغز ہاتھوں میں لے آئی۔ اس نے ڈپٹ کر پھر کچھ کہا۔ لڑکی نے الماری کا پٹ کھول کر پلاسٹک کی پلیٹ نکالی اور اخروٹ کی گریاں اس میں ڈال دیں۔ اس نے بھٹے کو درمیان سے دو ٹوٹے کیا اور ایک ٹکڑے کے چند دانے اکھیڑ کر اس کی ہتھیلی پر اخروٹ کی گریوں کے ساتھ رکھتے ہوئے محبت سے کہا۔ "لو اسے کھاؤ۔ مکئی ہمیشہ اخروٹ کی گری کے ساتھ کھانی چاہیے۔"

یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ شاید کچھ چیزیں ماحول کے مطابق ہوتی ہیں، اس نے سوچا۔

پوشن اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ پہاڑوں کی شام اس قدر حسین ہوگی، ساری کی ساری سونے اور سبزے میں نہائی ہوئی۔ چشموں اور آبشاروں کی گنگناہٹوں میں ڈوبی ہوئی۔ اپنے بلند و بالا پربتوں اور ان پر چھائے جنگلوں پر نازاں۔ میدانی حسن سے آشنا آنکھ نے کوہستانی رعنائی کو کہاں دیکھا تھا۔

پوشن کے کپڑوں پر گھنگرو چلتے ہوئے بجتے تھے۔ ایک تو چال کا بانکپن اوپر سے پہناوے کا پھیلاؤ۔ اسے بہت خوب صورت لگتے تھے۔

پوشن دکھی اور تنہا ہونے کے ساتھ ساتھ ممتا سے بھی بھری ہوئی تھی۔ زبان کا جانا بھی نعمت تھی۔ خدیجہ کو اس نے

جس طرح اجنبی جگہ پر فوراً اپنے بازوؤں میں سمیٹا وہ اس کے لیے بڑی طمانیت کا باعث تھا۔ وہ بتا رہی تھی۔

''سالوں گزر گئے، اگر یہ کہوں کہ زمانہ بیت گیا اپنے کلیجے میں سنبھالے اس راز کو تو غلط نہ ہوگا۔ جی چاہتا تھا کسی سے کچھ کہوں۔ کسی کو بتاؤں۔ اپنا اندر، جو سرطان کے پھوڑے کی طرح دکھتا ہے کسی ہم راز کو دکھاؤں۔ پر ڈرتی تھی، میری ممتا مجھے روکتی تھی۔ میرا بچہ میرے آگے آتا تھا۔ تم تو بڑی پیاری سی لڑکی ہو تمہیں تو سب کچھ سناؤں گی میں۔''

وہ رک گئی۔ ایک بڑے سے پتھر کے پاس جو ایک کشادہ قطعہ زمین پر صنوبر کے درخت کے پاس دھرا تھا۔

''پہلی مرتبہ میں نے اسے یہاں کھڑے دیکھا تھا۔ وہ شام بھی ایسی ہی تھی، خوب صورتی میں ڈوبی ہوئی، رنگوں میں نہائی ہوئی۔ تب بریر سے ہم نقل مکانی کر کے بتریک (بمبوریت) میں بسنے آئے تھے۔ میری عمر یہی کوئی بارہ تیرہ سال ہوگی۔ چھوٹی تھی تو شفاف پانی میں پڑتا میرا عکس مجھے بتاتا تھا کہ میں بہت حسین ہوں پھر گل بانو، اسماعیل شاہ کی بیوی نے مجھے ٹوٹے آئینے کا ایک ٹکڑا دے دیا جسے میں نے اپنے گھر کے سامنے دریائے بریر کے کنارے پر پڑے پتھروں میں ایک جگہ چھپا دیا۔ دن میں دو بار وہاں جانا اور اس آئینے میں خود کو دیکھنا میرے لیے کھانے ہی کی طرح ضروری بھی تھا اور محبوب بھی۔ ہمارے ماحول میں آزادی ہے لڑکے لڑکیوں کا ملنا معیوب نہیں۔ شاید اسی لیے لڑکوں کی چھیڑ چھاڑ مجھے لطف دیتی تھی۔ پر یہ سب تب تک تھا جب تک میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

پہلی نظر میں وہ مجھے اپنی لوک کہانیوں کا کوئی ماورائی کردار لگا جس کے گیت ہم ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی گانا شروع کر دیتے ہیں۔ میں گنگ کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ مردانہ وجاہت اور مردانہ حسن میرے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ میرے کافرستان میں دونوں کی فراوانی ہے۔ پر میرے سامنے جو نظارہ تھا اس نے مجھے سحر زدہ کر دیا تھا۔ میں ٹھٹک گئی تھی۔

درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں سے سورج کی کرنوں میں نہاتا وہ ایک ایسا ماورائی کردار لگا تھا جس کی شجاعت و دلیری اور حسن و جمال کے قصے ہمیں سنائے جاتے ہیں۔ بالکل سکندر اعظم کی طرح لگا تھا۔ نیلی آنکھوں اور چٹانوں جیسی سختی والے چہرے جیسا۔

اس نے مجھے دیکھا ضرور پر ایک اچٹتی سی نظر۔ پتا نہیں میرا دل کیوں یہ چاہا کہ وہ میرے ساتھ اسی طرح پیش آئے جیسے سکندر اعظم صحرائے سغد میں باختری سردار کے قبیلے کی لڑکی روشنک سے پیش آیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ سکندر قلعہ فتح کرنے کے بعد زنان خانے میں گیا تھا۔ سردار کی بیٹی روشنک باہر آئی تھی۔ اس وقت اس کی دونوں چوٹیاں اس کے سینے پر سانپوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ روشنک کی طرح میری سنہری چوٹیاں بھی میرے سینے پر دھری تھیں۔ روشنک اتنی خوب صورت تھی کہ سکندر اس کے چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکا تھا۔ حسن تو میرا بھی جہاں سوز تھا پر کیا ہوا اس نے مجھے دیکھا اور نگاہوں کا رخ بدل لیا۔ میرا جی مچلا تھا وہ بھی مجھ سے سکندر کی طرح میرا نام پوچھتا اور پھر سکندر کی طرح کہتا کہ تم جیسی لڑکی تو میں نے سارے جہان میں نہیں دیکھی اور پھر اسی کی طرح اپنی کلائی یا انگلی سے کوئی چیز اتار کر میرے ہاتھوں میں پہناتے ہوئے مجھے کہتا۔ ''اسے پہنے رکھنا میں تم سے شادی کروں گا۔''

پر وہ تو کسی سنگی بت کی طرح درختوں کے درمیان پہاڑوں پر نظریں جمائے جانے کیا دیکھتا اور سوچتا رہا تھا۔ میرے پندار کو چوٹ لگی تھی۔

کون تھا وہ؟ رات تک میں اس کے بارے میں جان چکی تھی۔ وہ بتریک کے امیر مسلمان گلباز خان کا مہمان تھا۔ مردان کے کسی بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ خاندان کے کسی قتل کے کیس میں ملوث ہونے پر پولیس اسے ڈھونڈ رہی تھی اور وہ گرفتاری سے بچنے کے لیے یہاں پناہ گزین تھا۔

وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ خدیجہ کو بھی اس نے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ پون فرلانگ پر مشتمل درختوں سے گھرے اس میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولی۔ ''یہاں ہمارا موسم گرما کا تہوار چلم جوشی ہوتا ہے۔ پار سال یہیں رقص کرتے ہوئے کئی لڑکے مجھ پر دیوانہ وار فدا ہوئے تھے اور یہیں اس نے مجھے ایک بار کے بعد میرے آگے بڑھنے اور اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔''

دونوں پھر چل پڑی تھیں۔ وادی بتریک کے کھیا کا گھر آ گیا تھا۔ آتلاخ خان گھر میں تھا۔ خدیجہ اس سے وادی کے اور خصوصی طور پر صحت اور تعلیم کے مسائل پر باتیں کرنے لگی۔ اتلاخ خان کے ڈھیروں شکوے شکایات پر اس نے کہا۔ ''دراصل آپ لوگ اپنی پرانی اقدار سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ حکومتِ پاکستان بھی آپ کو اسی طرح

محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ وادی سیاحتی نظر سے سونے کا انڈا ہے۔ گو اب سیاحت بھی دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ جاہل، کم علم اور لٹھ بردار مولوی اور پادری آپ لوگوں کو مسلمان اور عیسائی بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ سچی بات ہے، نئے رجحانات اپنانے میں آپ لوگوں کے خوف اور تحفظات کچھ معنی نہیں رکھتے۔ ایک انقلاب آپ کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے اور اس سے آپ لوگ آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔''

کچھ دیر بعد جب پوشن اسے لے کر چلی، باہر رات کی پھیلی ہوئی سیاہی شب کے اس اولین پہر میں بھی بڑی خوفناک نظر آتی تھی۔ درخت بھوت پریتوں کے ہیولے بن کر سامنے آئے تھے۔ چشموں کا گونج دار آواز سے بہنا اور ٹھنڈی ہواؤں کا زور دشور سے چلنا سب اس جیسی لڑکی کے لیے نامانوس اور دل دہلانے والا تھا۔

پوشن نے اسے اس کے ٹھکانے پر چھوڑا۔

خدیجہ کو یہاں آئے چند دن ہی ہوئے تھے پر لگتا تھا جیسے سال ہوگئے ہوں، وقت یہاں جیسے پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی تو جیسے پوشن سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چند آنسو نکلے اور گالوں سے بہتے ہوئے کہیں بالوں کے جنگل میں گم ہوگئے۔ پھر پتا نہیں کب وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

صبح کا بانکپن اس نے کھڑکی میں بیٹھ کر دیکھا۔ دریائے بمبوریت کی جولانیاں اور پہاڑوں کی ہیبت کو خاموش اداس نظروں سے محسوس کیا۔ پھر وہ ناشتے کے بعد کراکال گاؤں کا چکر لگا کر آئی۔

اسکول دیکھا۔ بچوں کی کلاسوں میں گئی۔ ٹیچرز سے باتیں کیں۔ مکئی کے کھیتوں کا ایک سمندر اور خوبانی و سیب کے درختوں کا بے حد و حساب پھیلاؤ اور دو منزلہ سہ منزلہ گھروں، سبھوں کو اس نے رک رک کر دیکھا اور جب وہ ہوٹل کے کمرے میں واپس آئی اور کھڑکی کے سامنے بیٹھی تو اس کا ذہن خالی، خالی سا تھا۔ وہ خالی، خالی نظروں سے اپنے سامنے بکھرے منظروں کو دیکھتی رہی تھی اس وقت اسے کہیں دل میں ٹیسیں سی اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔

پھر جیسے خود بخود کسی معمول کی طرح اس کے قدم اٹھتے چلے گئے۔ پوشن بی بی کے گھر کی طرف۔ پوش بی بی کا خیر مقدم محبت بھرا تھا۔ اس نے اس کے منع کرنے کے باوجود اخروٹ کی کوٹی کری اور کشمش کے آمیزے میں گندمی روٹی پکائی۔ یہ پوڑے کی ایک قسم تھی جسے وہ کیلاڑ کا نام دیتی تھی۔ خوبانی کے تیل والا پیالہ اس نے اس کے سامنے رکھا اور نوالے تیل میں بھگو بھگو کر چائے کے ساتھ کھانے کو کہا۔

یہ کھانا اس کے لیے نیا تھا پر مزیدار تھا۔ چائے کے گرم گرم گھونٹ نوالے کا لطف بڑھاتے تھے۔

''تو اب بتاؤ آگے کیا ہوا؟'' خدیجہ نے خالی کپ چولہے کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔

''رات اضطراب سے بھری ہوئی تھی۔ میرے اندر اس کے وجود میں گھل جانے کی بے کلی تھی۔ والدین کی اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے میرا باپ میرے وجود سے بودلک بچے کا متمنی تھا۔ ایک خوب صورت صحت مند بہادر اور دلیر بچہ اور مجھے ماہ ستمبر میں بودلک سے ہم بستری کے لیے جانا تھا۔''

خدیجہ کی آنکھوں میں چھلکتی حیرت پوشن سے چھپی نہ رہی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''اوہ۔'' پوشن رک گئی تھی، مجھے خیال ہی نہیں رہا تمہیں اس رسم کے بارے میں بتاتی ہوں۔ ہمارے قبیلے میں خاص طور پر وادی بریر میں قدیم یونانیوں کی طرح نسل بڑھانے کے لیے ایک صحت مند مرد کا انتخاب کیا جاتا ہے چھ ماہ کے لیے اسے اوپر پہاڑوں پر بہترین خوراک کھلا پلا کر ہٹا کٹا بنا کر نیچے وادی میں لا کر تقریباً تیس نوجوان غیر شادی شدہ لڑکیوں سے ایک رات کی ہم بستری کروائی جاتی ہے۔ اس سے مقصود دلیر بہادر صحت مند بچوں کی پیدائش ہوتی ہے۔ میرے باپ کے ہاں صرف میں نے جنم لیا۔ پتا نہیں میرے بعد کوئی بچہ کیوں نہیں ہوا۔ میرے باپ کے اندر بیٹے کی ایک حسرت ایک تمنا تھی جو وہ اب میرے وجود سے لگائے بیٹھا تھا۔'' وہ بولتے بولتے رکی پھر سانس لے کر بولی۔ ''ان دنوں چلم جوشی کے تہوار کے لیے تیاریاں شروع تھیں۔ اپنے سیاہ لبادے پر ڈوریاں لگاتے، پٹی پر موتی اور کوڈیاں سجاتے میرے اندر کے محبت بھرے جذبے میرے ہاتھوں کی ہر ہر پور میں سے ہوتے ہوئے ان ٹانکوں پر ابھرے جنہیں ٹانکتے ہوئے میں نے دعائیں مانگیں کہ وہ مجھے اور ان سب کو دیکھے۔''

''وہ بھی کیسی صبح تھی۔ پاکیزگی کے نور اور نکہتوں میں لپٹی ہوئی۔ رسیلے توت کی خوشبو نیم پختہ خوبانی اور سیب کی مہک بہار کے پھولوں کی جنگل کے درختوں اور گھروں کے

ہمسایوں میں اگنے والی فصلوں کی باس، سب نے صبح کی فضا کو نشیلی اور خمار آلودہ کررکھا تھا۔ ایسے میں ڈھول کی ڈھم ڈھم شنگھا ہے رسم ادا کرنے کے لیے پکار تھی۔ وادی نے انگڑائی لی۔ یہ جنگل میں جانے، بیشا کے زرد پھول اور اخروٹ کی سبز ٹہنیاں لانے کے لیے ایک پکار تھی اور جب میں اوپر جنگل کی طرف بھاگی تھی، میرے ہر اٹھتے قدم پر یہ دعا میرے ہونٹوں پر تھرکتی تھی کہ وہ دلبر مجھے نظر آئے۔

میری نظروں نے اسے آبشاروں کے کناروں پر بیشا کے پھولوں میں، درختوں کے تنوں کے ساتھ ہر جا دیکھا اور وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ موٹے موٹے آنسو میرے گالوں پر بہہ گئے۔

پر جب میں اخروٹ کی سبز ٹہنیوں اور میرا اباپ بیشا کے پھولوں سے گھر کا مرکزی دروازہ سجا رہے تھے۔ مجھے وہ نظر آیا تھا اور پھر جیسے میں اپنے حواسوں میں ہی نہ رہی۔ بیشا کے پھول لے کر اس کی طرف بھاگی حالانکہ میرا انہیں ہاتھ لگانا ہماری مذہبی روایت کے مطابق ممنوع تھا۔

میں نے ٹہنی اس کی طرف بڑھائی اور کہا۔ ''تم کہاں تھے میری آنکھیں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈتی رہی ہیں۔''

حیرت کا ایک جہان اس کے چہرے پر ظاہر ہوا۔ ہکا بکا سا وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ ٹہنی اس نے پکڑ لی۔ نرمی سے میری طرف دیکھا اور بغیر ایک لفظ کہے اپنے راستے پر ہولیا۔

میرے باپ نے قدرے خفگی سے میری طرف دیکھا۔ ہمارے ماحول میں بہت آزادی ہے پر صرف اپنے قبائل کے لوگوں کے لیے۔ مسلمانوں کے لیے بالکل نہیں۔ میں کون سا کم تھی، ہٹیلی اکھڑ اور سرکش۔ گردن جھلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی، جس نے میرے باپ کو پیغام دیا تھا کہ مجھے کسی کی ذرہ برابر پروا نہیں۔

مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میری سانسوں کے ہر تار سے وہ الجھ رہا تھا۔ میرے ہر خیال اور ہر احساس میں وہ کسی دھاگے کی گانٹھ کی طرح بندھ گیا تھا۔ جب دھیان گیان بٹا ہوا ہو تو کام الٹے پلٹے ہوتے ہیں۔ بریر کے خاص انگوروں سے کشید کی ہوئی شراب کے چھوٹے بڑے تین مٹکے جنہیں میرا اباپ کسی قیمتی اثاثے کی طرح سنبھالے ہوئے بمبوریت لایا تھا۔ ان میں سے ایک میری بے دھیانی کی بھینٹ چڑھا تھا کہ گھی اور پنیر کو برتنوں میں انڈیلتے ہوئے میں نے ایک مٹکے میں پنیر الٹ دیا تھا۔ میرا اباپ پھنکارے مارتا پھرتا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخ دے۔

اس نے ڈی سی چترال کے کارندوں کو بھی اس کی ایک بوتل نہیں دی تھی۔ صاف مکر گیا تھا اور گھر تلاشی کے لیے کھول دیا تھا۔

بے چارہ پلی پلی جوڑتا رہا تھا اپنی برادری کی تواضع اور انہیں خوش کرنے کے لیے اور میں نے کپالنڈ جا دیا تھا۔

اس رات میں بشتگان میں گئی۔ وہاں بیٹھی۔ اپنے دیوتا مہاندیو کو تصور میں لائی۔ میرے انداز میں وحشیانہ پن تھا تناؤ اور غصہ تھا۔ ''یاد رکھنا'' میں نے تنبیہی انداز میں جیسے ڈپٹ کر کہا۔ ''شیشاؤک والے دن اگر اس نے میری چاہت کا جواب نہ دیا تو میں تیرے ٹوٹے کردوں گی۔ اپنے دل سے نکال کر تجھے بمبوریت ندی میں پھینک دوں گی۔ میں سولی پر چڑھ گئی ہوں اور اسے میری پروا نہیں۔''

شیشاؤک کا دن وادی کی ہر لڑکی کا ایک خواب ہوتا ہے۔ کھلکھلاتی قہقہے لگاتی لڑکیوں کے پرے، اپنی اپنی آرائشی چیزوں اور کپڑوں کے ساتھ ندی پر جاتی ہیں۔ مہینوں کی جمی میل پانیوں کو سونپتے ہوئے نئی سج دھج کے ساتھ گھنگرو بجاتی دھرتی کے سینے پر غرور اور تمکنت سے چلتی واپس آتی ہیں۔ میں نے بال بال میں موتی سجائے روم روم کو مشاطہ جام کیا۔ دریا کنارے پتھروں میں چھپے اس آئینے نے مجھے بتایا کہ میری آنکھیں آتش شوق سے دہک اٹھی ہیں اور میرے چہرے پر صبح کے گلابوں کی شگفتگی اور لالی کے عکس بکھرے ہوئے ہیں۔ یقیناً اسی لیے ہر کسی نے مجھے حیرت سے دیکھ کر کہا تھا۔ ''پوشن لگتا ہے نورستان کے پہاڑوں کی پریاں اوپر اپنے رنگ چھوڑ گئی ہیں۔''

اور شام کو میں اخروٹ کے درختوں تلے پکائی روٹیاں جب مختلف گھروں میں تقسیم کرنے نکلی تو سب سے پہلے گلباز خان کے گھر جا دھمکی۔ وہ برآمدے میں تنہا بیٹھا تھا۔ میں عین اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی، اس نے مجھے دیکھا اور پھر وہ پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ بہت دیر بعد اس کی زبان سے نکلا۔ ''تم انسان ہو یا پروردگار کا کوئی شاہکار۔''

میری کانچ جیسی بلوری آنکھوں میں خوشی کسی پھلجڑی کی صورت ناچی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ ''اگر یہ سچ ہے تو مجھے چوبی پل کے پاس رات کو ملو۔''

میں نے اس کا انتظار کیا۔ وہ آیا۔ میرے پاس بیٹھا۔ نہ میرا وجود زمین پر تھا اور نہ میرا دماغ، سب کہیں ہواؤں میں اڑتے پھرتے تھے۔

''اسفند! مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔ مجھے بھگا کر لے چلو یہاں سے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

اس نے سگریٹ کے جلتے شعلے میں میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''کہاں؟ میں تو خود بھاگا پھرتا ہوں۔ میرا تو پورا خاندان مصیبت کی چکی میں پس رہا ہے۔ دیکھو نا میری یہ عمر ہے چھپ کر بیٹھنے کی۔ بے کار بے مقصد دن گزار رہا ہوں۔''

وہ اداس تھا مجھے اس کے دکھ کا اس شدت سے اس وقت اندازہ نہیں ہوا جس کا وہ اظہار کرتا تھا۔ شاید یہ میری بالی عمر کا قصور تھا کہ جس کے سامنے صرف میرے اپنے جذبے تھے۔ میں نہیں جانتی اسے بھی مجھ سے محبت ہوئی یا نہیں تاہم اتنا ضرور ہوا کہ وہ اب گاہے گاہے مجھ سے ملنے لگا اور جس دن میں نے اس سے کہا۔ ''تم مجھے بھگا نہیں سکتے ہو پر بچہ تو دے سکتے ہو۔ یہ دان پن تو کر دو۔''

بھونچکا سا ہو کر اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تم نے کیا کہا ہے، کیا تم اپنے حواسوں میں ہو؟''

وہ ہمارے کلچر سے ناواقف تھا۔ کنوار پنے کا اس معاشرے میں کوئی تصور نہیں ہے۔ لڑکی کا جب اور جس سے جی چاہتا وہ تعلق قائم کر لیتی ہے۔ میرے ساتھ پتا نہیں کیا معاملہ تھا کہ میں تیرہ سال کی عمر میں بھی ابھی تک کنواری تھی۔ وادی کے لڑکے تو مدتوں سے تعاقب میں تھے پر پتا نہیں دل ان پر کیوں نہیں آیا تھا اور اب یہ بے قدرہ سا مسلمان میری آرزو کی انتہا بن گیا تھا اور جو میری اس خواہش کے اظہار پر یوں اچھلا تھا جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔ ''یہ تو زنا ہے، گناہ ہے، حرام کاری ہے۔''

اور میں نے گلوگیر لہجے میں اس کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''میرا باپ مجھے بودلک کا بچہ دلانے کے لیے مر رہا ہے اور میں تم سے بچہ چاہتی ہوں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔''

یہ سسی کی طرح صحراؤں میں میری آبلہ پائی تھی۔ یہ سوہنی کی طرح کچے گھڑے پر دریا کو پار کرنے کی مہم جوئی تھی، یہ فرہاد کی طرح دودھ کی نہر نکالنے والی کشت تھی۔ میں اس کوہ نور کے ہیرے کو اپنی قوم قبیلے کی برچھی جیسی نوکیلی نگاہوں سے بچانے کے لیے کن کن پہاڑوں کی کھوہ کھنڈوں میں لیے لیے پھری اور جب وادی کے لڑکوں اور کچھ بڑوں کو ہماری خفیہ ملاقاتوں کا علم ہوا میں نے اسے اپنی چاہتوں کے زیر اثر خت کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جسمانی تعلق کے بعد اس کا میرے ساتھ دلی تعلق کا آغاز ہوا۔ پر اسے تو واپس جانا تھا۔ اور جب وہ واپس جا رہا تھا تو اس کی ایک ایک حرکت ایک ایک بات سے ندامت تاسف اور دکھ مترشح تھا۔

اور میرے لیے بھی وہ دن کسی خدائی عذاب سے کم نہیں تھے۔ وادی کے لڑکے تو پہلے ہی خار کھائے بیٹھے تھے۔ بڑے بھی جتھے کی صورت ہمارے مذہبی پیشوا کے گھر اکٹھے ہو گئے تھے اور مجھے بھی بلا کر کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا اور اس سوال پر کہ میرا کوئی اس سے جنسی تعلق قائم ہوا میں نے زور دار نفی میں گردن ہلائی۔ اگر کوئی بچہ ہوا تو یاد رکھنا اسے دریا برد کر دیا جائے گا۔

پھر میری تطہیر کے لیے مجھے مالوش (قربان گاہ) لے جایا گیا۔ بکرا ذبح ہوا۔ میرے ہاتھوں کی اوک میں خون ڈالا گیا جسے میں نے مالوش میں کھڑے چاروں چوبی گھوڑوں کے سروں پر چھڑکاؤ کیا اور جب مجھے دیودار کے سبز پتوں کی گاڑھی اور کسیلی دھونی میں پاک کیا جا رہا تھا، کھانستے کھانستے میرا برا حال تھا، میرے انگ انگ اور مو مو سے ایک دعا نکلتی تھی۔ مہاندیو اس کا بیج میری کوکھ میں پھولے۔

میری آنکھوں کے دہکتے انگارے اور میرے چہرے پر پھوٹتی گلابیاں افسردگیوں میں ڈھل رہی تھیں اور چند دنوں میں ہی ہم بریر کے لیے روانہ ہو گئے۔ بریر تو جیسے رنگ و آہنگ میں نہایا ہوا تھا۔ پوری وادی بودلک کے لیے سراپا انتظار تھی۔ سنہری شام میں، میں نے ایک سانڈ کی طرح پلے انسان کو لوگوں کے جلو میں پہاڑ سے اترتے دیکھا۔ لڑکیوں کی شوخیاں اور اتراہٹیں بھی قابلِ دید تھیں۔ چار سو رونق تھی۔ جشتگان (عبادت گاہ) میں چوبی مشعلیں روشن تھیں۔ جلوس جشتگان کی طرف رواں تھا۔ لڑکیوں کو بشمول میرے اکٹھا کیا گیا اور ہمارے مذہبی پروہت نے اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جشتگان کے باہر پہرے دار کھڑے ہوئے۔ طبل کی تیز گونج دار آواز میں پہلی لڑکی کی گل چینی اختتام پذیر ہوئی۔ طبل بجتے رہے۔ گل چینی کا عمل جاری تھا۔ جب میری باری آئی میرا نمبر اکیسواں تھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے کراہت کا احساس ہوا۔ حالانکہ ایسے احساسات کی ہمارے معاشرے میں تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔ میں نے خود کو پیش کیا اپنے آپ پر جبر کر کے۔ کہ مجھے اپنے محبوب کا بچہ دنیا میں سلامتی کے ساتھ لانا تھا اور میں جانتی تھی کہ میں بار آور ہو چکی ہوں۔

بیٹے کی پیدائش تک میں اپنے باپ اور ماں کی ہتھیلی کا
پھپھولا بنی رہی اور صحت مند خوب صورت بچے کی پیدائش پر
میرا باپ ہواؤں میں اڑتا پھر رہا تھا۔ یہ میرا نہیں اسفند کا بیٹا
تھا مگر سب اسے بودلک کا سمجھتے رہے۔ بودلک سے پیدا شدہ
بچے لڑکی کے والدین پالتے ہیں۔

یہ دل کی باتیں تھیں جو غم ناک ہونے کے ساتھ ساتھ
دلچسپ بھی تھیں۔ خدیجہ پتا ہی نہیں چلا کہ کب شام ڈھلی کب
رات اتری۔ نہ بھوک کا احساس نہ پیاس کی کوئی طلب۔
پوشن نے کہا۔ ''چلو میں بکری کا تازہ دودھ پلاتی ہوں۔''

پر خدیجہ نے پوشن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''نہیں اب جانے دو
میں ہوٹل والوں کو رات کے کھانے کا کہہ کر آئی تھی۔''

☆☆☆

فضا میں آج خنکی کا زور تھا۔ چھوٹے سے ڈائننگ ہال
میں خوشگواری سی حرارت کا لطیف سا احساس رگ و پے میں
طمانیت دوڑاتا تھا۔ پلاؤ گرم تھا۔ ساتھ پیاز، ٹماٹر، نیازبو
اور ہرے دھنیے کے پتوں کا سلاد اور دہی تھا۔ کھانے کے
بعد چائے کا کپ لے کر خدیجہ اوپر اپنے کمرے میں آگئی۔

باہر تاریکی میں دیکھتے ہوئے۔ ہواؤں کے جھگڑوں
اور دریا کے طغیانی جیسے بہاؤ کے گونج بھرے شور کو سنتے
ہوئے وہ پوشن اور اس کے بچے کے بارے میں سوچتی رہی۔
پاکستان میں رہنے والے کتنے لوگ اس عجیب وغریب دنیا کو
جانتے ہیں۔ انوکھی اور حیران کن یہ دنیا، اس کے کردار جو لمحہ
بہ لمحہ نئے انکشافات کے ساتھ اس کے سامنے آرہے
تھے۔ پوشن کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔

''آژور جب دو سال کا ہوا تو میں نے شادی کی، پر
اسفند ہمیشہ قریب رہا۔ بند آنکھوں نے ہر عمل اسی کی قربت
میں ہی طے کیا۔ یوں یہ اور بات ہے کہ شادی سے نہ کوئی بچہ
ہوا اور نہ وہ زیادہ عرصہ چلی۔''

''بیٹا عجیب سی عادتوں کا مالک تھا۔ ایک تو ہر بات
کے بارے میں سوال جواب سے ہی مت مارے رکھتا۔ تین
سال کا تھا جب ایک دن مسلمانوں کی مسجد کے دروازے پر
جا کر بیٹھ گیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ وہاں سے اٹھا کر لائی
تو عجیب سی سوچیں دماغ میں ناچنے لگی تھیں۔ زرتاج گلباز
خان کی بیوی سے دوستی کے باوجود میں نے کبھی اسفند کے
بارے میں اس سے بات نہیں کی تھی۔ اپنے بچے کے چھن
جانے کے خوف نے ہمیشہ میرے ہونٹوں پر تالے لگائے
رکھے۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اسکول جانے کے لیے مچلنے
لگا۔ کراکال میں گورنمنٹ پاکستان کی طرف سے پرائمری
اسکول تھا وہیں جانے لگا۔ ایک بار کوئی افسر معائنے کے لیے
آیا اس نے مجھے بلایا اور کہا۔ ایسا ذہین بچہ اس نے آج تک
نہیں دیکھا اسے پڑھانے میں کوتاہی نہ کرنا۔''

جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا۔ اس کے عجیب سے رویے
سامنے آرہے تھے۔ روٹی اگر پیٹ کی ضرورت ہے تو جنس
جسم کی ہے۔ ہمارے یہاں نفس پر قابو پانے یا اسے کنٹرول
کرنے کا کوئی رواج کوئی طریقہ کوئی اخلاقی قانون یا کوئی
ضابطہ ہے ہی نہیں۔ جب جس وقت جی چاہا اور جس سے
چاہا اس ضرورت یا خواہش کی تکمیل کر لی۔ میں نے محسوس کیا
تھا کہ آژور قبیلے کے مردوں سے الگ ہے۔ ان کی طرح کھلنے
ملنے شراب پینے اور پی کر غل غپاڑہ کرنے کے عمل کو ناپسند کرتا۔
اگر میں اٹھ کر کسی مرد کے ساتھ جانے لگتی تو وہ میری کمر پر
بندھی پٹی پر ہاتھ ڈال دیتا۔ مجھے روکتا، پاؤں پٹختا، چلاتا،
شور مچاتا۔

وہ نہانے کا، صاف کپڑے پہننے کا بڑا شوقین تھا۔ ہر
دوسرے دن کپڑے بدلنے پر جھگڑتا۔ ہم لوگ تو ہفتوں کیا
مہینوں کپڑے نہیں بدلتے تھے۔ ایام کے لیے جب میں
بشالینی (نرسنگ ہوم) جاتی وہ میرے پیچھے بھاگتا۔ باہر
دروازے کے پاس کھڑا ہو کر آوازیں لگاتا۔ ''یہاں کیوں
آتی ہو۔ میرے پاس رہو۔ گھر چلو۔''

اور پھر جیسے آنسوؤں کا ایک فوارہ پوشن کی آنکھوں
سے بہہ نکلا۔ ''دیکھو تو اب میں اکیلی ہوں اور وہ مجھے چھوڑ کر
چلا گیا۔ اب اسے کچھ یاد نہیں۔''

بازوؤں سے اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے
وہ پھر بولی۔ ''خلاشی بنانے کے لیے رسم کے مطابق جب
اسے سیاہ اون کی شلوار پہنا کر مالوش (قربان گاہ) بھیجا
جا رہا تھا، پہلے تو وہ وہاں جانے سے ہی انکاری ہوا اور جب
چلا گیا تو مالوش میں اس نے اپنے ہم عمر لڑکوں کو مارا اور
مذہبی پیشوا کی کئی باتوں کی حکم عدولی کی۔ آٹھ سال کی عمر میں
جب اس کے گلے میں سونے کا حلقہ پہنایا جانے لگا تب بھی
اس نے بڑی بحث کی، اس کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے نہیں
پہننا اسے۔

میرے ماں باپ دونوں حیران تھے۔ دونوں کو وجہ
سمجھ نہیں آئی تھی مگر مجھے سمجھ آتی تھی پر میں نے تو ہونٹوں پر
تالا لگایا ہوا تھا۔

اپنے طور پر میں نے اور میرے باپ نے بہت چاہا

کہ وہ کسی طرح کھیتی باڑی اور غلہ بانی کی طرف آجائے، پر ایک تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اس کی آگے پڑھائی کی پُرزور سفارش ہی نہیں کی بلکہ مہتر چترال ناصر الملک کے ہائی اسکول میں داخلے کا بھی بندوبست کر دیا اور وہ چترال پڑھنے کے لیے چلا گیا۔"

اور جیسے آنسوؤں کا ایک پرنالہ پھر اس کی بوڑھی آنکھوں سے بہنے لگا تھا۔ رات تو پتا ہی نہیں چلا کب اتر آئی تھی۔ اس نے دھیرے سے پاس بیٹھی پوشن کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو اپنے بیگ سے نکالے ٹشو پیپروں میں سمیٹا۔

وہ چترال کیا گیا سمجھ لو میری زندگی سے نکل گیا۔ شروع میں مہینے میں ایک بار آتا پھر وقفہ بڑھتا گیا۔ پر جب بھی آتا اسے کمرے کے اتنے دھوئیں میں لپٹے ہونے پر غصہ آتا۔ وہ مجھ سے بھی الجھتا کہ آخر میں مہینوں کیوں نہیں نہاتی۔ سر میں کنگھی کیوں نہیں کرتی اور شامتِ اعمال سے ہمارے گھر میں کوئی مرد ہوتا تو اس کا مزاج اور بھی برہم ہو جاتا۔ اب وہ کھل کر میرے شراب پینے کو بھی ناپسند کرنے لگا تھا۔

"وہ مجھے کہتا۔ "جس لڑکے کے گھر میں رہتا ہوں اس کا باپ مرا ہوا ہے اس کی ماں اتنی نیک عورت ہے کہ میرا جی چاہتا ہے میری ماں بھی ویسی ہی ہو۔

مجھے غصہ آگیا۔ تنک کر میں نے کہا۔ "تو اسی کو ماں بنا لو۔ اور ہاں تم مسلمان ہو گئے ہو؟"

"تم کیا سمجھتی ہو؟"

"تمہاری الٹی پلٹی سوچیں اور حرکتیں تو مجھے یہی بتاتی ہیں۔"

"ابھی تک تو نہیں ہوا۔ ہاں جب ہوا تو چھپاؤں گا تھوڑی اور ہاں مسلمان بھی کون سا سب اچھے ہیں۔ مہتر چترال تو اوّل درجے کا بدمعاش انسان ہے۔"

اور جب وہ آخری بار آیا اس وقت وہ پشاور میں پڑھ رہا تھا۔ ان دنوں چاؤمس کے تہوار کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ شراب اور شباب دونوں کی فراوانی تھی۔ لڑکیاں عورتیں مرد سب مے ناؤنوشی کے لیے مرے جا رہے تھے۔

"ماں شراب کوئی اچھی چیز نہیں ہے بندے کی صحت کا ناس مار دیتی ہے۔" اس نے نصیحت کے انداز میں کہا ہمارے درمیان تو تو میں میں ہوئی۔ اس نے غصے سے کہا۔ "اگر تم نے یہ گندی عادتیں نہ چھوڑیں تو میں یہاں نہیں آؤں گا۔"

میں بھی اس وقت تپی بیٹھی تھی۔ اسے کوستے ہوئے بولی۔ "ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے آگے۔ مت آنا۔ میرے لیے تو عذاب بن جاتے ہو۔ میری اس روکھی پھیکی سی زندگی میں ذرا سی خوشی تمہاری آنکھوں میں چبھنے لگتی ہے۔ سب کو دیکھو موج میلے میں لگے ہوئے ہیں اور تم چاہتے ہو میں جوگ لے کر بیٹھ جاؤں۔ جاؤ یہاں سے۔"

اور وہ پھر ایسا گیا کہ لوٹ کر نہ آیا۔"

"چلو آؤ دیکھو اندھیرا بہت بڑھ گیا ہے اور تمہیں ان راستوں پر چلنے کی عادت نہیں۔ آؤ۔"

پوشن آنکھیں پونچھتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھی اور خدیجہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

جشتگان سرمائی تہواروں کا مرکز ہے۔ ایک لمبا چوڑا بارہ چوبی ستونوں پر مشتمل ہال جس کے ستونوں پر منبت کاری کا کام بڑا نمایاں تھا۔ آگ کے لیے ایک جانب جگہ تھی۔ دیوار کی سبز ٹہنیوں کی سجاوٹ تھی اور بکری کے سینگوں کی آرائش فوراً نظروں کو متوجہ کرتی تھی۔ گھوڑے کے سر کا بت بھی وہیں سجا تھا۔ شعلوں کی تیز روشنی میں ماحول حد درجہ پُراسرار اور ہیبت زدہ سا تھا۔ رقص شروع ہونے والا تھا۔ طبل کی آواز جیسے صورِ اسرافیل کی طرح ہی تھی۔ حسین چہروں کا جمگھٹا تھا یہاں۔ نشے میں ڈوبی آنکھیں، یقیناً شراب زیادہ پی گئی تھی۔ رقص تو بس ایسے ہی تھا، نامانوس گیتوں پر آگے پیچھے کی چلت پھرت۔

خدیجہ کو بھی رقص میں گھسیٹنے کی کوشش کی گئی پر ہنستے ہوئے وہ انکاری ہوئی۔ خاصی دیر تک یہ ہنگامہ رہا۔ پھر وہ پوشن کے ساتھ باہر آگئی۔ فضا میں آج زیادہ خنکی تھی۔ پر ہوٹل میں جانے اور پوشن کو خدا حافظ کہنے سے پیشتر اس نے اسے اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ پوشن کو بھی زمانوں بعد کوئی ایسا رازدار ملا تھا جس کے سامنے وہ اپنے اندر دکھ کا پکتا سارا لاوہ باہر نکال رہی تھی اور جب پوشن کوئی تین گھنٹے بعد رخصت ہوئی تو وہ افسردہ تھی۔

"کاش میں اسے اپنے ساتھ نہ لاتی۔" اس نے بے اختیار سوچا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس درجہ دل گرفتہ ہے اور یوں بیٹے کی باتیں کرتے کرتے بکھر جائے گی کہ اس کے لیے اسے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔

"وہ کون سا منحوس وقت تھا جب میں نے اسے لعن طعن کی۔ دھتکارا۔ آن بان والا لڑکا کیسے سب برداشت کرتا۔ نکل گیا میری زندگی سے۔"

چار سال سے وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی

تھی۔ اس سے پہلے وہ سال ڈیڑھ سال کے وقفے سے اپنی صورت دکھا جاتا۔ اب تو جیسے جگ بیت گیا تھا۔

کیا وہ باہر چلا گیا۔ کہاں ہے؟ اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ ہاں البتہ اسے پیسے ضرور ماہ دو ماہ بعد ملتے۔ چترال سے بینک کا بندہ آتا اور اسے رقم دے جاتا۔

"تم تو نیچے سے آئی ہو۔ ہمارے علاقے پر کام کرنے کے لیے، تمہارے تعلقات بھی ہوں گے۔ تم بڑے شہروں میں بڑے لوگوں کو جانتی بھی ہوگی۔ کیا تم میرے بیٹے کا کھوج لگاؤ گی کہ وہ کہاں ہے؟"

اور جب وہ بستر پر لیٹی تو بار باران الفاظ کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "کیا تم میرے بیٹے کا کھوج لگاؤ گی؟"

اس کی دل گرفتگی اس کے اندر کی شکستگی اس کے لیے حد درجہ تکلیف اور دکھ کا باعث بن رہی تھی۔ بے شمار آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ گئے تھے۔ ممتا کی تڑپ اور کسک کو سمجھنا عورت یا لڑکی کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ اس رات خدیجہ نے اگلے دن چترال شہر جانے اور اس کے لیے دو تین جوڑے بنانے اور کچھ ضروریات کی چیزیں خریدنے کا سوچتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

چترال شہر کے اتالیق بازار سے کپڑے اور ڈوریوں کی خریداری کے بعد سلائی کے لیے درزی سے بات ہوئی۔ ایک تو اس نے شام تک سی دینے کا کہا اور دوسرے دو جوڑوں کے لیے چند دن مانگے۔ چلو ٹھیک ہے کہتے ہوئے اس نے بازار سے مزید چیزوں کی خریداری کی۔ پولو کا میچ دیکھا، شاہی قلعہ کی سیر کی اور شام کو واپس بمبوریت آ گئی۔

اگلے دن پوشن کے پاس گئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ "کل کہاں تھیں۔ تمہیں نہیں دیکھا تو کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔" خدیجہ کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

اس نے شاہی حکم صادر کر دیا۔ پوشن نہانا ہے۔ صاف کپڑے پہننے ہیں۔ وہ ناں ناں کرتی رہی۔ ٹھنڈ اور طبیعت کی خرابی کا کہتی رہی۔ خدیجہ نے تو پانی گرم کرنے رکھ دیا تھا۔ پھر پورے گھر میں نہانے کی موزوں جگہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر اسے وہاں لے گئی۔ اسے بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ بے چاری زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم تھی۔ خدیجہ کو اس کے بیٹے پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا، ناخلف کہیں کا۔ کیا فائدہ ایسے پڑھے لکھے انسان کا۔ جسے اپنی ماں کا احساس نہیں۔

وہ نہائی، خدیجہ نے اس کی کمر صابن سے ملی۔ نئے کپڑے پہنائے۔ بال خشک کر کے تیل لگایا۔ مینڈھیاں گوندھیں اور چوٹیاں کیں۔

"پوشن، تھوڑی دیر کے لیے ایک من کے بوجھ کو سر پر مت رکھو۔ سر کو ذرا سکون آنے دو۔ میں تو حیران ہوں تم لوگوں کے سر کیا لوہے کے ہیں۔ اس نے کاشونگ (ٹوپی) ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ چولہے کے آگے خدیجہ نے چھوٹا سا نیا نمدہ بچھا دیا تھا اور پوشن سے بولی تھی۔ اب تم چائے بناؤ۔ میں لکڑیاں نہیں جلا پاؤں گی۔"

"خدیجہ مجھے اپنا ایسا اسیر نہ بناؤ کہ میں تمہارے جانے کے بعد تمہیں بھی رویا کروں۔" اس کا لہجہ اس درجہ شکستہ تھا کہ وہ چند لمحوں کے لیے کانپ سی گئی پھر خود پر ضبط کرتے ہوئے شگفتگی سے بولی۔ "پوشن میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

پوشن اسے دیکھ رہی تھی۔ چپ چاپ پھر دفعتاً وہ گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔

"خدیجہ تم میری بیٹی کیوں نہیں ہو۔ تم نیچے کیوں پیدا ہوئیں۔ تم نے میری کوکھ سے کیوں جنم نہیں لیا۔"

اور ڈھیر سارے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ گئے۔ خدیجہ کی اپنی آنکھیں بھی گیلی ہو گئیں۔ پر وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری بیٹی ہوں۔ کبھی کبھار محبت اور پیار کے رشتے خون کے رشتوں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ ایک بات مانو گی پوشن۔"

خدیجہ کے ملتجی سے لہجے پر اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، وہ اس وقت دیگچی سے چائے کپوں میں انڈیل رہی تھی۔

"بولو کچھ کہنا چاہتی ہو۔" کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ حیرت زدہ سی اسے دیکھنے لگی تھی۔

"پوشن میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ یقین مانو تمہارے بیٹے کو ڈھونڈنے میں، میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گی۔"

خدیجہ نے دیکھا اس کے چہرے پر کرختگی سی پھیل گئی تھی۔ اس کی آواز میں تلخی اور روٹھاپن تھا جب وہ بولی۔ "کیوں؟ کیوں اسے ڈھونڈنے جاؤں۔ وہ اپنی جنم بھومی کا راستہ بھول گیا ہے۔ وہ دنیا کے میلے میں گم ہو گیا۔ وہ اگر ضدی ہے تو میں بھی اس کی ماں ہوں۔"

خدیجہ شاید کچھ اور کہتی پر پوشن کی ہمسائی شنگلی نے کمرے میں آ کر ان کی گفتگو کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ دو گلاس چاول ادھار لینے آئی تھی۔ ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر خود بھی بیٹھ گئی۔ شنگلی کو اردو کی بس تھوڑی بہت شد بد تھی۔

خدیجہ کو عصر کی نماز پڑھنی تھی۔ پوشن سے اجازت لے کر اٹھ گئی تھی۔
پر دو ایک دن بعد ہی وہ بات پھر زیر بحث آگئی۔
''خدیجہ تم نے اپنے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا۔ مجھے بھی تو اپنے آپ میں شامل کرو۔'' اور وہ ہنس پڑی۔
''کیا بتاؤں زندگی تو ایسے ہی بس اونچ نیچ کا نام ہے۔''
پوشن نے پوچھا تھا کہ کیا اس نے پسند کی شادی کی ہے۔ خدیجہ نے سرنفی میں ہلایا اور بولی۔ ''پوشن میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔''
میرا باپ ڈاکٹر تھا ایک نرم گداز دل کے ساتھ ساتھ مسیحائی کا تحفہ بھی اسے خدا نے دے رکھا تھا۔ ساری زندگی اس نے دھن دولت لوگوں پر لٹائی۔ غریب رشتے داروں اور غیروں کو پالتا رہا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کلینک پر پارٹ ٹائم کرنے والے ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ کے بارے میں تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے کہا کہ وہ اسے میرے لیے بہت موزوں انسان سمجھتا ہے۔
میں نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑتے ہوئے کہا۔
''پاپا میں کسی غریب انسان سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ آپ کو نہیں پتا ان لوگوں کی محرومیاں بہت نفسیاتی پیچیدگیوں کو ان کی شخصیتوں میں جنم دے کر انہیں عجیب سے رویوں کا حامل بنا دیتی ہیں اور یہ لوگ اکثر اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا جینا بھی حرام کر دیتے ہیں۔ یوں بھی میں ان کے خاندانوں کو غربت کی دلدل سے نکالنے کے لیے خود کو کولہو کا بیل نہیں بنانا چاہتی۔''
پاپا بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ انہیں شاید مجھ سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔
''خدیجہ میں انسانوں کو پرکھنے کا شعور رکھتا ہوں۔ سلمان اگر یہ کہوں کہ ہیرا ہے تو اس میں قطعی کوئی مبالغے والی بات نہ ہوگی۔ اگر تم اس سے مل لو تو مجھے خوشی ہوگی۔ وہ ہاؤس جاب کر رہا ہے اور اس کے بعد اسے باہر چلے جانا ہے۔''
''نہیں پاپا مجھے نہیں ملنا کسی سے۔''
میں نے نخوت سے کہا۔ سچی بات ہے میں تو ان کی دریا دلی سے بھی بہت تنگ تھی۔ ہمارے گاؤں کا ہر غریب لڑکا شہر میں پڑھ رہا تھا اور اس کا خرچا میرا باپ اٹھاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم بہت آسودہ سی زندگی گزار رہے تھے۔ پر یہ اس معیار زندگی کا عشر عشیر بھی نہیں تھا جو میری دوستوں کو حاصل تھا۔ پھر میرے باپ کے ایک امیر ترین دوست نے اپنے بیٹے کے لیے میرا رشتہ مانگا۔ بڑی دھوم دھڑکے سے منگنی ہوئی۔ میری خوشی کی بھی انتہا نہ تھی۔ مجھے منگنی پر انہوں نے زیوروں سے نہال کر دیا۔
لیکن پھر وہ ہوا جس کا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ہمارا باپ لوگوں کی مسیحائی کرتے کرتے دم توڑ گیا۔ میری عمر اس وقت کتنی تھی فقط بیس سال۔ پندرہ سالہ چھوٹی بہن تھی اور دل کش و خوب صورت چالیس سالہ ہماری ماں۔ میں اس وقت میڈیکل کے تیسرے سال میں تھی۔
سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ منگنی بھی ٹوٹ گئی اور قربان ہونے والے رشتے دار بھی چھوٹی موٹی جایداد میں سے حصہ بٹورنے کے لیے عدالتوں میں چڑھ گئے تھے۔
زندگی کی گاڑی کو گھسیٹنے کے لیے مجھے میدان میں نکلنا پڑا۔ بڑی کڑی اور گرم دھوپ تھی جو جھلسائے جا رہی تھی۔ ان دنوں ایک خیال ایک سوچ ایک احساس مجھے چمٹ گیا تھا۔ میں نے اپنے باپ کو دکھی کیا۔ اس کی نیکیوں کا مذاق اڑایا۔ یقیناً قدرت کو میرا تکبر پسند نہیں آیا۔ اس کے بندوں کی غربت کو باعث تضحیک بنانا اسے برا لگا۔ یہ سزا ہے۔
ان تلخ احساسات کی یہ جونکیں مجھے چمٹ گئی تھیں اور میرا خون پی پی کر گپا ہو رہی تھیں۔ پھر در توبہ ہی تھا جس پر حاضری ہوئی اور برستی آنکھوں سے کہا تھا۔ تیری رحمتوں کی چھتر چھاؤں میرے اوپر ہو۔ میں جھلس گئی ہوں۔ آیندہ زندگی اپنے باپ کی طرح تیرے بندوں کی خدمت میں بسر کرنا چاہتی ہوں۔
''خدیجہ!'' دفعتاً پوشن کی تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
''خدیجہ تم اوپر والے کو خوش کرنے کے لیے جو مرضی کرو پر تم نے مجھے یہ نہیں کہنا کہ میرے ساتھ چلو۔ دیکھو وہ تمہارے شوہر کا گھر ہے۔''
''ارے پوشن میری جان۔'' اس نے پوشن کا پلپلا سا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا اور اس کی نیلی کچور آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ڈرامائی سے لہجے میں بولی۔
''وہ میرے شوہر کا نہیں تمہارے بیٹے آذر یعنی ڈاکٹر سلمان کا گھر ہے اور تمہارا بیٹا میرے باپ کی نیکیوں کا انعام ہے جو قدرت نے مجھے دیا ہے۔''

مولا جٹ

انور فرہاد

ان دنوں کا قصہ جب پاکستانی فلم انڈسٹری اوج پر تھی اور شہکار فلمیں بنتی تھیں۔ اسی دور میں یہ فلم بنی جس نے فلمی دنیا کی روش ہی بدل دی۔ جس کا ہر کردار اپنی جگہ ایک کوہ گراں تھا۔ جب کہ اس کہانی پر پہلے بھی فلم بن چکی تھی مگر اس فلم میں ہدایت کاری، منظر نگاری اور اداکاری نے وہ جوہر دکھائے کہ برسوں گزرنے کے بعد بھی اس فلم کے مکالمے لوگوں کی زبان پر تازہ ہیں۔

سنگ میل ثابت ہونے والی فلم کا تذکرہ

آج دادا جی کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔ وہ خوب چہک رہے تھے۔ ان کے چلبلے جملوں کا ٹارگٹ سید صاحب تھے۔

''اس عقل مند کو دیکھو۔'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر سید صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ ''اپنی جوانی کا بہترین حصہ اس نے فلموں اور فلم والوں کو شجر ممنوعہ سمجھ کر ان کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھا......''

''مگر اب تو دادا ابو......''

''ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا۔'' دادا جی نے

قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''بھولا بادشاہ کہہ کر معاف کردینا چاہیے۔ یہی کہنا چاہتے ہو ناتم......؟''

''جی ہاں، آپ لوگوں کی صحبت میں، آپ لوگوں کی باتوں سے مجھے اس بات کا پتا چل گیا ہے کہ فلموں کا ایک اچھا پہلو بھی ہوتا ہے۔ برائی سے روکنا اور اچھائی کی طرف راغب کرنا۔ ہر اچھی فلم کا ایک مثبت پہلو ہوتا ہے۔ پھر فلم انڈسٹری حکومت کے خزانے کو 400 فیصد ٹیکس ادا کر کے معیشت کو سہارا دیتی ہے۔''

''ہاں سید صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ کی سوچ درست ہے۔ جس طرح سکے کے دو رخ ہوتے ہیں، جس طرح اندھیرے اور اجالے ہوتے ہیں، جس طرح رات اور دن ہوتے ہیں اسی طرح...... بالکل اسی طرح فلمیں بھی ہوتی ہیں۔ جو تفریح طبع کے لیے بنائی جاتی ہیں مگر ان میں صرف تفریحی عناصر موجود نہیں ہوتے۔ ان میں ملک اور معاشرہ کی عکاسی کر کے اچھائی اور برائی کی نقاب کشائی بھی کی جاتی ہے۔ برے کرداروں سے برائی کا چہرہ دکھایا جاتا ہے جبکہ اچھے کردار اچھائی اور بھلائی کا پرچار کرتے ہیں۔''

''اگر یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی ہے۔'' واداجی بولے۔ ''تو اس بھولے بادشاہ کو صبح کا بھولا سمجھ کر معاف کردینا چاہیے۔''

''شکریہ، مہربانی کرم۔'' سید صاحب برجستہ بولے۔

''یہ بات ہوئی ناں۔'' واداجی میز پر ہاتھ مار کر بولے۔ ''جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ دیکھو، یہ مورکھ فلمی گیتوں کے بول کس برجستگی کے ساتھ اپنی بول چال میں استعمال کررہا ہے۔ ہائے کیا گیت ہے یہ بھی

''میرے محبوب میرے صنم
شکریہ مہربانی کرم''

واداجی اس گانے کے سحر میں ذرا دیر تک کھوئے رہے پھر جب واپس آئے تو بولے۔ ''چلو بھئی اسی خوشی میں آج اس سید زادے کو کچھ ایمان افروز فلموں کے بارے میں جانکاری دی جائے۔''

سید صاحب کا رنگ سنہرا ہوگیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ان کے اندر خوشیاں انگڑائی لے رہی ہیں جس کا عکس ان کے چہرے پر نظر آرہا ہے۔

''ارے ہاں بھی کچھ ایسی فلمیں بنی ہیں۔'' واداجی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''اور دوسرے ملکوں میں بھی بنائی گئی ہیں جن میں حج اور عمرے کے روح پرور مناظر دکھائے گئے ہیں جیسے دربار حبیب جو ایک باضابطہ فیچر فلم تھی۔ ایک کہانی فلمائی گئی تھی جس میں حج اور عمرے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اسی طرح کچھ فلموں میں مقدس مقامات اور مزارات کی زیارت کے مناظر بھی شامل کیے گئے تھے۔ ایران، مصر اور کچھ دیگر اسلامی ممالک میں بھی ایسی فلمیں بنائی گئی ہیں جن میں ابتدائی اسلامی تاریخ کو فیچر فلم کے روپ میں پیش کیے گئے۔ حضرت بلالؓ اور دوسرے صحابہ اکرامؓ کے اسلام قبول کرنے پر انہیں کس قدر ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا یہ اور اس دور کے دیگر حالات سلور اسکرین میں پیش کیا گیا۔'' اتنا کہہ کر واداجی رک کے میری اور سید صاحب کی طرف دیکھا اور جب ہمیں ہمہ تن گوش پایا تو اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''ہمارے پیارے پاکستان میں ایک ایسی فلم بھی بنی ہے جس کی ابتدا حدیث اور قرآنی آیات کے ترجمے سے ہوتی ہے۔''

''اچھا۔'' سید صاحب ایک دم چونک پڑے۔ ''یہ کون سی فلم تھی؟ کب بنی؟ کس نے بنائی؟'' سید صاحب تابڑتوڑ کئی سوال کر گئے۔

''فلم تھی مولا جٹ جو آج سے 36 سال پہلے بنائی گئی تھی اور اس کے بنانے والے تھے سرور بھٹی۔ سرور بھٹی نے باوضو ہو کر قرآنی آیات کا ترجمہ اپنی آواز میں ریکارڈ کروایا جو فلم شروع ہونے سے پہلے سنائی دیتی ہے۔''

''مگر......'' سید صاحب نے ٹوکا۔ ''یہ تو مار دھاڑ سے بھرپور ایک فلم تھی۔ اس کے بارے میں تو میں نے بھی سنا ہے کہ خون خرابے کے مناظر پیش کرنے میں اس نے دوسری فلموں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔''

''تم نے غلط نہیں سنا یا پڑھا ہے۔'' واداجی بولے۔ ''ٹھیک ہے یہ فلم مار دھاڑ، قتل و غارت گری کے مناظر سے بھری ہے مگر ایسا اس فلم میں کیوں دکھایا گیا؟ اس لیے دکھایا گیا کہ ہر فرعون و موسیٰ۔ ہر دور میں ہر ظالم کو ظلم سے روکنے والا بھی کوئی ہوتا ہے۔ مولا جٹ کی کہانی حق کے راستے میں چلنے والے ایک دلیر شخص کی جرأت اور جواں مردی کے گرد گھومتی ہے۔ جب ایک مظلوم لڑکی کے سر سے ایک ظالم نے چادر کھینچ لی تو اس بہادر شخص نے ظالم اور طاقتور قوت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، عورت کے تقدس اور حرمت کی خاطر لڑتا رہا۔ ظاہر ہے حق و باطل کی جنگ ہوگی تو خون تو

ہے گا۔ قتل و غارت گری تو ہوگی۔''

''ذرا مزید وضاحت سے دادا ابو کہ اس بھولے بادشاہ کو آسانی سے ساری باتیں سمجھ میں آسکیں۔''

سید صاحب کی اس درخواست پر دادا جی نے میری طرف دیکھ کر ہلکا سا تبسم کیا پھر گویا ہوئے۔ ''تم نے یقیناً یہ پڑھا ہوگا کہ رب العالمین نے جب انسان کی تخلیق کی تو شیطان لعین نے مخالفت کی اور کہا یہ تو زمین پر فساد برپا کرے گا۔ اس فسادی کو آپ کیوں پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ یہ زمین پر میری خلافت قائم کرے گا۔ اس پر شیطان نے روگردانی کر دی۔''

''جی ہاں، میں نے پڑھا ہے یہ ذکر تو کلام پاک میں بھی آیا ہے۔''

''جیتے رہو اب تمہیں مولا جٹ کے بارے میں سمجھانے میں آسانی ہوگی۔ اس فلم کے فلمساز سرور بھٹی نے اسی قرآنی واقعے سے اپنی فلم کے لیے روشنی حاصل کی۔ جب شیطان نے اللہ کے حکم سے روگردانی کی اور آدم کے پتلے کو سجدہ نہیں کیا تو راندہ درگاہ ٹھہرایا گیا۔ ایسے میں اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا میں تمہارے بندوں کو تا قیامت بہکاتا رہوں گا۔ اچھائی رحمانی خوبی ہے اور برائی شیطانی وتیرہ۔'' دادا جی نے ذرا توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''سرور بھٹی نے اسی بات کو بنیاد بنا کر اپنی فلم مولا جٹ کی کہانی کی بنیاد رکھی۔ ایک کہانی کے تانے بانے بنے اور مستند فلمی رائٹر ناصر ادیب کو کہا کہ اس تھیم پر ایک بھرپور اسکرپٹ تیار کریں۔ کہانی کا تھیم اچھا ہو اس میں کچھ منفرد باتیں ہوں، کوئی نیا پن ہو تو جاندار اسکرپٹ لکھا جاتا ہے اور جاندار اسکرپٹ ہو تو شاندار فلم تخلیق ہوتی ہے۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مولا جٹ فکر و دانش کی مظہر ایک فلم ہے۔ جس کا ایک کردار مولا جٹ ہے جو رحمانی خوبیوں کا پیکر ہے۔ دوسرا کردار نوری نت کا ہے جو جیتا جاگتا شیطانی کارندہ ہے۔ اس فلم میں ان دونوں کرداروں کے درمیان جنگ دکھائی گئی ہے۔ مصنف، ہدایت کار اور فلم ساز کی مشترکہ فنی صلاحیتوں کا کمال ہے کہ انہوں نے مار دھاڑ سے بھرپور اس فلم کو اپنی فہم و فراست سے ایک غیر معمولی فلم بنا دیا۔ اس کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ 36 سال گزر جانے کے باوجود آج بھی اس کی تر و تازگی برقرار ہے۔ اس کی اسی سدا سہاگن مقبولیت کو دیکھتے ہوئے سرور بھٹی اسے جدید تکنیک کے تحت نیا روپ دینا چاہتے ہیں۔ جس طرح بھارت میں جی پی سی کی شہرہ آفاق فلم شعلے پر جدید انداز کا تجربہ کیا گیا ہے۔ بھٹی اپنی فلم مولا جٹ کو اسی طرح 3D ڈیجیٹل میں تبدیل کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔''

اتنا کہہ کر دادا جی دم لینے کے لیے ذرا رکے تھے کہ سید صاحب کی بیگم چائے لے کر آگئیں۔ انہیں دیکھ کر دادا جی بولے۔ ''آؤ آؤ بیٹا، تم بروقت آئی ہو۔ اس وقت چائے کی بڑی شدید طلب ہو رہی تھی۔'' چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔ ''جب تک چائے پی کر میں اپنی تھکن دور کرتا ہوں، تم اس فلم کے حوالے سے اپنے دوست کی معلومات میں اضافہ کرو۔''

ہم دونوں نے بھی چائے کے کپ سنبھال لیے تھے۔ میں نے ایک سپ لینے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''دادا جی نے بالکل درست کہا ہے کہ مولا جٹ ایک غیر معمولی فلم ہے۔ اس کا ایک ثبوت اس کی مقبولیت بھی ہے۔ یہ فلم بروز جمعہ 9 فروری 1979ء کو لاہور کے شبستان اور دیگر سینماؤں میں ریلیز کی گئی۔ مین تھیٹر شبستان پر یہ 4 فروری 1981ء تک مسلسل دو سال تک کامیابی کے ساتھ چلی۔ اس طرح مولا جٹ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اپنے مین تھیٹر میں 104 ہفتے چل کر اس نے سولو ڈائمنڈ جوبلی بنائی۔ یہ اب تک کی پہلی اور آخری پنجابی فلم ہے جس نے ایسی فقید المثال کامیابی حاصل کی۔ دیگر سینماؤں کے ہفتے ملا کر اس نے 212 ہفتے مکمل کیے۔''

''اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے تخلیق کاروں نے فلم کے خیال اور موضوع کو حقیقت کے روپ میں ڈھالنے کے لیے انتھک محنت کی تھی جس کے نتیجے میں تماشائیوں نے اس کے ایک ایک فریم کو پسندیدگی کی سند عطا کی۔ اس کے فلمساز کی لگن اور شوق کا یہ عالم تھا کہ اس فلم کی تکمیل کے لیے دل کھول کر خرچ کیا۔ جن دنوں یہ فلم بنائی گئی، ایک رنگین فلم پر چھ ساڑھے چھ لاکھ سے زیادہ سرمایہ کاری نہیں ہوتی تھی جبکہ سرور بھٹی نے اس دور میں 14 لاکھ کی خطیر رقم خرچ کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔''

اس کے بعد میں نے چائے کے ایک دو گھونٹ لیے۔ ابھی میں نے آگے بات شروع نہیں کی تھی کہ سید صاحب بولے۔ ''ابھی دادا ابو بتا رہے تھے کہ سرور بھٹی اپنی فلم مولا جٹ کو جدید تکنیک کے تحت 3D ڈیجیٹل میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں جبکہ میں نے حال ہی میں ایک دو اخباروں میں

پڑھا ہے کہ یہ کام بلاک بسٹر فلم وار کے ڈائریکٹر بلال لاشاری کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیا چکر ہے، کیا ایک فلم کو دو آدمی اپنے اپنے طور پر جدید ٹیکنالوجی پر منتقل کریں گے؟''

''اچھا کیا آپ نے یہ سوال پوچھ لیا۔ آپ کی طرح اور بہت سے لوگ بھی اس ابہام کے شکار ہوں گے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ سید صاحب! کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرنا جتنا دشوار کام ہے اس مقام کو برقرار رکھنا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بلال لاشاری نے وار جیسی فلم بنا کر جو عزت شہرت اور عظمت حاصل کی ہے اسے برقرار رکھنے کے لیے اس نے پروگرام بنایا کہ اپنے دور کی سپر ڈوپر فلم مولا جٹ کو جدید تقاضوں کے تحت بنا کر ایک بار پھر اپنا نام اونچا رکھے۔ اسی دوران اس کی ملاقات میمونہ نامی ایک امریکی لڑکی سے ہوئی جو یہ چاہتی تھی کہ مولا جٹ کو نئے سرے سے نئے انداز سے جدید تیکنیکی تقاضوں پر بنائی جائے۔ اس نے بلال لاشاری سے کہا میں اس مقصد کے تحت سرمایہ کاری کرنے پر تیار ہوں۔ کیا تم میرے لیے یہ فلم ری پروڈیوس کرو گے؟ لاشاری جو خواب دیکھ رہا تھا اس کی تعبیر اس کے سامنے آگئی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ جو کام وہ کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اسے پروڈیوسر مل گیا تھا جو خود چل کر اس کے پاس آیا تھا۔ امریکی لڑکی میمونہ سے معاملات طے ہونے کے بعد لاشاری نے کام کا آغاز کر دیا اور اخباروں میں خبریں شائع ہونے لگیں۔'' میں نے رک کر ایک نظر دادا جی پر ڈالی۔ پھر سلسلہ کلام کو جوڑا۔ ''سید صاحب! یہ گھر آپ کا ہے۔ اگر میں آپ کو بتائے بغیر اس کی مرمت اور رنگ روغن کروانا شروع کر دوں تو ظاہر ہے آپ کو تشویش لاحق ہوگی اور آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ یہ سب کچھ آپ کیوں کر رہے ہیں؟ مسرور بھٹی کو بھی بلال لاشاری کے حوالے سے شائع ہونے والی خبروں سے پریشانی لاحق ہوئی اور انہوں نے ایک دن بلال لاشاری کو لاہور جم خانے میں بلا کر پوچھا۔

''اے لڑکے! یہ کیا چکر ہے؟ مولا جٹ کا مالک اور خالق میں ہوں تم میری اجازت کے بغیر اسے ری پروڈیوس کیوں کر رہے ہو؟''

''میرے پروڈیوسر اور میں نے۔'' لاشاری نے کہا۔ ''ناصر ادیب کو کچھ ایڈوانس دیا ہے کہ وہ اب ہمارے مطابق اس فلم کی کہانی لکھیں۔''

[مسرو]ر بھٹی بولے۔ ''ناصر ادیب تو اس پروجیکٹ میں میرا ملازم تھا۔ پیڈ رائٹر تھا، کہانی میری تھی اس نے اسے فلمی رنگ دیا تھا۔ اس کہانی میں نوری نت اور اس کی فیملی کا تخلیق کار میں ہوں۔ بلال لاشاری کو سرور بھٹی کا قائل ہونا پڑا۔ یہ بات تسلیم کرنی پڑی کہ فلم بہر نوع سرور بھٹی کی ہے۔ اس لیے اس کی اجازت لیے بغیر اس فلم کے حوالے سے میں کوئی کام نہیں کر سکتا لہٰذا لاشاری نے وعدہ کیا کہ ہم فلم آپ کی اجازت کے بغیر نہیں بنائیں گے۔ اس نے کہا۔ میں اپنے پروڈیوسر سے کہوں گا کہ وہ آپ سے فون پر رابطہ کر کے آپ سے ملاقات کا وقت لیں اور آپ سے آپ کی شرائط کے مطابق فلم بنانے کی اجازت حاصل کریں مگر امریکی پروڈیوسر نے جب سرور بھٹی سے ملاقات نہیں کی اور وعدے کے مطابق بلال لاشاری نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تو سرور بھٹی نے اپنے طور پر اپنی فلم 3D ڈیجیٹل پر تبدیل کرنے کا اعلان کر دیا۔''

''ہاں یہ بات حقیقتاً وضاحت طلب تھی۔'' دادا جی جواب چائے ختم کر چکے تھے بولے۔ ''اچھا کیا تمہارے دوست نے اس بارے میں پوچھ لیا۔ میں نے سرور بھٹی کا یہ بیان پڑھا تھا کہ وہ خود مولا جٹ کو شعلے کی طرح جدید تقاضوں سے مزین کریں گے۔ اس وقت میرا دھیان بلال لاشاری کے حوالے سے شائع ہونے والی خبروں کی طرف نہیں گیا تھا۔''

ذرا دیر تک کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مکمل خاموشی رہی پھر دادا جی ہی نے یہ خاموشی ختم کی۔ وہ چائے پی کر تازہ دم ہو چکے تھے انہوں نے کہا۔ ''ابھی مولا جٹ کی مقبولیت کی بات ہو رہی تھی اور اس ضمن میں کچھ مثالیں بھی پیش کی گئی تھیں اور بھی کئی مثالیں ہیں مگر میں اس وقت ایک مثال دوں گا جس سے ثابت ہوگا کہ یہ فلم واقعی ہر خاص و عام میں مقبول ہوئی تھی۔ اس فلم کا ایک مشہور جملہ یا ڈائیلاگ ہے

مولے نوں مولا نہ مارے تے مولا نئیں مردا

جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ کسی کو مارنا نہ چاہے تو اسے کوئی نہیں مار سکتا یا عرفِ عام میں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ یہ جملہ اتنا مقبول ہوا، اتنا مقبول ہوا کہ صدر مملکت سے لے کر اسمبلیوں اور عدالتوں تک میں بوقتِ ضرورت بولا گیا۔''

''اچھا...... کیا واقعی یہ ڈائیلاگ اتنا مقبول ہوا؟'' سید صاحب کی حیرانگی دیدنی تھی۔

''ہاں۔'' کہہ کر دادا جی ذرا رکے پھر ہم دونوں کی

طرف دیکھ کر بولے۔ سابق صدر آصف علی زرداری غالباً اپنی صدارت کے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے ایک روز پہلے معروف صحافی سہیل وڑائچ کو ایک انٹرویو دے رہے تھے۔ سہیل وڑائچ نے اپنے مخصوص انداز میں جب صدر مملکت سے پوچھا۔

''ابھی تو آپ صدر پاکستان ہیں۔ آپ کو فل پروف سیکورٹی ملی ہوئی ہے۔ جب آپ اپنے عہدے سے ریٹائرڈ ہوجائیں گے تو آپ سے یہ سیکورٹی لے لی جائے گی تو آپ کیا محسوس کریں گے؟ آپ کے تو دشمن بھی بہت ہیں؟'' تو زرداری صاحب نے برجستہ جواب دیا۔

''ہم تو اس بات کو جانتے ہیں کہ مولے نوں مولا نہ مارے تے مولا نئیں مردا۔''

صدر مملکت کے اس جواب سے مولا جٹ کے اس مکالمے کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مکالمے کی مقبولیت کی اور بھی مثالیں ہیں۔

جن دنوں چیف جسٹس چودھری افتخار کو بحال کروانے کی تحریک چل رہی تھی۔ یہ مشرف دور کی بات ہے۔ چودھری اعتزاز احسن چیف جسٹس کے وکیل تھے، فل کورٹ میں سپریم کورٹ کے گیارہ جج یہ کیس سن رہے تھے، انہی دنوں کی بات ہے کہ سپریم کورٹ کے ایک ڈپٹی رجسٹرار حماد رضا کا قتل ہوگیا تھا اس قتل کے بعد جب کیس لگا تو جسٹس خلیل نے چودھری اعتزاز احسن سے کہا۔

''مشرف صاحب صدر ہیں آپ ایک معطل چیف جسٹس کا کیس لڑ رہے ہیں ڈپٹی رجسٹرار قتل ہوگیا ہے۔ کیا آپ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس نہیں کرتے؟'' تو فل کورٹ کے گیارہ ججوں کے سامنے چودھری اعتزاز احسن نے فلم مولا جٹ کے اس آفاقی مکالمے کو دہرایا۔

''مولے نوں مولا نہ مارے تے مولا نئیں مردا۔''

''واہ یہ تو واقعی مولا جٹ کے اس مکالمے کی آفاقیت ہے۔'' سید صاحب برجستہ بولے۔ ''کہ ایسے پڑھے لکھے اور معاشرے کے اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد اپنی گفتگو اور بول چال کے دوران اسے دہرائیں۔''

''چودھری اعتزاز احسن ایک بلند پایہ ایڈووکیٹ ہی نہیں'' میں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''بلکہ بہت پڑھے لکھے اور اعلیٰ ذوق کے انسان ہیں۔ ادب اور شعر و شاعری سے شغف رکھتے ہیں ان کا برجستہ فلمی مکالمہ دہرانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فلم کوئی معمولی فلم نہیں تھی۔ سپریم

کورٹ کے فل بینچ کے سامنے گیارہ آنریبل ججوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ فلمی ڈائیلاگ بولنا، اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ جملہ ادا کرنے والا اور اسے سنائے جانے والے جج صاحبان کے لیے بھی یہ فلم غیر مانوس نہیں تھی۔''

''جی ہاں یقیناً ایسی ہی بات ہوگی جبھی انہوں نے اس مکالمے کو سنا، سمجھا اور اس سے مطمئن ہوئے۔'' سید صاحب نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''کسی کو بھی عزت یا ذلت دینے والا اللہ کی ذات ہے۔'' دادا جی بولے۔'' لگتا ہے مولا جٹ کو بھی جو شہرۂ آفاق مقبولیت ملی مولا کی خصوصی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔''

''یقیناً ایسی ہی بات ہوسکتی ہے۔'' ہم دونوں نے تائید کی۔

''میرے خیال میں۔'' دادا جی بولے۔''اس کی وجہ بھی ہے۔ اس کے تخلیق کار سرور بھٹی نے قرآن پاک کی آیات۔ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا جب میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے خلقت کو پیدا کیا اور اس خلقت میں اشرف المخلوقات انسان تھا۔ شیطان نے چیلنج کیا کہ یہ زمین پر فساد پیدا کرے گا۔ خدائے برتر نے دعویٰ کیا یہ میری خلافت کا بوجھ اٹھائے گا۔''

کو بنیاد بنا کر جس فلم کو تخلیق کیا اس کی عزت و توقیر میں مولائے کریم معاون و مددگار ہوا۔ پاکستان جیسی پس ماندہ فلم انڈسٹری کی ایک پنجابی فلم کو اتنی عالمگیر شہرت یونہی نہیں ملی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشند

''اللہ کی وحدانیت کو موضوع بنا کر فلم بنانے کا خیال بڑا انوکھا تھا۔'' میں نے کہا۔'' اللہ رب العزت نے اس خیال کو ابلاغ کے سب سے مؤثر ذریعے فلم کا روپ دینے والے کی مدد فرمائی اور اس فلم کو وہ عزت اور عظمت عطا کی جس کی واقعی وہ مستحق تھی۔''

''کیا فلم والے دین دھرم کے ایسے پرچار ہوتے ہیں؟'' سید صاحب نے کہا۔''یہ سرور بھٹی آخر ہیں کیا کوئی مولوی مولانا یا......؟''

''مسجد وغیرہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے سید صاحب کا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔''وہ ایک شریف النفس زمین دار رمضان بھٹی کے گھر 16 اکتوبر 1956ء میں پیدا ہوئے۔ انہیں بہادری، شجاعت اور سخاوت اپنے والد محترم کی طرف سے ملی ہے۔ انتہائی خوش اخلاق، بے باک اور غریب پرور شخصیت کے مالک ہیں۔ مولا جٹ ان کی پہلی فلم تھی۔ جس نے پاکستان اور ہندوستان سمیت کئی ممالک میں اپنی شہرت اور مقبولیت کا لوہا منوایا۔ یہ ایک ایسی فلم تھی جو دنیائے فلم کے لیے قابلِ تقلید اور بے مثال تسلیم کی گئی۔''

''ہاں یہ درست ہے کہ سرور بھٹی کا تعلق مسجد ممبر سے نہیں۔'' دادا جی بولے۔''مگر وہ ایک مذہبی مزاج کے آدمی ہیں۔ حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ کے عقیدت مند ہیں۔ انہیں اپنا پیرو مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی اس عقیدت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنے پروڈکشن ہاؤس کا نام باہو فلمز رکھا۔ اپنے بیٹے کا نام بھی باہو رکھا۔ حضرت سلطان باہوؒ کے ایک شعر سے ان کی فلم مولا جٹ شروع ہوتی ہے۔ اب اتنی بات اگر یکجا ہو۔ قرآن، حدیث اور اللہ کے ایک ولی کی باتوں کو بنیاد بنا کر فلم بنائی جائے گی تو اس پر اللہ کے رحم و کرم کا سایہ تو ہوگا۔''

''بے شک......بے شک۔''

اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ ذرا توقف کے بعد سید صاحب بولے۔''اس انوکھی فلم کے بارے میں کوئی اور خاص بات؟''

دادا جی نے میری طرف اشارہ کیا۔ مطلب تھا تم جواب دو اس پر میں نے کہا۔

مولا جٹ سے پہلے ایک فلم بنی تھی وحشی جٹ اس فلم سے سرور بھٹی متاثر ہوئے تھے پھر جب انہیں فلم بنانے کا خیال آیا تو ان کے ذہن میں وحشی جٹ کی پرچھائیاں تھیں۔ مولا جٹ کی تکمیل کے دوران کئی لوگوں نے کہا یہ تو وحشی جٹ کی کاپی لگتی ہے۔ مولا جٹ جب مکمل ہوگئی تو اس کی عام نمائش سے پہلے سرور بھٹی نے اسٹوڈیو میں اس فلم کے ایک شو کا اہتمام کیا اور وحشی جٹ کے فلمساز کو خصوصی طور پر یہ فلم دیکھنے کی دعوت دی۔ مولا جٹ دیکھنے کے بعد وحشی جٹ کے فلمساز نے سرور بھٹی کی بڑی تعریف کی اور کہا۔

''بھٹی صاحب آپ نے نہایت اعلیٰ درجے کی فلم بنائی ہے میری فلم وحشی جٹ میں سب کچھ تھا مگر نوری نت نہیں تھا۔ اس لیے وہ فلم اتنی بڑی فلم نہ بن سکی جو یہ بن گئی ہے۔''

''میاں صاحبزادے، آپ ایک بات بتانا بھول گئے۔'' دادا جی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ سرور بھٹی نے مولا جٹ بنانے سے پہلے وحشی جٹ کے فلمساز سے باضابطہ اجازت لی تھی کہ میں آپ کی فلم اپنے انداز سے بنانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے؟''

اس یاددہانی پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا ''میں واقعی بھول گیا تھا۔''

سید صاحب نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''ابھی آپ کہہ رہے تھے وحشی جٹ کے فلمساز نے مولا جٹ دیکھ کر کہا میری فلم وحشی جٹ میں سب کچھ تھا مگر نوری نت نہیں تھا آخر یہ نوری نت کیا تھا جس نے مولا جٹ کو اتنی بڑی فلم بنا دیا؟''

''بڑا خوب صورت اور فکر انگیز سوال ہے۔'' دادا جی نے خوش ہو کر کہا۔ ''چلو میاں اب آپ ہی اس کا جواب دو۔''

''مولا جٹ۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ '' کا شمار پاکستان کی چند بڑی فلموں میں ہوتا ہے۔ اس فلم کو شہرۂ آفاق مقام دلانے میں مولا جٹ کے کردار کے بعد نوری نت کے کردار کی بڑی اہمیت ہے۔ نوری نت ایک ایسی بلا کا نام تھا جو خود اپنے لیے رب سے دشمن طلب کرتا تھا۔ پنجاب کی کوئی جیل ایسی نہ تھی جہاں نوری نت نہ گیا ہو۔ جیلوں میں کیونکہ بڑے بڑے سورمے اور خطرناک مجرم آتے ہیں۔ نوری نت ان میں کوئی جی دار تلاش کرتا جو اس کے جسم پر وار کر کے اس کا جسم لہولہان کرے۔ جیلوں سے ناکام ہو کر پنڈ پنڈ ایسا جی دار تلاش کرنے نکلا۔ بھرت پور کے میلے میں بھی اسے اپنے جوڑ کا کوئی نہ ملا۔ قصہ مختصر یہ کہ نوری نت ایک ایسی خونخوار طاقت کا نام تھا جو دریاؤں پر بند باندھتا، پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا اور اٹھے ہوئے سروں کو نیچا کر کے سونے کا عادی تھا۔ اسے اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔ مصطفیٰ قریشی کے پورے فلمی کیریئر میں جتنا یہ کردار مشہور ہوا دوسرا کوئی کردار نہ ہو پایا۔ اس کردار کی مثال شعلے کے گبر سنگھ سے دی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں منفی کردار برصغیر کی فلمی تاریخ کے ناقابلِ فراموش کردار ہیں۔ جن کی شہرت ہر دور میں، ہر نسل میں برقرار رہے گی۔''

''یہ کردار سازی کا کمال ہے، کہانی، ناول اور فلم کے تخلیق کار کبھی کبھی ایسا کردار سوچتے اور لکھتے ہیں کہ وہ حقیقی اور زندہ کرداروں کی طرح امر ہو جاتے ہیں۔'' دادا جی نے میرے خاموش ہونے کے بعد کہا۔ ذرا رک کے پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ مصطفیٰ قریشی کو جب اس کردار کے لیے کہا گیا تو اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ مصطفیٰ قریشی فلموں میں منفی کردار ضرور کرتا تھا مگر فطرتاً ایک نرم خو اور شریف النفس انسان ہے۔ اس لیے ایک خونخوار درندے کا کردار کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ سرور بھٹی بھی دھن کا پکا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کردار وہی کرے گا، اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کرے گا۔ یہ سوچ کر اس نے مصطفیٰ قریشی کو پیغام بھجوایا کہ اگر تم نے میری فلم میں کام نہیں کیا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

مصطفیٰ قریشی شش و پنج کی حالت میں تھا کہ کروں تو کیا کروں، ایسے میں تخی بادشاہ جگا گجر بنانے والے حاجی محبت علی نے اسے سمجھایا:

''قریشی جی! آپ سرور بھٹی کی فلم میں کام کرنے سے انکار نہ کریں۔ اس کی فلم مولا جٹ میں کام کر لیں کیونکہ یہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ یہ وہ بندہ ہے جس نے ضیاالحق کی حکومت سے بھی ٹکر لے رکھی ہے۔''

''مصطفیٰ قریشی ایک شریف اور امن پسند شخص تھا۔ وہ حیدرآباد سے فلم میں کام کرنے لاہور آیا تھا۔ اس لیے اس نے اس بات میں عافیت محسوس کی کہ سرور بھٹی کی فلم مولا جٹ میں کام کر لے۔'' دادا جی اتنا کہہ کر ذرا رک کے پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''اس سے پہلے کہ تمہارے دوست مولا جٹ کے کردار کے بارے میں سوال کریں تم خود ہی انہیں بتا دو کہ مولا جٹ کون تھا، کیا تھا؟''

''آپ کی اس قیافہ شناسی پر اللہ آپ کو سدا جوان رکھے۔'' سید صاحب ایک دم بول پڑے۔ ''واقعی میں یہ پوچھنے ہی والا تھا کہ......''

''مجھے مزید جوانی کی دعا نہ دو برخوردار۔ میں پہلے ہی تم جیسی بوڑھی طبیعت کے جوانوں کی تنقید کا مارا ہوں۔ اپنے دوست کی سنو کہ وہ تمہیں کیا بتاتے ہیں۔''

''مولا جٹ کا کردار امن و سلامتی اور انصاف کا علمبردار تھا۔ زمین پر فساد پھیلانے والوں کے خلاف اس نے اپنا گنڈاسا اٹھا لیا تھا۔'' میں نے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کر دیا۔ ''حکومت نے اسے پچیس گاؤں کا منصف بنایا تھا یہ کردار اپنے اندر انسانیت کا درد لیے پردہ سیمیں پر ایک خاص نجات دہندہ کے روپ میں نظر آتا ہے۔ یہ وہ کردار تھا جس نے ایک مظلوم غریب لڑکی کی پکار پر ایک ظالم کا سر جھکایا تھا۔ مولا جٹ اسلامی روایات کا ایک علم

برادر کردار تھا جس نے محمد بن قاسم کی روایت کو زندہ کیا۔ فساد پھیلانے والوں کے خلاف اپنا گنڈاسا اٹھایا اور انسانیت کا بول بالا کیا۔"

معاشرے میں انصاف قائم ہو جائے اور ظلم کا خاتمہ ہو جائے تو کوئی مولا جٹ بھی کھڑاک نہیں کرے گا۔ یہی مولا جٹ کا دعویٰ تھا یہی اس کردار کی پہچان تھی۔"

اتنا کہہ کر میں ذرا رکا اور سوچا کہ اس کردار کو کرنے والے اداکار سلطان راہی کے بارے میں بھی کچھ بتانا چاہیے اس کے بعد میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "سلطان راہی اس کردار کی ادائیگی میں فن کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ ایسی اداکاری کی نظیر پنجابی سینما میں تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ سلطان راہی اس کردار کو اس کی اصل روح کے ساتھ ادا کر کے امر ہو گئے۔ سید صاحب یہ تو آپ نے بھی سنا ہوگا کہ سلطان راہی اپنی ذاتی زندگی میں عملی طور پر ایک خداترس انسان تھے۔ اپنی کمائی کا زیادہ تر حصہ مفلس نادار اور غریب غربا کی امداد میں صرف کر دیتے تھے۔ دینے کا انداز بھی یہ تھا کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ اللہ نے ان کے نیک اعمال کی وجہ سے ان کا اتنا بڑا جنازہ اٹھا۔ لاہور کی تاریخ شاہد ہے کہ ان کا جنازہ غازی علم دین شہیدؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بعد تیسرا جنازہ تھا جس میں ان گنت لوگوں نے شرکت کی تھی۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔" اتنا کہہ کر میں رکا تو کمرے کی فضا میں اداسی کا سحر طاری تھا۔ اچھے لوگ ہمیشہ اپنی اچھائیوں کے حوالے سے ہی یاد کیے جاتے ہیں۔

ذرا دیر بعد دادا جی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "بہت سے مورکھ یہ سمجھتے ہیں کہ شوبز سے وابستہ سارے ہی لوگ برے ہوتے ہیں۔ یہ ان کی کتنی بڑی بھول ہے۔ سلطان راہی، محمد علی اور کئی فلمی لوگ آج بھی جب وہ اس دنیا میں موجود نہیں اپنی نیکوکاری، انسان دوستی اور دیگر اچھی باتوں کی وجہ سے ان گنت لوگوں کی یادوں میں زندہ ہیں۔"

"اگر مولا جٹ کے حوالے سے بھی بات کی جائے۔" میں نے دادا جی کی بات کو بڑھاوا دیا۔ "تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس فلم کو بنانے کا مقصد بھی ایک نیک کام ہے۔ ظلم، بربریت اور زور زبردستی ایک طاقتور طبقے کا ہمیشہ شعار رہا ہے۔ ہر دور میں کمزور انسانوں پر طاقت کے نشے میں چور لوگ ظلم اور جبر کے پہاڑ توڑتے رہے ہیں۔ مظلوم انسانیت کو ایسے جابروں اور ظالموں سے نجات دلانا، جہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ مولا جٹ بنانے والوں کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جائے۔ اس فلم میں مولا جٹ ایسے ہی کردار کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ بھی ایک بہادر اور جی دار انسان تھا۔ اس کے پاس بھی جدال وقتال کے لیے ایک خطرناک ہتھیار گنڈاسا تھا مگر اس نے اپنا یہ ہتھیار ایک قبرستان میں دفن کر دیا تھا۔ حکومت کی طرف سے اسے جو ایک منصف کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا۔ اس کی ذمے داری ادا کرتا تھا۔ 25 گاؤں میں عدل و انصاف کے تقاضے بڑے پُرامن ماحول میں پورے کرتا تھا۔ مگر جب ایک غریب اور مظلوم لڑکی نے اپنی عزت و ناموس کی پاسداری کے لیے اسے پکارا تو اسے چادر اور چار دیواری کے تقدس کے لیے ظالموں کے خلاف ہتھیار اٹھانا پڑا۔ اس نے قبرستان میں اپنا جو گنڈاسا دفن کر رکھا تھا اسے نکال لیا اور ظالموں کے خلاف، جنگ شروع کر دی۔"

سید صاحب، میری باتیں بڑی سنجیدگی سے سن رہے تھے۔ میں رکا تو بول پڑے۔ "میں نے مولا جٹ کے بارے میں بس یہی سنا تھا کہ یہ ایک مار دھاڑ سے بھرپور فلم ہے جس میں درندگی اور انسانیت سوز مناظر کے سوا اور کچھ نہیں مگر آپ نے تو اس کے بارے میں اس کے مثبت پہلوؤں کو اجاگر کر کے حیران کر دیا۔ اس کے تخلیق کار قابلِ تحسین ہیں۔ ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

"برخوردار!" دادا جی نے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اگر تم چائے پیے بغیر چائے کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لو کہ یہ اچھی ہے یا بری ہے تو یہ چائے کا نہیں تمہارا قصور ہوگا۔ اسی طرح فلم دیکھے بغیر یہ فیصلہ کر لینا کہ یہ ایسی ہوگی، یہ بھی بددیانتی ہے۔ فلم ابلاغ کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو صرف تفریح مہیا نہیں کرتا تفریح کے ساتھ ساتھ اچھی اور سبق آموز باتیں بھی سکھاتا ہے۔ یوں تو تقریباً ہر فلم میں خیر و شر کا پہلو ہوتا ہے مگر کچھ فلمیں خصوصی طور پر ملک و معاشرے کی کسی برائی یا خرابی کی نشاندہی کرتی ہیں تاکہ ان سے بچا جائے ان کی اصلاح کر کے انہیں ختم کر کے انسانیت کو تباہی و بربادی سے بچایا جائے۔"

"مولا جٹ میں اگر مار دھاڑ اور جبر و تشدد کے مناظر ہیں۔" میں نے دادا جی کے رکنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ "تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کہانی ہی ایسے لوگوں کے گرد گھومتی ہے جن کا کام ہی مار دھاڑ ہے، دنگا فساد ہے۔ یہ

سب کچھ دکھائے بغیر ان کے کردار کس طرح ڈیولپ ہو سکتے تھے؟ یہ سب کچھ دکھانے کا مقصد یہ تھا کہ معاشرے سے ایسے عناصر کا قلع قمع کیا جائے، عوام الناس کو ان کے شر سے نجات دلائی جائے۔ یہ باتیں کہ برائی کے خلاف جہاد کرو، فساد پھیلانے والوں کی سرکوبی کرو، اگر ہم لوگ اخباروں میں لکھیں، ٹی وی کے ٹاک شوز میں بیٹھ کر کریں یا ایک دوسرے سے ملاقات کے دوران کہیں تو اس کا اثر ہرگز اتنا مؤثر نہیں ہوگا جتنا فلم دیکھ کر ہوتا ہے۔ فلم ایک تفریح ہے، کھیل تماشا ہے۔ فلم میکر اس کھیل تماشے کے دوران تماشائیوں کے دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے اور وہ باتیں جو اسکول کالج اور تربیت گاہ میں مؤثر طور پر سمجھانا مشکل ہوتا ہے، فلم کے ذریعے انسانی ذہن آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔''

''آپ اگر اجازت دیں۔'' دادا جی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ کی کہی ہوئی باتوں کی وضاحت کے طور پر فلم مولا جٹ سے کچھ مثالیں دوں کہ کس طرح اس کے تخلیق کار نے تماشائیوں کو پورے طور پر اپنے شکنجے میں جکڑے رہنے پر مجبور کیا۔ اس کا ایک کلیدی کردار نوری نت ہے جس کے بارے میں آپ یہ سن چکے ہیں کہ اگر یہ کردار نہ ہوتا تو مولا جٹ اتنی بڑی اور اس قدر کامیاب فلم نہ ہوتی۔ یہ سرور بھٹی کی سوچ اور وژن کا کمال ہے کہ اس نے ایک ایسا انوکھا کردار تخلیق کیا جس کی ہر بات اور ہر عادت چونکا دینے والی تھی۔ جو ایسا ظالم اور اذیت پسند تھا کہ اپنے آپ کو بھی اپنی اذیت پسندی کا شکار بنانے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ اپنے جسم پر دوسروں سے ضربیں لگوا کر لہولہان ہوتا اور چاہتا کہ اس کا مدمقابل اسے مار مار کر ادھ موا کر دے، اسے قابو میں کر لے۔ اسے شکست دے دے مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو اس کا جنون اور پاگل پن اور بڑھ جاتا۔ ایسے کسی جی دار دشمن کی تلاش میں وہ جانے کتنی جیلوں میں جا چکا تھا جہاں بڑے بڑے مجرم ہوتے مگر کہیں بھی اس کی خواہش کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اس کی یہ جنونی خواہش جیل یا جیل کے باہر پوری نہیں ہوتی اس کا پاگل پن اور بڑھ جاتا تھا۔'' دادا جی ذرا رکے، ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر بولے۔ ''فلموں کے سارے ولن ہی منہ زور اور شیطانی خصلت کے حامل ہوتے ہیں مگر مولا جٹ کے ولن نوری نت کو اتنا خونخوار اور دہشت کا ایسا علمبردار دکھایا گیا ہے کہ تماشائی دنگ رہ جاتے ہیں۔ فلم کے اختتامی حصے میں

منڈاناؤ

جنوبی فلپین کا علاقہ۔ اس کا رقبہ 99040 مربع کلومیٹر یا 38229 مربع میل ہے۔ اس کا پہاڑی علاقہ 2954 میٹر یا 9691 فٹ تک بلند ہے۔ بلند ترین پہاڑ آپو (Apo) ہے۔ یہ زندہ آتش فشاں بھی ہے۔ ڈیواؤ Davao، زم بوآنگا اس کے مشہور قصبے ہیں۔ پٹ سن، اناس، کافی، چاول، ناریل، ربر اور لکڑی اس علاقے کی اہم زرعی پیداوار ہیں۔ معدنیات میں سونا، لوہا اور نکل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اہم صنعتوں میں ادویات، کھاد، فولاد سازی کی صنعتیں شامل ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہوں نے اس علاقے کو 1970ء کے عشرے میں آزاد کرانے کے لیے گوریلا تحریک شروع کی تھی۔

مرسلہ: اشرف عباس۔ ساہیوال

جب آخری مار کے دوران مولا جٹ اسے گرا دیتا ہے اور اپنا گنڈاسا اٹھا کر اس کی ٹانگ کاٹنا چاہتا ہے تو اس کی بہن ہاتھ جوڑ کر مولا جٹ سے رحم کی بھیک مانگتی ہے اور کہتی ہے، میرے بھائی کو نہ مارو میں پہلے ہی ایک بھائی گنوا چکی ہوں۔ اب اسے کھونا نہیں چاہتی۔ مولا جٹ اپنا گنڈاسا پھینک دیتا ہے اور نوری نت سے کہتا ہے۔''

''جا تو بھی کیا یاد کرے گا، میں نے تیری بہن کی درخواست پر تجھے معاف کیا، ورنہ میں نے تو تیری ٹانگ کاٹ کر زندگی بھر کے لیے اپاہج بنانے کا سوچ لیا تھا۔''

نوری نت نے خود ہی کھٹاک سے اپنی ٹانگ کاٹ لی اور بولا۔ ''مجھے بخشش میں جنت بھی ملے تو قبول نہ کروں۔'' پھر کٹی ہوئی ٹانگ مولا جٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''او جٹا! یہ میری طرف سے اپنی بہادری کا انعام سمجھ کر لیتا جا۔''

''آپ نے درست فرمایا۔'' میں نے دادا جی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''فلم بنانے والوں کو اپنی فلم کی کامیابی کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے۔ منفرد کہانی چونکا دینے والے واقعات، حیران کر دینے والے کردار، فن کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی اداکاری، عمدہ اسکرین پلے، دل کو چھوتے ہوئے مکالمے، مسحور کن عکاسی، مسحور کن موسیقی اور

ہدایت کاری کا کمال۔ یہ سارے عناصر مل کر فلم کو کامیاب بناتے ہیں اور ان سب باتوں کے ساتھ اگر کہانی کا موضوع اور تھیم سماج سدھارک ہو، تو سونے پر سہاگے والی بات ہوجاتی ہے۔ اب مولا جٹ کی پذیرائی، مقبولیت اور شہرت کو دیکھیے تو بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ یہ کامیابی اسے یونہی نہیں ملی۔ اس فلم کا نام ہی ضرب المثل بن گیا۔ سیاست داں اور اسمبلیوں کے ممبران بھی اپنی گفتگو میں مولا جٹ کا حوالہ دینے لگے۔

جن دنوں عمران خان اور طاہر القادری دھرنا دے رہے تھے تو حمزہ شریف نے اپنے ایک بیان میں کہا۔ ''یہ لوگ مولا جٹ بنے ہوئے ہیں۔''

''جس پر سرور بھٹی نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ وہ مولا جٹ ہیں جن کے پاس گنڈاسا نہیں ہے جس دن انہوں نے گنڈاسا اٹھالیا، حکومت گرادیں گے۔ تب یہ صحیح مولا جٹ بن جائیں گے۔''

سرور بھٹی جب انڈیا گئے تو وہاں کے میڈیا اور پریس نے سرور بھٹی کی تصویر کے ساتھ جو خبر چھاپی اس کا عنوان تھا۔ ''مولا جٹ ان انڈیا۔''

نامور بولی ووڈ اداکار دھرمندر نے سرور بھٹی کی میہمانی سات دنوں تک کی اور اپنی ساری شوٹنگ کینسل کر کے وہ اور ان کی فیملی ان کے ساتھ رہی۔ ہوٹل کا بل دھرمندر جی نے سرور بھٹی کو ادا کرنے نہیں دیا خود ادا کیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ دھرم جی اور ان کے اہلِ خانہ مولا جٹ کے عاشق ہیں۔

''یہ فلم اپنی غیر معمولی خوبیوں کی وجہ سے صرف پاکستان ہی میں نہیں دیگر ممالک میں بھی بے حد پسند کی گئی اور بھارت سمیت کئی ملکوں میں اس سے متاثر ہوکر فلمیں بنائی گئیں۔''

''یہ جو نوری نت نے خود اپنی ٹانگ کاٹ کر مولا جٹ کو اس کی بہادری کا انعام کہہ کر اسے دینا چاہا۔'' دادا جی بولے۔ ''اس سلسلے میں ایک اہم بات یاد آگئی۔''

''اچھا...... کیا وہ کوئی خاص بات ہے؟'' سید صاحب بول پڑے۔

''ہاں بھئی کہا نا کہ اہم بات ہے۔'' بے جا ٹوکنے پر دادا جی شاید برا مان گئے تھے پھر نارمل ہوتے ہوئے بولے۔ ''فلم کی نمائش سے پہلے جب اس منظر کے رش پرنٹ فلمی دنیا کے لوگوں نے اسٹوڈیو میں دیکھی تو سلطان راہی نے اپنا سر پیٹ لیا اور ڈائریکٹر یونس ملک سے کہا۔ ''یہ تم نے کیا کردیا میں نے ساری فلم میں کہا ہے کہ میں تیری بہن کو بیاہ لاؤں گا اور تیرے غرور کا سر نیچا کر دکھاؤں گا۔ تو نے اس کے ہاتھوں خود اس کی ٹانگ کٹوا کر مجھے دیتے ہوئے کہلوایا'' جا میں اپنے جگر کے ٹکڑے کے ساتھ ساتھ اپنے جسم کا یہ ٹکڑا بھی تجھے انعام کے طور پر دیتا ہوں۔'' اس منظر کے بعد تو میں ہیرو سے زیرو ہوجاؤں گا اور ولن ہیرو بن جائے گا۔''

یونس ملک بھاگا ہوا سرور بھٹی کے پاس گیا اور سلطان راہی کی باتیں بتا کر بولا۔ ''سلطان راہی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ یہ ٹانگ مولا جٹ ہی کے ہاتھوں کٹوائیں۔''

''نہیں میں ایسا نہیں کرواؤں گا فلم اسی منظر کے ساتھ ریلیز ہوگی۔ سلطان راہی یا مصطفی قریشی میرے رشتے دار نہیں کہ میں ان کے مفاد کو مقدم سمجھوں۔ ان کے حکم کی تابعداری کروں۔ جو مجھے ٹھیک لگا وہی میں نے کیا ہے۔''

''پھر تو فلم فلاپ ہوجائے گی۔''

''نہیں ہوگی۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ اس منظر نے ہی مولا جٹ کو ایک غیر معمولی ورجہ کی فلم بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔'' اس واقعے کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ فلم کے تخلیق کا وژن اگر درست ہو تو اس کی کامیابی کے لیے درست سمت اختیار کرتا ہے۔ صحیح فیصلے کرتا ہے۔ کوئی غلط قدم خود اٹھاتا ہے نہ دوسروں کے غلط مشوروں پر عمل کرتا ہے۔''

ذرا دیر تک خاموشی طاری رہی پھر سید صاحب کی آواز نے خاموشی کا طلسم توڑا۔ ''پھر تو فلم کا اختتام مولا جٹ اور نوری نت کی بہن کی شادی کے منظر پر ہوا ہوگا؟''

دادا جی نے میری طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا میں جواب دوں۔ میں نے سید صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''نہیں...... نوری نت کی بہن وارو سے مولا جٹ کی شادی نہیں ہوتی۔''

''کیوں؟''

اس لیے کہ جب نوری نت کی بہن نے ہاتھ جوڑ کر اپنے بھائی کی زندگی کی بھیک مانگی تو مولا جٹ نے کہا۔ ''دشمن کی بہن نے اگر مجھ سے مانگی بھی تو اتنی چھوٹی سی چیز...... اگر وہ ہاتھ اٹھا کر میری جان بھی مانگتی تو مولا قسم میں انکار نہ کرتا۔ بس ایک بار مجھے بھائی کہہ کر یہ دشمنی ختم

کردے، وارو بھائی کہتی ہے۔ مولا جٹ بہن کہہ کر اسے گلے لگا لیتا ہے۔ بس اسی وقت زخمی نوری نت جو زمین پر زخموں سے چور گرا ہوا ہے کھٹ کر کے خود ہی اپنی ٹانگ کاٹ کر مولا جٹ سے کہتا ہے۔ ''یہ لات اپنا انصاف سمجھ کر لے جا میں اسے تیری بہادری کا انعام سمجھ کر بھول جاؤں گا۔''

مولا جٹ اپنے گنڈاسے کو پھینکتے ہوئے کہتا ہے۔ ''میں اسے دفن کردوں گا۔ انسانیت انتقام نہیں انصاف چاہتی ہے۔ انصاف ہوتا رہے تو کوئی مولا جٹ کھڑاگ نہیں کرے گا۔'' اسی پر فلم کا اختتام ہوجاتا ہے۔

''یعنی......'' سید صاحب نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ''اس فلم میں پیار محبت کے جذبات کو اس قدر اجاگر نہیں کیا گیا جس قدر بہادری اور جی داری کو نمایاں کیا گیا۔''

''پیار محبت کا مطلب صرف عورت اور مرد کا پیار نہیں ہوتا۔ پیار ماں باپ بہن بھائی سے بھی کیا جاتا ہے۔ مظلوموں اور مجبوروں سے بھی کیا جاتا ہے۔ وطن سے بھی محبت کی جاتی ہے اور ملک اور معاشرے میں انصاف کا بول بالا کر کے بھی انسانیت سے پیار اور محبت کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔''

''اس مار دھاڑ اور خون خرابے سے بھرپور فلم میں بھی۔'' دادا جی نے میری بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہی بتانے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر مظلوموں کو انصاف ملتا رہے تو کسی بہادر اور سورما کو ظالموں کی سرکوبی کے لیے میدان جنگ میں نہ کودنا پڑے، ملک اور معاشرے میں ساری خرابی کا سبب انصاف کی عدم دستیابی ہے۔'' وہ لحہ بھر رک کر پھر بولے۔ ''کوئی اور سوال؟''

سید صاحب نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ ''اکثر پنجابی فلموں میں بڑے پیارے اور کانوں میں رس گھولنے والے گانے ہوتے ہیں جیسے

سب توں سونیا ہائے رے من مونیا
میں تری ہوگئی، پیار وچ کھوگئی

یا

سانوں نہر والے پل تے بلا کے
خورے ماہی کتھے رہ گیا

یا

آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے

وغیرہ مگر مولا جٹ میں ایسا کوئی گیت نہیں جو اس طرح مقبول ہوا ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

دادا جی نے خود ہی جواب دیا۔ ''مولا جٹ کے گانے واقعی ایسے مقبول نہیں ہوئے جیسے اس کی بعض دیگر باتیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے فلمساز نے اس کی موسیقی کے شعبے میں توجہ نہیں دی۔ اس دور کے ٹاپ کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین کی خدمات حاصل کیں۔ جب سرور بھٹی نے ماسٹر صاحب سے کہا۔ ''مجھے اے کلاس موسیقی چاہیے۔'' تو ماسٹر عنایت حسین نے کہا۔ ''تب تو مجھے پندرہ ہزار روپے معاوضہ ادا کرنا پڑے گا آپ کو۔''

سرور بھٹی نے یہ جانتے ہوئے کہ ان کا موجودہ ریٹ پانچ ہزار روپے ہے تو انہوں نے ان کی ڈیمانڈ پوری کردی جبکہ ماسٹر صاحب نے بھی گیتوں کی خوب صورت دھنیں کمپوز کیں۔ گانے فلمی کہانی کے سچوئشنز کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں۔ اس فلم کے سارے گیت بھی کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق تخلیق کیے گئے۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران کچھ لوگوں نے سرور بھٹی کو مشورہ دیا کہ اس فلم میں کچھ مسالے دار گیت اور ڈانس بھی ڈال دیں تاکہ فلم کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوجائے مگر سرور بھٹی نے یہ کہہ کر کہ میں چادر اور چاردیواری کے تقدس پر فلم بنارہا ہوں، اس مشورے کو مسترد کردیا اور کہا۔ ''میں اس فلم میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں کروں گا جو معاشرے میں بگاڑ پیدا کرے۔''

دادا جی ذرا رک کر پھر بولے۔ ''رہی یہ بات کہ اس فلم کا کوئی گانا ہٹ کیوں نہیں ہوا؟ یہ بڑا گمبھیر سوال ہے۔ موقع محل کے لحاظ سے تو سارے گانے انگوٹھی میں نگینے کی طرح ہیں۔ ان کے بول سچوئشن کے مطابق بامعنی اور فکر انگیز ہیں۔ سرور بھٹی نے جہاں ٹاپ کے موسیقار کو منہ مانگے معاوضے پر انگیج کیا وہاں کچھ سوچ کر ہی ایک نئے نغمہ نگار نسیم فضل کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی کارکردگی بری بھی نہیں تھی، کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق اس نے بہت خوب صورت شاعری کی تھی۔ اس کے باوجود ایک بھی گانا زیادہ زد و عام نہیں ہوا مگر یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں۔ اس سے مولا جٹ کی بلاک بسٹر کامیابی پر کوئی اثر نہیں پڑا البتہ......'' اتنا کہہ کر دادا جی رک کے پھر بڑے افسردہ لہجے میں بولے۔ ''اس غریب شاعر کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا اس فلم کے بعد کسی فلمساز یا موسیقار نے اسے کسی فلم کے گیت لکھنے کا موقع نہیں دیا۔''

علیم شاھد

سفر وسیلہ ظفر کہلاتا ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سفر تجربے کی دولت سے بھی مالا مال کرتا ہے۔ علیم شاہد کا تعلق قلم قبیلے سے ہے اس لیے انہوں نے اس سفر کو ایک نئے زاویے سے احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ اس سفر نامے میں آپ کو امریکا ایک نئے انداز میں سامنے آتا محسوس ہو گا۔

سفر نامہ پسند کرنے والوں کے لیے ایک جداگانہ تحریر

امریکا میں بیٹے فیصل اور بہو راحت نے ہماری بڑی پذیرائی کی۔ ہر طرح بہت خیال رکھا۔ راحت نے ہمارے آرام آسائش اور سہولت کے لیے انتھک محنت کی۔ پلیزنٹ ہل، ڈبلن سے 40-50 میل پر ہے لیکن نجمہ کے بھائی عتیق اور بھابی سعدیہ برابر ہم سے ملنے آتے رہے۔ ہم بھی ہفتے میں ایک دو مرتبہ عتیق کے یہاں جاتے رہے۔ ہمارے پہنچنے کے ایک ہفتے بعد بھتیجے شیکی بھی پہنچ گئے۔ شیکی کو بھی امریکا میں رہتے ہوئے 10 سال ہو رہے ہیں۔ اسٹیٹ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا سے فارغ التحصیل ہیں۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کی ڈگری کے حامل ہیں۔ امریکا کی

اچھی کمپنیوں میں ملازمت کر چکے ہیں اور اب رئیل اسٹیٹ کا ذاتی بزنس کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

Thanks giving day پر بھانجے فواد بہو فاریہ کے ہمراہ ہم سے ملنے آگئے۔ جواد میاں انجینئر ہیں سیکرامیٹو یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ سادہ، محنت کرنے والی، محبت کرنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ سان ڈیاگو میں I.T کی بہت بڑی کمپنی میں اچھی پوسٹ پر فائز ہیں۔ سارے سان ڈیگو میں موبائل چینلز انسٹال کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے آنے سے گھر میں چہل پہل اور رونق بڑھتی رہی۔ میں، نجمہ، فیصل، راحت، شکی، جواد، فاریہ، عتیق، سعدیہ جب مل بیٹھے، کھاتے پیتے، تفریح کو جاتے تو بہت مزہ آتا اور ماحول امریکا سے نکل کر پاکستان پہنچ جاتا۔ میں ان بھائیوں کے آپس میں میل جول اور اتفاق اور خوش حالی پر خدا کا شکر ادا کرتا اور برکت کا طالب ہوتا۔

شکاگو میں مقیم بھتیجی سمعیہ سے بھی برابر رابطہ رہا اور راشد رحیمی کا فون آتا رہا۔ دونوں ہی ہمیں وہاں بلانے کے خواہش مند تھے لیکن وہاں کی سردی ناقابل برداشت ہونے کی وجہ سے ہم نے انہیں ڈبلن آنے کی دعوت دی۔

راشد رحیمی والد محترم کے قریبی عزیز اشفاق عمر دراز مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ گزشتہ 30-35 سال سے امریکا میں رہتے ہیں۔ فیملی کے ہمراہ شکاگو سے ذرا آگے رسل میں رہائش پذیر ہیں۔ خود بڑی فرنیچر کمپنی میں مینیجر ہیں۔ بچے بھی تعلیم یافتہ اور برسر روزگار ہیں۔ ہم لوگوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ راشد بھائی پیاری شخصیت کے مالک اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ راشد کو اپنی بہن سے بھی ملے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا وہ یہاں قریب Fremont میں رہتی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے جلد آنے کا وعدہ کیا اور جواد کے جانے کے بعد وہ بھی بیگم کے ہمراہ تشریف لے آئے۔ فیصل اور راحت نے انہیں کھانے کی دعوت دی۔ راشد بھائی اور سوشیلا بھابی فریمونٹ سے ڈبلن آئے۔ عتیق سعدیہ پلیزنٹ ہل سے آئے۔ راحت نے عمدہ کھانا بنایا۔ سالن میں بکرے کا پایا تھا۔ سب نے مزے لے لے کے کھایا۔ راشد بھائی شاعر ہیں۔ میرے لیے اپنی کتاب اور تازہ کلام کا تحفہ لے کر آئے۔ اپنی فیملی کی تصاویر اور بیٹے کی شادی کی تقریب کی CD لائے۔ کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے، محفل جمی جس میں سب موجود تھے اور شعر و شاعری کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ بہت مزہ آیا۔ سب ہی بہت محظوظ ہوئے۔ رات گئے راشد بھائی اور سوشیلا بھابی خوشی خوشی رخصت ہوئے۔ عتیق سعدیہ بھی اپنے گھر گئے اور ہم سو گئے۔

کچھ دن بعد فیصل کے دوست اظفر کے ابو، امی، بہن، بہنوئی لاس ویگاس سے آ گئے۔

اظفر فیصل کے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو رہے ہیں اور آپس میں فیملی ریلیشنز ہیں۔ فیصل نے ان لوگوں کی بھی بڑی خوشی سے دعوت کی، یہ لوگ آئے بڑی اپنائیت سے ملے۔ فیصل نے ہمارا تعارف کرایا۔ بہت پڑھی لکھی اور Sophisticated فیملی ہے۔ اظفر کے والد دس سال پاکستان ایئرفورس میں رہے آخر میں Wing Comandar تھے۔ دس سال PIA میں سینئر پائلٹ رہے اور دس سال سے امریکا میں رہائش پذیر ہیں۔ بڑے مزے کی گفتگو رہی۔ کہہ رہے تھے کہ اب یہ میرا آخری Decade ہے۔ اظفر کی امی بھی تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ ساری دنیا کی سیاحت کر چکی ہیں۔ بہن اور بہنوئی ماسٹرز کر چکے ہیں اور اچھی اچھی کمپنیوں میں ملازمت کر رہے ہیں۔

کھانے کے بعد سب مل کر بیٹھے۔ بڑی معلوماتی مزیدار باتیں ہوئیں۔ میری نظموں کو سنا بہت ہمت افزائی کی اور لکھ کر بھجوانے کا وعدہ لیا۔ اندر محفل گرم تھی۔ باہر پالے کی سردی تھی۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ محفل برخواست ہوئی اور یہ لوگ خوشی خوشی رخصت ہو گئے۔

ہمارے ملک میں اللہ نے رشتے داروں، دوستوں اور ملنے والوں کی نعمت سے نوازا ہے لیکن گھر کی مرغی دال برابر والی کہاوت کا احساس پردیس میں ہوتا ہے جہاں کوئی اپنا ہمدم مل جائے تو اس قدر خوشی اور مسرت ہوتی ہے جیسے سمندر سے موتی مل گیا ہو، جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے، جیسے صحرا میں ہولے سے چلے باد نسیم، جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے۔

اگلے ہفتے ثنا اور شانی، برخوردار عبداللہ تشریف لے آئے۔ شکی کے ہمراہ میں بھی ایئرپورٹ گیا۔ ان لوگوں کی رہائش کا بندوبست شکی نے پہلے سے ہی ڈبلن میں Hay at Regang میں کرا دیا تھا۔ شانی کے لیے کیلی فورنیا نیا نہیں تھا۔ وہ یہاں State Universiety سے فارغ التحصیل ہیں اور یہاں کے گلی کوچوں اور یہاں کی زندگی سے واقف رہے ہیں۔ برابر یہ لوگ آتے رہے، ملتے رہے، کھانے پینے کی محفل جمتی رہی اور سب لوگ ہی اس خوب صورت شہر میں خوب صورت موسم میں لطف اندوز

ہوتے رہے۔ چند روز بعد فیصل، شیکی، شانی، عتیق کے مشترکہ دوست سہیل بھائی لاس ویگاس سے آگئے۔ سہیل بھائی اپنے بہنوئی کے اسٹور A1 Vaccume Wilders Vaccume اور Los Vegas الامیڈا کو manage کرتے ہیں۔ انتہائی بزلہ سنج، خوش مزاج، دبنگ، یاروں کے یار، پرانے تجربہ کار امریکی بزنس مین ہیں۔ کھانے کے بے حد شوقین ہیں۔ فیصل، نونی، عتیق، شیکی، شانی، سب لڑکوں نے ان کے پاس کام کیا ہے۔ کام سیکھا ہے بلکہ امریکا میں ان کی لڑکوں کے ساتھ بڑی رہنمائی رہی ہے۔ سب ہی کامیاب ہیں۔ سب ہی صاحب حیثیت ہیں۔ سہیل بھائی ان سب کے قدردان ہیں۔ مخلص دوست ہیں اور خوش ہو کر ملتے ہیں۔ انہیں پتا چلا کہ میں اور شانی ڈبلن میں موجود ہیں تو بے انتہا مسرت کا اظہار کیا۔ بے چارے بہت عزت کرتے ہیں۔ انہوں نے ہماری دعوت پکوان فری مونٹ میں کردی۔ فری مونٹ جنوب میں بڑی اچھی بستی ہے جہاں افغانیوں اور پاکستانیوں کی کثرت ہے اسی نسبت سے ایک بہترین کامیاب پاکستانی ریسٹورنٹ پکوان یہاں قائم ہے جو ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ پاکستانی ڈشز بڑے اہتمام کے ساتھ یہاں دستیاب ہوتی ہیں۔ اکثر پاکستانی یہیں اپنی ملاقاتوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ بہت سارے لوگوں سے یہاں ملاقات ہو جاتی ہے۔

میں، فیصل، شیکی، شانی پکوان پہنچ گئے۔ سہیل بھائی اپنے صاحبزادے کے ہمراہ موجود تھے۔ پرانے ساتھی عرصہ بعد مل رہے تھے اور خوشیاں ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھیں۔ کھانے میں کباب تھے، قورمہ چکن کا تھا، بکرے کے پائے، نہاری، کھیر اور چائے تھی، غرض ہر چیز لاجواب تھی۔ مزیدار تھی۔ لگ نہیں رہا تھا کہ امریکا میں بیٹھے ہیں مکمل پاکستانی، کراچی جیسا ماحول تھا۔ اس کھانے کو اس ماحول کو انجوائے کرنے کے لیے ہمیں دوسری ٹیبلوں پر گورے، چائنیز، انڈین اور میکسیکن بھی نظر آرہے تھے جنہیں یہ نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کھا رہے ہیں۔ وہ منہ سے کھا رہے تھے، آنکھوں اور ناک سے ٹپکتے پانی کو مسلسل پونچھ رہے تھے۔ چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ میں ابھی اور انجوائے کرتا مگر سردی شاندار تھی۔ اس لیے رات بھیگ رہی تھی۔ سب نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

جرگہ

بمعنی پنچایت۔ بلوچی میں انگریزی دور سے پہلے عموماً مقامی جرگوں کا رواج تھا جو وصیت، طلاق، منگنی، قتل، شدید چوٹ اور فتنہ و فساد کے مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ اس طرح ہر قبیلہ عدلی لحاظ سے آزاد تھا۔ بلوچستان کے پہلے ایجنٹ گورنر جنرل سر رابرٹ سنڈیمن (1877ء۔ 1892ء) نے نہ صرف جرگے کے وسیع استعمال پر زور دیا بلکہ اضلاع، قبائل اور صوبوں کے لیے جرگے منظم کیے۔ اضلاع اور قبائل کے باہمی جھگڑوں کے لیے شاہی جرگہ، گرمی میں کوئٹہ اور سردی میں سبی میں منعقد ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ فورٹ منرو میں سالانہ ایک جرگہ ہوتا تھا جو پنجاب اور بلوچستان کے سرحدی مقدمات سنتا تھا۔ جرگے کا کوئی تحریری دستور قانون نہ تھا بلکہ عموماً ہر قسم کے تنازعے کے لیے روایتی سزائیں مقرر تھیں۔ جو اہل جرگہ حالات کے مطابق دے دیتے تھے۔ مثلاً مکران میں معتبر بلوچ کا خون بہا تین ہزار روپیا تھا۔ ایک عام بلوچ کا دو ہزار روپے، سیر یعنی ملاح کا پانچ سو روپے اور غلام کا دو سو روپے۔ اس میں سے ایک تہائی نقد، ایک تہائی آلات اور ایک تہائی جائیداد کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا اکثر امور شرعی قانون کے مطابق حل ہوتے تھے لیکن بعض امور میں مقامی رسم کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جرگے کے ارکان نامزد ہوتے تھے اور صدر کوئی اعلیٰ سرکاری افسر جس کا تعلق قانون اور امن سے ہو جیسے مجسٹریٹ وغیرہ۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ نظام عدل قائم رہا۔ 1970ء میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل یحییٰ خان نے اسے منسوخ کردیا۔

مرسلہ: نادر مرزا۔ اسلام آباد

آج شام راحت نے اپنی سہیلیوں کی دعوت کی ہوئی ہے۔ سب ایک ایک ڈش بنا کر لائیں گی۔ یہ entertainment اور get to gather کا طریقہ امریکا میں مقبول ہے۔ اس طرح لوگ جمع ہوتے ہیں، مختلف ڈشز کو انجوائے کرتے ہیں ہلکی پھلکی خوش گپیاں کرتے اور رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگلی مرتبہ یہ تقریب کسی دوسرے گھر میں ہوتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسے Pod Luck Party کہتے ہیں۔ یہ تقریب

خالص خواتین پر مشتمل تھی۔ راحت نے اپنی خالہ جان کے ہمراہ اسپیشل ڈشیں بنائی تھیں۔ لہٰذا ناشتے کے بعد میں نے عتیق کی جانب وقت گزارنے کا پروگرام بنایا۔ شکیل اپنے آفس سان کینورامون جارہا تھا۔ میں نے کہا مجھے سان رامون ٹرانسٹ پر اتار دینا جو اس کے آفس کے قریب ہے۔ یہاں سے میں نے Country Counection کوچ پکڑی اور وال نٹ کریک کے لیے روانہ ہوگیا۔ سان رامون سے بس نکلی تو Daunvil کی سڑکوں، محلوں اور بازاروں میں سے گزرنے لگی۔ ڈینول اور دالنٹ کریک میں اکثریت گوروں کی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی بستیاں مغربی یورپ کے لوگوں نے بسائی ہیں۔ یہ لوگ جہاں رہتے ہیں اپنی شناخت قائم رکھتے ہیں۔ اپنی تہذیب کی جھلک اور طرزِ زندگی قائم رکھتے ہیں۔ گھاس، درخت، پیڑ پودوں میں سے ابھرتے ہوئے خوب صورت مکانات چھوٹی چھوٹی صاف شفاف گلیاں، لندن اور پیرس کے قدیم طرز کے ڈاؤن ٹاؤن۔ ان میں چھوٹے چھوٹے کافی ہاؤسز، ریستوران اور اسٹورز جن میں نفیس نوادرات شیشے کی مصنوعات، خوشبویات، جواہرات، بینک، گراسری، اسٹور، گارمنٹ شاپس وغیرہ وغیرہ۔ غرض زندگی کی ہر سہولت، رہائشی لوگوں کی ہر ضرورت کو بڑی مختصر اور نفاست سے اس خاموشی سے مہیا کرتے ہیں کہ دوسری قوموں سے ان کی انفرادیت واضح ہوجاتی ہے جو انہی کا حصہ ہے۔

شام کے سہانے موسم میں جب یہ لوگ ڈاؤن ٹاؤن کے بازاروں میں شیڈیڈ، ڈیکوریٹیڈ راہداریوں میں بیگمات کے ہمراہ روایتی اور فیشن کے لباس میں چہل قدمی کرتے ہیں۔ شاپنگ کرتے ہیں، ریستورانوں کے باہر چھوٹی چھوٹی کرسیوں اور بینچوں پر بیٹھ کر کافی پیتے، آئس کریم کھاتے، دیگر مشروبات اور موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں اور ماحول افسانوی رنگ اختیار کرلیتا ہے۔

میں والنٹ کریک پہنچ گیا۔ بس نے بارٹ اسٹیشن کے قریب اتار دیا۔ یہ اسٹیشن بھی 30-40 فٹ اونچا اور صاف ستھرا ہے۔ میں نے کارڈ پنچ کیا، ٹرین میں بیٹھا اور براستہ پلیزنٹ ہل کانکرڈ پہنچ گیا۔ مومن مجھے آکر اسٹیشن سے لے گیا۔ دکان Western Vaccume پر عتیق گوریوں کو ویکیوم کلینرز بیچتے رہے۔ میں بادام، اخروٹ اور چنے کھاتا رہا۔ عتیق نے اپنے گاہکوں سے ملوایا کہ یہ میرے بھائی پاکستان سے آئے ہیں۔ سب ہی نے خوش آمدید کہا۔ ایک واقف حال خاتون پاکستان کے حالات پر افسوس کا اظہار کرنے لگیں۔

ساڑھے چھ بجے عتیق نے دکان بند کی اور ہم دونوں ڈبلن روانہ ہوگئے۔ ساڑھے سات بجے ہم گھر پہنچ گئے۔ مہمانوں میں سعدیہ اور رابعہ بھی موجود تھیں۔ دعوت جاری تھی۔ خواتین کھانے اور خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ ان صاف ستھری صحبتوں، مزیدار کھانوں، نقرئی قہقہوں سے مزین ان روشن محفلوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ ان لوگوں نے اپنی شاندار روایتوں اور کراچی لاہور کی رونقوں کو ڈبلن میں زندہ رکھا ہوا ہے۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے، تقریب اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ راحت کے بنائے ہوئے کھانوں کی تعریف ہر ایک کی زبان پر تھی۔ باہر پالے کی سردی پڑ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خوشی خوشی مہمان رخصت ہونے شروع ہوئے۔ جانے والے تھوڑا تھوڑا اپنی مرضی کا کھانا بھی ہمراہ لے گئے۔ ہم نے بھی کھانا کھایا۔ اس خوب صورت تقریب پر تبصرے اور گفتگو ہونے لگی۔ میں نے راحت کو اور نجمہ کو اتنی اچھی Pod Luck سجانے پر مبارک باد دی اور راحت سے کہا بیٹا یہی زندگی کے میلے ہیں چراغ جلائے رکھنا۔

میں نے فیصل سے کہا مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں ان سے کبھی نہ گھبرانا، دسترخوان وسیع رکھنا۔

ابوالحسن روز شہر کی گزرگاہ پر جاکر بیٹھ جاتا تھا اور کسی نہ کسی مسافر کو گھر لے آتا، خاطر تواضع کرتا، کھلاتا پلاتا اور رخصت کردیتا، خلیفۂ وقت بھی اس کا مہمان ہوا۔

صدیاں گزر گئیں۔ اس کا نام زندہ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

☆......☆

حسب معمول آج صبح اٹھ کر موزے، مفلر، جرسی ٹوپی پہن کر میں داک کے لیے گھر سے نکل گیا۔ گھر کے پچھلی سڑک کے کنارے پارک ہے جو محلے کا ایک چھوٹا پارک ہے لیکن ہمارے یہاں کے بڑے بڑے پارکوں سے بڑا ہے۔ اس میں بچوں کے کھیلنے کے جھولے ہیں اور بڑوں کے لیے 2 بڑے بڑے شوٹنگ والی بال گراؤنڈ ہیں۔ بڑے بڑے گھاس کے تختے ہیں، بے شمار پیڑ ہیں، واکنگ جاگنگ کے لیے لمبی لمبی راہداریاں اور ٹریک ہیں۔ بڑے بڑے فوارے ہیں۔ پارٹیوں کے لیے باربی کیو کی سہولتیں ہیں۔

راہداریوں کے دونوں طرف تھوڑی تھوڑی دور پر بنچیں ہیں۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد آدھا حصہ کچا ہے، جس کو باغ کی شکل میں تیار کرنا باقی ہے۔ میں جب سے ڈبلن امریکا آیا ہوں بلا ناغہ روز صبح اس پارک میں آدھا گھنٹا واک اور پھر تھوڑی ورزش کر کے واپس گھر جاتا ہوں۔ یہاں قرب و جوار سے بہت سے لوگ جاگنگ / واکنگ کے لیے آتے ہیں جب کوئی بھی صاحب یا خاتون قریب سے گزرتے ہیں تو خوش ہو کر گڈ مارننگ ضرور کہتے ہیں۔ اس بات سے کسی کو غرض نہیں کہ کوئی گورا ہے یا کالا ہے۔ کوئی جوان ہے یا بوڑھا ہے، خوب صورت ہے یا بدصورت ہے۔ یہاں صبح اتنی سہانی ہوتی ہے۔ موسم اتنا خوشگوار ہوتا ہے۔ ماحول میں اتنی تازگی ہوتی ہے کہ ان محسوسات کو ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ یہاں گرد، دھواں یا ٹریفک کی کسی بھی قسم کی آلودگی کا امکان تک نہیں ہے۔ یہاں کی سردی میں، سرد ہواؤں میں لہک ہے اور فضا کی خوشبو جسم و جان میں بس جاتی ہے۔ درختوں کی قطاریں دور تک جاتی ہیں اور ان کی چھاؤں میں بڑی خنک تازگی ہوتی ہے۔ اس درمیان آدمی چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ درختوں کے پتے تھوڑے تھوڑے دن بعد رنگ بدلتے رہتے ہیں، شروع میں یہ ہرے تھے پھر پیلے ہونے شروع ہوئے، لال ہو گئے، گہرے رنگ کے ہو کر سوکھ کر گر گئے۔ فرش پر رنگین پتوں کا دبیز قالین بن گیا اور کافی دن تک ہم اس قالین پر ہی چلتے رہے۔ جنوری کی آمد کے ساتھ ہی پیڑ پتوں سے خالی ہو گئے۔ غرض یہ سمجھ لیں کہ اس خطے کی خوبی یہاں کا موسم ہے جو بڑی تیزی سے تبدیل ہوتا جاتا ہے اور ہر تبدیلی پہلے سے زیادہ تازگی اور خوشگواری پیدا کرتی ہے۔ آدمی سڑک کے کنارے بھی اگر ٹہلتا رہے تو اسے کسی تفریح گاہ کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نو وارد یہاں کے ماحول اور فضاؤں میں گم ہو جاتا ہے۔ میں گھر آیا، نہایا، دھویا اور تیار ہو کر نیچے آیا۔ راحت اور نجمہ ناشتے پر میرا انتظار کر رہی تھیں، انڈے، مکھن، پنیر، کیک، بسکٹ، ڈبل روٹی، فلوریڈا کا اورنج جوس، کیلی فورنیا کا کین بیری جوس، چائے کافی غرض اللہ کی نعمتیں جن کی اس ملک میں فراوانی ہے میز پر بھری ہوئی تھیں۔ جی بھر کے ناشتا کیا۔ دوبارہ اوپر گیا تیار ہو کر آیا۔ راحت مجھے ڈبلن پلیزنٹن بارٹ اسٹیشن چھوڑ گئی۔ یہاں ایسٹ بے ایریا میں اور سان فرانسسکو میں لائٹ ٹرین آبادیوں کے کنارے چلتی ہیں۔ یہ سان فرانسسکو کے بڑے علاقے کو کور کرتی ہیں اور ایسٹ بے کے شہروں کے لوگوں کے لیے بے حد سہولت سے سفر مہیا کرتی ہیں۔ بلو لائنز، گرین لائنز، یلو لائنز، اورنج لائنز پر ٹرینیں ایسٹ بے میں سطح زمین کے تقریباً 30 فٹ اوپر اور سان فرانسسکو میں زیرِ زمین چلتی ہیں اور مجموعی 44 اسٹیشنوں کے روزانہ لاکھوں مسافروں کو ان کی منزل پر پہنچاتی ہیں۔ لوگ بڑی آسانی سے اور بہت سہولت سے 100 میل تک کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں کر لیتے ہیں۔ ہر ٹرین ہر اسٹیشن سے 10-15 منٹ بعد مل جاتی ہے۔ ہر اسٹیشن پر پارکنگ کی سہولتیں مہیا ہیں۔ لوگ اپنی گاڑیوں میں گھر کے قریب اسٹیشن تک آتے ہیں۔ پارکنگ پر گاڑی کھڑی کرتے ہیں اور بارٹ کے ذریعے اپنے دفتروں اور اسٹوروں پر چلے جاتے ہیں۔ ہر بارٹ اسٹیشن کے باہر اس شہر کے اندرونِ سفر کے لیے ہر روٹ کی آرام دہ بسیں 10-15 منٹ بعد دستیاب ہوتی ہیں۔ غرض سفر بھی یہاں تفریح ہے۔ آدمی سارا دن ریل میں سفر کرتا رہے تھکتا نہیں ہے۔ فیصل راحت، عتیق سعدیہ شیکی ہر ایک کے پاس عمدہ گاڑیاں موجود ہیں لیکن مجھے یہاں کی آرام دہ ایئر کنڈیشنڈ اور ہیٹڈ بارٹ اور بسوں میں مزہ بہت آتا ہے۔ میرا زیادہ سفر بارٹوں اور بسوں میں گزرتا ہے۔ سارا ایسٹ بے پہاڑیوں اور وادیوں پر آباد ہے۔ یہاں ہر گلی، ہر سڑک، ہر محلہ، ہر علاقے، پہاڑیوں اور وادیوں میں واقع ہے کسی کسی جگہ وادیاں اتنی تنگ ہو جاتی ہیں کہ درمیان میں صرف سڑک ہی رہ جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے Foot hill سے مکانات شروع ہو جاتے ہیں جو اوپر پہاڑوں کی چوٹیوں تک چلے جاتے ہیں۔ ہرے بھرے پہاڑوں پر مکانات، گلیاں، سڑکیں، کمرشل سینٹر اس خوب صورتی سے بنائے گئے ہیں کہ انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے کہ ان پہاڑوں اور جنگلوں کا سروے کس طرح کیا گیا۔ اتنی ساری سڑکیں جن کا سرا پکڑنا مشکل ہے کس طرح بنائی گئیں اور سڑکوں کے کنارے ناہموار جگہوں کو کس طرح آباد کیا گیا۔ یہاں حقیقت میں قدرت کی کاریگری کا آدمی قائل ہو جاتا ہے کہ اس نے اس سرزمین پر اپنی عنایات کی بارش کی ہے اور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اس کی باگ ڈور دی ہے، ان کو ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے کہ جنہوں نے رات دن انتھک محنت سے اپنے شہروں، اپنے علاقوں، اپنے گھروں کو گلزار بنا دیا ہے۔ یہ محنت ایک دو افراد کی نہیں پوری قوم کی ہے۔ ایک دو دن کی نہیں صدیوں کی ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا حقیقت یہ ہے کہ

بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

میرے پاس بارٹ کا ٹکٹ موجود ہے جس کی مالیت 24 ڈالر ہے لیکن چونکہ میری عمر 65 سال سے زیادہ ہے لہٰذا مجھے بڑی آسانی سے بغیر سوال و جواب کے صرف صورت دیکھ کر یہ ٹکٹ 9 ڈالر میں ملا ہے۔ جو سہولت یہاں مہیا کردی جاتی ہے وہ بلا تمیز ہر ایک کو مل جاتی ہے۔ میں ریل میں سوار ہوا اور ہیورڈ کے اسٹیشن پر اتر گیا۔ ہیورڈ ایک بڑا شہر ہے۔ ہسپرین بلیوارڈ بڑی مرکزی سڑک ہے۔ بیشتر علاقے کمرشل اور انڈسٹریل ہے۔ بڑے بڑے گوڈاؤن ہیں اور پرائیویٹ ایئرپورٹ ہے۔ اسٹیشن کے قریب کا علاقہ ریزیڈنشل ہے اور بہت صاف ستھرا اور خوب صورت ہے State University of California dignity ہے۔ اسی یونیورسٹی سے شکیل اور شانی نے ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ فیصل کی دکان Hesperian پر ہی واقع ہے۔ میں اسٹیشن سے باہر آیا۔ 386 نمبر کی بس پکڑی جس نے 15 منٹ میں مجھے دکان کے قریب Winton Crussing پر اتار دیا۔ دکان پر کارلوس میرا انتظار کررہا تھا۔ اس نے بڑی خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ کارلوس A I Vaccume پر کام کرتا ہے۔ وہ ویکیوم کلینرز کی سیل اینڈ سروس کا ماہر ہے۔ بہت خوش اخلاق ہے۔ کارلوس کا تعلق جنوبی امریکا کے ملک السلاوڈور سے ہے۔ میکسیکو اور آس پاس کے لوگ شمالی امریکا کی سب سے بڑی اقلیت ہیں یہ لوگ قد و قامت رنگ و روپ میں وسطِ ایشیا کے لوگوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ امریکا میں انسانی محنت مزدوری کا کام بڑی حد تک اس قوم نے سنبھال رکھا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں میکسیکن یہاں ہر فیلڈ میں موجود ہیں۔ اس شہر کے بنانے سنوارنے میں ان لوگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ آج مجھے کارلوس کے ہمراہ میکسیکن ریسٹورنٹ میں لنچ کرنا ہے۔ یہ پہلے سے طے تھا لہٰذا وہ مجھے ہسپرین پر ہی me peublo ریسٹورنٹ لے گیا۔ کھانے میں تلی ہوئی مچھلی، دال چاول، سلاد منگوائے گئے جو میرے لیے قابلِ قبول تھے۔ میکسیکن کھانے ہماری طرح بڑے مزیدار اور چٹ پٹے ہوتے ہیں۔ قسم قسم کی سلاد اور چٹنیاں ہمراہ ہوتی ہیں۔ مجھے بڑا مزہ آیا لیکن آج شام راحت کی سہیلی رعنا کے یہاں ڈنر کی دعوت بھی اٹینڈ کرنی ضروری تھی لہٰذا کوشش کی کہ کم کھاؤں کیوں کہ وہاں جانا بھی ضروری تھا۔ ہم دکان پر واپس آئے۔ دکان کے برابر ہیئر ڈریسر ہے میں خط بنوانے چلا گیا۔ ماہر چینی خاتون بڑے اخلاق اور خوش مزاجی سے بال اور خط بناتی ہے۔ معاوضہ دس منٹ کا دس ڈالر یعنی صرف خط بنانے کے =/850 روپے ہوتا ہے جو رعایتی اور سستا شمار ہوتا ہے۔ شام ہوئی گھر واپس آئے تیار ہوئے اور 8 بجے فیصل کے پڑوس میں فیصل بھائی اور رعنا کے گھر چلے گئے۔ میرے لیے خاص بات یہ تھی کہ رعنا میری بیٹی جیسی ہی نکلی۔ خوش مزاج، بھولی بھالی اور بھاری بھرکم۔ میں اور نجمہ دونوں رعنا سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم تو ہماری بیٹی ہو۔ رعنا اور فیصل ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے، بڑی عزت دی۔

یہاں پندرہ بیس مرد و خواتین جمع تھے۔ سب مسلم، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی ملازمتوں پر فائز انڈین لوگ تھے۔ انڈیا کے لوگوں نے کمپیوٹر، سیل فون، انفارمیشن ٹیکنالوجی، انجینئرنگ میں بڑی تعلیم اور ترقی حاصل کی ہے اور امریکا میں I.T سے متعلق بڑی بڑی کمپنیوں میں اپنے لیے اچھی جگہیں بنائی ہیں۔ ہر خاتون اپنے ہمراہ ایک ڈش بنا کر لائی تھی لہٰذا یہ ایک مزیدار دعوت ثابت ہوئی۔

پردیس میں ہم خیال، ہم زبان، ہم مسلک لوگوں کا مل بیٹھنا بھی نعمت ہے۔ رات بھیگ رہی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی لوگ رخصت ہونا شروع ہوئے ہم بھی پیدل چلتے ہوئے خوش و خرم گھر آگئے۔ تھوڑی دیر بعد راحت اور نجمہ بھی آگئیں۔

اگر انسان یہاں ٹہلتا رہے تو کسی تفریح گاہ کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں چلچلاتی ہوئی دھوپ نہیں پڑتی۔ یہاں بارش کو لوگ نہیں ترستے، یہاں سبزہ پتھروں کو توڑ کر نکل آتا ہے۔ یہاں کی پیداوار میں ضرورت کی چیزیں وافر مقدار میں پیدا ہوتی ہیں، بہت ساری جگہوں پر جن کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں دریا کا پانی اتنا ہے کہ ڈیموں میں سما نہیں سکتا اور ہزاروں میل کی آبپاشی کے بعد بھی بچ جاتا ہے۔ لہٰذا پانی کے ذخیروں سے جو بجلی کا ذخیرہ پیدا ہوتا ہے وہ رات میں دن کو شرماتا ہے۔ یہاں جانوروں کی افزائش نسل کے ادارے اتنے وسیع و عریض ہیں جن میں پیدل سفر نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں گوشت اور دیگر اجناس کی ضرورت سے زیادہ بھرمار ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے لیکن اللہ یہ سب کچھ اس قوم کو عطا کرتا ہے جو شاید اس کی مستحق ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اگر بہت کچھ حاصل کیا

ہے تو وہ اس کو وصول کر کے بنانے، سنوارنے اور سنبھالنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

☆......☆

آج صبح میں تیار ہوا اور ہوا خوری، مارننگ واک کے لیے گھر سے نکل گیا۔ موسم سرد تھا لیکن دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں دروازے کے سامنے کی گلی کے لوپ سے ہوتا ہوا بڑی سڑک Tasahara پر آ گیا۔ یہ ڈبلن کی بڑی سڑکوں میں شمار ہوتی ہے۔ بائیں ہاتھ والی سڑک پر ٹاساہارا میڈوز ہیں جن میں ہمارا گھر ہے۔ سامنے Dublin Ranch ہے یعنی چھوٹی پہاڑی ہے اور چڑھائی پر سڑک بھی جاتی ہے اور خوب صورت اپارٹمنٹس کی بستی بھی ہے۔ میں فٹ پاتھ کے کنارے مکانوں کی Heges اور درختوں کی قطار کے ہمراہ واکنگ کرتا ہوا اس آبادی کے اختتام پر پہنچ گیا۔ تھوڑی دور پر میری نظر لکڑی سے بنی ہوئی باؤنڈری پر پڑی۔ قریب گیا تو ایک بڑے گراؤنڈ کے باہر تختی پر Yara Yara Ranch لکھا ہوا تھا۔ نام جانا پہچانا سا لگا۔ لہٰذا دلچسپی سے اندر غور سے دیکھا۔ بڑا سا گراؤنڈ ہے۔ گیٹ سے کافی اندر بیرکیں بنی ہوئی ہیں جن کے ہر کمرے کے آگے گھوڑے گھاس کھا رہے تھے۔ میرے قریب ایک حصہ کچا تھا جس پر دو لڑکیاں گھڑ سواری کی پریکٹس کر رہی تھیں۔ یہ گھوڑوں کی رہائش، دیکھ بھال اور ٹریننگ کا چھوٹا سا رانچ تھا۔ تعجب اس بات پر ہے تین ماہ سے سڑکوں پر نہ گھوڑے دیکھے نہ گھڑ سوار دیکھے نہ گھوڑا گاڑیاں دیکھیں اور بغل میں گھوڑوں کا رانچ موجود ہے جہاں سے ضرورت کے مطابق گھوڑوں کی فوج مل سکتی ہے۔ یہ امریکا کا مزاج ہے۔ یہاں آپ کے آس پاس آپ کی ضرورت کی ہر چیز مہیا ہے لیکن اس کے متعلق نہ کوئی تذکرہ ہوگا نہ شور نہ شہرت ہوگی۔ میں واپس مڑا اور واپسی کے لیے گلی سے مڑ کر دوسری سڑک پر آ گیا۔ اس کا نام Creek View ہے یہ چھوٹی سی سڑک ہے جو یہاں سے گلین پارک تک جاتی ہے۔ اس سڑک کے ایک طرف ٹاساہارا میڈوز ہیں دوسری جانب پہاڑی کے دامن میں کم گہری کھائی Creek ہے جس کے کنارے لکڑی کا جنگلا لگا ہوا ہے اور یہ کریک سڑک کے ساتھ ساتھ جاتی ہے اور سڑک ختم ہونے پر سیدھے ہاتھ مڑ جاتی ہے۔ اس کے کنارے تختیاں لگی ہیں کہ اس سے دور رہیں اس میں سے جانور بھی آ سکتے ہیں۔ سڑک کے اتنے قریب یہ کھائی دیکھ کر ڈر لگتا ہے لیکن اس کے کنارے ہی بنے ہوئے ٹریک پر لوگ واک بھی کرتے رہتے ہیں۔ کریک کے دوسری جانب بھی ریلنگ ہے پھر فٹ پاتھ ہے۔ سڑک ہے اور سڑک کے کنارے رانچ۔ چڑھائی پر مکانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں فٹ پاتھ کے کنارے بنے ہوئے مکانات کے ساتھ ساتھ اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ یہاں راستے میں ایک کونے میں ایک گھاس کا تختہ ہے جس پر تین لوہے کی ٹیبلیں اور آٹھ دس چھوٹی بینچیں ہیں۔ ایک سایہ دار درخت ہے۔ میں ستانے کے لیے وہاں بیٹھ گیا۔ پھر بینچ کے سہارے ورزش کرنے لگا۔ میری نگاہ سامنے ایک پرانی اسٹیل کی پلیٹ دیوار میں نصب تھی اس پر پڑی۔ میں نے غور سے پڑھا۔ لکھا تھا کہ یہ علاقہ جس پر ٹاساہارا میڈوز بنے ہوئے ہیں 1894ء میں کیسٹرسنز کی ملکیت تھا۔ یہ کیسٹر رانچ 1250 ایکڑ پر مشتمل تھی جس پر کیسٹر فیملی کاشتکاری کرتی تھی اور گائے پالتی تھی۔ اس فیملی نے پانچ نسلوں تک یہاں کامیاب زمینداری اور گائیوں کی پرورش کی۔ آج نہ کیسٹر ہے۔ نہ گائیں ہیں نہ کاشت کاری ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

ان خوب صورت مکانوں، گلیوں، پیڑوں، گھاس کے تختوں، دلکش راہداریوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ کبھی یہاں ایک ایگریکلچرل فارم تھا جس پر ایک خاندان نے پانچ نسلوں تک حکمرانی کی ہے۔ میں گھر واپس پہنچ گیا۔

آج اتوار ہے۔ فیصل کی چھٹی ہے۔ سب نے ناشتا دیر سے کیا ہے۔ آج باہر کہیں جانے کا پروگرام ہے۔ فیصل کی مرسیڈیز گہرے ہرے رنگ کی ہے۔ فیصل اور راحت اس میں بیٹھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں اور نجمہ بھی سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ ڈبلن سے نکلے، جنوب مغرب کی طرف براستہ کیسٹرو ویلی، ہیورڈ اور پھر سان ماٹیو کے پل پر پہنچ گئے۔ یہ پل دنیا کے طویل ترین پلوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ایسٹ بے ایریا کو سان فرانسسکو سے ملاتا ہے۔ اس کی لمبائی پانی کے اوپر آٹھ میل ہے جو کسی طرح بھی عجائبات عالم سے کم نہیں ہے۔ یہ پل نیچے پانی کی سطح سے قریب اور کھلا ہوا ہے۔ دونوں طرف دور تک نیلے پانی کی چادریں ہلکی ہلکی لہروں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی سڑک پر نہیں پانی پر چل رہی ہے۔ جہاں پانی ختم ہوتا ہے نیلا آسمان شروع ہو جاتا ہے۔ عقلِ انسانی ایسے مناظر دیکھتی اور حیران کن وادیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ موسم دھوپ نکلنے کی وجہ سے خوشگوار ہے اور ہم سان ماٹیو اور پانی

کے سفر کو پیچھے چھوڑ کر پھر پہاڑی راستوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو رہے ہیں۔ ذرا آگے بڑھے تو ہلز ڈیل کا علاقہ آ گیا۔ یہاں سے مغرب کی طرف بڑے بڑے چیڑ اور دیودار کے درختوں کے جنگل شروع ہو جاتے ہیں۔ لہراتی، بل کھاتی، کبھی اترائی پر کہیں چڑھائی پر، پہاڑی ڈھلوانوں پر سفر کرتی ہوئی سڑک میل ہا میل تک گئی ہے۔ عقل حیران ہے کہ اتنی ساری سڑکیں اتنے دشوار گزار جنگلوں اور پہاڑوں کے بیچ کس طرح بنائی گئی ہیں۔ یہاں پہاڑی سڑک کے دونوں طرف گھنے جنگل ہیں اور بہت بڑے طویل ترین، ایسے سایہ دار درخت ہیں جو سورج کو چھپا کر علاقے کے موسم کو بدل دیتے ہیں۔ ان راہوں پر سفر کرنے سے گرمی میں بھی سردی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ غرض ہم اس عجیب و غریب قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کہیں راستے میں چھوٹی چھوٹی جھیلیں ملتیں اور کبھی ایسے علاقے سے گزرتے جہاں کاشت کاری کے فارم ہیں۔ ہمیں راستے میں ایک ایسا دیہاتی فارم ملا جہاں تازہ اسی علاقے کی اسٹرابری، چیری، اورنج فروخت ہو رہے تھے۔ بہترین تازہ عمدہ فروٹ اور سستی قیمت۔ اس کے علاوہ اسی فارم پر تیار کردہ تازہ اصلی شہد بھی دستیاب تھا۔ فیصل نے گاڑی روکی اور اسٹرابری اور چیری لے آئے جو ہم نے اسی وقت کھانی شروع کر دی۔ اتنی بڑی، اتنی رس والی، اتنی شیریں، اتنی ٹھنڈی اسٹرابری اور چیری ہم نے آج تک نہیں کھائی تھی۔ سب نے شوق سے کھائی، سب نے تعریف کی اور ہم ہاف مون بے کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہمیں گھر سے نکلے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا اور ہم تقریباً 80 میل سفر طے کر چکے تھے اور ہاف مون بے پہنچ گئے۔

یہ سان فرانسسکو کے جنوب مغرب ساحل کا ایک عجیب و غریب خوب صورت نظارہ ہے۔ سمندر کی صاف شفاف دودھیا لہریں ہلکی براؤن ریت پر سے ہوتی ہوئی پہاڑیوں سے ٹکراتی ہیں اور شاید اتنا ٹکراتی ہیں کہ پہاڑیوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور کٹ کٹا کر چاند کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ساحل کے بائیں ہاتھ سے اگر سمندر کا نظارہ کیا جائے تو دائیں ہاتھ کی طرف پہاڑ، اس گولائی اور خوب صورتی سے کٹا ہوا ہے اور پانی کی لہریں اس گولائی میں اس طرح داخل ہوتی ہیں جیسے پیالے میں پانی بھر جائے۔ دور نیلا سمندر، نیلا پانی اور دودھیا بپھرتی ہوئی لہریں جب قریب آتی ہیں تو دیکھنے والے ان مناظر کو اپنی آنکھوں میں سمو لیتے ہیں۔ دل میں اتار لیتے ہیں۔ کبھی پہاڑی کے اس سرے سے نظارہ کرتے ہیں کبھی دوسرے سرے کی طرف سفر کرتے ہیں۔ مختلف پہاڑیوں اور پہاڑی ٹیلوں، ان سے پانی کی لہروں کی آنکھ مچولی۔ ان حسین مناظر سے دل نہیں بھرتا۔ دنیا بھر کے سیاح آتے ہیں، چہل قدمی کرتے ہیں، تھک کے چور ہو جاتے ہیں لیکن طبیعت نہیں بھرتی۔ پہاڑ کے دامن اور پانی کے درمیان ریت ہے۔ اس صاف اور شفاف ریت پر لوگ اپنے پیروں کو گیلا کرتے ہیں۔ نہاتے ہیں اور ریت پر لیٹ کر گرمی میں سن باتھ لیتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، خوش ہوتے زندگی کو تازہ کرتے ہیں، زندہ کرتے ہیں۔ یہ کیلی فورنیا کی نہیں بلکہ امریکا کی بہترین تفریح گاہ ہے جہاں امریکا کے دوسرے شہروں کے لوگ دل بستگی کے لیے آتے ہیں۔ شام ہونے لگی، ہم نے واپسی کی تیاری کی پھر ہم پہاڑی راستوں، بل کھاتی پگڈنڈیوں اوپر جاتی نیچے آتی ہوئی سڑکوں پر رواں دواں تھے۔ دونوں جانب درختوں کی چھاؤں نے اندھیرا اور ٹھنڈک بڑھا دی تھی اور ہم واپس سان ماٹیو کی طرف جا رہے تھے۔

جب ہم پل پر پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ کسی جگہ نیلا آسمان سرمئی ہو رہا تھا اور اس کے عکس نے پانی میں چاندی انڈیل دی تھی۔ کہیں آسمان گلابی ہو رہا تھا اس کا گلابی عکس پانی میں سونا گھول رہا تھا۔ کہیں پانی ہرا تھا کہیں نیلا تھا اور جب پانی میں لہریں پیدا ہوتیں تو رنگ اس طرح جھلملانے لگتے جیسے کسی حسینہ نے گنگا جمنی زیور پہن رکھا ہو۔ غرض ہم سان ماٹیو کے پل سے گزر رہے تھے اور قدرت کی بخشی ہوئی جنت ارضی کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہم دوبارہ ہیورڈ میں داخل ہو گئے۔ اب ہمارا سفر ہیورڈ سے نیچے فری مونٹ کی جانب ہے۔ فری مونٹ بھی ایسٹ بے کاؤنٹی کے دوسرے شہروں کی طرح ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں کا کمرشل ایریا، ڈاؤن ٹاؤن خاصا وسیع ہے۔ یہاں پاکستانی اور خاص طور سے افغانی لوگ زیادہ رہتے ہیں۔ افغانیوں کے یہاں ہوٹل ہیں، سنیما ہے، چھوٹے گراسری اسٹور ہیں، حلال میٹ شاپس ہیں۔

ہم نے افغان ریسٹورنٹ کا رخ کیا جو یہاں کا پرانا مشہور ریسٹورنٹ ہے جس کے کھانے روایتی، عمدہ اور لذیذ ہوتے ہیں۔ ہوٹل میں جگہ کم ہے۔ لوگ باہر انتظار کرتے ہیں اور پھر یہاں کے چپلی کباب، چکن بوٹی، سیخ کباب اور خاص طور سے آلو بھرے پراٹھوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

افغان طرز کی سلاد رائیتہ بھی بے حد مزیدار ہوتا ہے۔ ہم نے بھی آدھ گھنٹا سے زیادہ باہر سردی میں انتظار کیا۔ ہمیں جگہ مل گئی ہم نے چپلی کباب اور پراٹھوں سے پورا انصاف کیا۔ باہر سردی تھی، ریسٹورنٹ گرم تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ کھانا مزیدار تھا۔ بھوک کے ساتھ تھکن بھی دور ہوگئی۔ ہم بہت خوش ریسٹورنٹ سے نکلے اور فری مانٹ کی مشہور دکان Lovely Sweets پہنچ گئے۔ وہاں سے پستہ اور کاجو کی برفی لی۔ نمک پارے لیے اور رخ ڈبلن کی طرف موڑ دیا۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ دونوں طرف پہاڑ تھے اور ہم اندھیری وادی میں سفر کر رہے تھے کہ دور سے ڈبلن کی روشنیاں ایسی نظر آنی شروع ہوگئیں جیسے رات میں جہاز کراچی میں اترتا ہے۔ ہم گھر پہنچے تھوڑی دیر بعد عتیق، سعدیہ بھی آگئے، سب مل کر خوش ہوئے باتیں ہوئیں۔ ہاف مون بے (Half Moon Bay) کا ذکر ہوا۔ رات گیارہ بجے وہ لوگ چلے گئے اور میں لکھنے بیٹھ گیا۔

☆......☆

آج میں بارٹ میں سوار ہوں۔ یہاں سے بارٹ صرف مغرب کی طرف جاتی ہے۔ بارٹ کیسٹرو ویلی، بے فیر، کولسیوم فروٹ ویل سے ہوتی ہوئی لیک میرٹ پہنچی۔ لیک میرٹ کا اسٹیشن زیرزمین ہے۔ ٹرین یہاں سے چلی تو ویسٹ اوک لینڈ کے ساحلی اسٹیشن پر پہنچی۔ آگے بے ایریا کا سمندر ہے جس کو سان فرانسسکو سے ملانے کے لیے دنیا کا مشہور Oak Land Bay Bridge بنایا گیا ہے۔ یہ پل پانی سے بہت اونچا تین منزلہ اور دنیا کا طویل ترین Bridge ہے۔ اس کے کنارے بھی آپس میں 8 میل پر ملتے ہیں۔ یہ پل پانی پر ساڑھے چار میل چلتا ہے۔ اس کی بنیاد پانی کے نیچے دنیا کے کسی بھی پل سے زیادہ مضبوط اور گہری ہے۔ اوپر کی منزل کا ٹریک 5 لائنوں پر مشتمل ہے جو اوک لینڈ سے سان فرانسسکو کی طرف جاتی ہیں۔ درمیانی ٹریک بھی 5 لائنوں کا ہے جو بھرپور لاکھوں گاڑیوں کو روزانہ واپس لاتی ہے۔ اس کے نیچے ٹنل ہے جو Yarbbona کہلاتی ہے۔ یہ دنیا کی انڈر واٹر سب سے بڑی ٹنل ہے جو جینس آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہے۔ اس کی چوڑائی 76 فٹ اور اونچائی 58 فٹ ہے۔ یربابونا آئی لینڈ کی چٹان درمیان میں پڑتی ہے جس کو بورنگ کر کے سرنگ پانی کے اندر سے بنا کر اس میں سے اس ٹنل کو گزارا گیا ہے۔ اس پانی کی گہرائی میں بنی Trans bay انڈر واٹر ٹیوب میں ہر وقت دونوں جانب لائٹ ٹرینیں دوڑتی ہیں اور لاکھوں مسافروں کو ان کی منزل مقصود پر پہنچاتی ہیں۔ میں بارہا اس ٹنل سے بارٹ میں گزرا۔ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم ایسے راستے سے گزر رہے ہیں جس کے چاروں طرف بپھرتا ہوا سمندر ہے۔ یہ برج صرف ساڑھے تین سال میں 1936ء میں تیار ہوا اس کی تعمیر میں 6500 مزدوروں نے دن رات کام کیا جس میں کل ورکنگ آورز 54850000 بنتے ہیں دوران تعمیر 12 مزدور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

میں بذریعہ بارٹ ٹرین سان فرانسسکو کے پہلے زیرزمین اسٹیشن ایمبار کوڈیرو پہنچ گیا۔ بذریعہ ریل یہاں سے سان فرانسسکو شروع ہوتا ہے۔ سان فرانسسکو امریکا کا مغربی ساحل West Coast کا شہر کہلاتا ہے۔ یہ شہر تین طرف سے Pacific Ocean سے گھرا ہوا ہے اس کے مغرب میں دنیا کا عظیم سمندر پیسیفک ہے جو جگہ جگہ سے وہارف، ہاربر، پیئرز، چینلز اور بیچیز سے بھرا ہوا ہے اور پانی کے اس پار ایسٹ بے کے بے شمار شہر ہیں۔ شمال میں بھی پانی ہے اور اس پار میرین کاؤنٹی ساسی لوٹو، سونو ماویلی اور سیاٹل جیسی خوب صورت کاؤنٹیاں اور شہر آباد ہیں۔ نیچے جنوب میں لاس اینجلس اور سان ڈیاگو جیسے عظیم اور بڑے شہر آباد ہیں۔ یہ شہر بھی سی پورٹ، جہاز رانی اور مشہور بیچیز کے لیے دنیا میں مشہور ہیں۔ کیلی فورنیا صوبہ، امریکا کا سب سے بڑا کاروباری مرکز ہے۔ یہ امریکا کا Financial district کہلاتا ہے۔ سان فرانسسکو شہر اپنے خوشگوار موسم، اپنے پلوں، اپنی خوب صورت عمارتوں، سڑکوں، پارکوں، جھیلوں اور ساحلوں کی وجہ سے امریکا میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے ساری دنیا سے ٹورسٹ اور سیاحوں کی یہاں بھرمار ہے۔ یہاں دنیا کی ہر قوم، ہر رنگ، ہر نسل کے لوگ سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ نت نئے فیشن اور کلچر کا مظاہرہ کرتے ہوئے جب موسم ان کے چہروں کو نکھار دیتا ہے تو دیکھنے والا اپنے آپ کو پرستان میں پاتا ہے۔ امریکا کے دوسرے شہروں سے بھی لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کیلی فورنیا میں سان فرانسسکو اور اس کے آس پاس کا علاقہ دوسری ریاستوں کی نسبت مہنگا ہے۔ اس شہر کا کوئی گلی کوچہ، کوئی بازار، کوئی محلہ ایسا نہیں جسے دیکھ کر انسان حیران نہ رہ جائے۔ شہر کیا ہے ایک بہت بڑی نمائش ہے جو پہاڑیوں کی

سطح پر، ڈھلوانوں پر، پہاڑوں کے دامن میں اور وادیوں میں لگائی گئی ہے۔ عمارتیں ایسی کہ ایک بلڈنگ کا گیراج ہے تو برابر والی بلڈنگ کی چھت ہے۔ جس طرح اور جس طرف ڈھلوان جاتی ہے۔ سڑک فٹ پاتھ اور بلڈنگیں ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔ ہر طرف سے ہر ڈھلوان، ہر سڑک سمندر پہ جا کر کے ختم ہوتی ہے۔ آدمی کی ٹانگیں نہیں آنکھیں دیکھ دیکھ کر تھک جاتی ہیں مگر عجائبات جو بلڈنگوں کی شکل میں ہیں ختم نہیں ہوں گے، جو سڑکوں کی شکل میں ہیں ختم نہیں ہوں گے۔ پارکوں کی شکل میں ہیں ختم نہیں ہوں گے۔ جگہ جگہ سو سو سالہ پرانی تعمیرات بھی بڑی نفاست سے موجود ہیں۔ پرانے علاقوں، پرانے محلوں اور پرانی ریلوے لائن کو جو شہر کے ساحلی علاقے پر چلتی ہے اور کیبل کاروں کو، ان کی پٹڑیوں کو جو شہر کے بیچوں بیچ اونچی نیچی راہوں پر چلتی ہیں سنبھال کے رکھا ہوا ہے، جو سیاحوں کے لیے بڑا اٹریکشن ہے۔ جدید تعمیرات، اسکائی اسکریپرز بھی موجود ہیں اور ساحل کے کنارے اس قدر خوب صورت عمارتیں موجود ہیں کہ میلوں دور سے نظر آتی ہیں۔ شام سے ہی روشنی کی جگمگاہٹ آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہیں۔ آدمی کھڑا صرف انہیں دیکھتا رہے، دیکھتا رہے اور دیکھتا چلا جائے۔

Lombard is the most crocked street in the world حقیقت میں اتنی پیچیدہ اسٹریٹ دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ میں کیبل کار میں سفر کرتا ہوا لومبارڈ اسٹریٹ کے کنارے اتر گیا۔ سیدھے ہاتھ نیچے گہرائی میں اترتی ہوئی ایک ناہموار سڑک نظر آئی جس کے دونوں طرف عمارتیں، بیچ میں بل کھاتے ہوئے باغیچے۔ باغ کے دونوں طرف ریلنگ اور پتلی پتلی چمکدار سڑکیں جن کے ذریعے گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ اس عمودی ٹیڑھی بل کھاتی چڑھائی اترائی پہ چلنا بھی آسان نہیں لیکن ڈرائیونگ کرنا تو کمال ہے، مہارت اور شوقینی کا امتحان ہے۔ بلڈنگوں کی یہ پوزیشن ہے کہ ایک بلڈنگ کا مین گیٹ ہے یا گیراج ہے تو برابر والی بلڈنگ کی چھت ہے۔ غرض ایک ناہموار ٹیڑھی میڑھی بل کھاتی ہوئی پہاڑی کو آباد کردیا گیا ہے۔ جس میں رہائشی عمارتیں بھی ہیں، دفاتر بھی ہیں اور آمدورفت کے لیے سڑکیں بھی رواں دواں ہیں۔ یہ تعمیرات اس خوب صورتی، اس نفاست اور اس محنت سے کی گئی ہیں کہ دنیا کی کروکیڈ اسٹریٹ یعنی بے ہنگم اسٹریٹ کو دنیا کی حیرت انگیز حسین اور قابلِ دید اسٹریٹ بنادیا ہے۔ یہ شہر کا پوش مہنگا ترین علاقہ شمار ہوتا ہے جس کو دیکھنے اور اس پر چہل قدمی کرنے کے لیے بے شمار سیاح دن رات اوپر سے جنگلا پکڑ کر نیچے جاتے ہیں اور نیچے سے ریلنگ کے سہارے اوپر آتے ہیں۔ مختلف زاویوں سے لوگ تصویریں بناتے ہیں۔ ہر موڑ پر ہر اینگل پر ایک نئی سینری ایک نیا منظر آتا ہے۔ اوپر سے دیکھنے سے لگتا ہے سڑک دور سمندر میں گر رہی ہے۔ نیچے سے اوپر دیکھو تو لگتا ہے قطب کی لاٹھ دیکھ رہے ہیں۔ یہاں کی تصویریں عام لوگوں کے علاوہ ماہر فوٹو گرافر بھی بناتے ہیں اور بہترین منتخب رنگین تصاویر، پوسٹ کارڈوں اور کیلنڈروں پر لاکھوں کی تعداد میں گفٹ شاپس اور سوئیز شاپس پر فروخت کی جاتی ہیں۔ لوگ روزانہ تصاویری کارڈ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو اپنے اپنے ممالک میں بھیجتے ہیں۔

☆......☆

آج صبح سو کر اٹھا تو پتا چلا کہ سعدیہ کا فون آیا تھا۔ خوش خبری یہ تھی کہ عتیق کو آج صبح نیشنلٹی سرٹیفکیٹ مل گیا ہے۔ یہ بڑی مسرت کی خبر تھی۔ عرصہ دراز کی محنتوں اور کوششوں کے بعد آج یہ صورت اللہ نے پیدا کی کہ عتیق میاں پوری فیملی کے ساتھ امریکن نیشنل ہیں، یہ بڑی بات ہے۔ لوگ صرف تھوڑی مدت کے ویزے کے لیے چکر لگاتے اور دھکے کھاتے ہیں، اللہ کو منظور ہو تو پوری فیملی امریکا جیسے ملک میں نیشنلٹی اور امریکن حقوق حاصل کرلیتی ہے۔ اب جب جتنا چاہے یہ فیملی پاکستان آسکتی اور رہ سکتی ہے۔ دنیا کے بہت سارے ممالک میں انہیں ویزا کی ضرورت نہیں صرف امریکن پاسپورٹ ہی کافی ہے۔

میں نہایا، دھویا نیچے آیا، ناشتا کیا تو نجمہ نے کہا جاکر مبارک باد دے آؤ۔ میں پھر تیار ہونے اوپر چلا گیا۔ نئی جیکٹ پہنی اور راحت مجھے ڈبلن بارٹ اسٹیشن چھوڑ گئی۔ دوپہر کا وقت بھی خوشگوار تھا۔ بجائے ٹرین کے میں نے بس کو ترجیح دی۔ شکی کو فون کیا کہ میں عتیق کے پاس کانکرڈ جانا چاہتا ہوں۔ ٹرین میں دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ اس نے کہا آجائیں میں چھوڑ آؤں گا۔ میں نے 35 نمبر کی بس پکڑی اور سان رامون ٹرانسٹ کے لیے روانہ ہوگیا۔ بس ڈبلن سے نکلی، ڈورتھی سے ہوتی ہوئی ونڈ میئر میں داخل ہوگئی۔ ونڈ میئر ڈبلن کے بارڈر پر شمال کی جانب بہت اچھی بستی ہے۔ ونڈ میئر سے آگے سان رامون کی آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں کی وادی، سڑکیں اور ہریالی اس قدر پُرسکون، اس قدر خاموش، اس قدر صاف ستھری جیسے ابھی کوئی جھاڑو

دے کر گیا ہے۔ یہاں بھی پہاڑیاں، پہاڑیوں کی وادیوں، چڑھائیوں اور چوٹیوں پر مکانات اور بستیاں بسائی گئی ہیں۔ یہاں تعمیرات میں ایک خاص طریقہ اپنایا گیا ہے۔ سڑک کے کنارے پہاڑوں کی چوٹیوں کی سطح کو کافی دور تک ہموار کیا گیا ہے اور ان پر بڑی ترتیب سے مکان بنائے گئے ہیں مکان کے باہر سڑک کی جانب دور تک فصیل یعنی باؤنڈری کھینچ دی گئی ہے۔ باؤنڈری سے آگے 30-40 فٹ تک سرسبز پہاڑی ڈھلوان ہے۔ پھر فٹ پاتھ ہے اور یہ منظر دور تک چلا گیا ہے یہ Gated Community کہلاتی ہے۔ یہاں بڑے بڑے پہاڑی رانچوں پر اسی قسم کے خوب صورت ترتیب سے بنے ہوئے مکانات ہیں جو سڑک کی طرف سے بہت بھلے نظر آتے ہیں۔ پہاڑی کے دوسری طرف ان مکانات کی قطاریں ڈھلوان کے ساتھ ساتھ اترتی چلی جاتی ہیں۔ ہر آبادی میں ایک سڑک جاتی ہے۔ باہر سے مکانات اور فصیل گھاس کے تختے پیڑ اور صاف شفاف فٹ پاتھ اور سڑکیں نظر آتی ہیں۔ بس بولنگر کے قریب پہنچی تو پہاڑی پر دور تک لوہے کی بڑی ریلنگ نظر آئی۔ بس اسٹاپ پر اسکول کے بچے نظر آئے، پتا چلا یہ اسکول ہے۔ بچے سوار ہوئے اور بس چل پڑی۔ راستے میں خاموش ویران اسٹاپوں پر 2-2 اور 3-3 بچے اترتے رہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ ان پہاڑی مکانات کے باہر تو اونچائی پر باؤنڈریاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بچے اپنے گھروں کو کیسے جاتے ہوں گے۔ پتا چلا کہ ایک ایک دو دو فرلانگ کے بعد اندر داخل ہونے والی سڑک آتی ہے اور یہ بچے ابھی سے لانگ واک کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ہر قسم کی گاڑیوں، بسوں اور بارٹوں کی سہولتوں کے باوجود راستوں کا تعین مقرر ہے اور اس پر عمل کرنا پوری کمیونٹی کی ذمہ داری ہے۔ بس آہستہ آہستہ انٹرنیشنل سان رامون ٹرانزٹ پر پہنچ گئی۔ یہاں سامنے والی بلڈنگوں میں 2400 Camino Ramoon میں شکیل کا آفس ہے۔ میں نے فون کیا وہ آ گیا اور مجھے گاڑی میں لے کر والنٹ کریک اور پلیزنٹ ہل سے ہوتے ہوئے ہم کانکرڈ میں سولو یو اسٹریٹ پر عتیق کے ویسٹرن ویکیوم پہنچ گئے۔ عتیق کا شوروم ویکیوم کلینرز کا ہے۔ سولو یو اسٹریٹ کا یہ حصہ جہاں عتیق کا اسٹور ہے بڑا صاف ستھرا ہے خوب صورت ہے شو روم کے آس پاس چھوٹے چھوٹے ریستوران ہیں۔ ہیئر ڈریسنگ سیلون ہیں۔ نکڑ پر بینک ہے۔ شوروم کا دروازہ پیچھے کی طرف بھی کھلتا ہے جہاں پارکنگ لاٹ ہے، فوارے ہیں، پھولوں سے بھرے ہوئے بڑے بڑے گملے ہیں۔ سامنے چھوٹا سا کھلا گارڈن ہے جس میں جگہ جگہ بینچیں بچھی ہیں اور فوارے چل رہے ہیں۔ دکان سے تھوڑی دور بڑی سڑک جو سالو یو اسٹریٹ کو کراس کرتی ہے اور سڑک کے اس پار برینڈن تھیٹر ہے جو شوروم کے دروازے سے نظر آتا ہے۔ عتیق کا Vaccume cleaner کا بزنس ماشاء اللہ اچھا چل رہا ہے۔ عتیق نے یہ کاروبار اور اس کی مرمت کا کام امریکا آ کر ہی سیکھا ہے۔ کم تعلیم ہونے کے باوجود امریکن انگلش پر عبور، سیلز مین شپ میں، ریپئرنگ میں اور پبلک ریلیشن میں مہارت حاصل کی۔ پاکستان ہندوستان کے دوستوں کا اچھا خاصا حلقہ بنا رکھا ہے۔ بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں دکان پر گیا۔ مبارک باد دی بہت خوش ہوا اور عادت کے مطابق خاموشی سے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میکسیکن ریسٹورنٹ سے جو اس کے دوست کا ہے فش ٹاکو بمعہ سلاسل گرم گرم لیے چلا آ رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ مجھے کانکرڈ کا فش ٹاکو بہت پسند ہے۔ میکسیکن لوگوں کے کھانے کا ذوق ہم لوگوں سے کم نہیں۔ عمدہ، تازہ بغیر کانٹے کی اچھی بڑی مچھلی کو عمدہ زیتون کے تیل میں فرائی کرتے ہیں۔ ہمراہ بہت ساری سلاد جس میں پیاز، لوبیا، گوبھی، لال مولی، دھنیا اوپر سے کریم اور کئی قسم کی رنگین کم مرچوں والی چٹنیاں، اس ٹاکو کو اس قدر مزیدار بنا دیتے ہیں کہ جس نے ایک بار کھایا بار بار آیا۔ اوپر سے تازہ چھیلے ہوئے اناناس کے جوس کا بڑا گلاس جس نے ایک بار پیا وہ زندگی بھر جیا۔ غرض اس طرح کھاتے پیتے اور خوش ہوتے 6 بج گئے۔ عتیق نے دکان بند کی اور میری خواہش پر مجھے پلیزنٹ ہلز بارٹ اسٹیشن چھوڑ گیا۔ پلیزنٹ ہلز اسٹیشن بہت بڑا ہے۔ دوسرے اسٹیشنوں کی نسبت صاف ہے۔ اس کا ٹریک سڑک سے 40 فٹ اوپر ہے۔ میں نے ٹکٹ پنچ کرایا۔ ایکسلیٹر سے اوپر ٹریک پر پہنچ گیا۔ یہاں سے صرف ڈالی سٹی کی ٹرین ملتی ہے۔ میں وال نٹ کریک، لافیٹ، اورنڈا، روک راج، میک آرتھر، اوک لینڈ سے ہوتا ہوا ویسٹ اوک لینڈ کے اسٹیشن پر اتر گیا۔ یہ اسٹیشن پانی کے کنارے ہے۔ مغرب سے سان فرانسسکو کی ہائی رائیز اور روشنیاں نظر آ رہی تھیں اور مشرق میں اوک لینڈ ڈاؤن ٹاؤن جیک لنڈن کی شاندار بلڈنگوں کی روشنیاں تھیں۔ بچ

میں سمندر اور بے برج کی جھلک بھی تھی یہاں سے میں نے دوسری ٹرین مشرق کی جانب ڈبلن کے لیے پکڑی اور لیک میرٹ، فردٹ ویل، سان لیانڈرو، بے فیئر سے ہوتا ہوا کیسٹرو ویلی میں داخل ہوا، آگے ڈبلن ہلز اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دس منٹ بعد ٹرین سے جگمگ کرتا ہوا ڈبلن نظر آیا اور میں ٹھیک دو گھنٹے کا سفر کر کے ڈبلن پہنچ گیا۔

کانکرڈ سے 6 بجے چلا تھا یہاں 8 بجے پہنچا۔

فیصل مجھے ڈبلن اسٹیشن سے گھر لے گیا بہت جلد میں سو گیا۔

☆......☆

میں جو کچھ لکھتا تھا وہ بھتیجے شیکی کو سنا دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے کہا کہ آپ کی ملاقات جن لوگوں سے ہوتی ہے وہ بھی تحریر میں لائیں۔ مجھے گولڈن گیٹ کی فضا اور ماحول بہت پسند تھا لہٰذا میں وہاں جاتا رہتا تھا۔ برج کے کنارے سینکڑوں سیاح چہل قدمی کرتے برج کو غور سے دیکھتے اور تصویریں بناتے نظر آتے ہیں۔ ایک دن میں بھی چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور کچھ نوٹ کر رہے ہیں۔ یہ ایک گول ٹیبل کی شکل کا بورڈ تھا جس پر برج کی تعمیرات کے کچھ قیمتی حقیقی اعداد و شمار درج تھے۔ مجھے بھی ان معلومات کو حاصل کرنے کا شوق ہوا لیکن پینسل پاس نہ تھی اور کسی سے مانگنے کی ہمت نہ پڑی۔ مڑ کر دیکھا تو کچھ دور پہاڑی پر بہت بڑا سوینئر اسٹور تھا۔ میں فوری وہاں لپکا کہ شاید پینسل مل جائے۔ وہاں گیا تو بے شمار سوینئر رسالے، ماڈلز، کھلونے، کتابیں، لٹریچر، گولڈن گیٹ کے موضوع پر مہیا تھے اور بہت سارے شوقین خریداروں سے اسٹور بھرا پڑا تھا۔ پینسل قلم نام کو نہ تھی میں ٹیکری کی سیڑھیوں سے نیچے اترا تو یہ دروازہ ایک چھوٹی سی کافی شاپ کا تھا میں سیدھا اندر گیا کاؤنٹر پر ایک ادھیڑ عمر خوش شکل خاتون کھڑی تھیں۔ میں نے کہا کہ مادام پینسل چاہیے کہنے لگی کہ یہ کافی شاپ ہے۔ میں نے کہا کچھ ضروری تحریر کرنی ہے۔ دس منٹ میں واپس دے دوں گا۔ محترمہ بولیں دس منٹ بعد 5 بجے مجھے شاپ بند کرنی ہے۔ میں نے کہا آپ فکر نہ کریں جانے سے پہلے میں آپ کی پینسل واپس کر دوں گا۔ میڈم مسکرائیں اور کاؤنٹر سے پینسل اٹھا کے مجھے دے دی۔ میں دوڑ کر اسی جگہ پہنچا جہاں معلوماتی بورڈ لگا ہوا تھا۔ بھیڑ اسی طرح قائم تھی میں نے جلدی جلدی تحریر کیا اور واپس پینسل دینے کو لپکا۔ جب کافی شاپ پہنچا تو میڈم قینچی والا دروازہ کھینچ کر بند کر رہی تھیں مجھے دیکھ کر خوش ہوئیں اور بولیں Gentle man you are in time دروازہ کھولا اور مجھے لے کر اندر گئیں۔ ایک میز کے قریب بٹھایا اور خود پینسل رکھنے کاؤنٹر پر گئیں۔ پانچ منٹ میں دو مگ Espresso Coffee کے گرم جھاگ اڑاتے لائیں اور کہنے لگیں سردی بڑھ رہی ہے۔ یہ پی لو گے تو گرم رہو گے۔ میں نے کہا میڈم یہ آپ نے تکلف کیا۔ مجھے پینسل کی ضرورت تھی وہ آپ نے پوری کر دی آپ اب کافی پلا رہی ہیں حالانکہ آپ کو تو بند کر کے جانا ہے۔ کہنے لگیں ہاں یہاں سے تھوڑی دور ایک اسپاٹ پر میرے شوہر اپنی گاڑی لے کر آجاتے ہیں، میں یہاں سے پیدل چلی جاتی ہوں۔ تھوڑی واکنگ ہو جاتی ہے وہاں سے ہم گھر چلے جاتے ہیں۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک نہایت خوش شکل عمر رسیدہ صاحب آگئے۔ یہ محترمہ کے شوہر تھے۔ کہنے لگے مجھے اندازہ تھا کہ آج تم کسی نئے دوست کے ساتھ محو گفتگو ہو گی اور مجھے بھول جاؤ گی۔

میڈم نے میرا تعارف کرایا کہ یہ ٹورسٹ ہیں جنٹلمین ہیں۔ آپ ان سے مل کر خوش ہوں گے۔ میں نے بھی تعارف کرایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ یہاں Hay Ward میں میرے بیٹے کا A one Vacume/ Sewing Store ہے۔ آپ لوگ اگر وہاں آئیں گے تو مجھے خوشی ہو گی۔

دونوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم اسٹور پر ضرور آئیں گے۔ دونوں خوش مزاج تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں بے تکلف گفتگو ہونے لگی۔ لگتا تھا ملاقات پرانی ہے۔ دوران گفتگو میں نے کہا کہ مجھے سان فرانسسکو میں گولڈن گیٹ بہت پسند ہے اور اس تفریح گاہ پر ایک معلوماتی مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ کرسٹوفر صاحب نے کہا یہاں آنے والے بہت سے لوگ جو گولڈن گیٹ اور اس کے ماحول سے Inspire اور متاثر ہوتے ہیں وہ اپنے تاثرات کو قلمبند کر لیتے ہیں۔ اگر آپ آج کے بعد مجھے وقت دیں تو میں معلوماتی مدد کر سکتا ہوں۔ ایسی ہی باتیں کرتے ہوئے شام کے چھ بج گئے۔ گولڈن گیٹ پر دسمبر میں 6 بجے کی شام ایسی ہوتی ہے جیسے رات کے 11 بج رہے ہوں۔ یکا یک انہوں نے پوچھا آپ کہاں اور کیسے جائیں گے کیوں کہ سردی بڑھ رہی ہے اور آخری بس 6 بجے جا چکی ہے۔ میں فکر مند ہوا کیوں کہ میرے پاس ذاتی کنوینس نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی بولے بالکل فکر نہ کریں اور بتائیں کہاں

جانا ہے۔ میں نے کہا بہتر ہوگا کہ آپ مجھے قریبی بارٹ (ریلوے اسٹیشن) پر اتار دیں تو میرے لیے آسان ہو جائے گا۔ دونوں خوشی خوشی راضی ہو گئے۔ کافی شاپ بند کی۔ مجھے گاڑی میں بٹھایا اور قریبی بارٹ اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے جو گولڈن گیٹ سے تقریباً 15 میل دور تھا۔ زیادہ راستہ خاموش اور سنسان تھا۔ سردی سخت تھی۔ 20-25 منٹ میں ہم Balboa اسٹیشن پہنچ گئے۔ ٹکٹ میرے پاس تھا۔ دونوں میرے ہمراہ پلیٹ فارم تک آئے۔ دس منٹ میں گاڑی آ گئی۔ دونوں نے مجھے بائی بائی Have a Safe Journey کہا۔ اپنا خیال رکھنے کو کہا۔ مادام نے مجھے کارڈ دیا کہ کوئی پرابلم ہو مجھے فون کریں اور گھر پہنچنے پر اطلاع دیں۔

میں بارٹ میں داخل ہوا۔ سیٹ پر بیٹھا اور سوچنے لگا کہ کسی بھی اجنبی، نووارد ٹورسٹ کے ساتھ یہاں کے لوگوں کا رویہ کتنا Co-Operative ہے۔ یہ لوگ زندگی سے کتنی آسانی سے خوشیاں چن لیتے ہیں اور تقسیم بھی کرتے ہیں اور اس طرح جینے کا مشکل سفر طے ہو جاتا ہے۔

یکا یک مجھے احساس ہوا کہ کمپارٹمنٹ کے شروع کے حصے میں میں اکیلا ہوں اور کافی پیچھے دو تین مسافر ہیں۔ مجھے بڑی تنہائی اور اجنبیت محسوس ہوئی۔ اتنی دیر میں West Oak Land اسٹیشن آ گیا۔ ٹرین رکی دروازہ کھلا اور افریقن خواتین کی کھیپ کی کھیپ اندر داخل ہوئی۔ جن کے قد لمبے جسم بھاری تھے۔ رنگ سیاہ اور بال گھونگریالے تھے۔ ان کے کپڑے لال پیلے اور نیلے جھالر والے تھے۔ گلے میں مالائیں اور ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے، کانوں میں بالے تھے۔ ان عورتوں نے میرے قریب کی سیٹیں پسند کیں اور مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ آپس میں گفتگو کرنے لگیں اور مجھ سے کہنے لگیں We are your girl friends خوف کے مارے میرا خون خشک ہو رہا تھا۔ ان کو مستی سوجھ رہی تھی۔ بے تحاشا بے ہنگم ہنسی ہنس رہی تھیں۔ کھا رہی تھیں، گا رہی تھیں۔ میں چند لمحے دم سادھے بیٹھا رہا، جب گھٹن زیادہ محسوس ہوئی تو آہستہ سے کھڑا ہوا اور ان کو پھلانگتا ہوا دروازے تک پہنچا وہ بدستور ٹھٹھے لگاتی رہیں۔ اتنے میں اسٹیشن Lake Merit آ گیا اور میں اتر گیا۔ دس منٹ بعد دوسری ٹرین آ گئی۔ سردی کی وجہ سے رش بھی کم تھا۔

ایک گھنٹے بعد ٹرین کیسٹرو ویلی کراس کرتی ہوئی ڈبلن کی پہاڑیوں کے اندھیروں میں گم ہو گئی اور پندرہ منٹ بعد ڈبلن کا جگمگاتا ہوا چھچاتا ہوا شہر آ گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ اسٹیشن پر فیصل آیا اور پوچھنے لگا ابو اتنی رات گئے کہاں سے آئے۔ میں نے کہا ٹھنڈ زیادہ ہے۔ صبح بات ہوگی۔

سان فرانسسکو کا امبارکوڈیرو اسٹیشن بھی شہر کے رسل و

Refraction of Light

روشنی کا ایک واسطے سے دوسرے واسطے میں داخل ہوتے وقت اپنا راستہ تبدیل کرنا۔ دوسرے واسطے پر پڑنے والی شعاعیں عمودی ہوں تو وہ سیدھی گزر جاتی ہیں۔ ان میں روشنی کا انعطاف نہیں ہوتا۔ پینسل پانی میں کھڑی کی جائے تو اس کا وہ حصہ جو پانی کے اندر ہے۔ ٹیڑھا نظر آتا ہے اور یہ ٹیڑھا پن اسی جگہ سے شروع ہوتا ہے جہاں سے پانی کے اندر پینسل کا حصہ شروع ہوتا ہے۔ روشنی کی وہ شعاع جو ایک واسطے سے دوسرے واسطے میں داخل ہوتی ہے شعاع واقع (Incidence ray) کہلاتی ہے۔ جس نقطے سے شعاع واقع داخل ہوتی ہے اسے نقطہ وقوع (Point of incidence) کہتے ہیں اور اس نقطے پر گرایا ہوا عمود نارمل کہلاتا ہے۔ اسی عمود اور شعاع واقع کا درمیانی زاویہ، زاویہ وقوع (Angle of incidence) کہلاتا ہے اور عمود اور شعاع منعطف (Refracted ray) کا درمیانی زاویہ انعطاف (Angle of refraction) کہلاتا ہے۔ شعاع منعطف وہ شعاع ہوتی ہے جو دوسرے واسطے میں مڑ کر پھر سیدھے خط میں چلی جاتی ہے دوسرے واسطے کو پار کرنے کے بعد شعاع منعطف پھر پہلے واسطے میں داخل ہوتی ہے تو شعاع اخراج کا درمیانی زاویہ، زاویہ اخراج کہلاتا ہے۔ شعاع واقع اور شعاع منعطف پر نقطہ وقوع سے برابر فاصلے پر نقطہ وقوع پر عمود گرائے جائیں تو ان میں جو باہم نسبت ہوتی ہے اسے انعطاف نما (Refractive index) کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: زہیب سلطان۔ مانچسٹر یو کے

رسائل کی آماجگاہ ہے۔ یہاں سے زیر زمین بارٹ پورے شہر کو کراس کرتی ہوئی جنوب میں سان فرانسسکو ایئرپورٹ اور مل برائے تک جاتی ہے۔ یہاں سے میونی لائٹ ٹرین بھی چلتی ہے جو شہر کے بہت سے حصوں میں اپنی لائنوں یعنی ریلوے ٹریک پر چلتی ہے۔

امبارکوڈیرو سے اگلا اسٹیشن Powel ہے اس کے باہر بغلی سڑک پر کیبل کار چلتی ہے۔ کیبل کار پرانے زمانے کی ٹرام ہے جو اپنی لائن ٹریک پر چلتی ہے۔ یہ ٹریک تقریباً 100 سال پرانا ہے۔ اس زمانے میں لوگ جس سواری پر سفر کرتے تھے وہ اس وقت کے شہر کے بڑے حصے کو کور کرتی تھی۔ اسی دور کی ٹراموں کو سڑک کے بیچوں بیچ لائنوں کو اور اسی طرز کی سروس کو یہاں قائم رکھا گیا ہے۔ جو اب ایک صدی گزرنے کے بعد عجوبہ روزگار بن گئی ہے۔ یہ مصروف شہر کے بیچ ایک تفریح گاہ بن گئی ہے۔ ساری دنیا سے لوگ سیاح یہاں آتے ہیں، ان پرانی ٹراموں کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ سینکڑوں مرد عورتیں بچے ٹکٹ لینے اور ان ٹراموں کی سیٹ حاصل کرنے کے لیے لمبی لمبی لائنوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔ لکڑی کی بینچ نما سیٹوں پر بیٹھتے ہیں۔ ٹرام کی کچھ سیٹیں کھلی ہوتی ہیں اور کچھ حصہ بند ہوتا ہے۔ ٹرام ٹورسٹوں اور مسافروں سے کھچا کھچ بھر کے اپنے ٹریک اپنی سڑک پر چل پڑتی ہیں۔ ٹرامیں پرانی ہیں، چلانے والے اور کنڈیکٹر بھی حلیے سے پرانے جیسے ہیں، پرانے اسٹاپ ہیں۔ گاڑی رکتی ہے کنڈیکٹر آواز لگاتا ہے۔ Lombard, Market, Hyde, Powel وغیرہ وغیرہ۔ یہاں کے اسٹاپ کے مسافر اتر جاتے ہیں۔ کنڈیکٹر ڈوری کھینچتا ہے۔ سو سال پرانی گھنٹی بجتی ہے ٹرام چل پڑتی ہے۔ یہ ٹرام سڑک کے ساتھ ساتھ اترائی چڑھائی پر سفر کرتی ہے۔ گلیوں میں سڑکوں میں مڑتی ہے اور شہر کے مشہور اور آباد محلوں بازاروں اور قابلِ دید مقامات کی سیر کراتی ہوئی فشرمین دہارف اور دوسرے علاقوں تک لے جاتی ہے اور اسی طرح واپس لے آتی ہے۔ یہ کاریں شہر کے بیچوں بیچ چلتی ہے اور سارا دن مصروف رہتی ہیں۔ زیادہ تر ٹورسٹ ان پر سفر کا شوق پورا کرتے ہیں۔ شہر کی رونقوں میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں جب بھی پاول گیا میں نے کیبل کار کے ٹرمینل پر جو سڑک کے نکڑ پر ہے اس میں سفر کرنے کے شائقین کی بھیڑ دیکھی۔ کئی مرتبہ اس بھیڑ میں بھی شامل ہو گیا اور 5 ڈالر (450 روپے) کا یکطرفہ ٹکٹ لے کر فشرمین دہارف جو سمندر کے کنارے تفریحی مقام ہے چلا گیا۔

فشرمین دہارف بھی سان فرانسسکو میں انتہائی بارونق مقام ہے یہاں فیری اسٹیشن ہیں، یہاں پیئرز اور جیٹیاں ہیں ساحلی بلڈنگیں ہیں۔ مچھلی کے بڑے عظیم ایکیوریمز ہیں۔ سارے جہاں کے سیاح پوری پوری فیملیوں کے ہمراہ یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ یہاں عرصہ دراز سے قدم قدم پر کھانے کے ریسٹوران ہیں جن کے روایتی انداز کے کھانے خصوصاً سی فوڈز مشہور ہیں۔ یہاں مختلف الاقسام کی مچھلی، جھینگے اور کریب کے شوقین فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ریسٹورانوں میں بیٹھ کر مزے مزے کے کھانوں کا شوق پورا کرتے ہیں۔ درجنوں فیریاں یہاں سے اسکاٹریز آئی لینڈ کے لیے، ساسی لوٹو کے لیے، الامیڈا آئی لینڈ کے لیے اور دور دراز ساحلی علاقوں کے لیے ملتی ہیں۔ ان فیریوں میں بھی شوقین ٹورسٹوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ہر فیری نئے سے نئے انداز کی خوب صورت اور آرام دہ ہوتی ہے۔ ہر فیری ایک خوب صورت سمندری مکان ہوتی ہے۔ لوگ جوق در جوق ان میں بیٹھتے ہیں۔ سمندروں کی سیر کرتے ہیں اور قدرت کے مناظر دیکھ کے جھومنے اور اونگھنے لگتے ہیں۔

میں بھی Blue gold فیری میں بیٹھا۔ پہلے اس نے الکاٹریز آئی لینڈ کا چکر لگایا اور پھر گولڈ گیٹ برج کے نیچے لے گئی، واپس آتے ہوئے یہ سفر ڈیڑھ دو گھنٹے کا تھا۔ جب فیری گولڈن گیٹ کے نیچے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پیسفک اوشن پر پہنچتی ہے تو کھلے سمندر کی لہروں کی اونچائی پر ایک عجیب و غریب جھولے نما برج اس پر سے گزرتی ہوئی ہزاروں گاڑیاں انسان کو بے قابو کر دیتی ہیں۔ یہاں بھپرتے بل کھاتے اور ٹھاٹے مارتے سمندر کو دیکھ کر قدرت کی عظمت اور معلق پل دیکھ کر انسان کی محنت کا شدید احساس ابھرتا ہے۔ اچھے بھلے پڑھے لکھے ذہین فیشن ایبل مرد و خواتین کی قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔ سب مل کر اس بری طرح چیختے ہیں کہ 5 منٹ تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ حیرانگی اور خوشی کا بے ساختہ اور بے قابو اظہار ہے۔ فیری پل کے نیچے سے چکر کاٹ کر پیئر 39 فشرمین دہارف واپس آ گئی۔ میرے لیے بھی یہ سفر حیرت کا تھا۔ تجربے کا تھا، سبق کا تھا۔

جاری ہے

ذرہ حیدر آبادی

اردو ادب کا دامن اشعار کے جواہر سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ ایسے ایسے اشعار ملتے ہیں جو کئی صدی کے بعد بھی تازہ ہیں۔ جسے لوگ گنگناتے، لطف لیتے مل جائیں گے۔ کچھ اشعار تو اتنے زیادہ مقبول ہیں کہ لوگ شاعر کو بھی بھول گئے ہیں لیکن اشعار ذہن میں تازہ ہیں۔ کچھ شعر ایسے بھی ہیں جو کسی اور شاعر کا پروازِ تخیل ہے اور مشہور کسی اور شاعر کے نام سے ہو گیا ہے۔ ایسے ہی چند اشعار کو منتخب کیا گیا ہے جو مشہور تو بہت زیادہ ہیں لیکن کسی اور شاعر سے منسوب کردیے گئے ہیں۔

اردو ادب سے محبت رکھنے والوں کے لیے تحفۂ خاص

80ء کی دہائی میں ایک غزل بہت مقبول ہوئی۔

کون کہتا ہے محبت کی زباں ہوتی ہے
یہ حقیقت تو نگاہوں سے بیاں ہوتی ہے

کئی برسوں تک یہ غزل ساحر لدھیانوی سے منسوب رہی بعد میں کچھ حضرات نے اسے ساحر لکھنوی سے بھی منسوب کردیا۔ یہ غزل نہ تو ساحر لدھیانوی کی ہے اور نہ ہی ساحر لکھنوی کی بلکہ یہ غزل مرحوم ساحر ہوشیار پوری کی ہے۔ دیکھیے کلیات ساحر ہوشیار پوری۔

☆☆☆

انجمن انجمن شناسائی
پھر بھی دل کا نصیب تنہائی
خشک آنکھوں سے عمر بھر روئے
ہو نہ جائے کسی کی رُسوائی

یہ خوب صورت غزل آج بھی قتیل شفائی سے منسوب ہے مگر یہ ان کی نہیں ہے بلکہ یہ غزل بھی ہوشیار پور ہی کے ایک شاعر مرحوم طفیل ہوشیار پوری کی ہے، دیکھیے کلیات ساحر ہوشیار پوری، فرید یہ پبلی کیشنز۔ اردو بازار، کراچی۔

☆☆☆

اپنے ہی شب و روز میں آباد رہا کر
ہم لوگ بُرے لوگ ہیں ہم سے نہ ملا کر
اکثر حضرات لاعلمی کے باعث اس شعر کو رئیس باغی سے منسوب کرتے ہیں جو کہ درست نہیں۔ یہ شعر جناب رئیس فروغ کا ہے جن کا ایک اور خوب صورت شعر زبان زد عام ہے۔

حسن کو حسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے
آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے
آپ ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ تھے، دیکھیے جدید اردو غزل، رشید احمد صدیقی و عابد رضا بیدار: مرتبہ ڈاکٹر معین الرحمن، یونیورسل بکس لاہور۔

☆☆☆

تک ساتھ ہو حسرت دل مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
اکثر حضرات اس شعر کو رئیس امروہوی سے منسوب کرتے ہیں جب کہ کچھ حضرات نے اس شعر کو ثاقب لکھنوی سے بھی منسوب کیا ہے اور اس طرح سے لکھا ہے۔" چل ساتھ کہ حسرتِ دل مرحوم سے نکلے"
رئیس امروہوی نے روزنامہ جنگ میں جو قطعہ لکھا تھا اس کے آخر میں یوں تھا۔" اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔"

اس شعر کے اصل خالق فدوی عظیم آبادی ہیں، دیکھیے کلیات مرزا محمد علی فدوی، مرتبہ سید محمد حسنین مطبوعہ آزاد پریس، پٹنہ 1956ء۔

☆☆☆

آخر گلِ اپنی صرف درِ مے کدہ ہوئی
پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو
یہ شعر شاعر لکھنوی سے منسوب ہے اور اس طرح سے لکھا اور پڑھا جاتا ہے
پہنچی وہی پہ خاک جہاں کا خمیر تھا
یہ شعر سودا سے بھی منسوب ہے مگر کسی معتبر کلیاتِ سودا میں نہیں ہے، اس شعر کے خالق جہاندار شاہ جہاندار ہیں، دیکھیے، خم خانہ جاوید (جلد دوئم) صفحہ 322، اور دیوان جہاں دار: میرزا جوان بخت جہاں دار، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی اردو ادب لاہور، اس کے علاوہ یہ شعر گلشن بے خار، اور طبقات شعرائے ہند، مرتبہ کریم الدین میں بھی موجود ہے۔

☆☆☆

ہزار شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی
یہ شعر اکبرالہ آبادی سے منسوب ہے مگر کلیات الہ آبادی مرتبہ، عشرت حسین (فرزند اکبرالہ آبادی) مطبوعہ اسرا کریمی پریس الہ آباد، 1940ء میں یہ کہیں نہیں ہے۔ کلیات اکبرالہ آبادی (حصہ چہارم) کتابستان کراچی، مطبوعہ سول اینڈ ملٹری پریس، کراچی میں بھی یہ شعر کہیں موجود نہیں ہے۔
محمد شمس الحق صاحب اپنی کتاب "اردو کے ضرب المثل اشعار" ادارہ یادگار غالب کراچی میں لکھتے ہیں میری تحقیق کے مطابق یہ شعر انشاء اللہ خان انشا کا ہے۔ یہ شعر خم خانہ جاوید (جلد چہارم) لالہ سری رام دہلی، 1925ء میں صفحہ 320 پر انشاء سے منسوب ہے۔
مولوی عبدالحکیم خلفِ سید عبدالرحیم کے حالاتِ زندگی لکھتے ہوئے لالہ سری رام رقم طراز ہیں۔ آپ شاہ جہاں پور روہیل کھنڈ کے باشندے تھے۔ آپ مولوی مدن صاحب مشہور متبحر عالم کی اولاد میں سے ہیں جو نواب سعادت علی خان کے اتالیق تھے اور جن کی تعریف میں سید انشاء نے مزاحاً مذکورہ بالا شعر کہا۔ یہ شعر انشاء کا ہی ہے اکبر الہ آبادی کا نہیں۔

☆☆☆

1980ء کے عشرے میں غلام فرید صابری، مقبول فرید صابری کی ایک قوالی بہت مقبول ہوئی وہ قوالی یہ تھی
آئے ہیں وہ مزار پہ گھونگھٹ اتار کے
مجھ سے نصیب اچھے ہیں میرے مزار کے
یہ استاد قمر جلالوی کی غزل تھی جو صابری برادران نے گائی تھی اسی قوالی کا ایک شعر زبان زد عام ہوا، وہ یہ تھا۔
آپ کے لب پہ اور وفا کی قسم
کیا قسم کھائی ہے خدا کی قسم
اسی طرح لوگ سمجھنے لگے کہ یہ شعر بھی قمر جلالوی کا ہی ہے۔ جب کہ بعض ادبی گلدستوں میں اس شعر کے شاعر کے نام کی جگہ نامعلوم بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ شعر صبا اکبر آبادی مرحوم کا ہے۔ اس سلسلے میں راقم نے کینیڈا میں مقیم صبا اکبر آبادی کے فرزند جناب سلطان جمیل نسیم صاحب سے رابطہ کیا تو انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ یہ شعر ان کے والد حضرت صبا اکبر آبادی کا

ہے جو دوسروں کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ جناب سلطان جمیل نسیم صاحب نے مجھے یہ پوری غزل بھی سنائی جس کا مقطع درج ذیل ہے۔

مرگِ عاشق تو یوں بھی روتے ہیں
ہنس تو دینا تمہیں صبا کی قسم

صبا اکبر آبادی کا اصل نام خواجہ محمد امیر تھا۔ ولادت 14 اگست 1908ء آگرہ، وفات 30 اکتوبر 1991ء اسلام آباد۔ دیکھیے ان کی کتاب ''اوراقِ گل'' عدنان پبلی کیشنز، کراچی، 1970ء صفحہ 175۔

☆☆☆

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

یہ شعر میر سوز سے منسوب ہے مگر ''کلیاتِ میر سوز'' مرتبہ: ڈاکٹر سید علی حیدر، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ 1977ء میں یہ شعر کہیں نہیں ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی ایک کتاب ''شبستان سرور'' میں یہ شعر صفحہ 15 پر درج ہے یا پھر دیکھیے ''فسانہ عجائب'' رجب علی بیگ سرور، مرتبہ: رشید حسن خان، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1990ء اس میں بھی موجود ہے۔

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے

حامد حسن قادری مرحوم اپنے ایک خط مورخہ 12 مارچ 1958ء بنام ڈاکٹر ابوالخیر کشفی میں لکھتے ہیں:

اس شعر کا حوالہ ایک داستان ہے جو بڑی دل چسپ، بڑی طویل ہے جس کو شاید اب میرے علاوہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ میرے پاس ایک قدیم مطبوعہ کتاب ہے جس میں شاعر نے صرف اسی زمین میں اس قافیے کے پہلو بدل کر تقریباً ڈیڑھ سو شعر کہے ہیں۔ کتاب کا نام کچھ نہیں ہے بلکہ سرورق پر کتاب کے نام کی جگہ خطِ طغریٰ کی آرائش کے شوق میں نام کا ایک حرف لکھنے سے چھوٹ گیا ہے۔ بہرحال اتنا صاف پڑھا جاتا ہے، نواب امین الدولہ سیف الملک سید علی خان بہادر فیروز جنگ دام اقبالہ، کتاب مطبع محمدی میں چھپی ہے۔ معلوم نہیں یہ مطبع کہاں ہے سال طباعت کہیں درج نہیں ہے شاعر کا تخلص مہر ہے۔ اس کے بعد گیارہ صفحات پر پیمبری ہو جائے والی غزل ہے۔ کل 16 صفحے کی خوش خط جلی قلم، رنگین کاغذ کی کتابت ہے، ڈیڑھ سو [illegible] کوئی شعر ہے تو وہ ہی ''خدا کے دین والا'' باقی

سب قافیہ پیمائی ہے، غزل کے آخری اشعار یہ ہیں

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ہو جائے
بس اب وہ مقطعِ روشن ہو زور کا اے مہر
کہ زیبِ مطلعِ دیوان انوری ہو جائے

دیکھیے ''یہ لوگ بھی غضب تھے'' ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، مطبوعہ فیروز سنز، لاہور 1989ء۔

یہ شعر نواب امین الدولہ کا ہے۔

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

قربان علی سالک اسد اللہ غالب کے شاگرد تھے مگر اتنے مشہور نہیں تھے جتنے غالب اسی بنا پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شعر غالب کا ہے اور ان کے تخلص کے شمول اس طرح پڑھتے ہیں۔

''تنگ دستی اگر نہ ہو غالب''

یہ شعر سالک کا ہے، غالب کا نہیں، دیکھیے، کلیاتِ قربان علی سالک: مرتبہ کلب علی خان فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور نومبر 1966ء صفحہ 474۔

☆☆☆

آیئے اب ایک ایسے شعر پر بات کرتے ہیں جو غالب کا ہے بھی اور شاید نہیں بھی۔

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

حنیف نقوی شعبہ اردو بنارس، ہندو یونیورسٹی، وارانسی، اپنی کتاب ''غالب احوال و آثار'' نصرت پبلی کیشنز، لکھنو 1990ء میں غالب سے منسوب اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں۔ زیر بحث شعر نہ تو غالب کی ان دونوں غزلوں میں سے کسی غزل میں موجود ہے اور نہ غالب کی زندگی میں شائع شدہ کسی متند دیوانِ اوّل کے کسی نسخے میں اس کا سراغ ملتا ہے۔ اب تک دریافت شدہ متعدد قلمی نسخوں میں سے کسی بھی نسخے میں یہ شعر نہیں ملتا ہے۔ بعد میں مطبوعہ نسخوں میں جس نسخے کو سب سے پہلے کلام غالب کی حیثیت دی گئی، وہ نظامی پریس بدایوں سے شائع شدہ چوتھا ایڈیشن ہے جس کا دیباچہ 14 جولائی 1921ء کو لکھا جا چکا تھا اور یہ کتاب 1922ء میں شائع ہوئی اس کے صفحہ 255 پر یہ شعر موجود ہے مگر بعد میں نظامی صاحب پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ شعر غالب کا نہیں بلکہ کسی اور کا ہے تو 1923ء میں اسی دیوان کے دو

اور ایڈیشن شائع ہوئے تو ان میں سے اس شعر کو نکال دیا گیا۔ آیئے اب دوسری طرف دیکھتے ہیں، بزم اکبر آبادی جن کا اصل نام مرزا عاشق حسین، ولادت 1861ء، آپ منیر شکوہ آبادی کے پوتے تھے۔ دیوان ''بزم سخن'' اور مثنوی ''تصویر سخن'' آپ نے ایک طویل غزل اگست 1910ء سے قبل کہی تھی اس غزل کے تین اشعار درج ذیل ہیں۔

یوں تو دل چسپ بہت عالمِ امکاں نکلا
جب کیا غور تو اک خواب پریشاں نکلا
ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پسِ مرگ یہ ساماں نکلا
ہو کوئی تازہ ادا بزم کے انداز نیا
جو بھی نکلا وہ مری جان کا خواہاں نکلا

بزم اکبر آبادی کے دونوں مصرعے غالب سے منسوب اس شعر سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے سامنے ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے جس میں کسی شعر کے دونوں مصرعے ترمیم شدہ حالت میں اصل شعر سے بالکل مختلف ہوں۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ بزم اکبر آبادی نے زیر بحث شعر سے ملتا جلتا شعر کہا ہے لیکن مشہورِ زمانہ شعر ''چند تصویر بتاں......'' بزم اکبر آبادی کے شعر کی ترمیم یافتہ شکل ہرگز نہیں یہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے شاہ حاتم کا یہ شعر

پگڑی اپنی یہاں سنبھال چلو
بستی نہیں یہ دلی ہے

دیکھیے ''غزل نما'' ادا جعفری، انجمن ترقی اردو کراچی۔ پاکستان 1987ء صفحہ 178۔

اب اس شعر سے ملتا جلتا شعر، شاگردِ شاہ حاتم، بقا اللہ بقا ولادت، دہلی، سکونت لکھنو، وفات 1791ء کا ہے۔

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلی ہے

مصرع اولی میں لفظ میر کی وجہ سے اکثر لوگ اس شعر کو میر کا سمجھتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے دراصل بقا اللہ بقا نے میر پر چوٹ کی تھی۔

☆☆☆

آیئے اب ایک ایسے شعر کا بھی ذکر ہو جائے جو بائیس کے قریب شعرائے کرام سے منسوب ہے۔

بے تابیاں سمیٹ کر سارے جہان کی
جب کچھ نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

کچھ حضرات بے تابیاں کی جگہ ''اداسیاں'' بھی لکھتے ہیں جو درست نہیں۔ یہ شعر نجمی نگینوی کا ہے، آپ کا اصل نام سید عالم کاظمی، ولادت 17 جنوری 1927ء، نگینہ، ضلع بجنور۔ آپ شاعر مزدور حضرت احسان دانش کے شاگرد تھے اور رسالہ عالم گیر کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ دیکھیے، ''گل ہائے رنگ رنگ'' مرتبہ محمد شمس الحق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد 1995ء۔

☆☆☆

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل، کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے

شان الحق حقی، انتخاب ذوق وظفر، انتخاب ذوق مع مقدمہ، پنڈت برجموہن دتاتریہ اور انتخاب ظفر مع مقدمہ، شان الحق حقی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔ 1945ء میں اس شعر کو بہادر شاہ ظفر کی ملکیت قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ اس طرح ظفر کا کلام بہت غلط اور نامعتبر صورت میں ملتا ہے۔ تاہم بعض کلام ایسا موجود ہے جس پر کوئی معقول شبہ وارد نہیں ہوتا اور جو اپنے اندازِ قرائن کی داخلی شہادت کے بموجب بلاشبہ ظفر ہی کا قرار دیا جاسکتا۔ یوں بھی کوئی خاص اعتراض وارد نہ ہو تو کثرت شہرت اور زبانِ خلق کو اس معاملے میں کافی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے کلام میں ایک غزل یہ ہے

کبھی بن سنور کے جو آگئے تو بہارِ حسن دکھا گئے
مرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے
کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
مرے پاس آتے تھے دم بدم وہ جدا نہ ہوتے تھے ایک دم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم کہ مجھی سے آنکھیں چرا گئے
جو ملاتے تھے مرے منہ سے منہ کبھی لب سے لب کبھی دل سے دل
جو غرور تھا وہ انہی پہ تھا وہ کبھی غروروں کو ڈھا گئے

بہادر شاہ ظفر کی کلیات، مطبوعہ نول کشور پریس لکھنو، 1887ء اور بعد کے ایڈیشنوں میں نہ تو یہ غزل ہے اور نہ ہی زیرِ غور ضرب المثل شعر، شان الحق حقی صاحب نے جو غزل نقل کی ہے اس میں مقطع نہیں ہے اور اساتذہ کی کوئی غزل بالعموم مقطع کے بغیر نہیں ہوتی، معلوم نہیں حقی صاحب نے اس غزل کو کس بنا پر شاہ ظفر سے منسوب کردی ہے۔

حال ہی میں ایک معروف ادیب اور محقق نے اپنے ایک مضمون میں نعت کے ایک شعر کو حضرت بہزاد لکھنوی سے منسوب کیا ہے

یہ سب تمہارا کرم ہے آقا
کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

اول تو یہ مکمل شعر ہی نہیں ہے بلکہ مطلع کا مصرع ثانی ہے جو شعر کی شکل میں مقبول ہوگیا ہے۔ دوئم انہوں نے یہ دلیل دی ہے چونکہ یہ شعر حضرت بہزاد لکھنوی کے مزار پر لکھا ہے لہٰذا یہ شعر ان ہی کا ہے۔ حضرت بہزاد لکھنوی کا عاشق رسول ہونا اپنی جگہ مسلم اور مستند مگر کسی کے مزار پر کسی اور کا شعر ہونے سے وہ شعر صاحب مزار کا نہیں ہو جاتا، سابقہ صدرِ پاکستان ضیاء الحق کے مزار پر قائم چاند پوری کا مشہورِ زمانہ شعر

قسمت تو دیکھیے کہ ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب لبِ بام رہ گئے

لکھا ہے تو کیا اب یہ شعر جنرل ضیاء الحق کا ہوگیا؟
زیرِ بحث نعت کا یہ مصرع خالد محمود خالد نقشبندی کا ہے اور پورا شعر یوں ہے

کوئی سلیقہ ہے آرزو کا، نہ بندگی میری بندگی ہے
یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے

دیکھیے ''قدم قدم سجدے'' خالد محمود خالد نقشبندی، قادر پرنٹرز، کراچی 1998ء۔

☆☆☆

ہندی فلم گن اور گوڈ جو راج کمار کی آخری فلموں میں سے تھی اس فلم میں راج کمار نے ایک وکیل کا کردار ادا کیا تھا۔ اسی فلم میں علامہ اقبال کے نام سے راج کمار کو ایک شعر پڑھتے ہوئے دکھایا گیا وہ یہ ہے

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے کارواں بنتا گیا

کچھ شعری گلدستوں میں یہ مخدوم محی الدین سے منسوب ہے۔ کئی برس قبل کراچی کے ایک عالمی مشاعرے میں جب مرحوم مجروح سلطان پوری کو دعوت کلام دی گئی تو انہوں نے سب سے پہلے متفرق چار شعر پڑھے اور پہلا یہ ہی زیرِ بحث شعر پڑھا اور وضاحت کی کہ یہ میرے اشعار ہیں جو کچھ اور نامور شعرا سے منسوب ہو گئے ہیں۔ یہ شعر صرف مجروح سلطان پوری ہی کی ملکیت ہے۔ دیکھیے ان کی کتاب غزل ان کا اصل نام اسرار الحسن ولادت یکم جولائی 1915ء گنجہری، ضلع سلطان پور، وفات 24 مئی 2000ء ممبئی۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اس شعر کو لوگ حسرت موہانی سے منسوب کرتے ہیں جب کہ روزنامہ ''سیاست'' انڈیا میں ایک صاحب نے اسی شعر کو جلیل مانک پوری سے منسوب کیا ہے۔ کچھ حضرات لاعلمی کے باعث اس شعر کو اختر اکبر آبادی سے بھی منسوب کرتے ہیں جو کہ درست نہیں۔ یہ شعر اختر انصاری کی تخلیق ہے۔ جن کی ولادت یکم اکتوبر 1909ء بدایوں، وفات 6 اکتوبر 1988ء علی گڑھ ہے۔ دیکھیے شعری مجموعہ ''آبگینے'' اختر انصاری ادارہ فروغ اردو ادب لاہور، 1961ء۔

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملے جس کو سبق یاد رہے

شعر میں تصرف ہوگیا ہے۔ مصرع ثانی کچھ اس طرح عوام الناس میں مقبول ہے۔

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

یہ میر طاہر علی رضوی کی ملکیت ہے۔ آپ 1840ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ منشی امداد حسین صغیر کے شاگردِ خاص تھے۔ ضلع فرخ آباد میں کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے اور یہیں سے ریٹائرڈ ہوئے۔ میر طاہر علی رضوی کا تاریخ وفات 20 جولائی 1911ء ہے۔ یہ شعر ''خم خانہ جاوید'' جلد پانچ، مرتبہ پنڈت برج موہن، مطبوعہ دتاتریہ کیفی دہلی 1940ء کے صفحہ نمبر 426 پر بھی موجود ہے۔

☆☆☆

پہلی شکل

اس بزم کی طرفہ میہمانی نہیں دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو جاکے نہ آئے، وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

دوسری شکل

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

یہ مشہور زمانہ رباعی دوسری شکل میں میر انیس سے منسوب ہے اور کئی نامور دانشور اور کالم نگار اسے میر انیس سے ہی منسوب کرتے ہیں جالانکہ رباعیات میر انیس میں یہ رباعی کہیں نہیں ہے۔ کچھ حضرات لاعلمی کے باعث اسے ناسخ سے بھی منسوب کرتے ہیں مگر یہ بھی درست نہیں ہے۔

یہ رباعی اپنی اصل شکل میں بلا اختلاف رائے، مولا بخش قلق کی ہے۔ آپ کا پورا نام حکیم مولا علی بخش اور تخلص قلق تھا۔ آپ کی ولادت 1833ء میرٹھ ہے۔ آپ حکیم مومن خان مومن کے شاگرد تھے اور آپ بطور خدمتِ خلق مریضوں کا مفت علاج بھی کرتے تھے، قلق کی تاریخ وفات میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے مگر 1880ء کو مستند مانا جاتا ہے۔

میرے ایک دوست نے اصغر گونڈوی سے منسوب ایک واقعے کے بارے میں بارے میں پوچھا ہے کہ کیا یہ بات صحیح ہے؟ تو جناب شادی والی بات بالکل درست ہے۔ مگر اس کی تفصیل لکھنے کے لیے مجھے الگ مضمون لکھنا ہوگا لہٰذا مختصراً لکھ دیتا ہوں۔

اصغر گونڈوی کا پورا نام سید اصغر حسین تھا اور آپ یکم مارچ 1884ء کو گورکھپور میں پیدا ہوئے، وجد بلگرامی اور تسلیم لکھنوی آپ کے استادوں میں سے تھے۔ آپ کا انتقال 30 نومبر 1936ء کو الہ آباد میں ہوا۔

اصغر گونڈوی کے کئی ایک ہونہار شاگردوں میں سے ایک شاگرد جگر مراد آبادی بھی تھے جن کا اصل نام علی سکندر تھا۔ جگر صاحب کی اہلیہ بہت خوب صورت خاتون تھیں اور ان کی آواز بھی بہت دلنشین تھی۔ وہ اکثر اپنے شوہر یعنی جگر صاحب کی غزلیں ترنم سے گنگناتی رہتی تھیں۔

ایک بار کئی دن تک جگر صاحب اپنے استاد اصغر گونڈوی کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تو استاد کو کچھ تشویش ہوئی کہ نہ جانے کیا بات ہے اور جگر کس حال میں ہے...... یہ سوچتے ہوئے آپ جگر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑے اور جگر صاحب کے در پر پہنچ کر آواز دی تو اندر سے کسی خاتون کی آواز آئی کہ جگر گھر پر نہیں ہیں۔ اصغر گونڈوی خاتون کی آواز سن کر کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہے پھر واپس اپنے گھر کی جانب چل پڑے۔

بعد میں جب جگر صاحب کو علم ہوا کہ استاد گھر پر آئے تھے فوری استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ استاد بالکل گم صم بیٹھے ہیں، جگر صاحب کچھ دیر استاد کی خدمت میں رہ کر واپس گھر آگئے۔ چند روز بعد پھر استاد کے پاس گئے تو دیکھا کہ استاد ویسے ہی گم صم اور کھوئے کھوئے بیٹھے ہیں تو جگر صاحب سے اب کی بار رہا نہیں گیا دست بدستہ عرض کی۔ استاد محترم آپ کا اس طرح اداس اور گم صم رہنے کا سبب کیا ہے؟ برائے کرم بتایئے آپ کا یہ شاگرد وعدہ کرتا ہے، جو کچھ بھی ہو آپ کا مسئلہ ضرور حل کروں گا۔ اپنے شاگرد کی بات سن کر اصغر گونڈوی کو کچھ ہمت ہوئی اور گویا ہوئے۔

''جگر چند روز قبل جب میں تمہارے گھر آیا تھا اور تمہیں آواز دی تھی تو اندر سے آواز آئی تھی۔ جگر گھر پر نہیں ہیں، بس جس دن سے میں نے وہ آواز سنی ہے اس کے سحر میں مبتلا ہوں جس عورت کی آواز ایسی خوب اور سریلی ہے وہ عورت کتنی خوب صورت ہوگی، میں اسی دن سے اسی سوچ میں ہوں۔ جگر مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے بس تم مجھے ایک بار اس عورت سے ملا دو۔'' استاد کی بات سن کر جگر صاحب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ فوری وہاں سے اٹھے اور چلتے چلتے کہنے لگے استاد محترم آپ نے جس عورت کی آواز سنی تھی وہ میری بیوی ہے بس یہ کہا اور گھر چلے گئے۔ چند روز خاموشی سے گزر گئے۔ آخر کار جگر صاحب سے رہا نہیں گیا ایک روز صبح سویرے سارا قصہ اپنی بیوی کو سنایا اور اسی وقت طلاق دے دی۔ پھر اہلیہ کو تیار کر کے استاد اصغر گونڈوی کے گھر پر حاضر ہوئے اور کہا استاد یہ عورت ہے جس کے عشق میں آپ مبتلا ہو گئے ہیں۔ یہ پہلے میری بیوی تھی مگر آج میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ اب آپ اسے اپنے نکاح میں قبول کر لیجیے۔ عدت کے بعد قاضی کو بلوایا گیا اور اصغر گونڈوی کا نکاح اس خاتون (جگر صاحب کی بیوی) سے پڑھوا دیا گیا۔ اب گم صم ہونے کی باری جگر مراد آبادی کی تھی۔

اصغر گونڈوی کی موت کے بعد جگر صاحب نے اصغر گونڈوی کی بیوہ یعنی اپنی سابقہ بیوی سے پھر رجوع کیا اور اپنی ہی بیوی سے دوسری بار شادی کر لی۔

قارئین ایسے عاشق مزاج استاد تو آج بھی ہزاروں ہیں مگر ایسے فرمانبردار شاگرد اب کہاں ہیں؟ اور کیا شاگرد کو ایسی فرمانبرداری کرنی تھی یا نہیں؟

☆☆☆

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
جو ہم اٹھ کر چلے آئے تو ویرانے پہ کیا گزری

موزوں سے منسوب ہے، یہ شعر موزوں نے نواب سراج الدولہ کے قتل کی خبر سن کر فی البدیہ کہا تھا، موزوں کا اصل نام مہاراجا رام نرائن تھا۔ آپ کشن پور (مرشد آباد) کے رہنے والے تھے اور شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے۔ آپ کے زیادہ تر اشعار فارسی میں ہیں آپ پٹنہ کے گورنر بھی تھے اور نواب سراج الدولہ کے دوست، دربار سے بھی وابستہ تھے ایک الزام میں آپ کو خطاوار پایا گیا تو نواب میر محمد قاسم

کے حکم پر آپ کے جسم پر پتھر باندھ کر 1763ء میں آپ کو دریا گنگا میں زندہ غرق کر دیا گیا۔

☆☆☆

وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

یہ شعر نواب غلام احمد خاں احمدی سے منسوب ہے جو ضلع کنج پورہ کرنال کے رہنے والے تھے اور ریاست گوالیار کے ممبر کونسل تھے۔ یہ شعر ان سے منسوب کرنے والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ غلام احمدی اکثر محفلوں میں یہ شعر پڑھتے تھے لہٰذا یہ شعر ان ہی کا ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

یہ شعر جگن ناتھ آزاد کے والد تلوک چند محروم کی تخلیق ہے اور ان کی ایک نظم ''عقدۂ مشکل'' کے آخری بند کا حصہ ہے جو کچھ یوں ہے

ہے کارِ اہم شکر ترا ہو نہیں سکتا
بندوں سے یہ ہرگز ادا ہو نہیں سکتا
کوئی بھی یہاں عہدہ برا ہو نہیں سکتا
یہ شعر یہیں پر تو بجا ہو نہیں سکتا
وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

مزید دیکھیے تلوک چند محروم ''نیرنگ معانی'' مکتبہ جامعہ، دہلی۔

☆☆☆

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

یہ شعر پنڈت دیا شنکر نسیم سے منسوب ہے مگر ان کا نہیں ہے، بلکہ دیا شنکر نسیم کا زبان زد عام شعر یہ ہے

لائے اُس بُت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

اس کے علاوہ یہ وجد بلگرامی سے بھی منسوب ہے مگر ان کا بھی نہیں ہے اور نہ ہی کلیات وجد میں کہیں درج ہے۔ حال ہی میں میری ملاقات ایک معروف شاعر سے ہوئی تو انہوں نے بھی شعر مجھے حیات امروہوی کا نام لے کر سنایا تو میں نے عرض کیا جناب یہ شعر حیات امروہوی کا نہیں ہے بلکہ حیات کا مقبول عام شعر یہ ہے

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے
بج رہا ہے اور بے آواز ہے

تو وہ موصوف جو اپنے آپ کو ادب کا محقق بھی کہتے ہیں بحث کرنے لگ گئے مگر نہ کوئی دلیل نہ کوئی ادبی حوالہ، نہ کسی کتاب کا نام! کوئی کرے بھی تو کیا کرے والا معاملہ، یہ شعر 'تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں' صرف اور صرف جوہر فرخ آبادی کی فنی تخلیق ہے۔ ان کا پورا نام لالا مادھورام تھا۔ آپ فرخ آباد، یوپی کے رہنے والے تھے۔ اور منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے آخری زمانے میں آپ کے لیے مختارِ شاہی بھی تجویز ہوا تھا۔ لالا مادھورام جوہر کا ایک اور شعر بھی مقبول عام ہے مگر لوگ اسے بھی انور دہلوی کے نام سے، منسوب کرتے ہیں جب کہ انور دہلوی کا مشہور شعر یہ ہے

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے
پسینا پوچھیے اپنی جبیں سے

اور یہ شعر لالا مادھورام جوہر کا ہے

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینا گلاب تھا

جوہر کی تاریخ وفات 1889ء ہے۔

☆☆☆

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد
سرخ رو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد

یہ شعر داغ سے منسوب ہے مگر داغ کا نہیں ہے۔ اکثر حضرات اس شعر کو اکبر الہ آبادی سے بھی منسوب کرتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔ کیوں کہ کسی بھی کلیات اکبر الہ آبادی یا کسی بھی معتبر کلام اکبر الہ آبادی میں یہ شعر کہیں نہیں ہے۔ شفیق الرحمٰن نے اپنی کتاب شعروں کی ڈکشنری میں اس شعر کو امیر مینائی کے نام لکھا ہے مگر یہ درست نہیں ہے۔ یہ شعر وحشت لکھنوی کا ہے جو کلکتہ کے رہنے والے تھے مگر بعد میں ڈھاکا منتقل ہو گئے اور وہیں پر وفات پائی۔

☆☆☆

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اس نے کہا تھا
کیا اس نے کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں ہے

یہ خوب صورت شعر مزاج کا ہے جن کا اصل نام نثار احمد اور پورا نام، نواب نثار یار جنگ بہادر تھا۔ آپ علی گڑھ میں پیدا ہوئے مگر تلاش روزگار کے سلسلے میں بمبئی منتقل ہو گئے مگر جب یہاں بھی کچھ نہ ہو سکا تو حیدر آباد دکن چلے گئے پھر یہیں کے ہو رہے بعد میں یہیں کلکٹر کے عہدے پر بھی

فائز رہے۔ مزاج، داغ دہلوی کے شاگردوں میں سے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد آپ کراچی پاکستان چلے گئے اور کراچی میں ہی 1951ء میں انتقال کر گئے۔

معروف ڈراما نویس اور ٹی وی کمپیئر انور مقصود، فاطمہ ثریا بجیا اور لندن میں مقیم معروف غزل گو شاعرہ، زہرہ نگاہ، مزاج کی ہی اولادیں ہیں۔

☆☆☆

آدمی بلبلہ ہے پانی کا
کیا بھروسا ہے زندگانی کا

یہ شعر بھی کئی شاعروں سے منسوب ہے جس میں شعرائے قدیم بھی ہیں اور جدید بھی مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ موجودہ دور کے ایک معروف شاعر بھی اس شعر کے خالق ہونے کے دعویدار ہیں۔ ان کا نام لکھنا اس لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ماشاء اللہ ابھی بقید حیات ہیں اور اللہ ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ ان کا ہے جیسا کہ یہ ہر محفل میں کہہ رہے ہیں تو پھر ان کے کسی بھی شعری مجموعے میں یہ شعر کیوں نہیں ہے اور خیر سے اب تو ان کا انتخاب کلام بھی آگیا ہے اور اس میں بھی یہ شعر کہیں نہیں ہے، کیوں؟ راقم نے بہت مشکل سے ان صاحب سے جو اس شعر کے خالق ہونے کے دعویدار ہیں فون پر رابطہ کیا اور اس شعر کے بارے میں پوچھا تو وہ سخت برہم ہو گئے اور کہنے لگے۔ ذرہ صاحب آپ کی ہمت کیسے ہوئی یہ پوچھنے کی کہ یہ میرا ہے کہ نہیں؟ کیا آپ جانتے نہیں کہ اردو ادب میں میرا کیا مقام ہے؟ میں نے فوری خدا حافظ کہا اور فون رکھ دیا۔ کیونکہ سمجھ گیا تھا کہ انہوں نے ادب میں یہ مقام کیسے اور کہاں سے بنایا ہے۔

ابھی چند روز قبل ہی راقم کو امریکا میں ہی مقیم ایک معروف شاعر سرور راز صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے کہ ذرہ صاحب مجھے ایک نئے شاعر نے اپنا غیر مطبوعہ شعری مجموعہ تبصرے کے لیے بھیجا ہے میں اس کا مطالعہ کر رہا تھا تاکہ اس پر کچھ لکھ سکوں اور یہ مجموعہ شائع ہو جائے تو اچانک ایک غزل پر نظر پڑی جس میں مطلع یہ ہے ''آدمی بلبلہ ہے پانی کا'' تو مجھے شک گزرا کہ یہ شعر ان کا نہیں ہے کیوں میرا خیال ہے کہ یہ شعر بہت قدیم ہے۔ اگر ہو سکے تو برائے کرم اس شعر کی کچھ تفصیل بھیج دیجیے۔ میں نے انہیں کچھ معلومات جو اس ناچیز کے پاس تھی دیں اور فوراً کہ کر سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیسے کیسے غیر ادبی تماشے ادب میں ہو رہے ہیں۔

آئیے دیکھتے ہیں اس شعر کی حقیقت کیا ہے! یہ شعر ''آدمی بلبلہ ہے پانی کا'' رضا تھانسیری کی تخلیق ہے۔ آپ کا پورا نام مولانا عبدالرضا تھا۔ آپ معروف عالم دین حضرت امام بخش تھانسیری کے مرید خاص تھے اور پوری زندگی آپ نے امام بخش تھانسیری کی خدمت میں وقف کردی۔ یہ شعر ''مجموعہ نغز'' جلد دوم، میر قدرت اللہ قاسم مرتبہ محمود شیرانی، مطبوعہ نیشنل اکیڈی دہلی 1973ء صفحہ نمبر 387 پر اپنی اصل شکل میں موجود ہے اس کے علاوہ یہ ہی شعر تبدیل شدہ شکل میں امیر مینائی سے بھی منسوب ہے جو اس طرح ہے۔

زیست کا اعتبار کیا ہے امیر
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

دیکھیے ''غیرت بہارستان'' مع انتخاب کلام، امیر مینائی۔

یہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے محمد رضا خان برق کے ایک مشہور زمانہ شعر کا ہے۔

اے صنم! وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

دیکھیے دیوان محمد رضا خان برق محولہ بالا صفحہ نمبر 326۔

اب یہ ہی شعر تبدیل شدہ شکل میں آغا حشر کاشمیری سے بھی منسوب ہے اور زیادہ مشہور بھی۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

چونکہ مصرع ثانی محمد رضا خان برق کا ہے تو عین ممکن ہے کہ آغا صاحب جو ڈراما نگاری کے علاوہ گرہ لگانے میں بھی کافی شہرت رکھتے ہیں، نے اپنے کسی ڈرامے میں موقع کی مناسبت سے مصرع ثانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے مصرع اول کہا ہو، رضا خان برق کی تاریخ ولادت 1790ء لکھنو ہے اور تاریخ وفات 18 اکتوبر 1857ء لکھنو ہے۔ جب کہ آغا حشر کاشمیری کی تاریخ ولادت 13 اپریل 1879ء امرتسر اور تاریخ وفات 28 اپریل 1935ء لاہور ہے۔ اب اس بات سے صاف معلوم ہو جاتا ہے یہ شعر اصل شکل میں محمد رضا خان برق کا ہی ہے آغا حشر کا نہیں۔

ساہیوال

ایاز راہی

وطن عزیز کا یہ خطہ انسانی تہذیب کے ارتقائی دور کا امین ہے اسی خطے میں دنیا کی اولین تہذیب نے انگڑائی لی ، یہ خطہ سیاحوں کے لیے کشش کا باعث ہے لیکن ہم اس کی بھرپور تشہیر نہیں کرتے کہ غیر ملکیوں کو اسکی اہمیت کا اندازہ ہو سکے ، ہم صرف اتنا ہی کہہ کر مطمئین ہو جاتے ہیں کہ پہلے یہ منٹگمری تھا اب ساہیوال ہے۔

وہ شہر جو دنیا کی قدیم ترین آبادی کا گہوارہ کہلایا

ہم آپ جس خطہ زمین کو اپنا وطن کہتے ہیں کیا آپ نے غور کیا ہے کہ وہ کن کن اقسام کی دولت سے مالا مال ہے؟ یہ دھرتی، یہ امبر، یہ وادیاں، یہ آبشار عظیم تر ہے کبھی آپ غور کر کے دیکھیں۔ اِس جہانِ رنگ و بُو میں ارضِ پاکستان ہر لحاظ سے ایک منفرد، بھرپور اور زرخیز تاریخی دھرتی ثابت ہو گی کیونکہ زرعی پیداوار، معدنیات موسم، صنعت وتجارت نیز دیگر تمام شعبہ ہائے زندگی کی رنگینیاں یہاں بہ خوبی دیکھی جا سکتی ہیں، یہی نہیں شہروں کی قدامت اور تہذیبی رچاوٹ بھی انسانی

تاریخ کا زریں باب ہے۔ اس کے ارفع و اعلیٰ ہونے کے فن میں اس قلمی نشست میں پاکستان کے مشہور شہر ساہیوال (پنجاب) کا کچھ ذکر مقصود ہے جو بھرپور ماضی کے ساتھ ساتھ حال کی جدت بھی لیے ہوئے ہے۔

ساہیوال ہزاروں برس پرانی تہذیب (ہڑپہ) کا امین شہر ہے۔ نہ صرف امین بلکہ امن کا گہوارہ بھی ہے۔

امن و سلامتی جو ہر انسان کی بنیادی ضرورت اور خواہش ہوتی ہے جس کے لیے وہ ہر طرح کی تگ و دو کرتا ہے۔ ابتدائی انسان جنگلوں اور غاروں کا باسی تھا۔ اس نے غاروں میں رہتے ہوئے صدیاں گزار دیں، پھر وہ ترقی کی شاہراہ کی جانب بڑھا۔ جنگل اور غاروں سے نکلا تو پہلے اس نے گروہ کی صورت میں رہنا اور سفری زندگی یعنی خانہ بہ دوشی اختیار کی۔ جانور پالنا، اُن کے گوشت، دودھ اور کھال سے جینے کا سامان کرنا، اس کا مشغلہ ٹھہرا۔

پالتو مویشیوں کے لیے نت نئی چراگاہوں کی تلاش اُسے جگہ جگہ لیے پھرتی رہیں۔ کھلے آسمان تلے خشکی کا چوتھائی حصہ اُس کی جولان گاہ بنا۔ رفتہ رفتہ جب انسان نے سفری زندگی (خانہ بہ دوشی) سے ہاتھ اُٹھا کر حضری زندگی یعنی ایک جگہ جم کر رہنا اپنایا تو مکان بستی اور پھر شہروں کا وجود خالی زمین پر ابھرنے لگا لیکن اس شہری زندگی تک پہنچنے میں انسان کو ہزاروں برس لگے اور پھر دنیا کی اوّلین آبادی شہر ہڑپہ (ساہیوال۔ پنجاب) نیز موہن جو دڑو (مردوں کا شہر۔ مویاں دی ڈھیری) نے دھرتی پہ جنم لیا۔

ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق ہڑپہ، موہن جو داڑو سے زیادہ پرانی آبادی ہے۔ گویا اس کرۂ ارض پہ بسنے والی اوّلین بستی ہے۔ یہ بستی یعنی ہڑپہ کے کھنڈرات موجودہ شہر ساہیوال کے جنوب میں چوبیس کلومیٹر کی دوری پہ واقع ہیں۔ اب تک کی تحقیق کی رُو سے انسانی تہذیب و تمدن کی ابتدا ہڑپہ سے ہی ہوئی ہے۔

آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کا ذکر ہے جب انسان نے پہلے پہل تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی، مل جل کر رہنا سیکھا، آزاد زندگی کو اُصول و ضوابط کے تابع کیا، لین دین کا کاروبار چلایا، خوشی و غمی کے مشترکہ اظہار نے رواج پایا، زندگی میں سلیقہ در آیا۔ یہ سب اسی سرزمین کی مرہونِ منت ہے۔ یعنی ہڑپہ نے ہی انسان کو انسانیت کا سبق پڑھایا۔

ہڑپہ کی تہذیب کو عموماً پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (1) قبل از ہڑپائی دور۔ 3500 قبل از مسیح (2) ابتدائی ہڑپائی دور۔ 3200 ق م تا 2500 ق م (3) عروج یافتہ ہڑپائی دور۔ 2500 ق م تا 2000 ق م (4) متاخر ہڑپائی دور۔ 1900 ق م تا 1500 ق م (5) بعد از ہڑپائی دور یا غیر ہڑپائی دور۔ (1200 ق م تا 1000 ق م)۔

1970-73ء میں ڈاکٹر محمد رفیق مُغل نے انقلابی تحقیق کی جس کی بہ دولت علمی دنیا ایک واضح نتیجے پر پہنچ گئی کہ یہ تینوں ادوار انسان کی ترقی کی ابتدائی سیڑھیاں ہیں۔ انہی ادوار میں معاشرت نے جنم لیا۔ ڈاکٹر مُغل نے تین ادوار (قبل از ہڑپائی دور، ابتدائی ہڑپائی دور اور ترقیاتی ہڑپائی دور) کو ترجیح دی ہے۔ یعنی 3500 ق م تا 2000 ق م۔ ٹھوس دلائل پر مبنی یہ گہری تحقیق مشرق و مغرب دونوں سے اپنا لوہا منوا گئی ہے ڈاکٹر مُغل نے ان تینوں ہڑپائی ادوار کے ربط و تسلسل میں ثبوت فراہم کیے ہیں۔ ملتان کے محترم ابنِ حنیف نے اپنی گراں قدر تصنیف۔ سات دریاؤں کی سرزمین (مطبوعہ 1987 عیسوی) میں ہڑپہ نام کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں ایک اور شہر۔ ہری یُو پیا (ہری یُو پی یا) تھا جس کا ذکر رِگ وید کی چھٹی کتاب کے ستائیسویں گیت میں آیا ہے۔ ہری یُو پیا۔ کے لفظی معنی ہیں۔ سنہری طلائی قربان گاہیں۔ رِگ وید کا یہ ہری یُو پی یا دراصل وہی عظیم الشان شہر تھا جس کے ہزاروں برس قدیم تباہ شدہ کھنڈر اور پاس ہی آباد نئے قصبے کا نام آج بھی ہڑپہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ساہیوال سے کوئی سولہ میل کے فاصلے پر آباد موجودہ ہڑپہ کا ہی نام رِگ وید کے دور میں ہری یُو پیا (ہری یُو پی یا) تھا۔

ہڑپہ اک مستقل اور ہمہ گیر موضوع ہے جس کا ذکر بار بار ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ آنے والے ادوار میں اس شہر کے خدوخال اور خصوصیات مزید سامنے آتی جائیں گی۔ تحقیق کا دائرہ جوں جوں وسیع ہوتا جائے گا ہڑپہ کی اہمیت بڑھتی جائے گی۔ اہل ساہیوال اپنے اس نایاب تہذیبی ورثے اور تمدنی سرمائے پر جتنا بھی اترائیں کم ہے کہ یہ خزانہ دنیا میں کہیں اور نہیں پایا جاتا۔

مقدونیہ (یونان) کا سکندر اعظم (20-21 جولائی 356 قبل از مسیح تا 10-11 جون 323 ق م)۔ ساہیوال کے ہی ایک جنگ جو قبیلے کے ہاتھوں زخمی ہوا اور پھر راہی ملک عدم ہوا چناں چہ یہ واقعہ اس خطے کا اختصاص ہے۔

اس دھرتی پر اسلام کی روشنی بارھویں صدی عیسوی میں پھیلی جب حضرت بابا فرید شکر گنج (1173 عیسوی تا 1235

عیسوی) نے اجودھن تم پاک پتن شریف کو مرکز بنا کر اسلام کی تبلیغ کی اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو توحید و رسالت پر یکجا کیا۔

پاک پتن شریف ابتدا میں ضلع ساہیوال کی تحصیل تھی لیکن پھر جوں جوں آبادی کا دباؤ بڑھتا گیا انتظامی ڈھانچے میں تبدیلیاں آتی گئیں اور ضلع ساہیوال محدود ہوتا چلا گیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے نصف بعد (1857 عیسوی) میں انگریزی اقتدار کے خلاف آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو ساہیوال کے ایک نام ور دلیر سپوت رائے احمد نواز خان کھرل (شہادت ستمبر اٹھارہ سو اٹھاون عیسوی) نے اپنے ساتھیوں سمیت آزادی کے لیے مردانہ وار جنگ لڑی۔ جنرل منٹگمری کے کمانڈر اور اسسٹنٹ کمشنر ساہیوال مسٹر برکلے کو بار بار شکست دی بالآخر برکلے کو موت کے گھاٹ اتار کر رائے احمد نواز خان کھرل نے خود بھی جام شہادت نوش کیا۔ کمانڈر برکلے کی قبر آج بھی سینٹ فرانسس چرچ (ساہیوال) میں موجود ہے۔ اس جنگ کے حریت پسندوں کو جہاں پھانسی دی گئی وہاں آج یادگار ساہیوال اس واقعہ کی گواہی کے لیے موجود ہے جو 1967 عیسوی میں معرف سماجی شخصیت مفتی ضیاء الحسن نے تعمیر کرائی۔ آپ ٹرین یا بس۔ جس ذریعے سے بھی آ کر ساہیوال شہر میں داخل ہوں۔ یادگار ساہیوال آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوگی، اس پیغام کے ساتھ کہ ان شہیدوں نے اپنا آج آپ کے کل کے لیے قربان کر دیا ہے۔

رائے احمد نواز خان کھرل پر پی ٹی وی ایک سیریل بھی بنا چکا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے ساہیوال کا نام اپنے جنرل سے منسوب کر کے منٹگمری رکھ دیا۔ 1966 عیسوی میں اس وقت کے پاکستانی ڈپٹی کمشنر مظفر قادر نے حکومت سے منظوری لی اور یہاں کی قدیم بہادر قوم ”ساہو“ کی نسبت سے ساہیوال نام رکھ دیا۔ ساہیوال مردم خیز خطہ ہے۔ منیر نیازی۔ مجید امجد۔ بشیر احمد بشیر (فلم ساز) مجیب الرحمٰن شامی۔ نذیر ناجی (صحافی) اور طارق عزیز (نیلام گھر) اسی خطے کے فرزند ہیں منیر نیازی اپنا ادبی جریدہ سات رنگ یہیں سے نکالتے رہے اسی طرح ساہیوال نسل کی گائے بڑی مشہور ہے جو روزانہ تقریباً چالیس لیٹرز دودھ دیتی ہے ساہیوال اب ڈویژن بن چکا ہے یہاں میڈیکل کالج کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے نیز بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی کا کیمپس بھی عمل پذیر ہے۔ جدید ساہیوال اور ہڑپہ کھنڈرات و عجائب گھر۔ جدید و قدیم عہد کا حسین امتزاج ہیں۔

بپتسمہ Baptism

عیسائیوں کی ایک مذہبی رسم جس میں عیسائیت میں داخل ہونے والے نئے آدمی یا نو مولود پر مقدس پانی چھڑک کر باقاعدہ عیسائیت میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہ رسم گرجوں میں ادا کی جاتی ہے۔ بعض گرجوں میں عیسائیوں کو اس وقت بپتسمہ دیا جاتا ہے جب وہ جوان ہو جائیں۔

مرسلہ: شاہینہ چودھری۔ لاہور

نکولس مرے بٹلر

Nicholas Murray, Butler

(1862ء۔1947ء)

امریکی ماہر تعلیم۔ 1882ء میں کولمبیا کالج سے فلسفے میں بی اے کیا۔ دو سال بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ برلن اور پیرس میں مزید تعلیم حاصل کی۔ پانچ سال بعد کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفے کا پروفیسر اور 1902ء میں اسی یونیورسٹی کا صدر منتخب ہوا۔ 44 سالہ عہد صدارت میں کولمبیا یونیورسٹی کو دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی امن میں بھی گہری دلچسپی لی۔ اس صلے میں 1931ء میں امن کا نوبیل پرائز کا آدھا حصہ حاصل کیا۔ صدر میکنلی سے لے کر صدر ٹرومین تک امریکا کے نو صدور نے اس سے خط و کتابت کی۔ اس نے یہ تمام مکاتیب سترہ جلدوں میں مرتب کر کے کولمبیا یونیورسٹی لائبریری کو پیش کیے۔ اسے ملکی و غیر ملکی یونیورسٹیوں کی طرف سے 37 اعزازی ڈگریاں دی گئیں اور پندرہ حکومتوں نے اعزازی تمغے دیے۔ دنیا کی پچاس سے زیادہ علمی انجمنوں کا اعزازی رکن تھا۔ 1934ء تک اس کے تین ہزار سے زیادہ خطبے۔ رودادیں اور تحقیقی مضامین شائع ہو چکے تھے۔

مرسلہ: زہیب شاہ۔ پاراچنار

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر 101

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب ...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زردسکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زردسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زردسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لےکر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لےکر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا بائی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ”شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔“ ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچادیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکلافون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ”کنور ہوشیار“ ”سادی کو لےکر چیمبر......“ مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنادیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کردیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کرکے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جاکر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کرکے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شا کے گلے

لگ کر کہا" پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شانے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم آگے چلے جا رہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ تبتی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے کنپٹی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے ترنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیر لب کہا" اعلانِ جنگ" میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔

(اب آگے پڑھیں)

مجھے جکڑنے والے تین سپاہی تھے اور میں چاہتا تو خود کو چھڑا سکتا تھا مگر میں نے ایسی کسی کوشش سے گریز کیا اور سومرو کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"اسے چھوڑ دو۔" سامیرا نے کہا مگر اس کا انداز تحکمانہ نہیں بلکہ التجا آمیز تھا۔ سومرو نے سامیرا کی طرف دیکھا۔ میری اس سے گفتگو روبیر کے توسط سے ہو رہی تھی۔

"آپ جانتی ہیں یہ دونوں قانون شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ان کا فیصلہ اب عدالت کرے گی۔"

"کیسی قانون شکنی؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہم مصیبت سے بچ کر آ رہے ہیں۔ تم نے کل سے ہمیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اور جب ہم آئے تو قانون شکن کہہ رہے ہو۔"

"تم دونوں پوری رات غائب رہے۔" سومرو نے میری اور روبیر کی طرف اشارہ کیا۔ "ہمارے قانون میں یہ جرم ہے کہ ایسے مرد و عورت جن کا آپس میں کوئی رشتہ نہ ہو رات بھر غائب رہیں۔ ان کو سزا دی جاتی ہے۔"

میرے علم میں پہلی بار یہ قانون آیا تھا اور بہ ظاہر ٹھیک ہی تھا مگر ہم اس کے غلط شکار تھے۔ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔ "ہم جنوبی سمت پائی جانے والی چٹانوں میں پھنس گئے تھے۔ وہاں اسمار نے ہمیں گھیر لیا تھا اور پھر ہارن بھی آ گیا۔ ان کی آپس کی لڑائی سے فائدہ اٹھا کر ہم وہاں سے نکل بھاگے۔"

"یہ اگر سچی کہانی ہے تب بھی تم عدالت میں سنانا۔" سومرو نے کہا اور سپاہیوں کو بولا۔ "انہیں لے جاؤ۔"

"میری بات سنو۔" میں نے بپھر کر خود کو جھٹکے سے ان تینوں سے چھڑا لیا۔ "تم یوں مجھ پر اپنا قانون نہیں ٹھونس سکتے۔ میں یہاں کا باشندہ نہیں ہوں۔"

پیچھے ہٹتے ہی سپاہیوں نے اپنے تیز ے مجھ پر تان لیے تھے۔ سومرو نے کہا۔ "تم نے یہاں کے حکمران کا عہدہ قبول کیا اس لیے اب تم پر یہاں کا قانون لاگو ہوتا ہے۔"

میرا دماغ ایسا گھوما کہ میں سپاہیوں کی پروا کیے بغیر سومرو کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ سامیرا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آنکھوں سے مجھے منع کر رہی تھی کہ میں کوئی جذباتی قدم نہ اٹھاؤں۔ میں نے سومرو کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کی کیا حیثیت ہے جو یہ مجھے قید کرنے کا حکم دے رہا ہے۔"

"تم قانون شکن ہونے کی وجہ سے اب یہاں کے حکمران نہیں رہے ہو۔" سومرو نے واضح کیا۔ "تمہارے نائب کی حیثیت سے میں یہاں کا سربراہ ہوں۔ اب جب تک تم اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر دیتے یا یہاں کے لوگ کسی دوسرے فرد کو حکمران نہیں چن لیتے میں ہی یہاں کا سربراہ سمجھا جاؤں گا۔ البتہ تم بے گناہ ثابت ہوئے تو اپنے عہدے پر بحال ہو جاؤ گے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہاں بھی عدالت

اور قانون میرے ہی پیچھے تھے اور صحیح معنوں میں قانون شکنی کر رہے تھے ان کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے اگر یہ قانون ہے تو میں اس کی پاسداری کرتا ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی۔''

''یہاں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی ہے۔'' سامیرا نے یوں کہا جیسے مجھے اطمینان دلا رہی ہو کہ میرے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ کچھ دیر بعد میں اور روبیر سپاہیوں کے نرغے میں قلعے کے قید خانے کی طرف جا رہے تھے۔ حالات یوں پلٹا کھائیں گے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ قید خانہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور فی الحال یہاں کوئی اور قیدی بھی نہیں تھا۔ مجھے اور روبیر کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا اور یہ آمنے سامنے تھیں۔ اب بھی مجھے لگ رہا تھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد میں نے روبیر سے کہا۔

''تم نے مجھے خبردار نہیں کیا کہ یہاں ایسا بھی کوئی قانون ہے۔''

''ہم تو مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔ ''مجھے خیال نہیں آیا کہ یہ ہم پر اس طرح کا الزام لگا سکتے ہیں۔''

''یہ ساری رات غائب رہنے سے کیا مراد ہے؟''

''اگر مرد و عورت رات سے پہلے غائب ہو جائیں اور صبح روشنی ہونے تک نہ ملیں تو ان کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر انہیں اپنی بے گناہی ثابت کرنی پڑتی ہے۔''

میں چونکا۔ مجھے برف والے کا پیغام یاد آیا جو اس نے بچے کے توسط سے دیا تھا۔ اس نے مجھے شام کے بعد قلعے سے باہر نہ جانے کا مشورہ دیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں کسی وجہ سے نہ آسکوں تب بھی صبح روشنی ہونے سے پہلے لازمی واپس آجاؤں۔ اس نے مجھے ایسی ہی کسی صورتِ حال سے بچنے کے لیے یہ پیغام دیا تھا؟ یقیناً یہی بات تھی۔ برف والا مستقبل میں جھانک لیتا تھا اور شاید اسے علم تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ مگر یہاں کیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہوگا۔ سومرو نے قانون کو بے لچک انداز میں استعمال کیا تھا اس نے مجھے اپنے یا سامیرا کے سامنے صفائی کا موقع دیے بغیر مجھے عدالت کے سامنے کر دیا تھا۔ اب مجھے وہاں اپنی صفائی پیش کرنی تھی۔ مجھے خیال آیا اور میں نے روبیر سے پوچھا۔ ''اس طرح سے غائب ہونے والے مرد اور عورت اگر اپنی صفائی نہ پیش کر سکیں تو انہیں کیا سزا دی جاتی ہے؟''

''اگر ان میں سے کوئی شادی شدہ ہے تو اسے سزائے موت دی جاتی ہے اور اگر غیر شادی شدہ ہو تو اسے آبادی سے نکال دیا جاتا ہے۔''

میں حیران ہوا۔ ''تمہارا مطلب ہے قلعوں سے نکال دیا جاتا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہ باہر رہتا ہے۔ اسے نہ کھانا دیا جاتا ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز، اگر کوئی اس سے تعلق رکھے تو اسے بھی یہی سزا دی جاتی ہے۔ نکالتے ہوئے اس سے ہر چیز لے لی جاتی ہے۔''

حرام کاری کی یہ درست سزا تھی مگر ہمارے لیے غلط تھی کیونکہ ہم نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ ''یہ کیسے طے کیا جاتا ہے کہ رات بھر باہر رہنے والے مرد و عورت نے آپس میں گناہ کا ارتکاب کیا ہے؟''

''انہیں ثابت کرنا پڑتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''مجھے اس بارے میں صحیح سے علم نہیں ہے۔''

ہم نے گزشتہ رات بہت سخت وقت گزارا تھا۔ ہمارے جسم تھکن سے ہی نہیں زخموں سے بھی چور تھے۔ روبیر مرجھائی ہوئی تھی میں نے اسے آرام کرنے کا کہا اور خود بھی قید خانے میں موجود بستر پر لیٹ گیا۔ بستر مٹی کے بنے چبوترے پر بچھا ہوا تھا۔ یہاں ایک مٹی کی مٹکی اور ایک کٹورا تھا۔ مٹکی میں پانی تھا۔ اب تک میں ششدر تھا۔ مگر جیسے جیسے مجھے یقین آرہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ معاملہ صرف قانون کے نفاذ کا نہیں ہے اس کے پیچھے کچھ اور بھی تھا۔ سومرو کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کے اندر میرے لیے ہمدردی نہیں ہے۔ وہ شروع سے مجھ سے کھنچا ہوا تھا۔ کیونکہ فوج کی سربراہی اس سے لے کر میرے سپرد کی گئی تھی۔ وہ میرے خلاف کینہ دل میں دبائے بیٹھا ہوا تھا اور شاید اب اسے موقع ملا تھا کہ وہ کینہ نکال سکے۔ اس نے سارا کام قانون کے دائرے میں رہ کر کیا تھا اس لیے سامیرا بھی میری ایک حد سے زیادہ حمایت نہیں کر سکتی تھی۔ سوال یہ تھا کہ اگر سومرو میں بدنیتی تھی تو وہ مجھے سزا دلوانے کی پوری کوشش کرے گا اور اس نے اس کے لیے یقیناً پہلے سے پلان سوچ رکھا ہوگا۔ وہ صرف قانون پر یہ معاملہ نہیں چھوڑے گا کہ وہ مجھے سزا دے۔

رات جب ہم اسمار اور پھر ہارن کے نرغے میں تھے اور موت کا سامنا کر رہے تھے تب بھی مجھے اتنی ٹینشن نہیں ہوئی تھی جتنی کہ اس وقت ہو رہی تھی۔ میں تھکن اور تکلیفوں سے چور تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں سامیرا کے گھر پہنچ کر بس

ناشتا کروں گا اور اس کے بعد سو جاؤں گا مگر میں یہاں قید خانے میں پڑا ہوا تھا۔ ناشتا بھی نہیں ملا تھا اور آرام وہ... بستر پر بھی آرام نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا جب مجھے غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو لیکن اس موقع پر میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ کچھ زیادہ ہی غیر متوقع ہو گیا تھا میرے ساتھ۔ قید خانے کا دروازہ کھلا تو میں چونکا۔ ایک نوجوان لڑکا ناشتے کی ٹرے اٹھائے اندر آیا اور اس نے ادب سے ٹرے بستر کے کنارے رکھی۔ ناشتے میں حسبِ معمول میٹھی کھیر نما چیز اور چائے تھی۔ لڑکے نے مٹکی اور پیالہ اٹھایا اور باہر چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس سے سامیرا کو پیغام بھجواؤں کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

کچھ دیر بعد وہ آیا تو دونوں چیزیں دھو کر ان میں تازہ پانی بھر لایا تھا۔ میں نے سامیرا کا نام لے کر اسے اشاروں میں سمجھایا کہ میں سامیرا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے سر ہلا کر اشارہ دیا کہ وہ اسے بتا دے گا۔ جب تک لڑکا یہاں رہا دو مسلح سپاہی باہر مستعد رہے تھے۔ اس کے جاتے ہی دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ میں تن بہ تقدیر ہو کر ناشتا کرنے لگا کہ بھوکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کھیر خاصی مقدار میں تھی میرا پیٹ تقریباً بھر گیا۔ رفع حاجت والے کام میں باہر ہی نمٹا چکا تھا اس لیے ناشتا کر کے لیٹ گیا۔ تھکن حاوی آئی تو سو گیا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں سو سکا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے مجھے چونکایا۔ اندر آنے والی سامیرا تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟ کیا سومرو دشمنوں سے مل گیا ہے؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”سچی بات ہے کہ میرا دل نہیں مان رہا۔ اسے تم سے بغض ہو سکتا ہے کہ تم نے اس کی پوزیشن حاصل کر لی.....“

”میں نے اپنی مرضی سے حاصل نہیں کی۔“ میں نے سامیرا کی بات کاٹ کر کہا۔ ”یہ پوزیشن آپ نے مجھے دی تھی۔“

”ہاں لیکن سومرو سے لے کر تم کو دی۔ وہ میرے بہت پرانے ساتھیوں میں سے ہے۔“

”ممکن ہے اس پرانے ساتھی کا دماغ اس ”قدر دانی“ پر پھر گیا ہو جو میرے آنے کے بعد آپ نے اس کے ساتھ کی۔“

”ہو سکتا ہے۔“ سامیرا بولی۔ ”مگر تم اطمینان رکھو۔ تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہو گی اور جلد تم اپنے عہدے پر بحال ہو جاؤ گے۔“

”ہمارے غائب ہونے کے بعد کیا ہوا تھا؟“

”جب کل شام تک تم نظر نہیں آئے تو سیبوٹ نے مجھ سے رابطہ کیا۔ تم نے اس کے ذمے کوئی کام لگایا تھا وہ تمہیں اس کی رپورٹ دینا چاہتا تھا۔ مجھے فکر ہوئی اور میں نے تینوں قلعوں میں دکھوایا مگر تم اور روبیر کہیں نہیں تھے۔ پھر میں نے سپاہیوں کو آس پاس دیکھنے کو کہا۔ وہ زیادہ تر سامنے کھیتوں اور باغات میں دیکھتے رہے۔ اس وقت مجھے لگا کہ ریناٹ کی طرف سے کوئی سازش ہوئی ہے جو تم یوں غائب ہوئے ہو۔ سپاہی رات تک تلاش کرتے رہے اور تم دونوں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ رات کو جب سومرو کو پتا چلا تو اس نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ تم دونوں قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔“

”چٹانوں کی طرف کوئی نہیں گیا تھا؟“

”اتنی دور کا کسی کے ذہن میں نہیں آیا۔ سب کو معلوم ہے کہ اتنی دور جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”میری عقل پر پتھر پڑے تھے جو پتھروں کے چکر میں اتنی دور چلا گیا۔“

وہ چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

میں نے اسے بتایا کہ میں کس چکر میں چٹانوں تک چلا گیا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”تم فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اور اگر ایسا نہ ہو سکا۔“ میں نے غور سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

”میں نے سنا ہے یہاں آدمی کو اپنی بے گناہی خود ثابت کرنی پڑتی ہے اور میری بے گناہی کا ثبوت چٹانوں میں پائی جانے والی ہارن اور اسمار کی لاشیں ہوں گی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے ایک دستہ وہاں روانہ کیا تھا انہوں نے بھی یہی بتایا کہ وہاں ایک ادھ کھایا ہوا ہارن اور کچھ اسماروں کی لاشیں موجود ہیں۔“

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میری کہانی سچی ہے۔ میں اور روبیر بدقسمتی سے وہاں پھنس گئے تھے اور ہم نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔“

”مجھے یقین ہے میرے بیٹے۔“ سامیرا نے محبت سے کہا۔ ”میں تمہیں جانتی ہوں۔“

”اگر میرے خلاف سازش ہوئی ہے تو دشمنوں نے مجھے سزا دلانے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لیا ہو گا۔“

"ایسا نہیں ہوگا۔" اس نے مجھے اطمینان دلایا اور پھر ایک چھوٹی سی تنکوں سے بنی ٹوکری میری طرف بڑھائی۔ "اس میں تمہارے لیے کچھ چیزیں لائی ہوں۔"

ٹوکری میں میٹھی ٹکیاں اور کچھ پھل تھے۔ چند دنوں سے پھل بھی اترنا شروع ہوگئے تھے اور وہ انصاف سے تمام لوگوں میں بانٹ دیئے جاتے تھے۔ میں نے سامیرا کا شکریہ ادا کیا۔ "مجھے برف والے نے خبردار کیا تھا کہ شام کے بعد قلعے سے باہر نہ جاؤں اور اگر کسی وجہ سے چلا جاؤں تو روشنی ہونے سے پہلے واپس آجاؤں۔"

سامیرا تشویش زدہ ہوگئی۔ "برف والے نے خبردار کیا تھا۔"

"اس سے آپ اندازہ کرلیں کہ معاملہ گمبھیر ہے۔ یہ صرف قانون شکنی کا الزام نہیں ہے۔ اس کے پیچھے میرے دشمن ہیں اور آپ جانتی ہیں میرے دشمن کون ہیں۔ اس سازش کے سرے یہاں سے آرگون تک پھیلے ہوئے ہیں۔"

سامیرا سوچتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ "میں دیکھوں گی۔ اگر کوئی سازش بھی ہوئی تو میں اس کا مقابلہ کروں گی۔"

"ہمیں عدالت میں کب پیش کیا جائے گا؟"

"کل تک۔" اس نے جواب دیا۔

سامیرا کے جانے کے بعد میں دوبارہ لیٹ گیا۔ کچھ دیر پھلوں سے دل بہلاتا رہا پھر سونے کی کوشش کی اور مجھے اونگھ بھی آگئی۔ اسی دوران میں روبیر کی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ میں نے توجہ نہیں دی ممکن ہے اسے کوئی ضرورت ہو جس کی وجہ سے اسے کوٹھری سے نکالا گیا ہو۔ میں سوگیا تھا۔ دوسری بار میری آنکھ کھلی تو شام قریب تھی کیونکہ باہر روشنی کم ہوگئی تھی۔ کوٹھری میں ایک طرف روشن دان تھا جس سے باہر کا پتا چلتا رہتا تھا۔ کسی قدر آسمان (دھند) بھی نظر آتی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو روبیر اپنی کوٹھری میں تھی اور مجھے واش روم جانے کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کوٹھری کا دروازہ بجایا۔ وہی لڑکا آیا جو صبح ناشتا لے کر آیا تھا۔ میں نے روبیر کے توسط سے اسے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ وہ گیا اور دو سپاہیوں کو لے آیا۔ ان کی معیت میں میں قیدخانے کے گزارے لائق واش روم گیا۔

فارغ ہوکر میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ جہاں جہاں چوٹوں پر خون جم گیا تھا وہ جگہیں صاف کیں۔ زخم بھرنے والی پوزیشن میں آگئے تھے اس لیے میں نے ان کو دھونے [illegible] سمجھا۔ جہاں صبح بڑے نیل تھے اب وہاں معمولی نشانات رہ گئے تھے۔ مہینوں گزر گئے مگر حکیم قادس کی دی ہوئی دواؤں کا اثر اب بھی برقرار تھا اور میرے زخم اور چوٹیں بہت جلد ٹھیک ہوجاتے تھے، اس کی بنیادی وجہ وہ پتھر نما سیاہ چیز تھی جس کا سفوف دواؤں میں استعمال ہوتا تھا۔ اورگان نے راجا عمر دراز کو بتایا تھا کہ یہ سیاہ پتھر نما چیز وادی کی بعض ندیوں میں ملتی تھی اور کمیاب تھی۔ ڈیوڈ شا اس سیاہ پتھر نما چیز کے چکر میں بھی آیا تھا۔ بیرونی دنیا میں اس کی کیا قیمت ہوتی اس کا اندازہ لگانا بھی محال تھا۔ میں واپس آیا تو روبیر کوٹھری کے دروازے کے ساتھ کھڑی تھی۔ میں اس کے پاس رکا۔

"تم کہیں گئی تھیں؟"

اس نے انکار کیا۔ "نہیں۔"

"لیکن تمہاری کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔"

اس نے نظریں چرائیں۔ "آپ کو لگا ہوگا ورنہ میری کوٹھری کا دروازہ بھی نہیں کھلا۔"

میں نے دیکھا نہیں تھا صرف سنا تھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی مجھے غلط فہمی ہوسکتی تھی۔ مگر روبیر نے جس طرح سے نظریں چرائی تھیں اس سے میں کھٹکا تھا۔ کیا اس نے جھوٹ بولا تھا کہ اسے کہیں لے جایا نہیں گیا تھا؟ میں سوچتے ہوئے واپس اپنی کوٹھری میں آگیا۔ دروازہ ٹھوس لکڑی کا بنا ہوا تھا صرف اس کے اوپری حصے میں ایک پانچ انچ چوڑا اور کوئی دس انچ لمبا سوراخ تھا۔ اس سے جھانک کر باہر دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے پانی پیا اور ہلکی پھلکی ایکسر سائز کرنے لگا۔ چوٹوں کا درد کم تھا اور مجھے حرکت کرنے میں خاص دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ ایک اجنبی جو باہر سے آیا تھا جس طرح اس جگہ کا حکمران بنا تھا اسی طرح اچانک وہ مجرم اور قیدی بن گیا تھا۔ مگر میں اس کایا پلٹ کا عادی ہوگیا تھا اور کسی بھی نئی صورتِ حال کا مجھ پر زیادہ اثر نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کل ہونے والے مقدمے کی فکر تھی۔ جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میرے دشمنوں نے میرے لیے کوئی سرپرائز تیار رکھا ہوگا۔

رات کا کھانا تاریکی چھاتے ہی پیش کردیا گیا تھا۔ گویا یہاں قیدیوں کو دو وقت ہی کھانا ملتا تھا۔ سامیرا میرے لیے جو ٹوکری لائی تھی اس سے میرا گزارا ہوگیا۔ پھلوں میں ایک سیب سے ملتا جلتا تھا اور ایک انگور نما تھا مگر یہ شکل میں آم جیسے تھے یوں لگ رہا تھا کہ آم کو منی ایچر کردیا گیا ہو۔ سیب نما پھل کا ذائقہ بھی سیب جیسا تھا۔ تیسرا پھل نامانوس تھا۔ اس کے اوپر ٹماٹر کی طرح کا چھلکا تھا اور

اندر شہد جیسا میٹھا گودا ابھرا ہوا تھا۔ مجھے سب سے اچھا یہی لگا تھا۔ کچھ پھل بچ گئے جو میں نے رات کے کھانے کے بعد بہ طور سوئٹ ڈش استعمال کیے۔ صبح میری اور روبیر کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ ہماری دنیا میں اب اس کا فیصلہ بہت آسانی سے ہو جاتا ہے کہ مرد و عورت غلط کاری کے مرتکب ہوئے ہیں یا نہیں۔ ان کا میڈیکل چیک اپ ہو جاتا ہے مگر یہاں اس قسم کا کوئی تصور نہیں تھا۔

صبح میری آنکھ جلد کھل گئی تھی۔ باہر ابھی تاریکی تھی۔ یہاں آنے کے بعد سے بہت کم ایسا ہوا تھا کہ میں روشنی ہونے تک سوتا رہا ہوں عام طور سے اس سے پہلے اٹھ جاتا تھا۔ روز صبح اٹھتا تھا مگر اللہ یاد نہیں آتا تھا۔ اب مشکل پڑی تو اللہ یاد آیا اور میں نے مٹکی کے پانی سے وضو کر کے انداز سے قبلہ رو ہو کر فجر کی نماز ادا کی اور دعا کی کہ بہت مہربان پروردگار مجھے اس آزمائش سے بھی محفوظ رکھے اور مجھے دشمنوں کے سامنے سرخرو کرے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں نے خاص طور سے دعا کی اور میرے اندر کا بوجھل پن ہلکا نہ ہوا ہو۔ اس بار بھی میں نے خود کو ہلکا محسوس کیا اور اٹھ کر ہلکی ورزش کی۔ روشنی ہوتے ہی ناشتے اور دوسرے لوازمات کا مرحلہ آ گیا۔ اس سے فارغ ہوا تو سپاہی آ گئے۔ انہوں نے مجھے اور روبیر کو کوٹھریوں سے نکالا اور ہمیں لے کر روانہ ہوئے۔ روبیر نے مجھ سے بات نہیں کی اور نہ ہی وہ مجھ سے نظریں ملا رہی تھی۔ اس کا انداز مجھے کھٹکا ضرور تھا مگر اس وقت میں نے اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ قید خانے سے باہر آئے تو لوگوں کا ایک جم غفیر منتظر تھا اور وہ ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوا۔

ہمارے ساتھ چلنے والے لوگوں کے انداز میں کوئی مخالفت یا موافقت نہیں تھی ان کا انداز بے نیازانہ تھا۔ بہت کم لوگ تھے جن میں مجھے جذبات کی آمیزش نظر آئی۔ اس جلوس کے ساتھ ہم قلعے کے دروازے کے قریب ایک کھلی جگہ پہنچے جو شاید اسی کام کے لیے مخصوص تھی۔ وہاں عدالت بجی ہوئی تھی۔ سومرو، بیناٹ اور کانیٹور کے ساتھ قلعے کے تمام اہم عہدیداران اور سامیرا بھی وہاں موجود تھے۔ سماعت دیکھنے کے لیے تینوں قلعوں کی تقریباً ساری آبادی بھی یہاں موجود تھی۔ مجھے اور روبیر کو الگ الگ جگہ کھڑا کر دیا گیا اور سومرو نے سرکاری وکیل کا کردار ادا کرتے ہوئے ہم پر فرد جرم عائد کی ہم نے غیر قانونی جسمانی تعلق قائم کر کے اس وادی کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے ہمیں سزا دی جائے۔ اس نے لمبی تقریر کرنے کی بجائے مختصر بات کی۔

اس کے بعد جج رائنون جسے میں جانتا تھا اور وہ اس جگہ کے معزز لوگوں میں شمار ہوتا تھا اس نے مجھ سے اپنی صفائی دینے کو کہا۔ میرے ترجمان کے طور پر سامیرا کھڑی ہو گئی کیونکہ روبیر تو خود ملزم تھی۔ وہ میری ترجمان نہیں بن سکتی تھی۔ میں نے گزشتہ شام سے پیش آنے والے واقعات اپنی صفائی میں پیش کرنا شروع کیے اور تفصیل سے بیان کیا کہ میں اور روبیر کن کن مراحل سے گزرے۔ ہمیں چوٹیں لگیں اور درندوں سے موت کے خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم محصور ہو گئے اور اس وجہ سے ہم قلعے کی طرف واپس نہیں آ سکے۔ سامیرا میرے بیان کو منظم انداز میں ترجمہ کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ رائنون اور عدالت میں موجود دوسرے لوگ میری صفائی سے متاثر ہوئے تھے۔ سومرو سپاٹ چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ مگر باقیوں کے چہروں پر میرے لیے ہمدردی واضح تھی۔ مجھے امید ہوئی کہ عدالت مزید تفتیش کا حکم دے گی کہ میرے بیان کی تصدیق کی جا سکے۔ اس صورت میں ہمارے بری ہونے کا امکان بڑھ جاتا۔ میرا بیان مکمل ہوا اور جج رائنون نے روبیر سے پوچھا۔

''کیا تم شہباز کے بیان کی تائید کرتی ہو؟''

روبیر جو اس دوران میں سر جھکائے خاموش کھڑی رہی تھی اس نے چند لمحے بعد کہا۔ ''نہیں، میں ان کے بیان کی تائید نہیں کرتی۔''

عدالت میں ہلکا سا شور بلند ہوا تھا۔ مگر رائنون نے ہاتھ بلند کیا تو خاموشی چھا گئی۔ اس نے پوچھا۔ ''تب تم اپنا بیان دے سکتی ہو۔''

''ہم کل قلعے کے پیچھے والی چٹانوں کی طرف گئے اور ہم رات وہیں رہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ......'' کہتے ہوئے روبیر کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ''ہم جسمانی طور پر ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ اگرچہ روبیر کا انداز پہلے ہی بتا رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے مگر وہ اتنا بڑا جھوٹ بولے گی اس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں ہی نہیں عدالت میں موجود تمام ہی افراد روبیر کی اس کی بات پر دم بہ خود رہ گئے تھے۔ مجھے سومرو کے چہرے پر بھی حیرت نظر آئی جیسے اسے توقع نہیں تھی کہ روبیر یہ بات کہہ دے گی۔ میں نے تڑپ کر کہا۔ ''یہ غلط ہے...... روبیر جھوٹ کہہ رہی ہے۔''

سامیرا نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا

اور میری بات کا ترجمہ کر دیا۔ رائنون نے جواب دیا۔ ”شہباز اپنی بات کر چکا ہے اس لیے روبیر کو اپنی بات کرنے دی جائے۔“

یہاں وکیل کا کوئی رواج نہیں تھا۔ آدمی براہِ راست اپنا مقدمہ خود لڑتا تھا۔ روبیر نے کہا۔ ”ہم چٹانوں کے اندر تھے۔ اس لیے ہمیں علم نہیں تھا کہ باہر اسارا آ گئے اور پھر ہارن بھی آ گیا۔ ان سے بچنے کے لیے ہم بھاگتے رہے اور صبح ہو گئی۔“

”روبیر تمہیں کیا ہو گیا ہے.....“ اس بار میں نے براہِ راست اسے مخاطب کیا۔ ”جو بات ہوئی ہی نہیں تم اس کا اقرار کیسے کر رہی ہو۔“

سومرو آگے آیا۔ ”جناب ملزمہ نے اقرار کر لیا ہے جو دونوں کے اقرار کے برابر ہے اس لیے انہیں سزا سنائی جائے۔“

سامیرا جو عدالت میں آتے ہوئے پُراعتماد تھی۔ اس وقت وہ شاک کی کیفیت میں دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”آپ مجھے جانتی ہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ یہ سازش ہے جو آرگون والوں کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ یہ سب سازش کے مہرے بنے ہوئے ہیں ان میں روبیر بھی شامل ہے۔“

”میں تمہیں جانتی ہوں۔“ سامیرا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں روبیر کو بھی جانتی ہوں یہ جھوٹ نہیں بولتی۔“

”ابھی اس نے جھوٹ ہی بولا ہے۔“

اپنا بیان دے کر روبیر سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے بیان نے لوگوں کے تاثرات ہی بدل دیئے تھے اور جو اب تک اس معاملے میں غیر جانب دار تھے ان کی نظروں میں اب میرے لیے حقارت اور نفرت تھی۔ وہ آپس میں میرے خلاف بول رہے تھے۔ شاید برا بھلا کہہ رہے تھے۔ رائنون نے اپنا ہاتھ بلند کیا تو پھر خاموشی چھا گئی۔ رائنون نے کہا۔ ”ایک ملزمہ کے اعترافی بیان کے بعد ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں نے رات کی تاریکی میں غلط کاری کا ارتکاب کیا ہے۔ دونوں مجرم ثابت ہوتے ہیں۔ اگر یہ شادی شدہ ہوتے تو ان کو موت کی سزا دی جاتی لیکن یہ غیر شادی شدہ ہیں اس لیے ان کو قلعے سے نکالنے کی سزا دی جاتی ہے۔ اس سزا پر فوری عمل کیا جائے۔“

روبیر کے بیان کے بعد میری کسی قسم کی صفائی بیکار تھی۔ ایسا تھا کہ ایک فریق بھی اقرارِ جرم کر لے تو دوسرا خود بخود ملوث ہو جاتا تھا۔ اگر یہ سازش تھی تو روبیر اس میں برابر کی شامل تھی۔ سزا اسے بھی ملتی مگر اسے سزا نہیں ملتی کیونکہ وہ آرگون جا سکتی تھی جہاں اس کا شاندار استقبال ہوتا۔ میں مارا جاتا کیونکہ آرگون میں پہلے ہی میرے دشمن تھے وہ پہلی فرصت میں مجھے ہارن کے سامنے پھینک دیتے۔ اب یہاں بھی میرے دوست نہیں رہے تھے۔ اس واقعے نے جیسے مجھے سن کر دیا تھا۔ ایسی ذلت اور خود کو حقیر میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ سزا سنتے ہی سامیرا عدالت سے نکل گئی تھی۔ وہ شاید مجھے سزا پاتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کیونکہ سزا پر فوری عمل درآمد کا حکم دیا گیا تھا۔ سپاہی مجھے جلوس کے ساتھ قلعے کے دروازے تک لائے اور اس سے باہر دھکیل دیا۔ میرے جسم پر سوائے لباس اور پیروں میں جوتوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے کوئی ہتھیار نہیں دیا تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا سامان تھا۔ سومرو بھی آیا تھا اور اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم ہماری زبان سمجھتے ہو لیکن بول نہیں سکتے۔ تمہیں صرف قلعے سے ہی نہیں نکالا گیا ہے۔ بلکہ وہ تمام جگہیں جو ہمارے استعمال میں ہیں وہاں تمہارا داخلہ منع ہے۔ نظر آنے کی صورت میں سپاہی تمہیں گرفتار کر لیں گے اور دوسری بار تمہیں سزائے موت ملے گی۔“

”خواہش تو تمہاری یہی ہو گی مجھے سزائے موت ملے۔“ میں نے تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری بات نہیں سمجھ رہا ہے مگر میں دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ ”زندگی میں پہلی بار مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں کن لوگوں کے کام آ رہا تھا۔“

سومرو اور سپاہیوں کے ساتھ وہاں عام پبلک کا ایک چھوٹا سا ہجوم بھی تھا۔ مجھے اس میں مختصر بالوں والے ایک نوجوان کی جھلک نظر آئی۔ میں نے اکثر اسے سامیرا کے پاس دیکھا تھا۔ میری نظر اس پر گئی تو اس نے سر سے قلعے کے پیچھے والی سمت اشارہ کیا۔ کیا وہ مجھے اس طرف جانے کا کہہ رہا تھا؟ سومرو نے کہا۔ ”تم نہ جانے کیا کہہ رہے ہو لیکن اب یہاں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے اور تم جا سکتے ہو اپنے انجام کی طرف۔“

زبان سے کہتا تو سمجھ میں نہ آتا میں نے اس سے اشارے سے تیر کمان یا لاٹھی دینے کو کہا۔ میں بالکل نہتا تھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہارے ساتھ رعایت ہو رہی ہے ورنہ اس سزا میں باہر نکالے جانے والوں کا لباس تک اتار لیا جاتا ہے۔ اب جاؤ تمہاری مہلت ختم ہو رہی ہے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے قلعوں اور ہماری زمین سے دور نکل جاؤ۔ اس کے بعد یہاں نظر آئے تو گرفتار کر لیے جاؤ گے۔''

روبیرا ابھی تک نہیں لائی گئی تھی۔ شاید اسے بعد میں نکالا جاتا۔ میں مغرب کی طرف چل پڑا۔ بے اختیار غالب کا شعر ذہن میں گونجا تھا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

یہ شعر اس وقت میری حالت پر بالکل صادق آرہا تھا۔ کل تک میں جن لوگوں کے لیے دن رات ایک کر رہا تھا انہوں نے مجھے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ میں سوچتا رہا اور خون جلاتا ہوا چلتا رہا۔ دوسرے قلعے کو پار کر کے میں جھاڑیوں والی جگہ پہنچا اور وہاں سے جنوب کی طرف مڑ گیا۔ کوئی ایک کلومیٹر چلنے کے بعد میں دوبارہ مشرق کی طرف مڑا اور مرکزی قلعے کے عقبی سمت جانے لگا۔ مجھے اس نوجوان کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔ شاید ریبک یا اسی قسم کا کوئی نام تھا۔ میں قلعے کے عقب میں ایک ایسی جگہ پہنچا کہ قلعے سے تو مجھے نہیں دیکھا جاسکتا تھا مگر کوئی اس طرف آتا تو میں اسے فوراً نظر آجاتا۔ میری نگاہیں قلعے کی طرف تھیں۔ مگر ریبک عقب سے نکلا تھا۔ اس نے شش کر کے مجھے پکارا تو میں اچھل پڑا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ پہلے ہی یہاں پہنچا ہوا ہوگا۔

وہ ایک درخت کے پیچھے تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے ایک بڑا سا تھیلا، مضبوط قسم کا نیزہ، کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش اٹھا رکھا تھا۔ اس نے یہ سب میرے حوالے کر دیا۔ میں نے تھیلا کھول کر دیکھا اس میں کھانے پینے کا خاصا سامان اور ایک نیا لباس بھی تھا۔ مگر سب سے اہم چیز مٹی کی ایک بوتل میں وہ محلول تھا جسے پینے کے بعد ہارن، اسمار اور گوز جیسے درندے آپ کے پاس پھٹکنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب مجھے سامیرا نے بھیجا تھا۔ ریبک نے سامیرا کا پیغام دیا۔ اس نے کہا۔ ''میرے بیٹے، مجھے معلوم ہے تم بے گناہ ہو لیکن میں کھل کر تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ آرگون والے یہاں جو فتنہ پھیلا رہے ہیں اس سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ میں اپنی جگہ موجود رہوں۔ تم سمجھ لو کہ اوپر والے کی طرف سے یہ تمہاری آزمائش ہے۔ جلد تم اس میں سرخرو ہو گے اور تمہارے دشمن ناکام ہوں گے۔ ریبک میرا با اعتماد ہے۔ یہ ہر تیسرے دن تمہارے پاس آئے گا تم چاہو تو اس سے مجھے کوئی پیغام بھیج سکتے ہو۔ یہ تمہارے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر آئے گا۔ ابھی یہ تم کو ایک خفیہ جگہ دکھائے گا جہاں تم رہ سکتے ہو اور تمہیں وہاں کسی کا خطرہ نہیں ہوگا۔''

میں نے سر ہلایا تو اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے جنوب کی طرف لے جائے گا مگر اس نے مغرب کا رخ کیا۔ ہم قلعوں کے عقب سے ہوتے ہوئے مغرب میں واقع گھنے جنگلوں کی طرف جانے لگے۔ اس طرف بھی چٹانیں تھیں مگر جنگل زیادہ تھے۔ ریبک مجھے زیادہ اندر نہیں لے گیا۔ ہم کچھ دور گئے ہوں گے کہ ایک ٹیلا نما چٹان آگئی۔ ریبک مجھے لے کر اس کے عقب میں آیا۔ یہاں چٹان کے ساتھ گھنی جھاڑیاں تھیں اور ان کے ساتھ بیلیں بھی چڑھ رہی تھیں۔ ان ہی بیلوں کے درمیان لکڑی کی سیڑھی چھپی ہوئی تھی۔ یہ سیڑھی کوئی پچیس فٹ کی بلندی تک سیدھی گئی۔ ریبک پہلے چڑھا اور میں اس کے پیچھے تھا۔ ٹیلا اوپر سے بھی سرسبز تھا۔ اس پر مٹی جمع ہوئی تھی اور بارش کے پانی نے اس میں سبزہ اگا دیا تھا۔ ٹیلے کے عقبی حصے میں لکڑی سے ہی ایک چھوٹا سا ہٹ بنا ہوا تھا۔ اس کا سائز آٹھ بائی آٹھ فٹ تھا اور چھت کی اونچائی سات فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہاں فرش پر نرم بستر بچھا ہوا تھا۔ پانی کے لیے یہاں ایک چھوٹا مٹکا، ایک ڈول جس میں پانی بھر کر لایا جا سکتا۔ ایک عدد پیالہ اور کچھ برتن تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں بھی کوئی رہتا تھا۔ سامنے کی طرف دروازہ تھا اور عقب میں کھڑکی تھی جسے کھول کر ٹیلے کے نیچے بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ ریبک نے کہا۔

''یہ آپ کی رہائش ہے یہاں ہارن، اسمار یا گوز نہیں آسکتے۔ نیچے اترتے ہوئے آپ کو محتاط رہنا ہوگا۔ پانی یہاں سے کچھ دور ہے۔'' اس نے ہاتھ سے ٹیلے کے مغرب کی طرف اشارہ کیا۔ ''صبح اور شام کے اوقات میں وہاں جانے سے گریز کریں کیونکہ جانور پانی پینے آتے ہیں۔ میں تین دن بعد پھر آؤں گا۔''

اگرچہ اس وقت میرے ذہن میں خیال آیا کہ مجھے کب تک یہاں رہنا ہوگا؟ مگر سوال قبل از وقت تھا۔ ظاہر ہے مجھے ہمیشہ یہاں نہیں رہنا تھا۔ جیسے ہی حالات میرے لیے موافق ہوتے اور مجھے موقع ملتا میں یہاں سے نکل جاتا۔ میں نے سر ہلایا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور سیڑھی سے نیچے اتر گیا۔ وہ ٹیلے سے گھوم کر قلعوں کی طرف روانہ ہوا تھا۔ سیڑھی مضبوط لکڑی کی تھی اور خاصی پرانی تھی۔ مگر وقت نے اس کی مضبوطی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ میں نے تھیلا اور

دوسری چیزیں کیبن میں رکھیں اور باہر آیا۔ سامنے چھوٹا سا قدرتی باغ تھا جس میں گھاس کے ساتھ رنگا رنگ اور خوشبو دار پھولوں والے پودے اگ آئے تھے۔ یہاں کچھ گول اور چپٹی تراش والے پتھر نشست کے طور پر رکھے ہوئے تھے۔ آدمی ان پر آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ اس جگہ کا سامیرا سے کوئی تعلق رہا ہے۔

ابھی دن اپنے عروج پر تھا اور دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ مسلسل چلنے سے صبح کا ناشتا ہضم ہو گیا تھا میں نے تھیلے کا جائزہ لیا اور اس میں موجود تازہ پھل پہلے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اتنی مقدار میں تھے کہ دو دن آرام سے گزارا ہو جاتا۔ مجھے سامیرا کی اس مدد سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ میری بے گناہی کی قائل تھی۔ وہ جس طرح سے میرا ساتھ دے رہی تھی اس سے ظاہر تھا کہ وہ ناامید نہیں ہے۔ مجھے روبیر کا خیال آیا اور میں نے بیزاری سے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ بہ ظاہر معصوم نظر آنے والی اس لڑکی نے وہی کیا تھا جو کوئی خوب صورت ناگن کر سکتی تھی۔ اس نے مجھے اس وقت ڈسا جب میں اس کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ پھر مجھے برف والے کا خیال آیا کیا اسے میری حالت اور مجھ پر گزرنے والے واقعات کی خبر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسے خبر ہو اور ہو سکتا تھا کہ اسے خبر نہ ہو۔ وہ بہر حال ایک انسان تھا جو اپنی حدوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

برف والے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اب میں کیا کروں تو مجھے پانی کا منبع دیکھنے کا خیال آیا۔ ریک نے صبح اور شام کے اوقات وہاں جانے سے منع کیا تھا اور ابھی دن تھا۔ میں نے مٹکا چیک کیا۔ اس میں پرانا پانی تھا۔ اسے پھینک کر میں نے مٹکا اور ڈول لیا اور ٹیلے سے نیچے اترا۔ ڈول میں نے بے دھڑک پھینک دیا کہ وہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا البتہ مٹکا احتیاط سے پکڑ کر اترا تھا۔ کیونکہ وہ مٹی کو پکا کر بنایا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ یہاں پکانے والی مٹی بہت اعلیٰ درجے کی تھی اور یہ لوگ اس سے بہت نفیس برتن اور دوسری چیزیں بناتے تھے۔ شفاف پانی کی ندی چند گز دور ہی پودوں کے عقب میں بہہ رہی تھی اور اس کی چوڑائی دس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ پتھروں اور جمی ہوئی کائی پر اس کا شفاف پانی روانی سے پھسلتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ کچھ نیچے جا کر ندی ایک تالاب میں گر رہی تھی اور یہاں اتنی جگہ تھی کہ ایک آدمی آرام سے نہا سکتا تھا۔ میں نے ممکنہ خطرات کو بالائے طاق رکھا اور لباس اتار کر پانی میں گھس گیا۔

یہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے مجھے جھجک نہیں ہوئی۔ کئی دن سے نہانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پھر بہتی ندی میں نہانے کا اپنا ہی الگ مزہ ہے جو انسان کو کم ہی ملتا ہے۔ دل بھر کر نہانے کے بعد میں نے مٹکا اور ڈول دھوئے اور ان میں تازہ پانی بھر کر ٹیلے کے اوپر لے گیا۔ پہلے مٹکا لے کر گیا۔ یہ کام خاصا مشکل ثابت ہوا البتہ ڈول سے پانی لے جانا اتنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اب ڈول سے ہی پانی لے جاؤں گا۔ میں نے اتارا ہوا لباس بھی دھو لیا تھا۔ یہ کچھ جگہوں سے پھٹ گیا تھا اور کہیں کہیں خون کے داغ بھی آ ئے تھے مگر پہننے کے قابل تھا۔ اسے دھو کر سوکھنے کے لیے پھیلا دیا اور سامیرا کا دیا ہوا لباس پہن لیا۔ کیبن میں جلانے کے لیے مشعلیں اور آگ لگانے والی تیلیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ ہماری طرح ماچس سازی کا فن جانتے تھے۔ مسالہ بنا کر تیلیوں پر لگایا جاتا جو معمولی سی رگڑ سے جل اٹھتا تھا۔ کئی انچ لمبی یہ تیلیاں خاصی مقدار میں پہلے سے یہاں موجود تھیں۔

ابھی روشنی تھی اس لیے مشعل جلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیبن کی دیوار میں مشعل لگانے کی جگہ بھی تھی۔ اب تک میں خود کو بہلا رہا تھا مگر میرے اندر انتشار برپا تھا۔ میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا۔ زبردستی لایا گیا تھا اور پھر وادی میں بھی اپنی مرضی سے نہیں اترا تھا۔ دیکھا جائے تو برف والے نے یہاں ڈیوڈ شا کا کردار ادا کیا تھا جیسے وہ مجھے زبردستی وادی تک لے آیا تھا اسی طرح برف والے نے زبردستی مجھے وادی میں اتار دیا۔ پہلے ریناٹ کے حوالے کیا اور وہاں سے ایک جان لیوا مرحلے سے گزر کر میں سامیرا کے پاس پہنچا۔ وہاں پہلے تو یہ عزت ملی کہ مجھے مختار کل بنا دیا اور پھر بے عزت کر کے ایک گھٹیا سے الزام کے تحت گھٹیا مجرم کی طرح سزا دے کر شہر بدر کر دیا۔ میں اس ویرانے میں بیٹھا ہوا تھا اور فی الحال یہ فیصلہ کرنے سے بھی قاصر تھا کہ کہاں کا رخ کروں؟

ندی میں نہاتے ہوئے مجھے خیال آیا تھا کہ میں وادی سے نکلنے کی کوشش کروں۔ میں نے وہ راستہ دیکھا تھا جہاں سے آرگون کے سپاہی مجھے نیچے لائے تھے۔ میں چاہتا تو اسی راستے سے واپس اوپر جا سکتا تھا۔ مگر مجھے یہ خیال اچھا نہیں لگا۔ ٹھیک ہے میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا مگر میں برف والے اور سامیرا جیسے لوگوں کو ان سازشیوں پر چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ جو وادی کا امن و سکون تباہ کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے کچھ سازشی اندر کے تھے اور کچھ سازشی باہر سے آئے تھے۔ ڈیوڈ شا وہ شخص تھا جو مجھے یہاں لایا تھا اور اس کا

ایک مقصد تھا۔ میں اس کے مقصد کو ناکام بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار تھا۔ اس کے لیے یہاں رکنا ضروری تھا۔ نہانے سے میرے اندر ابلتا ہوا احساس ٹھنڈا ہوا تھا اور اب میں بہتر طور پر سوچ سکتا تھا۔ یہاں مجھے پہلا خیال اس معلومات کا آیا جو کیرٹ نے مجھے دی تھیں اور میں نے ان کو اپنی حد تک محدود رکھا تھا۔

یہ بھی خدا کی قدرت تھی کہ شاید وہ ان معلومات کو بچانا چاہتا تھا۔ ورنہ میں سومرد اور دوسرے لوگوں سے اس کا ذکر کر چکا ہوتا۔ میں نے صرف سامیرا سے بات کی تھی اور اس نے ان معلومات میں کوئی دل چسپی نہیں لی تھی اس کے خیال میں ہماری طرف سے آرگون پر حملے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ہمیں تو ریناٹ کے حملے سے خود کو بچانا تھا۔ ٹیلے کی بلندی سے آس پاس کے مناظر تو دکھائی دے رہے تھے مگر میں یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ آرگون کس سمت ہے اور سامیرا کے قلعے کس طرف واقع ہیں۔ آرگون کے عقب میں وہ سرنگ تھی جو معبد کو آرگون سے ملاتی تھی اور اسی سرنگ کے ہوا کے لیے کیے ہو سوراخوں میں سے ایک سوراخ سے اندر جانے کا راستہ تیار کیا گیا تھا۔ یہ کام کیرٹ نے اپنے آدمیوں سے لیا تھا۔ نہ جانے اس کی موت کے بعد یہ خانہ کھلا ہوا تھا یا ریناٹ نے واقف ہونے کے بعد اسے بند کرا دیا تھا۔ دوسرا فصیل میں موجود خفیہ خانہ تھا۔ مگر یہ اندر سے ہی کھولا جا سکتا۔

آرگون کی سمت دیکھنے کا ایک طریقہ تھا لیکن یہ نہایت مشکل تھا۔ بہر حال مجھے مشکل کام کرنے کی عادت تھی۔ میں ٹیلے سے اترا اور اندازے سے سب سے بلند درخت کو جانچا.... میں جوتے کیبن میں چھوڑ آیا تھا اور اپنے ساتھ صرف نیزہ اور تیر کمان لایا تھا۔ میں جوتے گنوانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ درخت بہت موٹے تنے کا تھا مگر اس میں ہر کچھ فاصلے کے بعد شاخیں نکل رہی تھیں۔ نیچے کی چند شاخیں جانوروں کی دست برد کا شکار ہو گئی تھیں مگر ان کے کچھ حصے باقی تھے۔ میں ان کی مدد سے شاخوں تک پہنچا۔ یہاں اپنا تیر کمان اور نیزہ حفاظت سے رکھا کہ وہ نیچے نہ گرنے پائے اور مزید اوپر چڑھنے لگا۔ جیسے جیسے اوپر جا رہا تھا۔ تنے سے نکلنے والی شاخیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں اور میرے لیے آسانی ہو رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ کوئی دو سو فٹ بلند درخت ہے مگر جب اس کے وسطی حصے تک پہنچا تو مجھے اپنا خیال غلط لگا تھا۔ میں دو سو فٹ اوپر آ چکا تھا اور درخت کا آخری سرا بدستور خاصا دور تھا۔

اس کی بلندی تین سو فٹ کے آس پاس تھی اور جب میں خاصی دیر بعد اس کے اوپری حصے کے نزدیک پہنچا تو اندازہ ایک بار پھر بدلا۔ اس کی بلندی لازی تین سو فٹ سے زیادہ تھی۔ میں حیران ہوا تھا کیونکہ دنیا میں بہت کم درخت اتنی بلندی رکھتے ہوں گے۔ جب کہ یہاں اتنی بلندی کے اور اس سے بھی زیادہ بلند درختوں کی بھرمار تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس بلندی پر آ کر ہوا جب میں نے دور نزدیک بہت سے درختوں کے سرے اس سے زیادہ بلند دیکھے۔ خوش قسمتی سے میں جس سمت دیکھنا چاہتا تھا اس سمت اس سے زیادہ بلند درخت اور کوئی نہیں تھا اور کھلی جگہ نکلتے ہی مجھے آرگون کی فصیل اور اس کی عمارتیں دکھائی دینے لگیں۔ اس بلندی سے معبد کا اوپری سنہری حصہ بھی نظر آ رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ آرگون کوئی چھ سات میل کے فاصلے پر تھا اور معبد اس سے زیادہ دوری پر تھا۔

سامیرا کے تینوں قلعے اس جگہ سے نزدیک تھے اور ترتیب سے دکھائی دے رہے تھے۔ آرگون اور قلعوں کے درمیان پھیلے ہوئے باغات اور کھیت بھی یہاں سے دکھائی دے رہے تھے۔ اوپر آتے آتے میرا سانس چڑھ گیا تھا اور میں نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ سانس بھی درست کرتا رہا۔ جب سانس ٹھیک ہوا تو میں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ کسی سیانے نے ٹھیک کہا ہے کہ چڑھائی سے زیادہ اترائی مشکل کام ہے۔ نیچے دیکھنا دشوار تھا اور بہت سنبھل کر پاؤں جمانے پڑ رہے تھے۔ ایک غلطی مجھے کئی سو فٹ نیچے پہنچا دیتی۔ اس لیے احتیاط لازی تھی۔ بہرحال میں صحیح سلامت نیچے پہنچنے میں کامیاب رہا۔ میرا اندازہ تھا مجھے چڑھنے میں آدھا گھنٹا لگا تھا اور اترنے میں بھی تقریباً اتنا ہی وقت لگا تھا۔ آدھا یا پون گھنٹا میں اوپر رکا تھا۔ جب نیچے پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا اور روشنی مدھم ہونے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد رات کی تاریکی چھا جاتی۔

میں واپس ٹیلے پر آیا۔ تاریکی چھانے تک آرام کرتا رہا پھر اٹھ کر مشعل جلائی اور تھیلے سے کچھ پھل نکال کر کھائے۔ میرے ساتھ جو ہوا۔ اس کے بارے میں مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ سازش کا حصہ ہے تو کیا سازشی مجھے قلعے سے نکلوا کر سکون سے بیٹھ گئے ہوں گے؟ یہ سوال بہت اہم تھا۔ اگر وہ نہیں جانتے تھے کہ میں کہاں تھا تو ان کی حکمت عملی کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ ان کا اصل مقصد مجھے مروانا یا پھر اپنے قبضے میں کرنا تھا اور قبضے میں لینے کا مقصد بھی میرا وجود نابود کرنا ہوتا۔ تب انہوں نے ایسی حماقت کیوں کی کہ صرف

مجھے شہر بدر کرا کے بیٹھ گئے۔ کیا سچ مچ ایسا ہی تھا یا میں اب بھی ان کی نظروں میں تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا تھا۔ ربیک کو سچ مچ سامیرا نے بھیجا تھا۔ تھیلے میں پھلوں کے ساتھ مخصوص ٹکیاں تھیں جو سامیرا خود بناتی تھی۔ مگر ایسی ٹکیاں کوئی دوسرا بھی تو بنا سکتا تھا۔ اسی طرح ہارن اور دوسرے درندوں سے بچانے والا محلول بھی ریناٹ مہیا کر سکتا تھا۔ لباس اور ہتھیاروں سے کچھ ثابت نہیں ہوتا تھا۔

ٹھیک ہے ربیک کو میں نے کئی بار سامیرا کے پاس دیکھا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اسی کا وفادار تھا۔ اس خیال نے مجھے اتنا بے چین کیا کہ میں کیبن سے باہر نکل آیا اور کھلی جگہ ٹہلنے لگا۔ آئے دن دشمنوں سے پالا پڑنے کے بعد میرے سوچنے کا انداز بدل گیا تھا اور اب میں ہر بات کو جانچتا تھا اور دشمن کے ذہن سے سوچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اندر جلنے والی مشعل کی روشنی یہاں تک آ رہی تھی مگر ٹیلے سے نیچے اس کے دیکھے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ کسی قدر سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اگر دشمن میری یہاں موجودگی سے واقف تھے تو مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ میں نے کیبن سے نکال کر مشعل ایسی جگہ لگائی کہ ٹیلے کا اوپری حصہ روشن رہے مگر دور سے اس کی روشنی نظر نہ آئے اور پھر نیچے اتر کر ایک نزدیکی درخت پر چڑھ گیا۔ میرے پاس تیر کمان اور نیزہ تھا۔ درخت کی شاخوں سے ہوتا ہوا میں اتنی بلندی تک آیا کہ مجھے ٹیلا اور کیبن نظر آنے لگا۔ ایک موٹی شاخ پر میں ٹھیک سے بیٹھ کر آرام کرنے لگا۔ میری نظر ٹیلے پر مرکوز تھیں۔

انتظار اور نگرانی کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ آدمی کو کچھ نہ کرتے ہوئے بھی کرنا پڑتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ وہ بھی خوب کرتے ہیں جو صرف انتظار کرتے ہیں۔ ان کی اذیت صرف وہی جانتے ہیں اور کچھ دیر بعد میں اسی اذیت سے گزر رہا تھا۔ درخت کی کمزوری شاخ پر بیٹھنا آسان کام نہیں تھا۔ جسم دکھنے لگا تھا اور پٹھے سخت ہو رہے تھے۔ یہاں پہلو بدلنے کی بھی گنجائش نہیں تھی کہ ایک پہلو سنگ اٹھے تو دوسرا بدل لیں۔ کچھ دیر بعد کیڑے مکوڑوں نے یلغار کی اور میرا خیال غلط ثابت کیا کہ اس وادی کے کیڑوں مکوڑوں میں شرافت پائی جاتی ہے۔ وہ ہر جگہ گھس رہے تھے اور کاٹ بھی رہے تھے۔ اس وقت واحد مصروفیت یہی تھی کہ انہیں چن چن کر ممنوعہ علاقوں سے بے دخل کرتا رہوں اور مارتا رہوں۔ دو گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ میں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔

درخت سے اتر کر واپس ٹیلے پر آیا اور یہاں آ کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ظالم کیڑوں نے ایسا کاٹا تھا کہ بعض جگہوں پر ددوڑے سے بن گئے تھے جو اب رفتہ رفتہ تحلیل ہو رہے تھے۔ ٹیلہ ایسی جگہ تھا جہاں سے میں صرف عقبی حصے کی نگرانی کر سکتا تھا اور اگر کوئی عقبی حصے تک آ جاتا تو میری فرار کی راہ مسدود ہو جاتی۔ ٹیلے کے علاوہ کسی اور جگہ سے نگرانی کرنا بہت خطرناک تھا کیونکہ یہاں ندی پاس تھی اور ہارن سے لے کر اسمارو گونزنگ سب کی آمد کا پورا امکان تھا۔ درخت پر جانے کا ایک ہی تجربہ کافی ثابت ہوا تھا۔ اس لیے اب میرے پاس ٹیلے پر رکنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے جن کیڑوں نے کاٹا تھا ان میں سے کچھ زہریلے تھے اور میں اپنے اندر ایک قسم کی تھکاوٹ اور سستی سی محسوس کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اندر جا کر لیٹوں اور سو جاؤں۔ مگر میں سونا نہیں چاہتا تھا اس لیے باہر ایک پتھر کی نشست پر بیٹھا رہا۔

مگر کچھ دیر بعد مجھے جھونکے آنے لگے۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ میں اونگھنے کے دوران گرنے لگا تو چونکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیند کی شدت بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی اندر جا کر لیٹنے کی خواہش بھی بڑھ رہی تھی مگر یہ خدشہ مجھے روک رہا تھا کہ یہ نیند ہمیشہ کی نہ ہو جائے۔ نیند بھگانے کے لیے میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے سسکی لی ہو۔ میں رک گیا اور کان غور سے لگائے۔ مختلف حشرات اپنے اپنے راگ الاپ رہے تھے مگر شکر ہے ان میں کوئی جھینگر نہیں تھا ورنہ اس کی آواز میں کوئی اور آواز کہاں سے سنائی دیتی۔ قدرت نے اس انچ سے چھوٹے کیڑے کو کتنی بلند آواز دی ہے جو نصف میل سے زیادہ دوری تک صاف سنائی دیتی ہے۔ یہاں جو بولنے والے حشرات تھے وہ معمولی آوازیں نکال رہے تھے اور اسی وجہ سے وہ سسکی میری سماعت تک پہنچ گئی تھی۔

پہلے میں اسے وہم یا کسی کیڑے کی آواز سمجھا۔ ہوا یہاں چلتی نہیں تھی ورنہ اس کی آواز سمجھتا۔ پہلی بار سنتے ہوئے مجھے لگا کہ سسکی نسوانی ہے۔ میں رک کر کچھ دیر کان لگائے سنتا رہا مگر جب آواز دوبارہ نہیں آئی تو میں پھر ٹہلنے لگا تھا۔ ٹہلنے کے لیے یہاں مشکل سے بارہ تیرہ فٹ لمبا ایک فٹ پاتھ تھا میں اس پر چکر لگا رہا تھا۔ تیسرے چکر میں واپس آتے ہوئے میں نے اس بار واضح کراہ سنی اور یہ کراہ نسوانی تھی۔ آواز ٹیلے کے نیچے سے اور سامنے سے آئی تھی۔ میں

اس جگہ سے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ میں نے جھانکنے کی کوشش کی مگر ٹیلے کی ساخت یہاں گولائی لیے ہوئے تھی اور اس کی جڑ تک دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

تیسری بار سسکی کی آواز آئی تو میں تیزی سے نیچے اترا۔ احتیاطاً میں نے نیزہ لیا تھا۔ دبے قدموں نیچے آیا اور پھر دبے ہی قدموں ٹیلے کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھا۔ میں ٹیلے کی دیوار کے ساتھ لگ کر آگے بڑھ رہا تھا اور میری کوشش تھی کہ میرے سرکنے کی آواز نہ ہو۔ اوپر ستارے نکل آئے تھے اور کسی قدر روشنی تھی۔ نزدیک آنے پر مجھے سسکیوں کی آواز مسلسل آنے لگی۔ وہ جو بھی تھی رو رہی تھی اور کبھی کبھی اس کی بلند آواز نکلتی تھی جو مجھ تک آتی تھی۔ بالآخر میں اس تک پہنچ گیا۔ وہ ٹیلے کی جڑ کے ساتھ لگی بیٹھی تھی اور اس نے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ رکھے تھے۔ وہ ٹیلے کی جڑ میں اس طرح گھسی ہوئی تھی اگر اس کی آواز نہ آرہی ہوتو میں اسے گول مول سا پتھر ہی سمجھتا جو ٹیلے کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور آہستہ سے اسے آواز دی۔

''روبیر......''

اس نے چیخ ماری اور اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں نے اسے پکڑ لیا اور تب انکشاف ہوا کہ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ مچل رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی دیوانہ وار کوشش کر رہی تھی۔ میں اسے آواز دے رہا تھا اپنی شناخت کرا رہا تھا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس وقت ہسٹریا کی کیفیت میں تھی۔ جب اس کی آوازیں ہسٹریائی انداز میں بلند ہونے لگی تھیں اور مجھے خطرہ ہوا کہ دشمن نہ سہی کہیں اس کی آوازیں کسی خطرناک درندے کو متوجہ نہ کرلیں۔ تو مجبوراً میں نے اسے ایک ہاتھ سے قابو کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ دوسرے تھپڑ میں وہ میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔ وہ نیم بے ہوش ہوگئی تھی۔

میں نے اسے اٹھا کر شانے پر ڈالا اور کسی نہ کسی طرح اوپر ٹیلے پر لے آیا۔ کیبن میں بستر پر لٹا کر میں نے پہلے مشعل کی روشنی میں دل کڑا کر کے اس کا جائزہ لیا۔ اس کا بدن خراشوں اور معمولی زخموں سے بھرا ہوا تھا مگر یہ کسی انسان کی کارستانی نہیں تھی۔ وہ یقیناً اس حالت میں جھاڑیوں سے گزرتی رہی تھی اور اس کی یہ حالت ہوئی تھی۔ پورا جسم مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ مگر اس کی حالت کی وجہ جسمانی زخم نہیں بلکہ ذہنی صدمہ تھا اور میں کسی حد تک اس کا سبب بھی سمجھ رہا تھا۔ دو تھپڑ کھا کر وہ نیم بے ہوش ہوئی تھی مگر اوپر لاتے لاتے وہ گہری غنودگی میں چلی گئی۔ شاید اس کے لاشعور نے سمجھ لیا کہ اب وہ محفوظ ہے اور بے ہوش ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے اسے پلٹ کر بھی دیکھا۔ اس کے جسم پر کہیں کوئی بڑا زخم نہیں تھا اور نہ ہی کہیں سے خون رس رہا تھا۔

میں نے تھیلے میں موجود ایک چھوٹا سا کپڑا نکالا اور ایک برتن میں پانی نکال کر اس سے کپڑا بھگو کر روبیر کا پورا جسم صاف کیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بہت مٹی زدہ ہو رہے تھے۔ میں بس کسی حد تک صاف کر سکا تھا۔ مجھے اپنی نظر بچا کر یہ کام کرنا پڑ رہا تھا۔ روبیر صرف صورت کی ہی نہیں بدن سے بھی دلکش تھی۔ گرد مٹی اور زخموں اور خراشوں میں بھی اس کا حسن جگمگا رہا تھا۔ اس لیے بھی مجھے دشواری پیش آئی۔ میں عورت کا احترام کرنے والا شخص ہوں مگر خدا نے اس مخلوق کو ایسا بنایا ہے کہ آدمی کی توجہ خود اس کی طرف جاتی ہے۔ آخر میں میں نے اسے اپنا اتارا اور دھویا ہوا کرتا لا کر پہنایا اور اطمینان کا سانس لیا۔ کرتا کسی قدر نم تھا مگر مجھے امید تھی کہ روبیر کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ موسم نہ ہونے کے برابر سرد تھا بلکہ اسے خوشگوار بھی مشکل سے کہا جا سکتا تھا۔ روبیر کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے مگر میں نے اسے پانی دینے سے گریز کیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر آرام کرلے جلدی ہوش میں آنے سے اس کی حالت پھر خراب ہو سکتی تھی۔ وہ جتنی دیر آرام کرتی اس کے دماغ اور اعصاب کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔

ویسے بھی میں سمجھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ یقیناً اسے پوری طرح سزا دی گئی تھی جیسا کہ سومرد نے بتایا تھا کہ شہر بدر ہونے والوں کے کپڑے بھی اتار لیے جاتے ہیں۔ روبیر کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ شہر بدر کرنے سے پہلے اس کا لباس اتار لیا گیا تھا۔ وہ آبادی سے نکلنے کے بعد جنگل اور ویرانے میں بھٹکتی رہی ہوگی۔ اس دوران اسے مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا ہوگا۔ جھاڑیوں اور چٹانوں سے اس کے نازک وجود نے زخم کھائے تھے اور شاید تاریکی چھانے پر اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ مگر اس کی ہسٹریا کی اصل وجہ اس کے ساتھ کیا جانے والا سلوک تھا۔ اسے بے لباس کر دیا گیا تھا اور اس کی نسوانیت یہ توہین برداشت نہیں کرسکی تھی۔ اس کی خوش قسمتی کہ وہ کسی درندے کے ہاتھ نہیں آئی۔ نہ دو پیروں والے اور نہ چار پیروں والے۔ ورنہ شاید اس وقت زندہ نہ ہوتی۔ دوسری خوش قسمتی

یہ رہی کہ وہ یہاں تک چلی آئی جہاں میرے پاس ایک محفوظ ٹھکانہ تھا۔ اب وہ یہاں محفوظ تھی۔

میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ جب اس نے میرے خلاف سازشیوں کا ساتھ دیا تھا تب اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہوا؟ بے ہوشی کی نیند سوتے ہوئے وہ اتنی معصوم لگ رہی تھی کہ میرے لیے یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا یہ وہی لڑکی ہے جس نے مجھ پر بدترین الزام لگایا اور اپنے حوالے سے اس کی تصدیق بھی کی تھی۔ وہ میرے خلاف استعمال ہوئی تھی۔ اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ جلد وجہ بھی میرے سامنے آجاتی۔ روبیر کے یوں آنے سے ایک فائدہ ہوا کہ میں جو نیند سے بے حال ہو رہا تھا میری نیند اڑ گئی تھی اور اب میں ذہنی طور پر خود کو چاک و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ روبیر کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں دوبارہ باہر نکل آیا۔ میں نے ایک مشعل اور جلائی اور اسے باہر لگا دیا۔ آج بھی آسمان پر چاند نہیں تھا۔ ابتدائی دنوں کا چاند تھا جو نکل کر جلد غروب ہو جاتا ہوگا اس لیے وادی کے باسی ان دنوں آسمان کی جھلک سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔

جب روبیر نے عدالت کے روبرو اعتراف کیا تو میرا اس پر غصہ لازمی تھا اور اگر اس وقت مجھے موقع ملتا تو شاید میں اس کی گردن مروڑ دیتا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا غصہ سرد ہونے لگا تھا۔ پھر مجھے لگا کہ میرے حق میں یہی بہتر تھا۔ جہاں تک وادی کے لوگوں کا تعلق تھا مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور میرا ضمیر مطمئن تھا۔ اس لیے کوئی مجھ پر الزام لگاتا تھا یا اسے ثابت کرتا تب بھی مجھے پروا نہیں تھی۔ میرے جذبات پر اب تجسس غالب تھا کہ روبیر نے ایسا کیوں کیا؟ اسے یوں جھوٹا الزام اپنے اور میرے سر لینے پر کس نے مجبور کیا اور ایسی کیا مجبوری تھی جو وہ اتنا بڑا جھوٹ بولنے پر مجبور ہوئی؟ یہ سب روبیر خود بتا سکتی تھی اور اب وہ میرے قبضے میں تھی اسے زبان کھولنا ہی پڑتی۔ اس لحاظ سے میں خوش قسمت تھا کہ وہ بھٹکتے ہوئے میرے پاس چلی آئی۔ اگر اسے علم ہوتا کہ یہاں میں ہوں تو وہ کبھی اس جگہ کا رخ نہ کرتی۔ میں نصف رات تک باہر رہا پھر اندر آیا تو روبیر نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ ہوش میں آگئی تھی مگر مجھے دیکھ کر سوتی بن گئی۔ شاید وہ ڈر رہی تھی۔ میں نے مٹکے سے پانی نکالا اور اس سے کہا۔ ''اٹھ جاؤ اور پانی پی لو۔ تمہیں ضرورت ہے۔''

اس نے آنکھیں کھولیں اور اٹھ بیٹھی۔ میں نے اس کی طرف پیالہ بڑھایا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر پیالہ لیا اور ایک ہی بار منہ سے لگا کر خالی کر دیا۔ اس سے پتا چلا کہ وہ کس قدر پیاسی تھی اسے یقیناً اور پانی کی ضرورت تھی مگر میں نے مزید پانی نہیں دیا اور اس سے پیالہ لے کر رکھ دیا۔ وہ خاموش اور سہمی ہوئی تھی۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ میں اس سے بات کروں۔ مگر میں نے بات نہیں کی اور باہر جانے لگا تو اس نے کہا۔ ''آپ نے مجھے کیوں بچایا؟''

''تاکہ تم آئندہ بھی مجھے دھوکا دے سکو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا اور باہر نکل آیا۔ اس وقت مجھے پھر غصہ آگیا تھا اور میرا سر گرم ہو رہا تھا۔ میں فی الحال اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ خوف تو نہیں تھا کہ میں اسے کوئی جسمانی گزند پہنچا سکتا ہوں۔ کسی عورت پر غصے میں بھی ہاتھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ لیکن میرے منہ سے اس کے لیے کچھ غلط سلط نکل جاتا تو مجھے اس کا افسوس رہتا۔ میں ہر حال میں عورت کی عزت کا قائل ہوں۔ کھلی فضا میں آکر اور چند گہرے سانس لے کر میں نے خود کو بہتر محسوس کیا۔ یہ بات روبیر نے بھی محسوس کر لی اور اس نے فوری میرے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی۔ خاصی دیر بعد وہ اندر سے برآمد ہوئی۔ میرا کرتا اسے پیروں سے بھی نیچے تھا۔ اس نے اسے سمیٹ کر اوپر کیا ہوا تھا۔ میں نے کمر بند بھی نہیں پہنایا تھا اس لیے کرتا پھیل رہا تھا اور اسے سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ میں ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر دوسرے پتھر پر بیٹھ گئی۔

''میں معافی نہیں مانگوں گی۔''

میں نے طنزاً پوچھا۔ ''کیونکہ تم اس کی قائل نہیں ہو؟''

''نہیں بلکہ اس لیے کہ میں نے جو کیا اس کے لیے معافی بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔ میں تو سزا کی مستحق ہوں۔''

اس بار میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تو تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے؟''

''ہاں، اگر آپ مجھے جانتے ہیں تو یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ میں نے کس قدر مجبور ہو کر آپ کے اور اپنے خلاف بیان دیا۔ دیکھا جائے تو میں نے خود کو سزا دلوائی ہے اور خود کو سزا کون دلواتا ہے؟''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اگر اس کے بیان سے مجھے سزا ہوئی تھی تو اسے بھی سزا زیادہ اذیت ناک انداز میں بھگتنا پڑی تھی۔ میں نے پھر کسی قدر طنز سے کہا۔ ''ان لوگوں نے تمہیں نہیں بچایا جنہوں نے تمہیں اس کام پر آمادہ کیا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے مجبور کیا گیا تھا مجھ سے

کوئی وعدہ نہیں لیا گیا تھا کہ مجھے بچا لیا جائے گا۔''

''آخر ایسی کیا بات تھی جو تم نے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دی۔ تم جانتی ہو آبادی سے نکل کر کوئی شخص زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔''

اس کا سر جھک گیا۔ ''میں نہیں بتا سکتی۔''

''کیوں؟''

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ''بس نہیں بتا سکتی۔''

''تمہارے کسی پیارے کی جان خطرے میں ہے؟'' میں نے اچانک کہا تو اس کے چہرے پر حیرت نظر آئی۔ شاید اسے تعجب ہوا تھا کہ میں یہ کیسے جان گیا۔ اس نے سنبھل کر انکار میں سر ہلانا چاہا مگر میں نے موقع نہیں دیا۔ ''یہی بات ہے، کون ہے وہ تمہارے ماں باپ، بہن بھائی یا کوئی ایسا فرد جو تمہیں محبوب ہو۔''

''آپ...... آپ کو کیسے پتا چلا؟'' وہ بہ مشکل بولی۔

''بس پتا چل گیا۔ مگر وہ فرد کہاں ہے۔ اس نے اس مشکل میں تمہارا ساتھ نہیں دیا؟''

روبیر جلدی سے بولی۔ ''اسے علم نہیں ہے۔''

''اس کا تعلق آرگون سے ہے؟'' میں نے ایک بار پھر تکا مارا۔

روبیر نے گہری سانس لی۔ ''ہاں، اس کا تعلق آرگون سے ہے۔''

''تمہاری اس سے ملاقات کیسے ہوئی؟''

''اتفاق سے۔'' وہ بولی۔ ''میں ایک دن باغات سے ہوتی ہوئی غلطی سے آرگون کے باغوں کی طرف نکل گئی۔ وہاں شامین موجود تھا۔''

میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ ''شامین؟''

''وہ آرگون کی فوج میں شامل ہے۔ اس نے مجھے تنہا پایا تھا مگر اس نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی اور بہت شرافت سے پیش آیا۔''

روبیر کو اس کی شرافت اور شخصیت نے متاثر کیا ہوگا۔

''پھر اس سے دوسری ملاقات کب ہوئی؟''

''چند دن بعد۔'' وہ جھجک کر بولی۔ ''میں اسی جگہ گئی۔''

''اور وہ وہاں موجود تھا۔'' میں نے کہا۔ ''یقیناً اسے بھی تمہارا انتظار ہوگا؟''

روبیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں وہ بھی میرا انتظار کر رہا تھا۔''

''اس کے بعد بھی تمہاری ملاقاتیں ہوتی رہیں؟''

''کئی بار۔'' روبیر نے گہری سانس لی۔ ''اس نے مجھ سے کئی بار کہا کہ میں اس کے ساتھ آرگون چلوں مگر میں نہیں گئی۔ میں اپنے گھر والوں اور یہاں کے لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔''

''تم نے اس سے کہا کہ وہ تمہارے ساتھ آ جائے؟''

''ہاں مگر اس کی بھی مجبوریاں ہیں۔ اس کے دو بھائی آرگون کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر ہیں۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی ہیں۔ وہ سب کو چھوڑ کر نہیں آ سکتا۔ ورنہ ان پر رینات کا عتاب نازل ہوتا۔''

''اگر کوئی فرد آرگون چھوڑ کر سامیرا کے پاس آ جائے تو اس کے پیچھے رہ جانے والے متعلقین کو سزا ملتی ہے؟''

''بالکل۔'' اس نے کہا۔ ''کئی لوگوں کو سزائیں بھی ہوئی ہیں۔ کچھ کو قید خانوں میں ڈال دیا گیا اور جو لوگ زیادہ ملوث تھے ان کو سزائے موت بھی دی گئی۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ روبیر کی باتوں سے ظاہر تھا کہ آرگون والے میری نقل و حرکت سے مکمل واقفیت رکھتے تھے اور یہی نہیں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ روبیر جو میرے ساتھ ہے وہ آرگون کے ایک نوجوان سپاہی سے محبت کرتی ہے اور یہ محبت اس حد تک ہے کہ روبیر کو شامین کے حوالے سے دھمکی دے کر کچھ بھی منوایا جا سکتا ہے۔ میں نے روبیر سے پوچھا۔ ''تمہیں کس طرح سے دھمکی دی گئی؟''

''میں اس فرد کو نہیں جانتی کیونکہ وہ مجھ سے رات کی تاریکی میں اور منہ چھپا کر ملا تھا۔''

''تم نے اس کی بات پر کیسے یقین کیا۔''

''اس نے مجھے شامین کے گلے میں موجود لاکٹ دکھایا تھا۔ یہ لاکٹ میں نے اس کی گلے میں دیکھا تھا۔ اس آدمی نے مجھے بتایا کہ شامین اس وقت حراست میں ہے اور اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو اسے اذیتیں دے کر مار دیا جائے گا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''سات دن پہلے کی۔''

یعنی جب روبیر کو میرے ساتھ چار یا پانچ دن ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اور پوچھا۔ ''وہ شخص کہاں ملا تھا؟''

''قلعے میں جب میں اپنے گھر جا رہی تھی۔ اس رات میں اپنے گھر چلی گئی تھی۔'' روبیر نے بتایا۔ ''وہ مجھے ایک تاریک گلی میں ملا تھا۔''

''اسی نے تم سے کہا تھا کہ رات میرے کمرے میں

آؤ؟''

اس سوال پر روبیر کا سر پھر جھک گیا تھا پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں اس کے حکم پر میں آپ کے پاس آئی تھی۔''

''اس نے کیا کہا تھا مجھے واضح بتاؤ وہ کیا چاہتا تھا؟''

اس سوال کا جواب دینا روبیر کے لیے مشکل کام ثابت ہوا تھا اس نے جو اٹک اٹک کر بتایا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس شخص نے روبیر کو حکم دیا کہ وہ میرے کمرے میں جائے اور مجھے مجبور کرے کہ میں اس سے جسمانی تعلق قائم کروں اور جب یہ کام ہو جائے تو وہ شور مچا دے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اللہ نے بھٹکنے سے پہلے مجھے ہوشیار کر دیا تھا۔ خود روبیر بھی دل سے راضی نہیں تھی۔ وہ اپنے محبوب کی خاطر دل پر جبر کر کے یہ کام کرنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ اس لیے جیسے ہی میری آنکھ کھلی اور میں نے اسے روکا تو وہ رک گئی اور جب میں نے جانے کا حکم دیا تو وہ چلی گئی۔ اس کے بعد دشمنوں کو دوسرا موقع اتفاق سے مل گیا اور میں روبیر کے ساتھ ساری رات باہر رہا اور روشنی ہونے سے پہلے واپس نہیں آسکا۔ اس لیے میرے اور روبیر کے خلاف مقدمہ بن گیا۔ میں نے کہا۔ ''جب ہمیں گرفتار کیا گیا تو کیا اس کے بعد پھر اسی شخص نے تم سے رابطہ کیا تھا؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''آپ کو یاد ہوگا آپ نے پوچھا تھا کہ میں کہاں گئی تھی تو ایک سپاہی مجھے نکال کر اسی عمارت کے ایک کمرے میں لے گیا تھا اور وہاں وہی چادر پوش شخص موجود تھا۔ اس نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں عدالت میں اقرار کروں کہ میں......'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ قید خانے کے سپاہی کے ملوث ہونے سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ قلعوں کا کوئی اعلیٰ عہدیدار تھا جس کے حکم کی سپاہی نے تعمیل کی تھی۔ میرا دھیان ایک بار پھر سرمرو کی طرف گیا۔ ''تم نے اس کا چہرہ دیکھا۔''

''نہیں دونوں بار وہ چادر میں چھپ کر ملا اور مجھے لگا کہ وہ آواز بدل کر بول رہا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے وہ قلعے کا ایسا فرد ہے جس کی آواز سب کے لیے مانوس ہو سکتی تھی۔''

''شاید......'' وہ بے دھیانی میں بولی۔

''تم نے وہی کیا جو اس نے کہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تمہارا کیا خیال ہے انہوں نے شامین کو چھوڑ دیا ہوگا؟''

''میں نہیں جانتی لیکن میں نے اسے بچانے کے لیے ایسا کیا۔'' وہ کہتے ہوئے روہانسی ہو گئی۔ ''میں آپ سے معافی بھی نہیں مانگ سکتی میں کیا کروں مجھے محبت نے اتنا مجبور کر دیا۔ مجھے معلوم تھا مجھے بھی ذلت آمیز سزا ملے گی مگر مجھے کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ اگر مجھے شامین کے لیے مرنا پڑے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

وہ رونے لگی۔ میں اس کی حالت سمجھ رہا تھا۔ محبت انسان کو کیسے بے بس اور پاگل کرتی ہے یہ میں جانتا تھا۔ یہ کیفیت مجھ پر بھی گزر چکی ہے۔ میں نے اسے رونے دیا کہ اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں تھمنے لگیں تو میں نے پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے آئیں؟''

''آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مجھے کس طرح باہر نکالا گیا۔ میری کھال اتار لی جاتی تب بھی مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی لباس اتارنے پر ہوئی تھی۔ میرے حواس گم تھے اور مجھے نہیں پتا کہ میں کس طرف جا رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں بے شک مجھے اسمار یا گورنر کھا لیں یا کوئی ہارن مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ جب قلعوں سے دور نکل گئی تب بھی مجھے بہت شرم آرہی تھی اس لیے میں جھاڑیوں میں گھس کر چلتی رہی اور جب چلتے چلتے تھک گئی تو یہاں بیٹھ گئی مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں آپ ہوں گے۔ اگر معلوم ہوتا تو کبھی اس طرف نہ آتی۔ میں تو موت کی تلاش میں تھی۔''

''مگر اوپر والے کو تمہاری زندگی مقصود تھی اس لیے تم یہاں آگئیں۔''

''لیکن آپ یہاں کیسے آئے کیا یہ جگہ آپ کی ہے؟'' اس نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔ اگرچہ اس کا انداز کہہ رہا تھا کہ اس نے جو کہانی سنائی ہے وہ سچ ہے مگر اب میں انداز سے اندازے لگانے کا قائل نہیں رہا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ روبیر کی یہاں یوں آمد میرے دشمنوں کی ہی ایک چال ہوتی۔ وہ اعتراف کر چکی تھی کہ میرے دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہی ہے۔ پوری وادی چھوڑ کر اس کا یہاں آنا بھی نظر انداز کیے جانے والی بات نہیں تھی۔ ممکن ہے وہ اسے شامین کے حوالے سے دھمکی دے کر مجھے قتل کرنے کا کہتے تو روبیر یہ کام بھی کر گزرتی۔ میرے لہجے پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر پھیکے انداز میں مسکرائی۔

''آپ محتاط ہیں۔ اچھی بات ہے مجھ سے آپ کو محتاط

ہی رہنا چاہیے میں بالکل بھی بھروسے کے قابل نہیں ہوں۔''

''میرا خیال ہے تم آرام کرو۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے اور اگر بھوک لگی ہو تو اندر رکھے تھیلے میں کھانے کو بہت کچھ ہے۔''

''میں یہاں سے جانا چاہوں گی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے مجھے لباس دے دیا میرے لیے۔ یہی بہت ہے۔ اب میرے لیے مرنا آسان ہو جائے گا۔''

''تم جذباتی ہو رہی ہو۔'' میں نے بدستور نرمی سے کہا۔ ''میں نے کہا نا تمہیں آرام کی ضرورت ہے اور جہاں تک یہاں سے جانے کی بات ہے تو اسے بھول جاؤ، میں تمہیں کوئی حماقت کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر سر ہلاتی ہوئی کیبن کی طرف چلی گئی۔ میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا۔ اگر وہ دشمن کی طرف سے بھیجی گئی تھی یا پھر خود آئی تھی دونوں صورتوں میں مجھے اس پر نظر رکھنی تھی۔ میں وہیں ایک جگہ گھاس پر لیٹ گیا۔ یہ تختہ زیادہ بڑا تو نہیں تھا مگر میرے لیے کافی تھا اور سب سے بڑی بات تھی کہ اس میں بستر کی سی نرمی تھی۔ مگر میں سونا نہیں صرف آرام کرنا چاہتا تھا اس لیے جب کچھ دیر بعد نیند کے جھونکے آنے لگے تو میں اٹھ بیٹھا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو دوبارہ لیٹ گیا اور جب تیسری بار لیٹا تو مجھے نیند آگئی۔ مگر میں زیادہ دیر نہیں سویا تھا۔ اچانک ہی میری آنکھ کھلی اور میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ میری آنکھ کیوں کھلی ہے۔ تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کیبن میں جلنے والی مشعل روشن نہیں تھی۔ میں تیزی سے اٹھا اور کیبن میں جھانکا۔

حسب توقع روبیر وہاں نہیں تھی۔ وہ شاید ابھی نکلی تھی اور کسی آہٹ نے مجھے چونکایا تھا۔ میں سیڑھی تک آیا اور اترنے سے پہلے میں نے نیچے کا جائزہ لیا اور اس کا فائدہ ہوا تھا۔ کچھ ہی دور مجھے روشنی نظر آئی اور وہ یقیناً اس مشعل کی روشنی تھی جو روبیر لے کر نکلی تھی۔ میں اتر کر نیچے آیا اور تیز قدموں سے اس طرف روانہ ہو گیا۔ میرے پاس نیزہ تھا۔ میں نے جان کر مشعل نہیں لی ورنہ روبیر اس کی روشنی سے ہوشیار ہو سکتی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے جا کر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیوں نکلی تھی؟ جب میں اس جگہ پہنچا جہاں میں نے روشنی دیکھی تھی تو وہاں اب کوئی نہیں تھا اور تاریکی تھی۔ میں سکون سے کھڑا ہو کر نظریں دوڑانے لگا اور اس بار بھی چند لمحے بعد مجھے روشنی نظر آگئی۔ وہ کئی سو گز آگے جنگل میں جا رہی تھی۔ میں روشنی کو مدنظر رکھتے ہوئے تیزی سے چلنے لگا۔

ابھی تک تارے نکلے ہوئے تھے اس کا مطلب تھا کہ صبح میں کچھ وقت تھا۔ نیچے تاریکی تھی اور مجھے محتاط بھی ہونا پڑ رہا تھا ایک ذرا غلط قدم مجھے مشکل میں ڈال سکتا تھا یا کوئی آواز روبیر کو میرے تعاقب سے خبردار کر دیتی۔ اس لیے مجھے ہر قدم دیکھ کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ روبیر کو روشنی کی سہولت تھی اس لیے وہ تیز چل رہی تھی اور مجھے اس کے پاس جانے کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ ایک بار وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئی اور مجھے روشنی دیکھنے کے لیے رکنا پڑا تھا۔ اس بار روبیر ایک کھلی جگہ سے گزر رہی تھی اور مجھے اس کے پاس پہنچنے کا موقع مل گیا۔ اس کا رخ ایک چٹان کی طرف تھا۔ میں اس سے دس بارہ قدم پیچھے تھا اور وہ پیچھے دیکھے بغیر چل رہی تھی۔ شاید اتنی دور نکل آنے کے بعد اسے اطمینان تھا کہ میں اس کے پیچھے نہیں آسکوں گا۔ وہ چٹان کے پاس پہنچی اور اس پر چڑھنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ مگر چٹان اس قسم کی تھی کہ اس پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔

اس کے دوسری طرف کیا تھا یہ مجھے علم نہیں تھا۔ وادی کی دیوار یہاں سے کچھ فاصلے پر تھی۔ روبیر چڑھنے میں ناکامی کے بعد چٹان سے گھوم کر جانے لگی۔ میں نے تیزی دکھائی اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ یہ تیزی ہی کام آئی کیونکہ جب میں اس کے پیچھے گھومتا ہوا چٹان کے دوسری طرف پہنچا تو وہ ایک مہیب کھائی کے کنارے کھڑی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس میں کودنے والی ہو۔ وہ کود بھی جاتی مگر شاید اس کے لیے ہمت کر رہی تھی۔ میں تیزی سے لپکا اور بروقت اس کا بازو پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ اس کوشش میں میں خود اس کے ساتھ جاتے جاتے بچا تھا کیونکہ وہ تقریباً کود گئی تھی اور مجھے اس کو پورے وزن کے ساتھ کھینچنا پڑا تھا۔ وہ جھٹکے سے آئی اور مجھ سے ٹکرائی۔ میرا توازن بگڑا تو وہ مجھ پر ہی گری تھی۔ مشعل ہمارے پاس گری اور اس سے پہلے کہ وہ بجھتی میں نے دوسرے ہاتھ سے اسے اٹھا لیا اس وقت روشنی کے لیے بس یہی ایک چیز تھی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے روبیر کو مضبوطی سے پکڑا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ پھر کودنے کی کوشش کرے گی۔ مگر اس نے مزاحمت نہیں کی اور وہ رو رہی تھی۔ میں نے اس کے بازو پر گرفت مضبوط کی اور کھڑا ہو گیا۔

''تم خودکشی کرنے یہاں آئی تھیں۔''

''ہاں میں نہیں چاہتی تھی کہ میری لاش کسی کو ملے یا

میرے انجام کا کسی کو علم ہو۔"

میں نے مشعل آگے کی اور کھائی میں جھانکا۔ جہاں تک روشنی جاتی تھی اس کی تہہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ اصل میں کھائی نہیں بلکہ بہت بڑا کنواں تھا۔ اس کا قطر کم سے کم بھی سو فٹ تھا۔ گہرائی اس سے کہیں زیادہ تھی۔ میں نے روبیر کی طرف دیکھا۔ "تمہیں اس کنویں کا علم ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "کبھی یہاں آئی تھی۔"

"واپس چلو۔"

"مجھے مر جانے دیں۔" اس نے التجا کی۔

"احمقانہ بات مت کرو۔ تمہارے اس طرح مر جانے سے کسی پر کیا اثر ہوگا۔ ہاں وہ لوگ خوش ہوں گے جنہوں نے تمہیں استعمال کیا۔ تمہیں شامین کا خیال بھی نہیں آیا۔"

"شامین۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "کیا میں اس کے قابل ہوں؟"

"ایک اور احمقانہ بات، تم نے اس پر احسان کیا ہے اس کی خاطر وہ کرنے کو تیار ہو گئیں جو کوئی لڑکی یا عورت نہیں کر سکتی ہے۔ تم اسے قبول کرو گی تو تمہارا یہ احسان اور ہوگا۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی ہوں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "اگر تم ایسا سمجھتی ہو تب بھی تمہیں یوں جان نہیں دینا چاہیے۔ زندگی اوپر والے کی امانت ہوتی ہے اور اسے ہمیشہ کسی اچھے کام میں استعمال کرنا چاہیے۔"

"اچھا کام؟"

"ہاں آرگون کو ان لوگوں سے نجات دلانا کیا اچھا کام نہیں ہے جو تم جیسی لڑکیوں کو اپنے مفاد میں اتنے گھٹیا انداز میں استعمال کرتے ہیں۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ "میں ان کا کیا بگاڑ سکتی ہوں۔"

"یہ میں تمہیں بتاؤں گا۔ اگر تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو۔ دوسری صورت میں یہ کھائی تمہارے سامنے ہے اور میں تمہیں ہمیشہ نہیں روک سکوں گا۔" میں نے کہتے ہوئے رسک لیا اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اگر وہ کنویں میں کودنے کی کوشش کرتی تو اسے بچانا مشکل ہوتا۔ اس بار اس نے سوچنے میں زیادہ وقت لیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور کھائی کی طرف دیکھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ موقع تو میرے پاس ہمیشہ رہے گا۔"

"یعنی تم نے میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"ہاں آپ نے کہا نا کہ میں کسی اچھے مقصد کے لیے جان دوں تو میں پہلے اس کی کوشش کروں گی اور اگر میں اچھے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی تو پھر......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور میرے ساتھ قدم بڑھائے۔ ہم واپس آنے لگے۔ میرے ساتھ چلتے ہوئے اس نے جھرجھری لی۔ "پتا نہیں میں کیسے رات میں یہاں تک چلی آئی۔"

"بنیادی طور پر تم ایک بہادر لڑکی ہو اور خطرات کو خاطر میں نہیں لاتی ہو۔" میں نے اس کی ہمت افزائی کی۔ "ہماری خوش قسمتی کہ اس دوران میں ہمیں کسی جانور سے واسطہ نہیں پڑا۔ دعا کرو کہ جاتے ہوئے بھی کسی سے واسطہ نہ پڑے۔ ورنہ ہمارے پاس بس یہی ایک نیزہ ہے۔"

مگر دعا قبول نہیں ہوئی اور جب ہم ٹیلے کے نزدیک تھے تو ایک گونر سے واسطہ پڑ گیا۔ وہ اچانک ہی ہمارے سامنے آیا اور یہ اس کے لیے بھی سرپرائز تھا۔ بدقسمتی وہ رکا ہوا تھا۔ ورنہ وہ حرکت کر رہا ہوتا تو اس کے جسم سے آنے والی ہڈیاں چٹخنے جیسی آواز ہمیں پہلے ہی خبردار کر دیتی۔ وہ شاید اس درخت کے تنے سے ٹکا ہوا آرام کر رہا تھا اور اسی وقت حرکت میں آیا جب ہم اس جگہ سے گزر رہے تھے۔ ایک لمحے کو وہ ششدر ہوا اور مجھے روبیر کو پیچھے کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے نیزہ اور دوسرے سے مشعل سنبھالی۔ گونر ہماری طرف لپکا تھا۔ میں نے اس کے نزدیک آنے کا انتظار کیا اور جیسے ہی وہ پاس آیا میں نے مشعل لہرائی اور اس کے منہ پر ماری۔ لہرانے سے مشعل بھڑک گئی تھی اور اس کا شعلہ بڑھ گیا تھا۔ گونر نے شاید زندگی میں پہلی بار آگ کا شعلہ براہِ راست اپنے منہ پر محسوس کیا تھا۔ اس نے منمناتی ہوئی آواز نکالی اور پیچھے ہٹ گیا۔

تقریباً چھ فٹ قامت اور ریچھ جیسی جسامت والے اس جانور کے پنجے ریچھ سے زیادہ چوڑے تھے اور یہی پنجے اس کا ہتھیار تھا۔ میں نے نیزے سے اس کی توجہ بھٹکائی اور اچانک ہی مشعل اس کے سینے پر موجود گھنے بالوں سے لگا دی۔ اس نے منمنا کر ہاتھ مارا مگر میں مشعل پیچھے کر چکا تھا۔ جب اس کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا تو میں نے مشعل اس کے ہاتھ سے لگا دی۔ یہاں بال زیادہ لمبے تھے اور انہوں نے آگ پکڑ لی۔ گونر نے بوکھلا کر ہاتھ ہلایا اور آگ بجھانے کی کوشش کی مگر وہ ہوا سے اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ ابھی وہ

اس آگ سے الجھا ہوا تھا کہ میں نے اس کی کمر سے مشعل لگا دی۔ اسے اس وقت پتا چلا جب اس کی کمر کے بالوں نے بھی آگ پکڑ لی۔ اب وہ دو طرف سے گھر گیا تھا اور اس موقع پر اس نے درست کام کیا کہ زمین پر گر کر لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ موقع تھا ہمارے پاس اور ہم بھاگے۔ روبیر پہلے ہی بھاگ کر ٹیلے تک پہنچ چکی تھی۔ میں بھی بھاگا اور جب تک گونر کھڑا ہوتا میں ٹیلے کے پیچھے آ گیا تھا میں نے مشعل اوپر پھینکی اور خود بھی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔ روبیر کنارے لیٹی ہوئی نیچے دیکھ رہی تھی۔ میری پھینکی مشعل اس نے اٹھالی تھی۔

"وہ کہاں ہے؟"

"شش۔" میں نے کہا اور اس سے لے کر مشعل بجھا دی کیونکہ کیبن کے آگے ایک مشعل اور جل رہی تھی اور دو مشعلوں کی روشنی یقیناً زیادہ ہو جاتی۔ گونر چند لمحے بعد نمودار ہوا۔ وہ تیزی سے آیا تھا اس لیے بے آواز تھا۔ یہاں آ کر اس نے چاروں طرف دیکھا مگر ہم کہیں نظر نہیں آئے۔ کیونکہ وہ خود ٹیلے پر نہیں چڑھ سکتا تھا اس لیے اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ہم اوپر ہو سکتے ہیں۔ اس کے بالوں سے لگی آگ بجھ گئی تھی مگر ہلکا سا دھواں اٹھ رہا تھا اور جلنے کی بدبو یہاں تک آ رہی تھی۔ وہ غراتا نہیں تھا بلکہ منمناتا تھا۔ اس وقت بھی کچھ دیر منمناتا رہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ ہم نے سکون کا سانس لیا تھا۔ یہ سب سے کم خطرناک جانور تھا اور اس سے بھی ہم بہ مشکل بچے تھے اس کی جگہ اسمار ہوتا تو اور مشکل میں پڑ جاتے اور ہارن سے تو بس اللہ ہی بچائے۔ مگر اسمار اور ہارن کے برعکس اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ یہ سیڑھیاں چڑھ سکتا تھا اگر وہ اسے نظر آ جاتیں۔ اس لیے میں نے مشعل بجھا دی کہ اسے سیڑھیاں نظر نہ آئیں۔ اس وقت تک روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ میں نے روبیر سے کہا۔

"تم نے کچھ آرام کر لیا ہے اب میری باری ہے تم یہاں پہرہ دو اگر کوئی بات ہو تو مجھے جگا دینا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں جگا دوں گی۔"

میں کیبن میں آیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ روبیر کی خودکشی کی کوشش نے اس کی طرف سے میرے شکوک رفع کر دیے تھے اور اب میں اس پر پورا نہیں لیکن خاصی حد تک اعتماد کر رہا تھا۔ اگر وہ دشمنوں کی طرف سے آئی ہوتی تو یوں اپنی جان دینے کی کوشش نہ کرتی۔ پھر بھی اس کی سب سے بڑی کمزوری شامی میرے دشمنوں کے قبضے میں تھا اور وہ اسے استعمال کر کے روبیر سے کچھ بھی کروا سکتے تھے۔ میں سو گیا اور جب خود آنکھ کھلی تو دن خاصا روشن ہو گیا تھا۔ روبیر نے مجھے نہیں اٹھایا تھا بلکہ وہ خود باغ میں گھاس کے تختے پر سو رہی تھی اس نے بھی نگرانی کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیا تھا اور گھاس کی نرمی نے اسے سلا دیا تھا۔ میرا بڑا کرتہ پکا نہ ہونے کی وجہ سے اس کے جسم پر بے ترتیب ہو رہا تھا۔ یہ پیروں پر گھٹنوں سے اوپر ہو گیا تھا۔ اس کی شفاف بنڈلیوں اور رانوں پر جہاں جہاں زخم تھے وہ اب سرخی مائل ہو رہے تھے اور ان میں سے کچھ یقیناً پک رہے ہوں گے۔ میں نے کھنکھار کر اسے خبردار کیا۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور پھر جلدی سے کرتہ اپنے پیروں پر کیا۔ اس نے خفت سے کہا۔ "وہ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب سو گئی؟"

"اچھا ہوا تم نے بھی آرام کر لیا۔"

اس نے ہچکچا کر کہا۔ "وہ مجھے منہ ہاتھ دھونا ہے۔"

میں سمجھ گیا۔ میں اسے لے کر ندی تک آیا اور میں نے اسے مشورہ دیا۔ "تم نہا لو، میں یہاں پودوں کے پیچھے موجود ہوں۔ مگر جلدی کرنا یہ جگہ محفوظ نہیں ہے۔"

"ہاں میں مٹی مٹی ہو رہی ہوں۔" اس نے اطمینان کا سانس لیا اور میں واپس ٹیلے کی طرف آ گیا۔ وہ کچھ دیر بعد گیلے بالوں سے پانی نچوڑتی نمودار ہوئی۔ "اب آپ چلے جائیں۔"

میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ کوئی چیز تیزی سے باہر سے اچھل کر کنارے پر گری۔ میں نے چونک کر دیکھا یہ خاصی بڑی سی مچھلی تھی۔ شاید وہ میری پانی میں موجودگی سے ڈر گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ واپس جاتی میں نے اسے دبوچ لیا۔ مچھلی نے تڑپ کر خود کو چھڑانا چاہا اور وہ شاید کامیاب بھی ہو جاتی کیونکہ اس کا جسم چکنا تھا۔ میرے لیے گرفت برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس لیے میں نے اسے ندی سے دور پودوں میں اچھال دیا اور پھر نیزہ اٹھاتے ہوئے اس طرف لپکا۔ میں نے پودوں میں تڑپتی مچھلی کو نیزے میں پرو دیا۔ وہ کچھ دیر ہلتی رہی پھر ساکت ہو گئی۔ یہ اچھی خاصی بڑی اور کوئی ڈھائی کلوگرام وزنی مچھلی تھی۔ اس کے جسم پر چھلکے کی بجائے کھال تھی اور منہ کھگا مچھلی جیسا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس وادی میں آنے کے بعد پہلی بار مجھے گوشت نصیب ہونے والا تھا۔ ورنہ اب تک سبزیوں اور دودھ دہی مکھن پر گزارا چل رہا تھا۔ میں مچھلی لے کر اوپر پہنچا تو روبیر حیران ہوئی۔

"یہ کیسے پکڑی یہ بہت مشکل سے ہاتھ آتی ہے۔"

''بس خود ہی آ گئی۔'' میں نے اسے نیزے سے الگ کیا۔ پھر نیزے کی انی سے ہی اس کا پیٹ صاف کیا۔ سر اور کھال اتاری اور اس کے ٹکڑے کیے۔ یہ کام آسان نہیں تھا مگر میں نے کسی نہ کسی طرح کر لیا۔ پھر لکڑیاں جمع کر کے آگ جلائی اور اس پر مچھلی کے قتلے بھون کر ناشتا کیا۔ روبیر اب نارمل تھی۔ مچھلی بھوننے کا کام اس نے کیا۔ اس کے اندر کا حال تو اسے ہی معلوم تھا مگر اوپر سے وہ کبھی کبھی بولتی اور مسکراتی بھی تھی۔ اس پر جو گزری تھی وہ اس کے لحاظ سے بہت بڑی قیامت تھی۔ جو اس نے جانتے بوجھتے صرف اپنے محبوب کی خاطر قبول کی تھی۔ اسے کچھ وقت چاہیے تھا اس ذلت کو بھولنے کے لیے۔ وہ اس کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ اس نے اچانک پوچھا۔ ''اب آپ کیا کریں گے؟''

''ہونے والی جنگ میں اپنا کردار ادا کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''اس کے باوجود جو آپ کے ساتھ ہوا ہے؟''

''ہاں کیونکہ اصل میں تو یہ آرگون والوں کی سازش ہے۔ وہاں بیٹھے میرے دشمنوں کا کام ہے اور مجھے ان کی سازش کو ناکام بنانا ہے۔''

''آپ اس جنگ میں سامیرا کی وجہ سے شامل ہو رہے ہیں؟''

''ایک وجہ تو یہ بھی ہے لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ دنیا میں میرے کچھ دشمن جو مجھے یہاں لائے ہیں اور وہ اس وقت ریناٹ کے مہمان ہیں۔''

روبیر اچھل پڑی۔ ''باہر سے آنے والے کچھ لوگ ریناٹ کے مہمان ہیں۔''

''ہاں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''جس بات پر کیرٹ جیسے اچھے انسان کو سزائے موت دی گئی وہی جرم اس سے کہیں بڑھ کر آرگون کے حکمران نے کیا ہے۔''

''تب آپ نے یہ بات سامیرا اور دوسروں کو کیوں نہیں بتائی۔ جب کیرٹ کو سزائے موت دی جا رہی تھی تب کیوں نہیں بتائی۔''

''سامیرا کو علم ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''برف والے نے ہمیں منع کیا تھا کہ ہم ریناٹ کے پاس موجود باہر سے آنے والوں کا ذکر نہ کریں۔''

روبیر نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''اب آپ کو مجھ پر اعتبار ہو گیا ہے تو مجھے بتا دیں کہ یہاں آپ کو کس نے پہنچایا ہے؟''

''ریک نامی نوجوان نے جو سامیرا کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے سامیرا نے میری مدد پر معمور کیا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے اس پر پورا یقین نہیں ہے۔''

روبیر نے سر ہلایا۔ ''میں اسے جانتی ہوں اور بہ ظاہر وہ اچھا انسان ہے۔''

''اسی نے اس جگہ پہنچایا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ وہ ہر تیسرے دن میرے پاس آئے گا۔''

''اگر وہ دشمن کا آدمی ہوتا تو اب تک دشمن یہاں آ چکے ہوتے۔'' روبیر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے وہ آپ سے بہت خوف زدہ ہیں اور ہر صورت آپ سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔''

''یہ حقیقت ہے۔ انہوں نے پہلے مجھے خود سزائے موت دینا چاہی مگر کیرٹ عین موقع پر نجات دہندہ بن کر آ گیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں سامیرا کی مدد کر رہا ہوں تو انہوں نے یہ چال چلی۔''

روبیر بولی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ریناٹ ہم سے کہیں زیادہ طاقتور ہے تو اس نے اب تک ہم پر حملہ کیوں نہیں کیا ہے۔''

روبیر کے اس سوال نے میرے دماغ میں جیسے ایک کھڑکی سی کھول دی تھی۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ ''سامیرا اور برف والے کو یقین ہے کہ میں جس کے ساتھ ہوں گا اسے فتح ملے گی اور ممکن ہے یہی سوچ ریناٹ کی بھی ہو اس لیے وہ پہلے مجھے سامیرا سے الگ کرنا چاہتا تھا اور اس میں کامیاب رہا، اب مجھے یقین ہے وہ جلد حملہ کرے گا۔''

روبیر بے چین ہو گئی۔ ''اور آپ سامیرا سے دور ہیں۔ اس کی فوج کو شکست ہو گی۔''

''اللہ نے چاہا تو ایسا نہیں ہو گا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''سنو تم میں ہمت ہے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''ہمیں دور جانا ہے اور شاید مشکل مرحلوں سے گزرنا پڑے۔''

اس نے جھرجھری لی۔ ''ہارن اور اسمار......؟''

''نہیں ان کی فکر مت کرو میرے پاس ان کا توڑ ہے۔ مگر ہمیں دور جانا ہو گا اور شام سے پہلے واپس بھی آنا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں تیار ہوں۔''

میں نے تیاری شروع کر دی۔ سب سے پہلے روبیر کے لباس کا مسئلہ حل کیا۔ میرا کرتہ بڑا تھا اور کچھ زیادہ ہی کھلا

ہوا تھا۔ میں نے اس کا نچلا ایک بالشت کا حصہ پھاڑا اور اسی کی مدد سے پٹکا بنا کر روبیر نے اپنی کمر سے باندھ لیا۔ پاجامے کی مجبوری تھی مگر کرتہ ویسے ہی پیروں تک آرہا تھا اس لیے ستر پوشی ہو رہی تھی۔ پٹکا باندھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ ''اب بہتر ہے ورنہ تو یہ قابو میں نہیں آرہا تھا۔''

وہ ماہر تیرانداز تھی اس لیے کمان اور ترکش اس کے حوالے کر دیا۔ خود میں نے نیزہ لیا تھا۔ پھر میں نے محلول نکالا اور اس کی مخصوص مقدار نکال کر پہلے روبیر کو دی۔ مجھے یاد تھا کہ کیرٹ نے مجھے کتنی مقدار میں محلول بھیجا تھا۔ اس بوتل میں اس جیسی کوئی ایک درجن خوراکیں تھیں۔ اس نے تجسس سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ شربت پی لو، اسے پینے کے بعد تمہیں پسینا آئے گا جس میں مخصوص مہک شامل ہو گی اور اس مہک کی وجہ سے ہارن، اسمار اور گونز جیسے خطرناک جانور پاس نہیں آئیں گے۔''

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ''سچ میں، میں نے آج تک کسی ایسے شربت کے بارے میں نہیں سنا۔''

''اسے سامیرا کے باپ اورگان نے ایجاد کیا تھا اور جب وہ مہا پجاری بنا تو یہ محلول معبد کے رازوں میں شامل ہو گیا اس لیے عام افراد اس کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔''

''آپ جانتے ہیں؟''

''ہاں یہاں آنے سے پہلے ہی اس سے واقف تھا اور یہاں آنے کے بعد اس کا عملی تجربہ بھی کیا۔ سچ سچ درندے میرے پاس آنے سے گریز کرتے تھے اور میں آرام سے جنگل سے ہوتا ہوا تم لوگوں تک آگیا۔''

''اس کا اثر کتنی دیر رہتا ہے۔''

''کم سے کم دس بارہ گھنٹے رہتا ہے۔''

روبیر نے محلول پی لیا اور پھر منہ بنایا۔ ''عجیب سا ذائقہ ہے۔''

''کچھ دیر بعد بہتر محسوس ہو گا۔'' میں نے کہا اور پیالے میں نکال کر خود بھی محلول پیا۔ سامیرا نے جو تھیلا بھیجا تھا اس میں چمڑے کی ایک چھاگل بھی تھی۔ اس میں آرام سے ڈیڑھ دو لیٹر پانی آسکتا تھا اور اس میں لگے تسمے سے اسے شانے پر لادا جا سکتا تھا۔ میں نے اس میں پانی بھرا۔ روبیر نے کچھ چقماقی ٹکیاں ساتھ لے لیں۔ دو عدد تازہ مشعلیں اور ان کو جلانے کے لیے تیلیاں بھی ساتھ لیں اور ہم روانہ ہوئے۔ روز درخت پیمائی کر کے میں نے جو سمت تعین کی تھی۔ اسے ذہن میں رکھتے ہوئے سفر شروع کیا۔ روبیر نے پوچھا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''آرگون اور معبد کے درمیان ایک جگہ۔''

''وہاں کیا ہے؟''

''آرگون اور معبد کو ملانے والی سرنگ اسی جگہ سے گزرتی ہے۔'' میں نے جواب دیا تو روبیر خاموش ہو گئی۔ ابھی دن نصف نہیں ہوا تھا۔ مگر روشنی بہت تیز تھی اور ہلکی سی گرمی کا احساس بھی ہو رہا تھا اور یہ اچھا ہوا کیونکہ ذرا سا چلنے سے ہمیں پسینا آنے لگا اور روبیر نے کہا۔ ''میرے پاس سے عجیب سی بو آرہی ہے۔''

''یہی بو ہمیں جانوروں سے محفوظ رکھے گی۔''

اس نے ذرا نزدیک ہو کر مجھے سونگھا۔ ''آپ کے پاس سے بھی آرہی ہے۔''

''یہ اچھا ہوا کیونکہ یہاں کچھ پتا نہیں کب کس جانور سے سامنا ہو جائے۔'' میں نے سر ہلایا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہمیں کوئی دس میل دور جانا تھا اور اس نارمل رفتار سے اتنا فاصلہ طے کرنے میں تین سے چار گھنٹے لگ سکتے تھے مگر میں نے رفتار کسی قدر تیز رکھی تھی۔ روبیر کا خیال کرتے ہوئے رفتار کو اتنا تیز بھی نہیں کیا تھا کہ اسے بھاگنا پڑتا اور نہ ہی اتنی کم تھی کہ تین چار گھنٹے تک سفر کرتے رہتے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں آنے جانے میں پانچ سے ساڑھے پانچ گھنٹے لگتے تو ہم تین چار گھنٹے وہاں سرنگ میں اترنے والا راستہ تلاش کر سکتے تھے۔ ہمیں لازمی آج ہی واپس آنا تھا چاہے اس میں نصف رات ہی کیوں نہ ہو جائے۔ دوسری صورت میں محلول کا اثر ختم ہو جاتا اور ہم درندوں کے خلاف اپنی ڈھال سے محروم ہو جاتے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم گیارہ بجے روانہ ہوئے تھے تو ابھی دن کی روشنی کے ہی آٹھ گھنٹے باقی تھے۔

جنگل سے گزرتے ہوئے ہم کسی قدر کھلی جگہ آئے اور یہاں ہمیں پہلے خطرے سے واسطہ پڑا۔ یہ ایک اسمار تھا جو دیکھنے میں بہت کمزور اور بیمار لگ رہا تھا۔ شاید وہ کسی قابل نہیں رہا تھا اور اسے جھنڈ سے نکال دیا گیا تھا۔ مگر ہمارے لیے وہ بھی کافی تھا۔ وہ غراتا ہوا ہماری طرف لپکا اور روبیر چیخ مار کر میرے پیچھے ہو گئی۔ اسمار دوڑتا ہوا آیا اور پھر ہمارے پاس پہنچ کر یوں رکا جیسے درمیان میں کوئی دیوار آگئی ہو۔ اس نے منہ اٹھا کر سونگھا اور ناپسندیدہ انداز میں غراتا ہوا پیچھے ہٹا۔ کئی بار اس نے آگے آنے کی کوشش کی اور میں نیزہ لے کر بالکل تیار تھا۔ جانور کا کیا بھروسا اگر وہ پاگل

ہو جائے تو شاید اس بُو کی پروا بھی نہ کرے۔ مجھے اعتماد تھا کہ میں نیزے سے اس اسمار کو قابو کر سکتا تھا۔ دوسری طرف روبیر نے بھی تیر کمان نکال لیا اور اسمار کی طرف تیر کا رخ کیا تھا کہ وہ غراتا ہوا فرار ہو گیا۔ اس گرگ باراں دیدہ کو تیر کی خطرناکی کا خوب علم تھا۔

''شکر ہے بھاگ گیا۔'' روبیر نے تیر واپس ترکش میں رکھا اور کمان کمر سے لٹکالی۔ ''یہ چیز حیرت انگیز ہے۔''

''میں خود اس کی وجہ سے ہارن سے بچا ہوں۔ اس کے پاس موقع تھا کہ وہ مجھے پکڑ لے مگر وہ میرے پاس بھی نہیں پھٹکا۔''

روبیر غور کر رہی تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ''اب بو تیز ہو گئی ہے۔''

کھلی جگہ آنے اور کسی قدر آگے نکلنے کے بعد کئی میل دور شمال مشرق میں آرگون کی فصیل نظر آنے لگی تھی مگر ہمیں اس سے کترا کر شمال کی طرف سفر جاری رکھنا تھا۔ اس طرف آرگون کے کھیت اور باغات تھے اور ہمیں ان سے بھی دور رہنا تھا۔ ان کھیتوں میں کام کرنے والوں کے علاوہ مسلح سپاہی بھی ہوتے تھے جو اصل میں کارکنوں کی حفاظت کے لیے معمور تھے۔ اگر وہ ہمیں دیکھ لیتے تو ہم مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ جب ہم کھیتوں اور باغات کے پاس آئے تو سپاہیوں کی نظر سے محفوظ رہنے کے لیے ہم نے نومینز لینڈ کے پاس جنگل کا رخ کیا۔ وہاں ہم کسی کی نظر میں آئے بغیر سفر کر سکتے تھے۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا تھا اور اب آرگون شہر ہمارے دائیں طرف مشرق میں تھا۔ گویا زیادہ فاصلہ نہیں رہا تھا۔ میں خاص تھکن محسوس نہیں کر رہا تھا مگر روبیر کا سانس پھول گیا تھا اس لیے ہم کچھ دیر کو ستانے کے لیے رکے۔ میں نے چھاگل سے پانی پیا اور پھر روبیر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اگر تم تھکن محسوس کر رہی ہو تو ہم کچھ دیر کو رک جاتے ہیں۔''

اس نے انکار کیا۔ ''نہیں آپ زیادہ مت رکیں، مجھے اتنی تھکن نہیں ہو رہی ہے۔''

اس نے گزشتہ دن جسمانی اور ذہنی لحاظ سے بدترین دن گزارا تھا۔ اتنی جلد اس کا ری کور ہونا مشکل تھا۔ اسے جہاں جہاں زخم آئے تھے وہ اب پک گئے تھے اور انہیں ٹھیک ہونے میں دو تین دن کا وقت لگتا۔ اعصاب نے جو دباؤ سہا تھا وہ الگ تکلیف تھی۔ وہ یقیناً ہمت کر کے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ویسے یہ اس لحاظ سے اس کے لیے بہتر تھا کہ وہ فارغ بیٹھ کر سوچنے کی بجائے میدان عمل میں تھی۔ وہ جتنا کم سوچتی اس کے لیے اتنا ہی اچھا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم چلنے کو تیار ہوئے۔ اتنا آرام کافی تھا۔ مگر کچھ ہی آگے گئے ہوں گے کہ ایک چیخ سنائی دی۔ چیخ نسوانی تھی۔ میں نے روبیر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی چیخ سنی تھی اور آہستہ سے بولی۔ ''کوئی عورت چیخی ہے۔''

''یہاں کوئی جانور یا پرندہ اس قسم کی آواز نہیں نکال سکتا ہے؟''

''میں ایسے کسی جانور یا پرندے سے واقف نہیں ہوں۔''

آواز سامنے سے آئی تھی اور ہمیں اسی طرف جانا تھا۔ دس بارہ قدم آگے گئے تو چیخ پھر سنائی دی اور اس بار زیادہ بلند اور زیادہ نزدیک سے آئی تھی۔ روبیر نے تیر نکال کر کمان پر لگا لیا اور میں نے نیزہ آگے کر لیا ہم درختوں کے اس گھنے جھنڈ کی طرف بڑھے جہاں سے چیخ سنائی دی۔ نزدیک جانے پر چند مردانہ آوازیں بھی سنائی دیں۔ جو کچھ اس قسم کی تھیں۔

''مضبوطی سے پکڑو...... اس کا منہ بند کرو...... اس کی چیخ سن کر کوئی آ گیا تو...... تو کیا اسے بھی حصہ دیں گے۔''

واضح رہے یہ ساری آوازیں مختلف مردوں کی تھیں اور ان سے صورتِ حال کسی قدر واضح تھی۔ باقی آنکھوں سے دیکھ کر پتا چل گیا۔ تین سپاہیوں نے ایک جوان عورت کو قابو کیا ہوا تھا۔ ایک نے اس کا منہ دبایا ہوا تھا اور باقی دو اسے بے لباس کر رہے تھے۔ میں نے بتایا کہ یہ آسانی سے پہنا اور اتارا جانے والا لباس ہے مگر اپنی کسی حیوانیت کی تسکین کے لیے وہ لباس پھاڑ کر اتار رہے تھے اور عورت کے مچلنے سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میرا خون کھولا تھا کیونکہ مجھے دنیا میں کسی فعل سے اتنی نفرت نہیں ہے جتنی کہ اس فعل سے ہے۔ میں نے نیزہ سیدھا کیا تھا مگر روبیر بازی لے گئی۔ اس نے سب سے نزدیک موجود سپاہی کو تیر مارا جو اس کی گردن میں اتر کر دوسری طرف نکل گیا اور وہ خرخراتا ہوا زمین پر گر گیا۔ باقی دو چلائے اور اپنے ہتھیاروں کی طرف بھاگے تھے۔ روبیر پھر تیر کمان پر چڑھا رہی تھی کہ میں نے اس سے کہا۔

''رک جاؤ...... تیر مت چلانا۔'' میں نے کہتے ہوئے اپنا سامان اور پٹکا کھولتے ہوئے کرتہ بھی اتار دیا۔ تب تک سپاہی اپنے نیزے اٹھا چکے تھے۔ روبیر بے چین ہو گئی۔

''آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ بہت ماہر ہوتے

ہیں۔“

”یہی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ان میں سے کوئی تمہاری طرف آئے یا عورت کو نقصان پہنچانا چاہے تو اسے پہلی فرصت میں مار دینا۔ مگر جب تک میں کمزور نہ پڑوں درمیان میں مت آنا۔“

سپاہیوں کے پاس اگر تیر کمان تھے تب بھی وہ کہیں چھوڑ آئے تھے اور یہاں ان کے پاس صرف نیزے اور سامنے پٹکوں میں سنگی چاقو تھے۔ ایک نے براہِ راست نیزہ میرے سینے میں اتارنے کی کوشش کی۔ میں نے ترچھا ہوتے ہوئے اس کا وار خالی جانے دیا اور پھر نیزہ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ یہ داؤ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ وہ کھنچا چلا آیا اور نزدیک آنے پر میں نے اس کے سینے پر لات ماری۔ وہ پیچھے جا گرا۔ میں نے اس کا نیزہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسی اثنا میں دوسرا مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے نیزہ میرے پیٹ میں مارنا چاہا مگر میں نے اپنے نیزے سے اس کے وار کو روکتے ہوئے اس کا نیزہ گھمایا اور وہ میرے شانے کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ جس وقت میں اس کا نیزہ اپنے نیزے سے گھمار ہا تھا اور میرا جسم ترچھی پوزیشن میں آیا ہوا تھا۔ اس کا بایاں پاؤں وار کرنے کی پوزیشن میں آگے تھا اور میرا بایاں پاؤں بچنے والی پوزیشن میں تھا۔

میں نے اسی پوزیشن میں پاؤں اٹھا کر اس کے بائیں گھٹنے پر مارا۔ وار شدید تھا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی کراہ سے ظاہر تھا کہ چوٹ شدید آئی ہے۔ وہ اپنا گھٹنا پکڑ کر لڑکھڑانے لگا اس دوران میں پہلا والا اٹھ کر آیا اور اس نے دوبارہ میرے سینے میں نیزہ اتارنے کی کوشش کی۔ میں پیچھے کی طرف جھکا اور نیزے کی انی میرے چہرے کے سامنے سے نکلتی چلی گئی۔ میں اتنا پیچھے جا چکا تھا کہ توازن رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ پیچھے گرا اور فوراً ہی کروٹ لی ورنہ اس بار نیزہ جسم میں اترا جاتا۔ نیزہ زمین میں اتر گیا تھا اور وہیں پھنس چکا تھا۔ میں نے واپس کروٹ لیتے ہوئے نیزہ پکڑ لیا دوسرے ہاتھ سے اپنا نیزہ اس کی ران پر مارا۔ پوزیشن درست نہ ہونے سے وار ہلکا پڑا تھا اس کے باوجود اس کی ران پر زخم آیا اور وہ کراہ کر پیچھے ہوا۔ روبیر چلائی۔ ”شہباز بچیں۔“

دوسرا اپنے گھٹنے سے فارغ ہو کر مجھ پر چھلانگ لگا رہا تھا اور اس نے نیزہ سیدھا کر لیا تھا۔ میں نے اس سے بچنے کے لیے پھر کروٹ لی اور وہ میری خالی کی ہوئی جگہ آ کر گرا۔ اس نے نیزے کا رخ بدلنا چاہا مگر نیزہ مجھ سے دور ہی رہا اور زمین پر لگا۔ اس بار بھی میں بال بال بچا۔ روبیر بولی۔ ”میں تیر مار رہی ہوں۔“

میں نے واپس پلٹتے ہوئے ساتھ گرنے والی کی کن پٹی پر کہنی آزمائی اور روبیر کو منع کیا۔ ”تیر مت چلانا۔“

اس دوران میں پہلا زمین سے نیزہ نکال چکا تھا۔ اس نے دانت کچکچا کر مجھ پر وار کیا۔ میں اسی کی طرف پلٹ گیا اور نیزہ دوسرے کے دائیں پہلو میں اتر گیا۔ کن پٹی پر آنے والی چوٹ نے اس کے حواس گم کر دیے تھے مگر نیزہ نے اس کے سارے حواس بالکل بجا کر دیے اور وہ گلا پھاڑ کر چلایا تھا۔ اس کا ساتھی نیزہ چھوڑ کر پیچھے ہٹا۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنے ہی ساتھی کو نشانہ بنا لیا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے نیزہ اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس نے دونوں ہاتھ بلند کر لیے تھے۔ جسے روبیر نے تیر مارا تھا وہ دم توڑ چکا تھا اور نیزے کا زخمی بھی آخری دموں پر لگ رہا تھا۔ تیسرا ہاتھ اوپر کیے موت کے خوف سے لرزہ براندام تھا۔ چند منٹ پہلے یہ تینوں ایک مجبور اور بے بس عورت کے سامنے فرعون بنے ہوئے تھے۔ بے بس ہو جانے والی عورت ایک طرف کھڑی اپنے پھٹ جانے والے لباس کو پکڑ کر ستر پوشی کر رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور اسے صرف اپنی ستر پوشی کا خیال تھا۔ میں نے روبیر کی طرف دیکھا۔

”اس سے پوچھو۔ اس کا تعلق فوج کے کس حصے سے ہے؟“

روبیر کے سوال پر اس نے گڑگڑا کر جواب دیا۔ ”میرا تعلق کسانوں کی حفاظت کرنے والے دستے سے ہے۔ سینتور کے لیے مجھے مت مارنا۔“

”اگر تم نے میرے سوالوں کے جواب دیے تو تم زندہ رہو گے لیکن جیسے ہی تم نے غلط بیانی کی تم مارے جاؤ گے۔“

ان لوگوں سے مقابلہ کرتے ہوئے میرے ذہن میں ایک تو اپنی جسمانی کنڈیشن جانچنا تھا اور دوسرے اگر ان میں سے ایک بھی قابو میں آ جاتا تو میں اس آرگون کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ روبیر کے توسط سے میں اس سے سوال کرنے لگا۔ روبیر میرا بتایا ہوا سوال کرتی تھی کیونکہ وہ جو کہہ رہا تھا وہ میں خود بھی سمجھ رہا تھا۔ اس لیے وہ سوال کرنے کے بعد عورت سے بات کرنے میں لگ جاتی۔ یہ اچھا تھا کہ کم سے کم وقت میں ہمیں زیادہ معلومات مل رہی تھیں۔ اس لیے میں نے روبیر کو بات کرنے پر نہیں

ڈ کا۔ میں نے پوچھا۔

''آرگون میں جنگ کی تیاری کس مرحلے میں ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''کل تک تو خاص نہیں تھیں مگر اب جنگ کی تیاری تیزی سے جاری ہے۔''

''ریناٹ کے پاس فوج کی تعداد کتنی ہے۔''

ان کے ہاں حساب کتاب کا خاصا پیچیدہ سا سسٹم تھا اور اس نے جو جواب دیا اس کے مطابق ریناٹ کی کل فوج تین ہزار سے کچھ اوپر تھی۔ لیکن یہ سب اعلیٰ تربیت یافتہ اور بہترین ہتھیاروں سے لیس تھی۔ سامیرا کے پاس اس سے نصف فوج تھی اور اس کے پاس بعض اہم ہتھیاروں کی کمی تھی۔ میں نے اس کے لیے کچھ دفاعی حکمتِ عملی ترتیب دی تھی لیکن میرے بعد نہ جانے اس پر ٹھیک سے عمل ہوتا ہے یا نہیں۔ میں نے جو گھاس کے گٹھوں کی لائن بنائی تھی۔ اس کے لیے آگ لگانے والی رال خاصی مقدار میں جمع کر لی گئی تھی اور تقریباً تیس افراد رضا کاروں میں سے صرف اسی مقصد کے لیے تھے کہ جب انہیں اشارہ کیا جائے تو وہ ان گٹھوں پر رال ڈال دیں۔ پھر جب ضرورت پڑتی آتشیں تیر برسا کر ان کو آگ لگا دی جاتی۔ یہ کام مکمل ہو گیا تھا۔ مگر سومرد کے توسط سے آرگون والوں تک اس دفاعی حکمتِ عملی کی اطلاع پہنچ چکی ہوگی۔

گٹھوں کے اوپر بڑی لکڑیاں جمع کی گئی تھیں اور دور سے دیکھنے پر یہ حفاظتی دیوار جیسی کوئی چیز نظر آتی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آتشیں تیر... بھی تیار کرائے تھے۔ سو تیر اندازوں کا ایک دستہ آتشیں تیروں سے حملہ کرتا۔ یوں حملے اور دفاع دونوں میں آگ کا استعمال آرگون کی فوج کے لیے سرپرائز ہوتا۔ اگرچہ وہ اس سے واقف بھی ہوتے تب بھی انہیں عملی سامنا کرنا پڑتا جو الگ چیز تھی۔ زبانی کلامی علم الگ ہوتا ہے اور عملی سامنا الگ ہوتا ہے۔ میں سپاہی سے جو سوال کر رہا تھا۔ اس کا مقصد آرگون کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا تھا۔ مگر چند سوالوں کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اتنا زیادہ نہیں جانتا ہے۔ اس کی وجہ بھی جلد سامنے آ گئی۔

بدقسمتی سے یہ سپاہی کسانوں کی حفاظت پر معمور تھا اور اسے آرگون کے معاملات کا اتنا علم نہیں تھا۔ خاص طور جنگ کی تیاریوں اور آرگون کے حفاظتی انتظامات کا۔ اس کے باوجود اس نے میری معلومات میں خاصا اضافہ کیا تھا۔ اس کے مطابق اب قلعے کے عام لوگوں پر رات ہونے کے بعد گھر سے نکلنے کی پابندی تھی۔ گویا کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ سوائے فوج اور انتظامیہ کے کوئی فرد باہر نہیں آ سکتا تھا اور جو اس کی خلاف ورزی کرتا اسے کڑی سزا دی جاتی۔ آرگون اور معبد کو ملانے والی سرنگ میں بھی تاریکی چھانے کے بعد آمد و رفت بند کر دی جاتی تھی۔ البتہ سپاہی رات میں بھی اسے استعمال کر سکتے تھے۔ پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے والے سخت سزا کے مستحق سمجھے جاتے۔ جب میں نے اس سے کیرٹ کی موت پر لوگوں کا ردِعمل پوچھا تو اس نے ہچکچا کر جواب دیا۔ ''لوگوں نے اسے اچھا نہیں سمجھا۔ کیونکہ کیرٹ پجاریوں میں ایک ایسی شخصیت تھا۔ جو عام لوگوں سے ہمدردی رکھتا تھا اور ان کے کام آتا تھا۔''

اس سے ممکنہ حد تک معلومات حاصل کر کے آخر میں عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم لوگ اس کے ساتھ زبردستی کر رہے تھے کیا تمہیں خوف نہیں تھا کہ تمہیں سزا ملے گی۔''

اس نے ہچکچاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''ان دنوں فوج کے خلاف کوئی شکایت نہیں سنی جا رہی ہے۔''

بات واضح تھی ریناٹ، سامیرا اور حریت پسندوں کے خلاف جنگ لڑنے جا رہا تھا اور یہ جنگ اس کے سپاہیوں نے لڑنی تھی اس لیے اس نے انہیں کھلی چھوٹ دے دی تھی کہ وہ کچھ بھی کریں ان کو کوئی سزا نہیں دے گا۔ اسی کا فائدہ اٹھا کر یہ لوگ باغ میں کام کرنے والی اس عورت کو زبردستی یہاں لا کر اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ میرے خیال میں اب اس سے مزید سوالات کی ضرورت نہیں رہی تھی اس نے پُراُمید لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہارے ہر سوال کا ٹھیک جواب دیا ہے اب مجھے جانے دو۔''

میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کا معاملہ اس عورت اور روبیر پر چھوڑ دوں گا۔ مجھے معلوم تھا روبیرا سے نہیں چھوڑے گی۔ اس نے جس طرح پہلے سپاہی کو مارا تھا اس سے مجھے اس کے دل میں ان لوگوں کے خلاف نفرت کا اندازہ تھا۔ میں اسے کہنے جا رہا تھا کہ اسی لمحے روبیر نے مجھے آواز دی اور میں نے مڑ کر دیکھا۔ روبیر اشارہ کر رہی تھی اور وہ جس طرف اشارہ کر رہی تھی وہاں وہی بوڑھا اور کمزور ہو جانے والا اسمار موجود تھا۔ وہ شاید چھپ کر ہمارا پیچھا کرتا رہا تھا۔ وہ ہمارے قریب نہیں آیا تھا۔ تیسرا سپاہی سمجھا کہ ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں اور وہ اٹھ کر اچانک بھاگا۔ مگر اسے زیادہ دور جانا نصیب نہیں ہوا۔ بوڑھے اسمار نے اسے چند جستوں میں آ لیا تھا۔ اسمار نے اسے منہ کے بل زمین پر گرایا

اور اس پر اپنے دانت اور پنجے آزمانے لگا۔
اسمار اگرچہ بوڑھا ہو گیا تھا مگر پھر بھی درندہ تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے سپاہی کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اس دوران میں وہ بری طرح چیخ چلا رہا تھا اور اس پر مشتعل ہو کر اسمار نے ایک بار جو اس کی گردن دبوچی تو اس وقت چھوڑی جب اس کا دم نکل گیا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کی بے تابی بتا رہی تھی وہ بہت بھوکا تھا اور شاید ہفتے بھر سے اسے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ تیسرے سپاہی کا یہ بہت مناسب انجام ہوا تھا اور مجھے یا روبیر کو اس کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنے پڑے تھے۔ روبیر دل چسپی سے دیکھ رہی تھی اور عورت دم بہ خود کھڑی تھی۔ یہ منظر ایسا تھا کہ اس کے ہاتھ سے اپنا لباس بھی چھوٹ گیا تھا اور پھٹے حصوں سے اس کا جسم جھلکنے لگا تھا۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ''اس کا خیال رکھنا۔''

روبیر نے سر ہلایا اور میں مرنے والے سپاہیوں کا لباس اتارنے لگا۔ دونوں کا ہی لباس خون آلود ہو گیا تھا مگر اسے صاف کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی یہ سرخ رنگ کا تھا اگر وجہ پوری طرح صاف نہ بھی ہوتے تب بھی کام چل سکتا تھا۔ اس طرح ان کی زرہ بکتر بھی اتاریں اور آخر میں ان کے ہتھیار سمیٹے۔ عورت نے بتایا کہ تیر کمان انہوں نے جھنڈ کے باہر رکھے تھے۔ میں بلا خطر سپاہی کو کھاتے اسمار کے پاس سے گزرا تو وہ میرے پاس سے آتی بو پر ایک طرف ہو گیا۔ میں تیروں سے بھرے ترکش اور کمانیں اٹھا لایا۔ یہ سامیرا کی فوج کے پاس موجود کمانوں سے بہتر اور زیادہ مضبوط تھیں۔ اسی طرح تیروں کی کوالٹی بھی بہت عمدہ تھی۔ میں نے مرنے والے سپاہی کی گردن سے تیر اور دوسرے کے جسم سے نیزہ الگ کر لیا۔ روبیر نے پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں؟''
''انہیں بھی یہ اسمار یا دوسرے اسمار کھا لیں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کی موت کسی انسان کی کارستانی سمجھی جائے۔''
''اس صورت میں ان کے ہتھیار اور لباس لے جانا مناسب ہو گا۔ اسمار لباس پھاڑ سکتے ہیں اور ہتھیاروں کا انہوں نے کیا کرنا ہے۔''
اس کی بات مناسب تھی۔ میں نے یہ کیا کہ ایک ترکش اور کمان اور ایک اضافی نیزہ لے لیا۔ باقی چیزیں اس طرح پھیلا دیں جیسے اسماروں کے حملے میں وہ ادھر اُدھر ہو گئی ہوں اب ان میں سے کچھ غائب ہوں گی تب بھی کسی کو شک نہیں ہو گا۔ لباس کے بارے میں اگر کوئی سوچتا ہے سوچتا رہے۔ لیکن ایک مسئلہ بدستور باقی تھا جس کی طرف میں نے ابھی تک توجہ نہیں دی تھی۔ روبیر نے اب عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے یہ سب بتا دے گی۔''
میں عورت کے پاس آیا تو وہ جلدی سے اپنے لباس کے پھٹوں حصوں کو درست کرنے لگی۔ وہ تقریباً پینتیس برس کی مگر جسمانی لحاظ سے جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ اس کے سرخی مائل بھورے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر خراشوں اور مار کے نشانات تھے۔ مگر یہ بہت نمایاں بھی نہیں تھے۔ ہم بروقت پہنچ گئے تھے۔ ورنہ یہ درندے اس عورت کا اس سے کہیں زیادہ برا حشر کر دیتے اور اگر وہ زندہ بچتی تب بھی کسی کو صورت دکھانے کے لائق نہیں رہتی۔
میں نے روبیر کے توسط سے کہا۔ ''تم اپنی زبان بند رکھو گی۔ دوسری صورت میں تمہیں بھی ان تین سپاہیوں کی ہلاکت میں شامل سمجھا جائے گا۔ ہم تو ملیں گے نہیں تمہیں ضرور سزائے موت ہو جائے گی۔''
وہ کانپ اٹھی۔ ''میں کسی سے نہیں کہوں گی، اپنی زبان بند رکھوں گی، میرے تین چھوٹے بچے ہیں۔ میں مرگئی تو ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''
''تم کام کیوں کرتی ہو؟''
''میرا شوہر مر چکا ہے وہ باغ میں کام کرتا تھا اب اس کی جگہ میں کرتی ہوں۔'' عورت نے سادہ سی وجہ بتائی۔
''مگر بے سہارا عورتوں کی تو حکومت کفالت کرتی ہے۔'' روبیر نے حیرت سے کہا۔
''پہلے کرتی تھی اب نہیں کرتی ہے۔'' عورت تلخی سے بولی۔ ''اب ہر فرد کو کام کرنا پڑتا ہے۔ جن عورتوں کے مرد نہیں ہوتے ان کو کام کرنا پڑتا اور جن بچوں کے ماں باپ مر جائیں انہیں سرکاری افسران اور حکومتی اہمال اپنے غلاموں میں شامل کر لیتے ہیں۔''
عورت کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ آرگون میں جبر و استبداد کا نظام پوری طرح نافذ ہو چکا تھا۔ ایک بار مزاحمتی تحریک کا خاتمہ ہو جاتا تو وادی کے لوگ بدترین قسم کی غلامی کی لپیٹ میں آ جاتے۔ میں نے کہا۔ ''اب تم جاؤ اور اپنی زبان بند رکھنا۔''
''میرا پھٹا ہوا لباس سب کی نظروں میں آئے گا۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔ میں نے سوچا اور اپنا کرتہ اس کی طرف بڑھا دیا۔
''تم یہ پہن لو۔''

یہاں زیادہ تر امرا اور عوام سفید لباس ہی پہنتے تھے۔ میرا کرتہ بھی سفید تھا۔ عورت ہچکچائی لیکن پھر اس نے کرتہ لے لیا اور درخت کی آڑ میں جا کر بدل لیا۔ میں نے روبیر سے پوچھا۔ ''تم نے اسے ہمارے بارے میں بتایا تو نہیں؟''

''اس نے پوچھا تو تھا لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔''

''تم نے اچھا کیا۔''

عورت لباس پہن کر آگئی اور میں نے اس کا پھٹا ہوا کرتہ لے لیا یہ کہیں نہ کہیں کام آجاتا۔ روبیر نے اسے جانے کو کہا تو وہ سہمے انداز میں اسمار سے دور ہو کر جانے لگی۔ مگر ہم سے جدا ہوتے ہی اسمار نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر غراتا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا کہ عورت چیخ مار کر واپس بھاگی اور ہمارے درمیان میں آگئی۔ جیسے ہی وہ ہمارے پاس آئی اسمار اپنے کام میں لگ گیا تھا۔ روبیر نے کہا۔ ''اس کے پاس سے بو نہیں آرہی ہے اسمار اسے بھی مار دے گا۔''

''اسے باغ تک چھوڑ کر آنا ہوگا۔'' میں نے کسی قدر فکرمندی سے کہا۔ روبیر سمجھ گئی تھی۔

''آپ یہیں رکیں میں اسے چھوڑ کر آتی ہوں۔''

روبیر نے عورت کو ساتھ لیا اور وہ درختوں سے نکل کر کھلے میدان سے ہوتے ہوئے باغات کی طرف بڑھے اور جب پاس پہنچے تو روبیر رک گئی اور عورت تیزی سے باغوں کی طرف بھاگی۔ روبیر نے انتظار نہیں کیا کہ عورت باغ میں داخل ہو وہ فوراً واپس آگئی۔ یہاں خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی سپاہی آسکتے تھے۔ اسی خطرے کو مدِنظر رکھتے ہوئے روبیر فوراً واپس آئی تھی اور جیسے ہی وہ درختوں میں داخل ہوئی ہم آگے بڑھ گئے۔ اسمار جس کے لیے ایک سپاہی کی لاش بھی کافی تھی وہ اسے چھوڑ کر اب دوسری لاش پر پلا پڑ رہا تھا۔ اگرچہ یہ انسان کی توہین تھی کہ اسے درندوں کی غذا بننے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ مگر یہ انسان کہاں تھے یہ تو دو پیروں پر چلنے والے درندے تھے۔ وہ اسی سلوک کے مستحق تھے۔ پھر میں چاہتا تھا کہ ہمارے بارے میں کوئی نہ سوچے۔ ان سپاہیوں کی ہلاکت کا الزام اسمار کے سر جائے۔ مجھے اُمید تھی کہ جلد وہاں اور اسمار بھی آئیں گے اور ان کی ہڈیاں بھی باقی نہیں رہیں گی۔ میں نے روبیر سے پوچھا۔

''کیا خیال ہے یہ عورت زبان بند رکھے گی۔''

''ہاں میں نے ربان کو سمجھا دیا ہے۔ راستے میں بھی اسے پکا کرتی رہی تھی کہ وہ چپ رہے ورنہ ریناٹ جیسے ظالم سے کچھ بعید نہیں ہے وہ اس کے ساتھ اس کے بچوں کو بھی مروا دے گا۔''

''یہ تم نے اچھا نقطہ دیا ورنہ عورت کی زبان بند رکھنا بہت مشکل کام ہے۔''

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''عورتیں کہاں زیادہ بولتی ہیں۔''

میں بے ساختہ ہنسا۔ ''ہمارے ہاں بھی عورتیں یہی کہتی ہیں۔''

میری بات پر وہ کسی قدر خفا نظر آنے لگی۔ اس نے رخ دوسری طرف کر لیا تھا اور اس کے بعد بات نہیں کی۔ مجھے ہی پہل کرنا پڑی تھی۔ ''یہ اچھا ہوا کہ ہمیں آرگون کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئیں۔''

وہ خفگی بھول گئی۔ ''اگر سرنگ میں اترنے کا راستہ مل گیا تو......؟''

''آج ہم راستہ تلاش کریں گے اور ممکن ہوا تو کل رات اس میں اتریں گے۔''

''پھر......؟''

''ہمیں شہر میں ریناٹ کی فوج کی تیاریاں دیکھنی ہوں گی۔''

''اگر ہم یہ کام کر بھی لیں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''فائدہ ہوگا۔'' میں نے یقین سے کہا۔ وہ ایک محدود دنیا کی باسی تھی اگرچہ وہ ذہین تھی مگر جنگی حکمتِ عملی اور اس میں جاسوسی کی اہمیت سے ناآشنا تھی۔ اس وقت ہم آرگون کی فصیل کے ساتھ ویران حصے میں آگئے تھے۔ باغات اور کھیت ختم ہوگئے تھے اور یہاں اب گھنے جنگل تھے یا جھاڑیوں اور گھاس سے بھرے ہوئے میدان تھے۔ اب ہم وادی کے خطرناک ترین حصے میں داخل ہو رہے تھے کیونکہ یہی ہارن کا اصل مسکن تھا۔ روبیر جانتی تھی اور وہ مخلول کی کارکردگی دیکھنے کے باوجود سہمی ہوئی نظر آنے لگی۔ چلنے کے دوران اس کی نظر مستقل آس پاس بھٹک رہی تھی۔ اسے فری ہینڈ دینے کے لیے میں نے سارا سامان خود اٹھا رکھا تھا۔ اس میں سپاہیوں کا لباس اور ہتھیار بھی تھے۔ یہ سب میں نے عورت کے پھٹے لباس میں لپیٹ کر گٹھری سی بنالی تھی اور اسے شانے پر لادا ہوا تھا۔ دوسرے شانے پر چھاگل اور ترکش و کمان تھی۔ ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے میں مشعلوں والی لکڑیاں تھیں۔ روبیر نے صرف تیر کمان اٹھایا ہوا تھا۔

اس چکر میں کچھ وقت ضائع ہوا تھا۔ مگر مجھے اُمید تھی کہ ہماری واپسی تک محلول کا اثر رہے گا۔ جب کیرٹ نے مجھے معبد سے فرار کرایا تھا تو اس نے محلول دیا تھا مگر بدقسمتی سے دورانِ سفر پانی نہ ملنے کی وجہ سے مجھے پسینا آنا بند ہو گیا تھا اور بُو مدھم پڑ گئی تھی مگر اب ہمارے پاس پانی تھا اور راستے میں آنے والے ایک چشمے سے میں نے دوبارہ چھاگل بھر لی تھی۔ اس لیے پانی کی کمی نہیں تھی۔ اُمید تھی ہمیں شام تک پسینا آتا رہتا اور اس میں محلول کی بو شامل ہو کر جانوروں کو ہم سے دور رکھتی۔ دن ڈھلنے کا آغاز تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ دو بج رہے تھے اور ہم سفر کے آخری مرحلے میں تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سرنگ تازہ ہوا کی آمدورفت کے لیے بنائے ہوئے سوراخ یہاں جنگل میں کس صورت میں موجود تھے۔ لازمی بات تھی کہ انہیں کھلا تو نہیں چھوڑا گیا ہوگا ورنہ جنگل کے جانور ان سے سرنگ میں گھس سکتے تھے۔ ان کے تحفظ کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہوگا۔ اس وقت ہم آرگون کے عقبی حصے میں تھے۔

یہاں سے معبد ذرا فاصلے پر تھا۔ ہمیں آرگون اور معبد کے درمیان میں اس سرنگ کے ہوادان تلاش کرنے تھے۔ ہم جھاڑیوں سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک خاصا بڑا اور خوش رنگ پرندہ سامنے آیا۔ اس نے ہمیں دیکھا لیکن کسی خوف کا اظہار نہیں کیا۔ وہ شاید انسانوں سے مانوس تھا یا اس نے پہلی بار کسی انسان کو دیکھا تھا۔ اس کے رنگ بڑے دلکش اور پر ذرا پھولے پھولے سے تھے۔ میں نے دل چسپی سے دیکھا مگر روبیر خوفزدہ نظر آنے لگی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اس سے دور ہوں۔ یہ پر جھاڑتا ہے تو بہت باریک زہریلے کانٹے نزدیک موجود جاندار کو لگتے ہیں اور اس کا زہر بہت مہلک ہے۔“

اس وقت ہم پرندے سے کوئی بیس پچیس گز کے فاصلے پر تھے۔ روبیر کی بات نے پرندے کی خوشنمائی کے بارے میں میرے خیالات کو اڑا کر رکھ دیا تھا۔ میں محتاط ہو گیا اور ہم سست روی سے پیچھے ہٹنے لگے اور روبیر نے بہت آہستہ سے کمان اس کی طرف کی۔ تیر پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔ مگر جیسے ہی تیر اس کی طرف ہوا اس نے مکروہ سی آواز نکالی اور جن جھاڑیوں سے نکلا تھا مڑ کر انہی میں گھس گیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور حیرت سے کہا۔ ”اتنا خطرناک ہوتا ہے یہ پرندہ؟ دیکھنے میں تو یہ بہت بے ضرر اور خوب صورت لگ رہا ہے۔“

”یہ صرف اسی علاقے میں ہوتا ہے اور اس سے سارے جانور ڈرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہارن جیسا درندہ بھی اس کے سامنے نہیں رکتا بھاگ جاتا ہے۔“

ظاہر ہے موت کے سامنے کون رکے گا۔ ہم ان جھاڑیوں سے دور ہو کر گزرے اور کچھ دیر بعد ہم آرگون اور معبد کے درمیان میں تھے۔ یہاں چٹانیں تھیں۔ جنگل تھا اور کہیں کہیں خشک جھاڑیوں اور گھاس کے قطعے تھے۔ مگر یہاں کوئی چیز زیادہ وسیع نہیں تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا مگر مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جسے میں سرنگ کا ہوادان کہہ سکتا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ کسی بلند جگہ سے آس پاس کا جائزہ لوں اور سب سے مناسب جگہ ایک بلند ٹیلہ لگا جو تقریباً ستر اسّی فٹ بلند تھا اور اس پر چڑھنے کے امکانات بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ میں اور روبیر ٹیلے تک آئے۔ سامان نیچے چھوڑنے میں خطرہ تھا اس لیے ہم اسی سمیت اوپر چڑھے اور ایک مناسب جگہ ہم نے سامان اور ہتھیار رکھ دیے۔ ان کے ساتھ اوپر جانا بہت مشکل تھا کیونکہ اب ہمیں باقاعدہ کوہ پیمائی کرنا تھی۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ”تم یہیں رکو۔ میں اوپر سے آتا ہوں۔“

”نہیں جہاں تک میں چڑھ سکوں گی میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔“

میں نے سر ہلایا اور اوپر چڑھنے لگا۔ ٹیلہ پتھر اور مٹی پر مشتمل تھا اس لیے جہاں مٹی تھی وہاں پودے اور سبزہ بھی اگا ہوا تھا۔ جہاں جگہ تھی وہاں کچھ درخت نما جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ ہم مضبوط پودوں، پتھروں اور مٹی سے نکلی جڑوں کو پکڑ کر اوپر چڑھنے لگے۔ خلاف توقع اوپر جانا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا اور ہم با آسانی ٹیلے کی چوٹی تک پہنچ گئے۔ ہموار سطح چوٹی پر چڑھ کر میں نے روبیر کو ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کھینچا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور میری سانس کسی قدر تیز تھی۔ یہاں کسی قدر ہوا تھی اور روبیر کا کرتہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ میں نے صرف پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے چاروں طرف دیکھا اور بولی۔ ”یہاں سے تو سب صاف دکھائی دے رہا ہے۔ آرگون اور معبد بھی۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ یہاں سے آرگون کی بلند عمارتیں اور معبد کی اہرام نما عمارت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مگر ہم انہیں دیکھنے کے لیے اوپر نہیں آئے تھے۔ ہمیں سرنگ کے ہوادانوں کی تلاش تھی اور وہ فوراً ہی نظر آ گئے۔ میں نے نیشنل جیوگرافک پر افریقا میں پائی جانے والی ایک قسم کی دیمک کا گھر دیکھا تھا۔ یہ مٹی کو کھا کر اور پھر اس میں اپنا

لعاب شامل کر کے اس سے اونچے مخروطی گھر بناتی ہے۔ نیچے سے چوڑے یہ گھر جیسے جیسے اوپر جاتے ہیں پتلے ہوتے جاتے ہیں یوں سمجھ لیں کہ کون کو الٹا کر کے رکھ دیا جائے تو ان کے گھر بالکل اس شکل کے ہوتے ہیں۔ یہاں جنگل میں اسی طرح کی مخروطی کون کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کا آپس میں فاصلہ اور سائز بالکل ایک جیسا تھا۔ سرخ پکی اینٹوں سے بنی ان کون کے اوپر سرے میں سوراخ تھا اور اسی سوراخ سے ہوا نیچے سرنگ تک جاتی ہوگی اور وہاں موجود گندی ہوا باہر آتی ہوگی۔ ان کی اونچائی یہاں سے واضح نہیں تھی مگر میرا اندازہ تھا کہ وہ پندرہ بیس فٹ اونچے ضرور تھے۔

''یہ ہیں ہوادان۔'' میں نے اشارہ کیا۔

''لیکن ہم ان میں کیسے جا سکتے ہیں۔'' روبیر نے پوچھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کیونکہ ان کی زمین سے بلندی خاصی تھی اور بہ ظاہر چڑھنے کے لیے کوئی سہارا نظر نہیں آرہا تھا۔ نیچے سے ان کا قطر کوئی دس فٹ اور اوپر جاتے ہوئے ان کا دہانہ مشکل سے تین فیٹ کا رہ جاتا تھا۔ اوپر جاتی ڈھلان اتنی ترچھی اور ہموار تھی کہ اس پر چڑھنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ صرف بہت ہلکے جسم اور تیز پنجوں والے جانور ہی ان پر چڑھ سکتے تھے۔ مگر وہ اندر نہیں اتر سکتے ہوں گے۔ سرنگ سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا تھا کہ ہوا دان خاصے بلند تھے اور اگر کوئی ان سے اترنا چاہتا تو وہ سیدھا نیچے آکر گرتا کیونکہ ہوادان میں کہیں پکڑنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی دیواریں اندر سے بھی بالکل سپاٹ تھیں۔ اس لیے کوئی جانور اندر آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور کرتا تو صحیح سلامت ہرگز نیچے نہیں آسکتا تھا۔

کون کے اوپری سرے سے سرنگ کے پختہ فرش تک گہرائی پچاس فٹ کے قریب تھی اور اتنی بلندی سے گرنے والا کوئی فرد یا جانور سلامت نہیں رہ سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے نیچے اترنا ہوا تو میں کیا کروں گا۔ اس کے لیے رسی کی ضرورت ہوگی۔ مجھے کیرٹ کی بات یاد تھی کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے ایک ہوادان کو اس قابل بنا دیا تھا کہ آدمی اس سے آسانی سے نیچے اتر سکے۔ اس نے نقشے پر اس ہوا دان کی نشان دہی بھی کی تھی۔ مجھے اس کی لوکیشن یاد تھی۔ وہ آرگون شہر سے چوتھا ہوادان تھا۔ میں نے آرگون کی طرف سے دیکھنا شروع کیا اور چوتھے ہوادان کو ذہن نشین کر لیا۔ یہ اس ٹیلے سے دائیں طرف کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھا اور ٹیلے سے سب سے نزدیک ہوادان یہی تھا۔

میں نے روبیر کو اشارے سے بتایا۔ ''ہمیں اس ہوادان تک جانا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''کیا اس سے ہم نیچے اتر سکتے ہیں۔''

''ہاں کیرٹ نے اسی ہوادان کا بتایا تھا۔ مگر ہمیں آج نہیں اترنا ہے۔''

ہم نیچے اترنے لگے۔ اترنا کسی قدر دشوار ہوا تھا اور مجھے روبیر کو سہارا دینا پڑا تھا۔ وہ تھک گئی تھی اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس وقت میں سمجھا کہ شاید مسلسل حرکت میں رہنے کی وجہ سے ایسا ہے۔ اس کی حرکت میں بھی سستی آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند نہیں رہی تھی۔ مگر یہ فطری امر تھا۔ ہم نے جتنا فاصلہ طے کیا تھا وہ ایک عام آدمی کو تھکانے کے لیے کافی تھا۔ ہم نیچے آئے اور ہوا دان کی طرف روانہ ہوئے۔ میں محتاط تھا کیونکہ اس کا امکان تھا کہ کیرٹ سے اگلوالیا گیا ہو کہ اس نے ہماری کیا کیا مدد کی تھی؟ پھانسی دیتے وقت میں نے اس کے جسم پر تشدد کے نشانات دیکھے تھے۔ اس صورت میں یا تو یہ ہوادان بند کیا جا چکا ہوگا یا پھر وہاں ریناٹ کے آدمیوں کا پہرہ ہوگا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ ریناٹ کے آدمی وہاں چھپ کر آنے والوں کے منتظر ہوں۔ میں نے ہوادان سے کوئی سو گز دور روبیر سے کہا۔ ''تم اسی جگہ رکو اور چھپ کر دیکھو اگر کوئی مجھ پر حملہ کرے تو تم مجھے بچاؤ گی۔''

اس نے سر ہلایا اور ایک چٹان کی آڑ میں ہوگئی۔ میں آگے بڑھا۔ سست قدموں سے ہوادان تک پہنچا۔ اس کے آس پاس نہ تو کوئی تھا اور نہ ہی ایسے آثار نظر آرہے تھے کہ وہاں انسانوں کی آمد و رفت تھی۔ یعنی زمین بالکل فطری حالت میں تھی۔ مگر یہ بھی دھوکا ہو سکتا تھا۔ نگران دور سے دیکھ سکتے تھے ان کو پاس آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں محتاط انداز میں کون تک آیا جو چاروں طرف سے جھاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس پر چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔ مگر میں اس پر چڑھنے نہیں آیا تھا بلکہ وہ آسانی تلاش کرنے آیا جو کیرٹ نے یہاں بنوائی تھی اور جس کی مدد سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ میں نے جھاڑیاں ہٹا کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہوا پیچھے کی طرف جانے لگا۔ یہ عام نرم اور بنا کانٹوں والی جھاڑی تھی۔ نیزے کی مدد سے میں آرام سے ہٹا رہا تھا اور بالآخر مجھے وہ دروازہ نظر آگیا جو کون کی جڑ میں بنا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا دروازہ تھا جس کے باہر باقاعدہ کنڈی لگی ہوئی تھی۔

میں نے یہاں سے جھاڑیاں یوں ہٹائیں کہ پھر وہ آسانی سے واپس اپنی جگہ بھی آجائیں۔ جھاڑیاں زیادہ ہلانے سے دروازے کا راز غیروں پر بھی کھل سکتا تھا۔ میں اس جگہ کو کھلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ دروازہ مشکل سے تین بائی دو کا تھا۔ اسے آپ کھڑکی سمجھ لیں۔ میں نے کنڈی ہٹائی اور پٹ کو باہر کی طرف کھینچا۔ یہ زیادہ پرانا نہیں تھا مگر موسمی حالات نے اسے جام کر دیا تھا اور یہ کھلنے میں دشوار ہو رہا تھا۔ میں زور لگا کر کھول سکتا تھا مگر مجھے خوف تھا کہ اس صورت میں آواز ہوگی اور اگر کوئی اس وقت نیچے سے گزر رہا ہوتو وہ یہ آواز سن سکتا تھا۔ اس لیے میں دروازہ کھولنے میں احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ بالآخر وہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلنے لگا۔ ایک بار چوکھٹ سے نکلنے کے بعد کام آسان تھا اور دروازہ کھل گیا۔

میں حیران تھا کہ اس کے اندر کا ڈیزائن بالکل سرخ مٹی کی اینٹوں کی طرح تھا اور نیچے سے اگر کوئی دیکھتا تو اسے دیوار میں الگ سے دروازہ ہرگز نظر نہیں آتا۔ اسے بنانے اور یہاں لگانے والے یقیناً ماہر کاریگر تھے۔ میں نے نیچے جھانکا۔ عین اسی وقت نیچے سے ایک بیل گاڑی گزری جس کا رخ معبد کی طرف تھا اور اس پر مٹکے لدے ہوئے تھے۔ جن میں نہ جانے کیا سامان تھا جو معبد کے لیے لے جایا جارہا تھا۔ بیل گاڑی چلانے والے معبد کے خدام کے لباس میں تھے۔ یہاں انسان کے مرتبے اور کام کی شناخت اس کے لباس سے ہوتی تھی۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا یہاں سے سرنگ کے پختہ فرش تک کوئی پچاس پچپن فٹ کا فاصلہ تھا اور کوئی انسان اتنی بلندی سے اندر نہیں کود سکتا تھا۔

مگر کیرٹ نے مکمل انتظام کیا تھا۔ دروازے کے پاس ہی ایک چرمی تھیلا رکھا تھا اور میں نے اسے کھولا تو اس میں رسی کا ایک بڑا سا بنڈل تھا۔ رسی کی لمبائی یقیناً کئی سو فٹ تھی اور اس سے بیک وقت چار یا پانچ رسیاں لٹکا کر اتنے ہی لوگ اندر اتر سکتے تھے۔ کیرٹ نے درست کہا تھا اس نے مکمل انتظام کر دیا تھا۔ رسی سوت جیسے کسی ریشے سے بنی گئی تھی۔ میں نے چیک کر کے دیکھا یہ بہت مضبوط تھی اور مجھ جیسے کئی آدمیوں کا بوجھ بیک وقت سنبھال سکتی تھی۔ میں نے رسی کو واپس چرمی بیگ میں رکھا اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ ابھی تک کسی طرف سے مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ رینانٹ اینڈ کمپنی اس جگہ سے واقف نہیں تھے۔ جھاڑیوں کو اسی شکل میں کر کے میں واپس روبیر کے پاس آیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے کہا۔

''کون میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے اور وہاں رسیاں بھی' ان کی مدد سے کئی افراد نیچے اتر سکتے ہیں۔''

''کیا ہم آج اندر نہیں جا سکتے؟'' روبیر نے کسی قدر بے تابی سے کہا۔

''نہیں صرف دو افراد اور دن میں کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں زیادہ افراد کی ضرورت ہے پھر ہم رات کی تاریکی میں اندر اتر سکتے ہیں۔''

میرے جواب سے روبیر مایوس ہوئی تھی اور میں کسی حد تک اس کی مایوسی کی وجہ بھی سمجھ رہا تھا۔ اس کا محبوب شامین آرگون میں کہیں قید تھا اور روبیر کا خیال تھا کہ ایک بار ہم آرگون میں داخل ہوجاتے تو اسے چھڑانے کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن اس کا یہ ممکنہ خیال بچکانہ تھا۔ میں نے آرگون دیکھا تھا یہ بہت بڑا شہر تھا اور یہاں گھس کر کسی قسم کی کوئی کارروائی کرنا ایک دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہمیں زیادہ آدمیوں اور ایک منصوبے کی ضرورت تھی۔ ساتھ ہی ضروری تھا کہ ہم اس وقت اندر گھسیں جب رینانٹ کی فوج فیصلہ کن حملے کے لیے شہر سے نکل چکی ہو اور شہر میں بہت کم فوجی دستے ہوں۔ روشنی کم ہونے لگی تھی اس کا مطلب تھا کہ شام ہو چکی تھی۔ اب ہمیں واپس جانا تھا اور واپسی کے سفر سے پہلے ہم نے پیٹ پوجا کی۔ میٹھی ٹکیاں کھا کر پانی پیا اور چل پڑے۔ روبیر سست تھی اور وہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے دل کی بات کہتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''ہم آئیں گے اور اندر بھی اتریں گے۔ تم یقین رکھو ہم جب بھی شہر میں داخل ہوئے تو شامین کو زندہ سلامت بازیاب کرانا میری مہم کا ایک حصہ ہوگا۔''

وہ خوش ہوگئی۔ ''سچ کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں تم میری ساتھی ہو اور میں تمہارے لیے یہ کام کروں گا۔''

''میں ساتھی کہاں آپ پر بوجھ ہوں۔ اگر آپ بر وقت نہ آتے تو آج میں زندہ بھی نہ ہوتی۔''

''تم ساتھی ہو تبھی اس دشوار ترین مرحلے میں میرے ساتھ ہو۔'' میں نے یقین دلایا۔ ''خودکشی بزدل لوگ کرتے ہیں جو بہادر ہوتے ہیں وہ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دیتے ہیں۔''

واپسی کے سفر میں' میں نے محسوس کیا کہ اب میرے اور روبیر کے پاس سے بُو زیادہ نہیں آرہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ محلول کا اثر اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ میں نے

سوچا تھا۔ یہ شاید وقت سے پہلے ختم ہو رہا تھا۔ اورگان جس نے یہ محلول ایجاد کیا تھا وہ اس کا اثر بارہ گھنٹے تک رکھتا تھا مگر بعد میں پجاریوں نے اسے بنایا تو شاید وہ اتنا پُراثر نہیں رہا یا اس میں کسی خاص چیز کی کمی تھی۔ اس لیے اس کا اثر جلدی ختم ہو جاتا تھا۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ''ہمیں تیز چلنا ہوگا مجھے لگ رہا ہے کہ محلول کا اثر ختم ہو رہا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے اپنے پاس سے آتی بو اب کم لگ رہی ہے۔''

''اس سے پہلے کہ یہ بہت کم ہو جائے اور ہمارا واسطہ کسی درندے سے پڑ جائے ہمیں واپس پہنچ جانا چاہیے۔''

ہم نے رفتار تیز کی اور کسی قدر بھاگنے کے انداز میں چلنے لگے۔ دن ڈھلنے کے ساتھ گرمی کم ہو گئی تھی مگر روبیر کا چہرہ ویسا ہی سرخ ہو رہا تھا۔ میں فکر مند ہو گیا کہ اس کی طبیعت خراب تو نہیں تھی۔ اس نے گزشتہ دن جیسا گزارا تھا وہ مکمل ٹھیک نہیں تھی اور ہمت کر کے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ مجھے اصل فکر یہ تھی کہ راستے میں یہ خرابی بڑھ گئی تو میں اسے سنبھال کر اتنی آسانی سے سفر کیسے کروں گا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے ہم جلد اس جگہ پہنچ گئے جہاں سپاہیوں سے واسطہ پڑا تھا اور ان کا موت سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ وہاں اب اسمار نہیں تھے۔ سپاہیوں کی لاشیں بھی نہیں رہی تھیں۔ مگر لومڑی کے سائز کے چھوٹے جانور بچ جانے والی ہڈیوں کو بھنبھوڑ رہے تھے اور کتے کی سی آواز میں بھونک رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان میں کھلبلی مچی تھی۔ مگر ان کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔ وہ آس پاس درختوں اور جھاڑیوں میں چھپنے لگے۔ مگر جب ہم ذرا آگے نکلے تو وہ دوبارہ پلٹ آئے۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ''اب تک ان سپاہیوں کی تلاش میں کوئی نہیں آیا اس کا مطلب ہے ربان نے اپنی زبان بند رکھی ہے۔''

''مجھے بھی یقین تھا کہ وہ خاموش رہے گی۔ صرف اس کی نہیں اس کے بچوں کی زندگی بھی خطرے میں تھی۔''

اس جگہ سے ہمیں مشعلیں روشن کرنا پڑی تھیں کیونکہ اب ہم جنگل میں سفر کر رہے تھے اور یہاں روشنی بہت کم رہ گئی تھی۔ کچھ آگے جا کر ہم سستانے کے لیے رکے اور جیسے ہی سانس درست ہوا دوبارہ چل پڑے۔ مگر اب میں نے محسوس کیا کہ روبیر کی چال سست تھی اور وہ جیسے مجبوراً میری رفتار کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ قدم اٹھا نہیں رہی تھی بلکہ گھسیٹ رہی تھی۔ کچھ آگے نکل کر میں نے جان بوجھ کر رفتار کم کر لی۔ مگر اس سے پوچھا نہیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس حد تک ہمت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے اور وہ پھر بھی ہمت کر کے چلتی رہی۔ اب ایک گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ اب میں نے بنا کہے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے کھینچنے لگا۔ اس کی ہمت کو مزید آزمانے کا وقت نہیں تھا۔ یوں اسے کسی قدر سہارا ملا تو اس کے قدم بہتر ہو گئے تھے۔

ہم آرگون سے آگے نکل آئے تھے اور اب ہمارے بائیں طرف ذرا فاصلے پر سامیرا کے لوگوں کے کھیت اور باغات تھے۔ ہمیں ان سے بھی دور رہنا تھا۔ درختوں سے گزرتے ہوئے وہاں کام کرنے والے اور ان کی حفاظت کرنے والے سپاہی نظر نہیں آ رہے تھے مگر اور لوگ موجود تھے۔ یہاں تاریکی چھانے تک کام ہوتا تھا اس کے مزدور اور دوسرے واپس آرگون کے قلعے میں چلے جاتے تھے اور اس کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ اگر ربان نے زبان بند رکھی ہو گی تو وہ بھی زندہ سلامت شہر جانے والوں میں شامل ہو گی۔ روبیر کی رفتار بہتر ہوئی تھی کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''بس اب میں خود چل سکتی ہوں۔ آپ میرا ہاتھ چھوڑ دیں۔''

جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ سخت گرم ہو رہا تھا۔ اسے بخار تھا اور یقیناً اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ خود سے چل سکے گی مگر اس نے کہا تو میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پھر سے لڑکھڑانے لگی تھی اور پھر اچانک ہی لہرا کر نیچے گری۔ میں کچھ دور تھا اس لیے اسے پکڑ نہیں سکا اور پھر سامان بھی لدا ہوا تھا۔ وہ پہلو کے بل گری اور ساکت ہو گئی۔ میں نے سامان پھینکا اور اسے جلدی سے سیدھا کیا تو وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی نبض کی رفتار سست اور کسی قدر بے ترتیب تھی۔ یہ یقیناً زخموں، تھکن اور گزشتہ روز کے شاک کا مجموعہ تھا جو اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ابھی ہم ٹیلے سے کچھ فاصلے پر تھے۔

روبیر کا ہوش میں آنا ضروری تھا۔ میں نے اس کے منہ میں پانی ٹپکایا اور کچھ اس کے منہ پر بھی چھڑکا۔ وہ کسمسائی مگر اس کی بے ہوشی نہیں ٹوٹی تھی۔ ابھی آدھے گھنٹے کا سفر باقی تھا اور ہمارے پاس خاصا سامان تھا۔ بیک وقت سامان اور روبیر کے ساتھ سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسے زبردستی ہوش میں لانا بھی مناسب نہیں ہوتا وہ پھر سے بے ہوش ہو جاتی۔ اس لیے میں نے سوچا اور سامان یہیں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا۔ سارا سامان کپڑوں والے تھیلے کے ساتھ ایک درخت کی بلند شاخ پر باندھ دیا۔ اب میرے پاس

صرف ایک نیزہ اور مشعل تھی۔ تاریکی تقریباً مکمل ہوگئی تھی اور اب ہمیں مشعل کے سہارے سفر کرنا تھا۔ نیزہ بھی لازمی تھا کہ کسی خطرے کا سامنا ہونے کی صورت میں بالکل ہی نہتا بھی نہ ہوتا۔ روبیر کو اٹھا کر یوں شانے پر ڈالا کہ اس کا اگلا دھڑ میری پشت پر جھول رہا تھا اور میں نے اس کی ٹانگوں سے اسے پکڑا ہوا تھا۔ اسی ہاتھ میں نیزہ تھا اور دوسرے میں مشعل تھامے میں آگے بڑھنے لگا۔

اب تک کسی جانور سے واسطہ نہیں پڑا تھا اور میں دعا کررہا تھا کہ واسطہ پڑے بھی نہ، ورنہ میں کسی صورت اپنا اور روبیر کا دفاع نہیں کرسکتا تھا۔ میرے پاس ایک نیزے کے سوا کچھ نہیں تھا اور ہمارے جسموں سے آتی بُو بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ بُو اب درندوں کو روکنے کے لیے کافی نہیں رہی تھی۔ اچانک بھیڑیوں جیسی آواز بلند ہوئی اور میرا دل ایک لمحے کو رک گیا۔ کیا اسماروں نے ہماری بو پالی تھی یا کسی نے دیکھ لیا تھا اور اب دوسروں کو مطلع کررہا تھا۔ بھیڑیے جیسی شکل وصورت کے اس جانور کی یہ عادت بھی بھیڑیوں سے ملتی تھی کہ کسی صورت میں یہ بلند آواز نکال کر اپنے دوسرے ساتھیوں کو مطلع کرتے تھے۔ وہ مختلف آوازوں سے نہ صرف لوکیشن بلکہ شکار کے بارے میں بھی بتاتے تھے۔ میں اس پر انحصار نہیں کرسکتا تھا کہ یہ آوازیں اسماروں کے معمول کا حصہ تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہے اور اب وہ کہیں آس پاس موجود تھے۔

میں نے رفتار تیز کی، ٹیلہ اب کچھ ہی دور رہ گیا تھا اور بھیڑیوں جیسی آوازیں نزدیک آرہی تھیں۔ میرا شبہ بڑھ رہا تھا کہ اسماروں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ میری کوشش تھی کہ ان کی آمد سے پہلے ٹیلے تک پہنچ جاؤں۔ آخر میں میں نے تقریباً بھاگنا شروع کردیا تھا۔ روبیر کا وزن ساٹھ کلوگرام سے کم نہیں تھا۔ بظاہر وہ چھریری دکھائی دیتی تھی مگر اس کا جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ اس لیے وزن بھی زیادہ تھا۔ مسلسل بھاگنے سے میرا سانس بری طرح پھول رہا تھا اور جسم پر پسینا ایک بار پھر بہنے لگا تھا۔ مگر اس وقت مجھے پتا ہی نہیں تھا۔ اب مجھے روبیر سمیت اوپر جانا تھا۔ بالآخر میں کامیاب رہا مگر جس وقت روبیر کو لے کر اوپر چڑھ رہا تھا تین چار اسمار وہاں آن موجود ہوئے۔ خوش قسمتی سے تقریباً اوپر چڑھ گیا تھا ورنہ نصف راستے میں ہوتا تب بھی اسمار چھلانگ لگا کر مجھے پکڑ سکتے تھے۔

انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی اور ان میں سے

بتھوا Goosefoot

اس ساگ کی ساٹھ سے زائد اقسام ہیں اور بعض اقسام خودرو گھاس پات کی شکل میں دنیا کے تقریباً ہر حصے میں پائی جاتی ہیں۔ بتھوا جنوبی امریکا میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس کے تنے پر سرخ یا سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔ پتوں کے کنارے ہموار یا کٹاؤ دار اور تکون نما ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پھول پودوں کی چھوٹی اور ضمنی شاخوں اور خوشوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ پھل عموماً پھول کی پنکھڑیوں کے مجموعے میں لپٹا ہوتا ہے۔ پھول کی عموماً پانچ پنکھڑیاں اور پانچ ہی حامل زر ہوتی ہیں۔ سیاہ رنگ کا بیج جس کی جسامت ایک دو ملی میٹر ہوتی ہے پھل کے چھلکا نما خول میں بند ہوتا ہے۔ اگرچہ بتھوا باقاعدہ کاشت نہیں کیا جاتا۔ تاہم اس کا ساگ سرسوں وغیرہ کے ساگ کے ساتھ ملا کر پکایا جاتا ہے۔

بُت

کسی دیوی، دیوتا کی پتھر، لکڑی یا دھات سے بنی ہوئی شبیہہ، جسے ارتکاز توجہ کے لیے عبادت کے وقت سامنے رکھ لیا جائے۔ اس شبیہہ کو سنسکرت میں مورتی، عربی میں صنم، فارسی میں بت اور انگریزی میں Idol کہتے ہیں۔ جو یونانی الفاظ Eldolon سے ماخوذ ہے۔ حتمی طور پر یہ بتانا ممکن نہیں کہ بت پرستی کب اور کہاں شروع ہوئی۔ بہرحال دنیا کی تمام قدیم تہذیبیں مشرک اور بت پرست تھیں۔ الہامی مذاہب بت پرستی کے مخالف ہیں۔ اسلام نے تو اس باب میں اتنی احتیاط برتی کہ جان داروں کے مجسمے اور تصویریں بنانے کی بھی ممانعت کردی۔ یہودیوں کے معبدوں میں مسلمانوں کی مساجد کی طرح کوئی مجسمہ یا تصویر نہیں ہوتی۔ رومن، کیتھولک، عیسائیوں کے گرجوں میں حضرت عیسیٰؑ کے مجسمے اور شبیہیں ہوتی ہیں۔ عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ فرقہ عبادت کے وقت حضرت عیسیٰؑ کی تصویر یا مجسمہ رکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ ہندوؤں کا سناتن دھری فرقہ بت پرست ہے لیکن آریہ سماجی مورتی پوجا کے خلاف ہیں۔ بدھ مت کے پیرو مہاتما بدھ کی مورتی کے آگے احتراماً ماتھا ٹیکتے ہیں۔

مرسلہ: ایاز راہی۔ مانسہرہ

ایک تو اتنے نزدیک تک آیا کہ اس کا منہ میرے جوتوں سے کچھ ہی دور رہ گیا تھا۔ بیک وقت دو نے چھلانگ لگائی تھی۔ اوپر آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرا سانس دھکنی کی طرح چل رہا تھا اور میں سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ آخری پندرہ بیس منٹ کا سفر میں نے بھاگتے ہوئے طے کیا تھا اور اسی وجہ سے ہم اسمار کا نشانہ بننے سے بال بال بچے تھے۔ یقیناً محلول کی تاثیر ختم ہو چکی تھی اور میرے پاس سے بو آنا تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ تبھی اسمار نے بے دریغ حملہ کیا۔ روبیر کو گھاس پر لٹا کر میں کنارے تک آیا۔ اوپر چڑھنے سے پہلے میں نے مشعل ایک جگہ لگا دی تھی کہ روبیر کو اوپر چھوڑ کر مشعل واپس لے جاؤں گا مگر اب نیچے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر نیچے جانا بھی لازمی تھا۔ میں اپنا اہم ترین سامان پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اسی میں ہمارے سارے ہتھیار تھے۔ جو سامیرا نے دیئے تھے وہ بھی وہیں رہ گئے تھے اور اب میرے پاس سوائے ایک نیزے کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک مشعل جلا کر باہر لگائی۔

بہر حال سامان بعد کا مسئلہ تھا اس وقت مجھے روبیر کی فکر تھی۔ خوش قسمتی سے صبح میں نے منکا اور ڈول بھر کر رکھ لیا تھا اس لیے ہمارے پاس پانی تھا۔ میں نے پہلے خود پانی پیا اور پھر روبیر کو پلایا۔ اس کا بدن جیسے آگ بنا ہوا تھا۔ میرے پاس کوئی دوا یا ایسی چیز نہیں تھی جسے اس کے علاج کے لیے استعمال کرتا۔ بخار کم کرنے کی ایک ہی ترکیب تھی۔ میں نے پٹیاں پانی میں بھگو کر اس کے سر، ہاتھوں اور پیروں پر رکھنا شروع کر دیں۔ کپڑے کے لیے اس کی کمر سے بندھا ہوا پٹکا اتارا تھا۔ مسلسل پٹیاں رکھنے سے اس کا درجۂ حرارت کم ہوا تھا اور چہرے کی سرخی بھی کم ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے میں اس کے منہ میں پانی بھی ٹپکا رہا تھا۔ بالآخر اسے ہوش آ گیا۔ اس نے بہت سرخ آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا۔ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ لٹا دیا۔ ''ابھی مت اٹھو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''پانی مجھے پیاس لگی ہے۔''

میں اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اچھا خاصا پانی پلا چکا تھا مگر اس کے ہونٹ یوں خشک تھے جیسے اس نے نہ جانے کب سے پانی نہ پیا ہو۔ بخار اسے خشک کر رہا تھا۔ میں نے اسے کٹورے میں ڈال کر اور سہارا دے کر پانی پلایا۔ ''تھوڑا تھوڑا کر کے اور چوس کر پیو، ایک ساتھ زیادہ پانی پیا تو طبیعت خراب ہو جائے گی۔ تم خالی پیٹ بھی ہو۔''

اس نے سر ہلایا اور میری ہدایت کے مطابق پانی پینے لگی۔ کچھ دیر میں اس نے پورا کٹورا خالی کر دیا اور نڈھال سی ہو کر گھاس پر لیٹ گئی۔ پھر اس نے شکایت کی۔ ''پورا جسم دکھ رہا ہے۔ گرمی لگ رہی ہے۔''

اس کا بخار کم ہوا تھا مگر اب بھی یہ اچھا خاصا تھا۔ میں پھر اس کے ہاتھ پیروں پر پانی سے پٹیاں بھگو کر رکھنے لگا۔ اس دوران میں اسمار نیچے موجود تھے۔ کبھی کبھی وہ آواز نکالتے تھے۔ روبیر کے ہوش میں آنے کے بعد وہ بولے تو روبیر سہم گئی۔ ''اسمار ہیں یہاں؟''

''ہاں وہ راستے میں ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ میں بہت تیزی سے آیا اور جب اوپر چڑھ رہا تھا تو انہوں نے حملہ بھی کیا تھا مگر خوش قسمتی سے میں ان کی پہنچ سے نکل گیا تھا۔''

وہ حیران ہوئی تھی۔ ''آپ مجھے اٹھا کر لائے، اتنی دور سے۔''

''ہاں تمہیں بالکل ہوش نہیں تھا۔ تم جو ایک بار گریں تو پھر اٹھیں نہیں، سامان بھی وہیں چھوڑنا پڑا تھا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ محلول کا اثر بھی ختم ہو گیا تھا اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہم قسمت سے بچے ہیں۔ اگر ذرا دیر ہو جاتی تو اسمار ہمیں آ لیتے۔''

''نہیں میں آپ کی وجہ سے بچی ہوں۔'' اس نے جذباتی انداز میں اپنے گرم ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ کیوں میرے لیے اتنا کر رہے ہیں۔ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی ہوں۔ میں نے تو آپ کے ساتھ برا کیا۔ آپ کو دھوکا دیا۔''

''میں نے کہا نا تم میری ساتھی ہو اور میرے مشکل وقت میں میرا ساتھ دے رہی ہو۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔''

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ ''اتنا میرے لیے کسی نے نہیں کیا۔''

''یہ سب اوپر والے کی مہربانی ہے اور تم خود بہت اچھی لڑکی ہو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''تم اس وقت روؤ گی اور جذباتی ہو گی تو تمہاری طبیعت اور خراب ہو جائے گی۔ میرے پاس تمہارے علاج کے لیے کچھ نہیں ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم خود پر قابو رکھو اور جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

اس نے خود پر قابو پایا اور آنسو صاف کرنے لگی۔ میں نے اسے مجبور کر کے کچھ پھل کھلائے۔ وہ پھر آنکھ بند کر کے لیٹ گئی تھی۔ رات گہری ہونے لگی تھی۔ میں روبیر

کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور کبھی کبھی جا کر جھانک کر اسماروں کو دیکھتا تھا۔ ان کی تعداد بڑھ گئی تھی اور اب وہاں نصف درجن خونخوار اسمار موجود تھے۔ مگر اب وہ آوازیں نہیں نکال رہے تھے۔ شاید ان کا سارا جھنڈ یہاں جمع ہو گیا تھا اور اب انہیں مزید آوازیں نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ غالباً انہوں نے تاڑ لیا تھا کہ ہم اس ٹیلے پر محصور ہیں اور یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے۔ اس لیے وہ اطمینان سے نیچے گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے تھے کہ کبھی نہ کبھی ہم نیچے اتریں گے۔ انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ رات بھیگنے لگی تو میں نے روبیر کو اٹھایا۔ ''اندر چلو، اب ٹھنڈ ہو رہی ہے اور اوس گر رہی ہے۔''

اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر بے بسی سے بولی۔ ''مجھ سے نہیں اٹھا جا رہا۔''

میں نے اسے اٹھایا اور لے جا کر اندر بستر پر لٹا دیا۔ اس کا جسم اب بھی گرم تھا لیکن یہ پہلے کے مقابلے میں خاصا کم ہو گیا تھا۔ اگر رات میں اس کا بخار اتر جاتا تو صبح تک اس کی طبیعت ٹھیک ہو سکتی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائے تاکہ میں دوسرے کاموں پر توجہ دے سکوں اور خاص طور سے وہ سامان لاؤں جو میں چھوڑ آیا تھا۔ اس میں ہتھیاروں کے ساتھ اہم ترین چیز آرگون کے سپاہیوں کی وردیاں تھیں۔ روبیر کو کیبن میں لٹا کر میں خود گھاس کے تختے پر لیٹ گیا اور اس سے اٹھتی ہوئی سوندھی سی خوشبو محسوس کرتا ہوا سو گیا۔ رات میں آنکھ کھلی تو میں نے روبیر کو چیک کیا۔ اس کا چہرہ اور سانس نارمل تھا اور بخار تقریباً اتر گیا تھا۔ اسے دیکھ کر سویا۔ دوسری بار آنکھ کھلی تو صبح قریب تھی۔ بھرپور نیند کے بعد اب میں خود کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے اسماروں کی خبر لی جو بدستور نیچے موجود تھے۔ مشعل بجھ گئی تھی اور نیچے تاریکی تھی مگر ان کے غرانے کی ہلکی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ وہیں موجود ہیں۔ میں کیبن میں آیا تو روبیر جاگ رہی تھی۔ وہ کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔

''اب کیسی ہو؟''

وہ مسکرائی۔ ''ٹھیک ہوں، درد اور بخار نہیں ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے، بھوک لگی ہے کچھ کھاؤ گی؟''

اس نے سر ہلایا اور اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنے کھلے بال ایک چھوٹی سی اسٹک کی مدد سے جوڑے میں باندھے پھر جھینپے انداز میں کہا۔ ''وہ مجھے نیچے جانا ہے۔''

''اس وقت تو نیچے جانا ممکن نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں اسی ٹیلے پر پیچھے کی طرف جا سکتی ہو۔''

میں نے پہلے ہی مناسب جگہ دیکھ لی تھی کہ رفع حاجت کے لیے نیچے جانا ممکن نہیں تھا۔ کیبن میں جانے سے پہلے میں خود وہاں سے ہو آیا تھا۔ روبیر وہاں سے آئی تو اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی کفایت شعاری سے خرچ کیا جا رہا تھا۔ جب تک اسمار موجود تھے نیچے جا کر پانی لانا بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس نے بھی نیچے موجود اسماروں کو دیکھ لیا تھا۔ ''ان کے ہوتے ہوئے ہم نیچے نہیں اتر سکتے ہیں۔''

''محلول پی کر میں جا سکتا ہوں۔''

وہ بے چین ہو گئی۔ ''آپ اکیلے؟''

''ہاں مجھے سامان لانا ہے اور پھر پانی بھی لانا ہے۔''

''محلول کا اثر جلدی ختم ہو رہا ہے۔''

''ہاں لیکن اتنی جلدی بھی نہیں۔'' میں نے کہا اور تھیلا کھولا۔ اس میں اب کھانے کا سامان کم رہ گیا تھا چند ایک پھل تھے جو میں نے روبیر کو دے دیے اور خود میٹھی ٹکیوں سے گزارہ کیا تھا۔ اس دوران میں روشنی ہونے لگی تھی۔ اچانک مجھے ربیک کا خیال آ رہا تھا اس نے یہاں آنا تھا اور وہ بے خبر تھا کہ یہاں اسمار کا پورا جھنڈ موجود ہے۔ وہ بے خبری میں چلا آتا تو ان کے ہاتھ لگ جاتا۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ اسمار جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں ہتھیار لے کر آؤں اور تیروں سے اسماروں کو مار بھگاؤں۔ ناشتے کے فوراً بعد میں نے محلول کی ایک خوراک پی لی۔ روبیر بولی۔

''مجھے پورے جسم میں بے چینی ہو رہی ہے یہ یہاں سے دفع ہوں تو میں چشمے پر جا کر نہاؤں گی۔''

''بخار کے بعد ایسی ہی بے چینی ہوتی ہے۔'' میں نے تائید کی اور اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ میری کوشش تھی کہ مجھے جلد از جلد پسینا آئے اور مجھ سے بو آنا شروع ہو۔ دس پندرہ منٹ بعد مجھ سے بو آنے لگی اور روبیر نے تائید کی۔

''بو آ رہی ہے مگر آپ کچھ دیر بعد جایئے گا۔''

میں نے بھی یہی مناسب سمجھا۔ محلول پینے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں ٹیلے سے نیچے اترنے کے لیے سیڑھی تک آیا۔ روشنی ہو گئی تھی اور اسمار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی جسامت دیکھ کر روبیر سہم گئی۔ اس نے مجھ سے احتیاط کرنے کو کہا۔ مگر میں جو احتیاط کر سکتا تھا وہ کر لی تھی اس سے زیادہ کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میرے پاس سے آتی بو محسوس کر کے اسمار ناپسندیدہ انداز میں غرانے لگے اور جب میں نیچے اتر رہا تھا وہ آگے آنے کی بجائے پیچھے ہٹنے لگے۔ نیچے اتر کر میں آگے بڑھا تو وہ دائیں بائیں ہو کر دور

ہونے لگے۔ سچی بات ہے کہ اس خوفناک درندے کے جھنڈ کے بیچوں بیچ سے گزر کر جاتے ہوئے میرا خوف سے رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر وہ بو کی پروا کیے بغیر حملہ آور ہو جاتے تو لمحوں میں میرا خاتمہ کر سکتے تھے۔ مگر اس بو نے انہیں پاس آنے سے روکا تھا۔ البتہ انہوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور دائیں بائیں اور پیچھے فاصلہ رکھ کر میرے ساتھ چلنے لگے۔ وہ اس اُمید میں تھے کہ شاید مجھ سے آنے والی بو ختم ہو جائے اور وہ مجھ پر حملہ کر سکیں۔

میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ سب میرے پیچھے تھے اور میرے پاس بھی نہیں آرہے تھے۔ میں نے راستے کی کچھ نشانیاں ذہن میں رکھی تھیں تاکہ میں ٹھیک اسی درخت تک پہنچ سکوں جہاں میں نے سامان رکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھے کچھ دیر بھٹکنا پڑا تھا اور تب میں درخت تک پہنچا تھا وہاں شاخ پر سامان دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ یہ خدشہ بھی تھا کہ سامان ہی غائب نہ ہو جائے۔ میں نے تھیلا اتار کر سب سے پہلے کمان اور ترکش نکالے اور سب سے نزدیک موجود اسمار پر تیراندازی کی مشق کی۔ غیر متوقع طور پر تیر اس کی گردن میں اتر گیا۔ اس نے بھیانک آواز نکالی اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کا حشر دیکھ کر دوسرے اسمار تیزی سے بھاگے اور مجھ سے کچھ فاصلے پر جا کر رکے تھے۔ میں نے لوٹتے اسمار کو چند تیر اور مارے جو تقریباً سارے نشانے پر لگے۔

وہ بے دم سا ہو گیا تھا اور مجھے نیزے کی مدد سے اس کا خاتمہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ نیزہ میں نے اس کی گردن میں اتار دیا تھا۔ اس نے چند لمحے تڑپنے کے بعد جان دے دی۔ میں نے اس کے جسم میں اتر جانے والے تیر نکال کر صاف کیے اور واپس ترکش میں رکھ لیے۔ یہ سارا کام میں نے اطمینان سے کیا تھا۔ اپنے ایک ساتھی کا انجام دیکھ کر دیگر اسماروں نے اسی میں عافیت جانی کہ میرا پیچھا چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ جب تک میں نے تیر نکالے وہ غائب ہو گئے تھے۔ میں مطمئن ہو کر آگے بڑھا۔ سامان خاصا تھا مگر وزنی نہیں تھا۔ ربان کے پھٹے کرتے نے بڑا کام دیا اور اسی میں سب ڈال کر میں نے گٹھری بنالی تھی ورنہ الگ الگ ان کو لے جانا آسان نہیں تھا۔ البتہ نیزے اور کمانیں ساتھ رکھی تھیں۔ نصف گھنٹے بعد میں دوبارہ ٹیلے کے پاس تھا۔ میں نے نیچے سے روبیر کو آواز دی۔ وہ نزدیک ہی تھی۔ فوراً دوڑی آئی اور چہک کر بولی۔

''آپ آگئے۔''

''ہاں ڈول دو۔''

اس نے اوپر سے ڈول پھینکا۔ میں نے نیچے سے سامان اچھالا اور پھر ڈول اور وردیاں لے کر ندی پر آیا۔ پہلے میں نے وردیاں دھوئیں اور پھر ڈول بھر کر واپس ٹیلے پر آیا۔ مزید چند چکر لگا کر میں نے اتنا پانی کر دیا کہ روبیر اوپر ہی نہالی تھی۔ اسمار ٹیلہ اور اس پر ہماری موجودگی سے واقف ہو چکے تھے۔ مجھے شک تھا کہ وہ اب آس پاس رہیں گے۔ اس صورت میں روبیر کا ندی پر جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ آرام سے نہائے میں نیچے ہی موجود ہوں۔ اس نے نہا لیا تو میں نے دوبارہ ندی سے جا کر پانی بھرا۔ روبیر نے کچھ خشک بیلیں آپس میں ملا کر رسی بنالی تھی۔ وہ اس کی مدد سے بھرا ہوا ڈول اس سے اوپر کھینچ لیتی اور مجھے اوپر نہیں جانا پڑتا تھا۔ یوں کام آسانی سے اور تیزی سے ہو گیا۔ مجھے بھی بار بار اوپر نہیں جانا پڑا تھا۔

ہمارے پاس خوراک تقریباً ختم تھی۔ جو مچھلی پہلے پکڑی تھی اس کا تھوڑا سا بچ جانے والا حصہ اب خراب ہو گیا تھا اور اس سے بو اٹھ رہی تھی۔ ربیک کی آمد کے آثار نظر نہیں آرہے تھے اور ہمیں خوراک کی ضرورت تھی۔ یہاں صرف مچھلیاں تھیں۔ پانی بھرنے کے دوران میں نے ندی میں ایک جگہ دیکھ لی تھی جہاں مچھلیاں تھیں۔ مگر وہاں پانی گہرا تھا اور انہیں پکڑنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں نے ربان کا کرتہ لے کر اسے یوں کھولا کہ وہ چادر سی بن گئی۔ جہاں سے وہ پھٹا ہوا تھا وہاں گرہ لگا دی۔ پھر یہ جال لے کر ندی تک آیا اور اس کے کنارے روبیر کی بنائی بیلوں کی رسی سے باندھ دیے۔ جال کو تہہ میں بچھا دیا۔ یہ آسان کام نہیں تھا کیونکہ پانی بہہ رہا تھا جو کپڑا ابھی بہا لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

کسی نہ کسی طرح میں نے کپڑا تہہ میں بچھا دیا اور پھر ڈوریاں تھام کر انتظار کرنے لگا کہ کب کچھ مچھلیاں کپڑے کے اوپر آتی ہیں اور میں جال کھینچ کر انہیں پکڑتا ہوں۔ شروع میں مچھلیاں کچھ بدکی تھیں مگر پھر کپڑے کو بے ضرر جان کر اس پر آگئیں۔ جیسے ہی تین بڑی مچھلیاں جال کے اوپر آئیں۔ میں نے پوری قوت اور تیزی سے جال کھینچ لیا۔ ایک مچھلی بھاگنے میں کامیاب ہوئی مگر دو جال کے ساتھ ندی سے باہر آگئی تھیں۔ احتیاطاً میں نے کپڑا ندی سے دور پھینک دیا کہ مچھلیاں اس سے نکلیں بھی تو پانی میں واپس نہ جا سکیں۔ وہ جس طرح تڑپ رہی تھیں انہیں کپڑے میں رکھنا

دشوار لگ رہا تھا اور لگ رہا تھا کہ واپس ندی میں چلی جائیں گی۔ دور گرنے پر بھی وہ باہر نکل آئیں اور ندی کی طرف آنے کی کوشش کی مگر میں نے انہیں دوبارہ کپڑا ڈال کر لپیٹ لیا۔

آج اور شاید کل کے لیے بھی یہ مچھلیاں کافی تھیں۔ ان کا گوشت ذائقے دار تھا۔ جب میں نے مچھلیاں لاکر روبیر کو دیں تو اس کی خوشی دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں گھر گرہستی میں گرفتار شخص ہوں جس کی صبح شام اس فکر میں ہوتی ہے کہ اپنے خاندان کا پیٹ کیسے بھروں۔ روبیر کی خوشی اصل میں مچھلی کی نہیں خوراک کی تھی کیونکہ اب ہمارے پاس کھانے کو کچھ خاص نہیں تھا۔ اس لیے میرے ہنسنے پر اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”کیوں ہنس رہے ہیں۔“

”میں نے آج تک ایسے کام نہیں کیے۔ اس لیے جب کر رہا ہوں تو ہنسی آرہی ہے۔“

”آپ کی بیوی بچے ہیں؟“

”نہیں۔“

”تبھی عجیب لگ رہا ہے۔“ اس نے سادگی سے کہا اور پتھر کے چاقو سے مچھلیوں کو ہلاک کرنے لگی جو اب تک تڑپ رہی تھیں۔ یہ چاقو سپاہیوں کے پاس سے نکلے تھے اور کام میں دھات کے چاقو سے کم نہیں تھے۔ مجھے خیال آیا کہ جب یہ چاقو بنا سکتے ہیں تو پتھر کے اور تیز دھار ہتھیار کیوں نہیں بناتے۔ شاید اس لیے کہ بڑے ہتھیار کی صورت میں پتھر آسانی سے ٹوٹ جاتا اسی لیے یہ پتھر سے چھوٹے ہتھیار اور اوزار بناتے ہیں۔ روبیر جنگجو لڑکی ہونے کے باوجود کھانے پکانے کے کام جانتی تھی۔ اس نے مہارت سے مچھلیوں کو صاف کیا اور ان کے قتلے کیے۔ نہا دھو کر روبیر تازہ دم نظر آرہی تھی۔ اس نے خاتون خانہ کا کردار ادا کرتے ہوئے کیبن اور اس کے آس پاس کی صفائی کر دی تھی۔ چیزیں سلیقے سے رکھی تھیں اور اب مچھلی صاف کر رہی تھی۔ آلائشیں نکال کر اس نے گوشت ہوا میں رکھ دیا تاکہ دیر تک خراب نہ ہو۔ کچھ قتلے اس نے نکال لیے تھے اور دوپہر کے لیے ان کو بھوننے لگی۔ ٹیلے پر خشک جھاڑیوں کی بھی کمی نہیں تھی جن سے جلانے کے لیے لکڑی مل رہی تھی۔

بغیر نمک اور کسی مسالے کے مچھلی کا سادہ گوشت بھی بہت مزے کا تھا اور میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ روبیر سے بھی کہا کہ وہ ٹھیک سے کھائے ورنہ کل تک یہ گوشت خراب ہو جاتا۔ اس سے بہتر تھا کہ ہم زیادہ کھالیں۔ اس کے بعد کچھ وقت ہلکا کھائیں گے تو برابر ہو جائے۔ میری ہدایت پر روبیر نے مزید قتلے بھون لیے تھے۔ کھا پی کر میں آرام کرنے لگا اور کچھ دیر بعد اٹھ کر نیچے جھانکا۔ ربیک اب تک نہیں آیا تھا اور میں کچھ ہی دیر میں کئی بار ٹیلے کے نیچے کا جائزہ لے لیا اور فی الحال مجھے اسمار کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ روبیر نے غالباً میری بے چینی بھانپ لی۔ ”آپ نیچے کیوں دیکھ رہے ہیں۔“

میں نے اسے ربیک کے بارے میں بتایا تھا۔ ”وہ آئے گا اور مجھے خطرہ ہے کہ اسمار ہمارے چکر میں آس پاس موجود ہیں کہیں وہ اسے نہ گھیر لیں۔“

”ہاں اس کا خطرہ ہے۔“ روبیر بولی۔ ”سامیرا سے رابطے کا وہی ایک ذریعہ ہے۔“

”ہاں اگر وہ نہ رہا تو ہم سامیرا سے رابطے سے محروم ہو جائیں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”کیا میرے پاس سے آنے والی بو اب بھی واضح ہے؟“

روبیر نے سونگھا اور بولی۔ ”ہاں اب بھی آرہی ہے۔“

”تب میں نیچے کا ایک چکر لگاتا ہوں۔ ربیک یا اسمار آس پاس ہوئے تو پتا چل جائے گا۔“

میرا کرتہ ربان پہن گئی تھی اور اس کا کرتہ کسی قابل نہیں رہا تھا۔ سپاہیوں کی دھوئی جانے والی وردیاں تقریباً خشک ہو گئی تھیں میں نے ان میں سے ایک کا انتخاب کیا۔ پھر میں نے نیزہ اور تیر کمان لیے اور نیچے اتر آیا۔ مارے جانے والے سپاہیوں کے پاس ڈھالیں بھی تھیں مگر وہ بڑی اور بھاری تھیں ہم لا نہیں سکتے تھے۔ وہ ویسے بھی ہمارے لیے بیکار تھیں کہ صرف کھلی جنگ میں کارآمد ہو سکتی تھیں۔ میں نے پہلے آس پاس کا جائزہ لیا اور میری چھٹی حس نے بتایا کہ اسمار یہاں نہیں ہیں۔ مطمئن ہو کر میں قلعوں والی سمت روانہ ہوا۔ ربیک اسی سمت سے آتا۔ جنگل سے نکل کر کھلی جگہ آیا جہاں دور تک نظر رکھی جا سکتی تھی۔ باغات اور کھیت یہاں سے خاصے فاصلے پر تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کسی درخت پر چڑھ جاؤں اور یوں میں دور تک دیکھ سکوں گا۔ ایک درخت جو زیادہ اونچا تھا میں اس کی ایک درمیانی شاخ پر چڑھ گیا۔ کیونکہ درخت کے آگے کھلا میدان تھا اس لیے یہاں سے وادی کا جنوبی حصہ اور کسی حد تک قلعے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

اب مجھے انتظار کرنا تھا۔ شاخ خاصی موٹی تھی اور میں آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ دن کا وقت تھا اس لیے کپڑے

مکوڑے بھی آرام کر رہے تھے۔ ورنہ رات میں انہوں نے میرا جو حال کیا تھا اس کا سوچ کر میری روح کانپ اٹھتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہاں پرندے درختوں پر گھونسلے نہیں بناتے تھے۔ وہ شاید چٹانوں اور وادی کی دیواروں میں گھونسلے بناتے تھے۔ جو پرندے اڑتے نہیں تھے وہ جھاڑیوں میں رہتے تھے۔ جیسا کہ وہ زہریلے کانٹے برسانے والا خوش رنگ پرندہ تھا۔ سائز میں وہ مور سے کچھ ہی چھوٹا تھا مگر اس کے پر مور سے کہیں زیادہ حسین اور دلکش تھے۔ وقت گزرتا گیا اور مجھے ریک کی آمد کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ میرے پاس سے آتی بو بھی کم ہو رہی تھی اس سے پہلے کہ بو اتنی کم ہو جاتی کہ اسماروں کے لیے قابلِ برداشت ہو جاتی میں نے مناسب سمجھا کہ واپس جاؤں۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں درخت سے اترتا مجھے مشرقی سمت سے کچھ افراد حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ وہ خاصے فاصلے پر تھے اس لیے ان کی تعداد اور صورتیں واضح نہیں تھیں لیکن ان کے لباس کا سرخ رنگ اتنی دور سے بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ درحقیقت سرخ رنگ نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ سرخ رنگ سفیدی مائل سبزے میں نمایاں ہو رہا تھا۔ سرخ رنگ کا لباس یہاں صرف آرگون کے سپاہی پہنتے تھے۔ تو کیا آرگون کے سپاہی اس طرف آ رہے تھے۔ چند منٹ بعد وہ واضح دکھائی دینے لگے اور وہ آرگون کے مسلح سپاہی ہی تھے۔ ان کی تعداد سات آٹھ تھی اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس ڈھالیں تک موجود تھیں۔ وہ پھیل کر چل رہے تھے اور ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔

میری چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ وہ کل غائب ہونے والے تین سپاہیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ مجھے ذرا تعجب ہوا کہ ان کی لاشیں باغات اور کھیتوں سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ بے شک لاشیں جانور کھا چکے تھے مگر ان کی ہڈیاں تو ملنی چاہیے تھیں۔ شاید وہ اس طرف کے سپاہی نہیں تھے یا پھر کسی وجہ سے ان کی ہڈیاں بھی نظر میں نہیں آئی تھیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جانوروں نے ان کی ہڈیاں تک کھالی ہوں۔ اس کے باوجود جو ہتھیار ہم چھوڑ کر آئے تھے وہ تو ملنے چاہیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس جگہ آرگون کے سپاہی گئے ہی نہیں تھے۔ ان کا رخ اسی طرف تھا اور کیونکہ میں ابتدائی درخت پر تھا اس لیے اگر ان کے قریب آنے پر اترتا تو وہ مجھے دیکھ سکتے تھے۔ میں نے سوچا اور فوری نیچے اتر آیا۔

مجھے فکر تھی کہ اگر یہ ٹیلے کے پاس آگئے تو وہاں سیڑھی اور دوسرے نشانات دیکھ سکتے تھے جن سے ان کو پتا چل جاتا کہ یہاں کوئی رہتا ہے۔ میں ٹیلے کی طرف روانہ ہوا تھا کہ ان کی آمد سے پہلے ٹیلے تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر جب ابھی ٹیلے سے ذرا دور تھا کہ کچھ آوازیں سن کر رکا۔ پھر درختوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا ٹیلے کے عقبی حصے پہنچا تو وہاں اسمار موجود تھے۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا یہ مکار جانور گھوم پھر کر دوبارہ آگیا تھا۔ ان کی تعداد چار تھی۔ میرے پاس سے آتی بو کم ہو گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے ان کے درمیان سے گزر کر ٹیلے تک جانے کا خطرہ مول لینا مناسب ہوگا؟ مجھے یہ مناسب نہیں لگا اس لیے میں نے ایک درخت منتخب کیا اور اس پر چڑھ گیا۔ درخت ٹیلے سے کوئی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ یہاں سے مجھے ٹیلہ اور اسمار دونوں دکھائی دے رہے تھے۔

بلندی پر آیا تو روبیر بھی دکھائی دی جو بے چین سی پھر رہی تھی اور بار بار آکر ٹیلے سے نیچے جھانکتی تھی۔ اگر صرف اسمار ہوتے تو میں اسے آواز دے کر خبردار کر دیتا مگر آرگون کے سپاہی جنگل میں داخل ہو چکے تھے اگر روبیر میری آواز سنتی تو لازی وہ بھی سن لیتے۔ اسے علم نہیں تھا کہ اسمار سے بڑا خطرہ آرگون کے سپاہیوں کی صورت میں اس طرف آ رہا ہے۔ میں نے درخت کے عقب میں دیکھنا چاہا مگر میں خاصا اندر آگیا تھا اور یہاں سے عقب میں دور تک دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اب آرگون کے سپاہی نزدیک آتے تب مجھے پتا چلتا۔ میں بالکل خاموشی سے آیا تھا ان چند دنوں میں مجھے جنگل میں بھی دبے قدموں چلنے کی عادت پڑ گئی تھی اس لیے اسمار میری آمد سے بے خبر رہے۔ پھر میرے پاس سے ناگوار بو آ رہی تھی جو میری اصل بو کو دبا رہی تھی۔

اس لیے بھی اسمار بے خبر رہے مگر آرگون کے سپاہی نہ تو بے آواز آ رہے تھے اور نہ ہی ان کی اصل بو دبی ہوئی تھی۔ میں نے ایک اسمار کو چونک کر درخت سے ذرا فاصلے سے پیچھے کی طرف جاتے دیکھا اور پھر وہ جس طرح دبے قدموں گیا تھا اسی طرح دبے قدموں واپس بھی آگیا۔ اس نے یقیناً سپاہیوں کو دیکھ لیا تھا۔ اسمار نے آواز نہیں نکالی تھی اور جب واپس آیا تو اپنے ساتھیوں کو نہ جانے کیسے اشارہ کیا کہ وہ سب پوزیشن میں آگئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آنے والوں کے لیے پھندا بنا رہے تھے۔ وہ خود چھپ کر پھیل رہے تھے۔ چند منٹ بعد مجھے سپاہیوں کے بولنے کی آواز آنے لگی۔ وہ خاصے نزدیک آگئے تھے اور آپس میں زیادہ زور سے بات نہیں کر رہے تھے اس کے باوجود مجھے ان کی

آواز آ رہی تھی۔ اسمار کے کان یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ تیز تھے۔ انہوں نے اس وقت سپاہیوں کی آواز سن لی تھی جب مجھے قطعی کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔

دوسری طرف روبیر بار بار نیچے دیکھ رہی تھی اور اس نے اسمار کو غائب دیکھا تو سمجھی کہ وہ جا چکے ہیں۔ وہ سیڑھیوں کے پاس تھی اور مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں وہ نیچے نہ اتر جائے یقیناً وہ میرے نہ آنے سے فکر مند تھی۔ میں چاہتا تو اسے آواز دے کر متوجہ کر سکتا تھا مگر ایسا کرنے سے سپاہی اور اسمار بھی میری پوزیشن سے آگاہ ہو جاتے اس لیے میں صبر سے کام لے رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ روبیر ٹیلے سے اترنے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ ترکش پہن رہی تھی۔ اس نے اپنا پٹکا دوبارہ کمر سے باندھ لیا تھا۔ میں نے تیر کمان نکالا۔ مگر مجھے اس کی کوئی مشق نہیں تھی۔ دس بارہ فٹ کے بعد میرا نشانہ اندھے کا تیر بن جاتا۔ مجھے تیر مار کر متوجہ کرنے کا خیال آیا مگر پھر رک گیا کہ اناڑی پن میں اسے ہی تیر نہ مار دوں۔

سپاہیوں کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ وہ خاصے نزدیک آ گئے تھے۔ وہ بے پروائی سے کام لے رہے تھے یا سپاہی ہونے کے زعم میں تھے کہ ہر مشکل سے نمٹ سکتے تھے اس لیے بلند آواز میں بات کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر روبیر ان کی آواز سن لے تو شاید نیچے اترنے کا ارادہ ترک کر دے۔ مگر وہ ٹیلے سے دور تھے۔ ٹیلہ میرے بائیں طرف تھا اور وہ دائیں طرف سے آ رہے تھے۔ اسمار جنہوں نے پہلے درخت اور ٹیلے کے درمیان مورچہ لگایا تھا۔ اب وہ آنے والوں کے لحاظ سے اپنی پوزیشن چینج کر رہے تھے۔ یہ اس لحاظ سے اطمینان بخش تھا کہ وہ ٹیلے سے دور جا رہے تھے۔ میں نے روبیر کو سیڑھی سے نیچے جاتے دیکھا اور اسے روک نہیں سکا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے روکوں۔ نیچے اترنے کے بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا اس لیے اسے اللہ کے سپرد کیا اور آنے والے حالات کے لیے تیار ہو گیا۔

سپاہی اب نزدیک تھے اور میں ان کو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے خود کو شاخوں اور پتوں میں چھپا لیا تھا کیونکہ میرا سرخ کرتہ اگرچہ نمایاں نہیں ہوتا مگر میں محتاط تھا۔ اسماروں سے اب صبر نہیں ہو رہا تھا اور ان کی باڈی لینگویج ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کسی لمحے بھی سپاہیوں پر حملہ کر سکتے تھے۔ سپاہی ان کے گھیرے میں تقریباً آ چکے تھے اور پھر ایک سپاہی نے جھاڑی کے پیچھے چھپے اسمار کو دیکھ لیا۔ اس نے چیخ کر دوسروں کو خبردار کیا اور اسمار غراتا ہوا اس پر جھپٹا۔ وہ سپاہی کو گراتا ہوا اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ سپاہی ڈھال کی مدد سے خود کو بچا رہا تھا۔ دوسرے سپاہی جو اب تک بے فکری سے چل رہے تھے انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ دو سپاہیوں نے بیک وقت اسمار پر نیزے سے حملہ کیا۔ وہ زخمی ہوا اور سپاہی کو چھوڑ کر غراتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ اسی اثنا میں باقی اسمار بھی سپاہیوں پر جھپٹ پڑے تھے اور وہاں انسانوں اور درندوں کے درمیان ایک کشمکش شروع ہو گئی تھی۔

میں اس کشمکش سے بے نیاز روبیر کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں اب بے پناہ چیخ و پکار تھی اور روبیر کو لازمی یہ آوازیں سن لینی چاہیے تھیں۔ اس صورت میں اسے واپس ٹیلے پر جانا تھا مگر وہ مجھے ٹیلے پر جاتی نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے اس کی حماقت پر غصہ آنے لگا اسے اتنی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے نیچے اتر جانا چاہیے کیونکہ اسمار اور سپاہی لڑتے ہوئے اس جگہ سے دور جا رہے تھے۔ اصل میں سپاہی فرار کی کوشش کر رہے تھے اور اسمار ان کی یہ کوشش ناکام بنا رہے تھے۔ میں نیچے اترنے لگا اور میری کوشش تھی کہ کوئی سپاہی یا اسمار میری طرف متوجہ نہ ہو اس لیے میں احتیاط سے اور تنے کے پیچھے رہتے ہوئے اتر رہا تھا۔ اس دوران میں اسمار تین سپاہیوں کو مار چکے تھے یا ان کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ ان کی پھرتی، طاقت اور مہارت کے آگے سپاہی مسلح ہونے کے باوجود بے بس تھے۔

سپاہیوں نے اسماروں کو زخمی ضرور کیا تھا مگر وہ انہیں روکنے میں ناکام رہے تھے۔ بہرحال ان کی جنگ سے فائدہ اٹھا کر میں درخت سے نیچے اتر آیا اور دبے قدموں اور جھک کر چلتا ہوا ٹیلے کی طرف جانے لگا۔ ساتھ ہی میں عقب میں بھی دیکھ رہا تھا کہ کوئی اسمار پیچھے تو نہیں آ رہا ہے۔ بیس پچیس گز دور نکلنے کے بعد میں نے اطمینان محسوس کیا اور تیز قدموں سے ٹیلے کی طرف آیا۔ اس دوران میں سپاہیوں کی طرف سے مدافعتی جنگ ناکام ہو گئی تھی اور اسمار ان پر غالب آ گئے تھے۔ یہ حقیقت ان کی چیخ و پکار سے بھی واضح تھی۔ وہ جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور اسمار ان پر ذرا بھی رحم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ میں بے خبر تھا کہ ایک اسمار نے مجھے دیکھ لیا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کو سپاہیوں کو چیرتے

پھاڑتے چھوڑ کر میرے پیچھے آیا تھا۔ میں تیز قدموں سے ٹیلے کے عقبی حصے میں آیا اور روبیر کو تلاش کیا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنے ہنگامے کے باوجود اس نے ٹیلے سے دور جانے کی حماقت کیوں کی؟ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔

''روبیر کہاں ہو تم؟''

مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کی بجائے مجھے عقب سے غراہٹ سنائی دی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں تیزی سے پلٹا تو ایک تنومند اسمار مجھ سے کوئی دس بارہ قدم کے فاصلے پر موجود تھا اور وہ ایک ہی جست میں مجھ تک آسکتا تھا۔ اس کا سر چھ فٹ سے بھی زیادہ اونچا تھا۔ اس کے کھلے خون آلود جبڑے سے رال بہہ رہی تھی۔ میں نے تیر کمان ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا مگر تیر نہیں چھوڑا۔ تیر اس کے جسم میں اتر جاتا مگر اسے مار نہیں سکتا تھا۔ ایک تیر کھانے کے بعد وہ لازمی زیادہ غضب ناک ہو کر حملہ کرتا اور مجھے دوسرا تیر چلانے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے گہری سانس لی اور کمان و ترکش اتار دیا۔

اب میرے پاس صرف ایک نیزہ تھا اور مجھے اسی کی مدد سے اس بلا سے نمٹنا تھا۔ مجھے تیار دیکھ کر وہ خوفناک آواز میں غرایا، ذرا جھکا اور پھر اس نے ایک قدم اٹھا کر مجھ پر جست لگائی۔ اس دوران میں میں نیزے کا پچھلا حصہ زمین پر ٹکا چکا تھا۔ اسمار کے کھلے جبڑے کا ہدف میرا سر تھا۔ میں نیزے کو تھامے اور اس کی انی کو حرکت دیتے ہوئے گھوما۔ یہ سیکنڈ کا بھی نہیں اس سے بھی مختصر کھیل تھا۔ مگر زندگی و موت کا کھیل تھا۔

جب اسمار نے جست لگائی اور میری طرف آیا تو میں اپنا سر بچا رہا تھا اور ساتھ ہی نیزے کی انی کو اسمار کے سینے کی طرف رکھ رہا تھا۔ وہ ہوا میں تھا اور میری طرح حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور نیزے کی انی ٹھیک اس کے سینے میں اتار دی۔ نیزہ اس کے جسم سے گزر گیا اور وہ مجھ پر آگرا۔ میری نظر آخری لمحے تک اس کے جبڑے پر تھی۔ اگر اس کے شکنجے میں میرا سر یا گردن آجاتی تو وہ ایک لمحے میں مجھے مار دیتا۔ گرتے ہوئے اس نے یہی کوشش کی تھی۔ مگر میں نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچتے ہوئے اس کا سر خود سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ نیزہ اس کے جسم سے گزرا اس نے تکلیف دہ انداز میں چیخ ماری تھی اور اب مجھے اپنے جبڑوں میں دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جسم سے پھوٹنے والا خون مجھے بھگو رہا تھا۔ اس کے پنجے میرے جسم کے اطراف میں تھے اور میں ایک طرح سے اس کے سینے تلے دبا ہوا تھا۔

مجھے پنجوں سے بھی خطرہ تھا کہ وہ مجھے ادھیڑ کر رکھ دیتے مگر اصل خطرہ جبڑے سے ہی تھا۔ اچانک اس کی مدافعت کمزور ہوئی تو میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور مجھے پوری قوت صرف کرنا پڑی تھی۔ اس کی گردن چھوڑ کر میں نے اس کے سینے میں پرویا ہوا نیزہ تھام لیا۔ یہ دوسری چیز تھی جس سے میں اسے خود سے دور رکھ سکتا تھا۔ اس نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے نیزہ کی مدد سے اسے پھر گرا دیا۔ میں زیادہ زور نہیں لگا رہا تھا کہ نیزے کی لکڑی ہی نہ ٹوٹ جائے۔ ساتھ ہی اس کے پنجوں سے بھی دور رہا تھا۔ میں نیزہ چھوڑ نہیں سکتا تھا کہ وہ کھڑا ہو جاتا۔ میں اس کے زخمی سینے پر لاتیں مارنے لگا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے مزاحمت ترک کر دی۔ اب وہ زمین پر لیٹ گیا تھا اور دم توڑنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ مگر میں اسے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا ہو سکتا تھا کہ یہ اس کی مکاری ہوتی میں اسے چھوڑتا اور وہ پھر کھڑا ہو جاتا۔

ابھی میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ پھر غراہٹ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو تین عدد اسمار مزید آن موجود ہوئے تھے۔ یہ وہی تھے جو اب تک سپاہیوں سے نمٹ رہے تھے اور شاید ان کا خاتمہ کر چکے تھے اور اب اپنے ساتھی کی مدد کے لیے آئے تھے۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ زیادہ دور نہیں تھے اور میں بھاگ کر سیڑھیوں تک نہیں جا سکتا تھا وہ اس سے پہلے ہی مجھے آلیتے۔ میں نے تقریباً نیم مردہ اسمار کے سینے سے نیزہ نکالنے کی کوشش کی اور ظاہر ہے ناکام رہا۔ نیزہ بری طرح اس کے سینے میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے نیزہ چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹنے لگا تھا۔ میری پشت پر ٹیلے کی دیوار تھی۔ جیسے جیسے میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اسمار آگے آرہے تھے۔ وہ زخمی تھے مگر ان زخموں کی پروا کیے بغیر میرے خاتمے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے انہوں نے درمیانی فاصلہ کم نہیں ہونے دیا تھا۔ جب وہ دم توڑتے اسمار کے پاس پہنچے تو اس نے آخری بار سر اوپر کیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دم نکل گیا۔ بالآخر میری پشت پر دیوار آگئی۔ اسمار غرانے لگے تھے۔ اپنے ساتھی کی موت نے انہیں مشتعل کر دیا تھا۔ ایک اسمار آگے آیا اور اس نے مجھ پر فیصلہ کن چھلانگ لگائی تھی۔

(جاری ہے)

(محمد کلیم سرفراز جہلم کا جواب)

نعیم الحسن شاہ........ترنول اسلام آباد

اس شہرِ بے مثال میں اک مجھ کو چھوڑ کر
ہر شخص لاجواب ہے ہر شخص باکمال

ناہید بٹ........شیخوپورہ

اغیار کو گل پیرہن ہم نے عطا کی
اپنے لیے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

سلیم ادریس........ملتان

آنے والی نسلوں کو کچھ نغمے دے کر اٹھ جاؤں گا
بار بار گائیں گے لیکن جی نہ بھرے گا جی نہ بھرے گا

آفاق احمد........ساہیوال

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی پروین سے رشتے جوڑے ہیں

(محمد توحید اسلم لاہور کا جواب)

فیض الحسن........کوٹ ادو

وہ اشک بن کر میری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

(ناعمہ تحریم.....کا جواب)

معراج محبوب عباس........ہری پور ہزارہ

نمکداں ہاتھ میں لے کر میری جاں سوچنا کیسا
ہزاروں زخم ہیں جاں پر جہاں چاہو چھڑک ڈالو

نگہت سلطانہ........حیدرآباد

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان کھاٹاں کا جواب)

منشی محمد عزیز مے........لندن

لوگ کہتے ہیں کہ مسکان ہے ہونٹوں پر میرے
کون جانے کہ تصور میں ہنسایا کس نے

شگفتہ مشتاق........لاہور

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

ایاز فاروق........سکھر

لوگو اس کے راگ الاپو جس نے دیپ جلائے ہیں
مانجھی بن کر وقت کے بیڑے اس نے پار لگائے ہیں

(تنویر نواز گل کے شعر کا جواب)

حنا غفار........بہاولپور

رنگ جتنے ہیں سب اس آنکھ کے ہیں
کوئی موسم نہیں اپنا مجھ میں

نجمی رحمان........یو ایس اے

رہو رہرو محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

اشفاق محمود........مظفرگڑھ

رخِ سحر چھپا ہوا تھا تیرگی کی گود میں
مگر ابال پل رہا تھا پالکی کی گود میں

(انیس اقبال لاہور کا جواب)

محمد احمد رضا انصاری........کوٹ ادو

جس دل میں ماں کی قدر دانی ہے
کامیاب اس کی زندگانی ہے

نوشین کنول........فیصل آباد

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

زویاب مصطفیٰ........پشاور

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تیرے رہ گزر کو میں

(نادیہ اصفہانی اسلام آباد کا جواب)

منظر علی خان........لاہور

یہ دوستی یہ مراسم یہ چاہتیں یہ خلوص
کبھی کبھی مجھے سب کچھ عجیب لگتا ہے

(فرخندہ حیات خان پور کا جواب)

انعم عباس........پشاور

تمہاری وہ یاد ہوں میں
ہمیشہ جسے بھول جاتے ہو

مجید احمد جائی......ملتان
تقدیر کے لکھے پہ کبھی شکوہ نہ کیا کر
پھول بھی تو خوش رہتا ہے کانٹوں کی بھیڑ میں

زاہد سلطانی........ کراچی
تو اور سوئے غیر نظر آئے تیز تیز
میں اور دکھ تیری مژدہ ہائے دراز

حبیبہ ادریس........ حاصل پور
ترے سرو قامت سے یک قدم آگے
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
(نسرین مجتبیٰ کراچی کا جواب)

نادرہ خورشید........ العین (یو اے ای)
یہاں خوابوں کی شاخوں پر کھلے ہیں پھول کچھ ایسے
وہ جب مہکے تو آنکھوں پر کئی الزام بھی دیکھے

محمد عمران جونانی........ کراچی
یوں توڑتی رہتی ہیں مسلسل تیری یادیں
آئینہ میرا جسم ہے پتھر تیری یادیں

ارمغان خان........ کوئٹہ
یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

محمد فہیم........ سرگودھا
یہ تمنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
(ارم افشین منڈی بہاؤالدین کا جواب)

رحیم افضل........ ساہیوال
وادیِ دل میں رہتے ہیں اب بھی سوکھے پتے وعدوں کے
یوں تو بظاہر دشت و دمن میں فصل بہار آئی ہے
(رمیش دیو ریہ سکھر کا جواب)

نیلوفر شاہین........ اسلام آباد
تمہارے ہونٹوں پہ کانپتی ہے میرے کانوں میں گونجتی ہے
جو بات تم نے کبھی نہیں جو بات میں نے سنی نہیں
(نورعین طلعت کراچی کا جواب)

نیلوفر شاہین........ اسلام آباد
یہ حیات چند روزہ کچھ عجب طرح گزری
کبھی زیست کی دعا کی کبھی موت کو پکارا

محمد اسلام شیخ........ چنیوٹ
کرامت سے کم نہیں ناصح
عشق میں جو زیاں نہیں ہوتا
(نصرت جبین خانپور کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری........ سرگودھا
اتنا تو اس نے مجھ کو ستایا نہیں ابھی
چھوڑو اسے خیال یہ آیا نہیں ابھی

ندیم ایاز........ لاہور
اپنے ہی شعلہ رنگیں سے جلا دامنِ گل
اپنی ہی شاخِ تبسم پہ کلی مرجھائی
(مظہر علی خان لاہور کا جواب)

مرزا ہادی بیگ........ حیدر آباد
ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوش گوار نہیں

اریشہ کائنات........ ملتان
ابر مجبور ہے صبا مجبور ہے
حسنِ فطرت کی ہر ادا مجبور ہے

ظہیر الحسن........ سیالکوٹ
اک جبر وقت ہے کہ سہے جا رہے ہیں ہم
اور اس کو زندگی بھی کہے جا رہے ہیں ہم
(ارم حارث کراچی کا جواب)

فلک شیر........ شاہ گڑھ رحیم یار خان
نہیں نہیں اب تیری کوئی جستجو ہی نہیں
تجھے ہم بھول گئے تیری خوشی کے لیے
(ارشد علی خان لاہور کا جواب)

مجید احمد جائی........ ملتان
بس گیا کچھ اس طرح تیرے بچھڑنے کا سماں
عمر بھر مڑ مڑ کے دیکھا اور پھر آیا نہیں

نسرین مشتاق........ لاہور
باہر آتی نہیں دراڑ کوئی
ہجر اندر سے توڑ دیتا ہے

بیت بازی کا اصول ہے۔ جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا اشعار ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 118

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 ستمبر 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

والد کا نام رام سنگھ تھا۔ کٹر سکھ مذہبی گھرانے سے تعلق تھا۔ باپ کے فوت ہونے پر والدہ ننھیال لے آئیں۔ 1878ء سے جام پور اردو مڈل اسکول میں تعلیم شروع ہوئی۔ تیسری جماعت میں تھے کہ دل میں اسلام کی چاہت پیدا ہوئی اور 15 اگست 1887ء میں گھر سے فرار ہو کر سیالکوٹ آگئے۔ 9 ذی الحجہ 1304ھ کو سنت تطہیر ادا ہوئی۔ اسی دوران خبر ملی کہ رشتے دار تعاقب میں ہیں تو وہ وہاں سے فرار ہو کر سندھ آگئے۔ دیوبند سے بھی تعلیم حاصل کی۔ اپنے وقت کے جید عالم دین قرار پائے۔ آج بھی ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔

علمی آزمائش 116 کا جواب

ظہیر عباس جولائی 1947ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 1989ء میں لندن کی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کی۔ 62 ون ڈے میچوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور 2572 رنز بنائے جس میں 7 سنچریاں شامل ہیں۔ 14 ٹیسٹ اور 13 ون ڈے انٹرنیشنل میچوں میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی۔ دائیں ہاتھ کے بیٹس مین اور آف بریک بالر رہ چکے ہیں۔

انعام یافتگان

1۔ احمد علی خان۔ سیالکوٹ 2۔ ناصر چغتائی۔ کراچی 3۔ عباس بٹ۔ لاہور

4۔ ناصرہ پراچہ۔ حیدرآباد 5۔ رونق بھٹو۔ لاڑکانہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے خادم حسین (کریم آباد)، سعید احمد چاند (لائنز ایریا)، نادر اسلم پراچہ (پی سی ایچ ایس)، نگار سلطانہ، افشاں ملک، زرین ملک، عنایت بھٹی (ڈی ایچ اے)، رفیق عباس، اصغر علی، فراز واصف، ندیم جگر، خالد سلطان، ایاز

صدیقی (نارتھ کراچی)، ابثار حسین، زاہد علی انصاری (کورنگی)، ندیم اکبر خان (قصبہ)، رانا لیاقت (طارق روڈ)، فیصل ندیم، ظہور علی خان، ابرار حسن (گلشن اقبال)، ناصر اکبر ملک، افشاں اقبال (گلشن درید)، ظہیر آفاقی (گلشن وسیم)، نصرت حسن (گولیمار)، عنایت علی راہی (رنچھوڑ لائن)، افضل خان (اورنگی)، وحید الحسن (ملیر)، انعام اللہ، شاہد احمد، محمد اشفاق (شاہ فیصل)۔ لاہور سے مناحل خان، ملک شفیع احمد، نادر احمد نوشاہی، الطاف الٰہی شیخ۔ نور احمد نور، وسیم قیصر، خلیق حسن، زاہد تسلیم، زلفی احمد، قیصر ایاز، شگفتہ یاسمین، ابرار احمد، روحا بانو، ثناء اللہ، احمد جاوید پاشا، نوازش بھٹی، ملک عباس، خالد احسن، ساجد ترمذی، چوہدری فیصل، کاوش احمد۔ ملتان سے راحیل خان، محمد فاروق نواں شہر، محمد معین چشتی، دروانہ شیخ، راجا ضیائی، نرجس عابدی، گل محمد شاہ، انیس چٹھہ، فیض الاسلام، خورشید جدون، معراج عباس، انور شاہ، یوسف بٹ، محمد صدیق، اسلام الدین، شیخ فخر عالم۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، سیف الرحمن خان، بشیر احمد عثمانی، سعادت حسن، افتخار الاسلام، وجاہت علی، عباس گوندل، جاوید ضیائی، نوری احسن، نذر احمد، عدیل رضوی، جبار علی، لیاقت شہزاد۔ راولپنڈی سے محمد رعنا، نوروز علی، اظہر الدین، ام حبیبہ فاروقی، غازی پاشا، ثناء احمد، گل مہر، عبدالقیوم، ارباز خان، نشاط فاطمہ، انور حسن۔ پشاور سے ام حبیبہ، بدیع الزماں حسن زئی، فراز حسن، غلام حسن طوری۔ اٹک سے شجاع الدین، ایس ایم فاروق، وزیر حسن، خضر حیات۔ میرپور خاص سے زریاب شکیل، اختر علی عباس، شبیر انصاری۔ میرپور اے کے سے ممتاز الحسن، فاضل بھٹ، اشفاق چنگیزی۔ ڈی جی خان سے نصیر احمد، شفاعت شیخ، انعام بٹ۔ وہاڑی سے محمد نیاز ٹبہ سلطان پور۔ حیدرآباد سے توقیر حسن زیدی۔ مظفر گڑھ سے ندیم احسن، ناہید عباس۔ منڈی بہاؤالدین سے کاشان قریشی، عطا محمد بٹ، کوثر تسنیم۔ ہری پور ہزارہ سے کاشان محمد خان، محبوب رند، حسن کمال۔ بھکر سے بتول انصاری، زوہیب محمد۔ جھنگ سے نادر انصاری، حسن ضیائی، عاصم سہیل، کامل اختر، نادرہ خورشیدہ۔ چنیوٹ سے ضغیم عباس زیدی، فریحہ انعام، اسد اللہ شیرازی۔ شادی پور سے ثناء احمد۔ تلہ گنگ سے شعیب احمد، ناہید بٹ۔ چکوال سے زاہد ترمذی، عارف امام، عثمان ملک، جعفر علی۔ خان بیلہ سے شگفتہ ایاز، ناصر علی، اشرف خان۔ میانوالی سے تحریم فاطمہ، نیاز ملکھانی، بربریٹ، عباس علی سید۔ ٹنڈو آدم سے نصر جاوید، نیاز عباس، کمالیہ سے عذوہیب اظہر ملک۔ لیہ سے عنایت علی، شجاعت خان، نوروز حسن، کیف علی خان۔ سکھر سے حافظ محمد تقی، عثمان رند، فاضل قریشی، محمد اسلام بھٹو، نیاز احسن، عالیہ ممتاز، نوازش علی۔ فیصل آباد سے دلاور حسین، تفصیل بٹ، عباس علی سانول، صدیق لغاری۔ کوٹ ادو سے محمد احمد رضا انصاری۔ وزیرآباد سے وسیم عارف ہاشمی۔ جامشورو سے منصور احمد، نور العین، غلام محمد (ٹنڈو جام)۔ ٹنڈو جان محمد سے تھری امولکھ۔ رحیم یار خان سے فلک شیر ملک (شاہ گڑھ)۔ بہاول نگر سے میاں خلیل الرحمن (فورٹ عباس)۔ حیدرآباد سے مرزا ہادی بیگ، ماہ رخ۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالاباغ) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمی اکملی ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدرآباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہٰ یاسین، دعا زہرا۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس جنسی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ توفیق، مظہر حسین، مانک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز احمد، وقار احمد، خالد کنول، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میکو، شاہ وقار، منہال زیدی، ابشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر السلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، ارہام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر شہنواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید فہیم، اصغر طوری بنگش، محمود اچکزئی، نزرانہ شاہ، ارباب خان، دروانہ شاہ، نسیم نیازی۔ چشتیاں سے معظم علی۔ مردان سے محمد انور (باڑی چیم)۔ ذوالفقار فضلک کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔

بیرونِ ملک سے آفاق احمد، نصیر اشرفی (یو اے ای)، عباس فاروق (عمان۔ سعودی عرب)، حکمت باری (امریکا)۔ زاہد بشیر فاروقی (جاپان) احمد انصاری (جرمنی) نصیر خان ناصری (جدہ سعودیہ) حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنت اومان)۔ انعام ملک (جرمنی)۔ فہد فاروق (ٹوکیو جاپان)۔

عجب دستور

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم
والدین بچوں کے لیے قربانیاں دیا کرتے ہیں۔ بھائی بہن ایک دوسرے کے لیے قربانیوں کی مثال قائم کرتے ہیں لیکن میں نے اپنے عزیزوں، خونی رشتے داروں کا جو چہرہ دیکھا ہے اس نے یہ الفاظ میرے دل پر ثبت کردیے ہیں کہ سب دھوکا ہے۔ سب مطلب پرست ہوتے ہیں۔ پتا نہیں وہ کون لوگ ہیں جو قربانیاں دیتے ہیں۔ میری آپ بیتی پڑھ کر آپ بھی میری ہم خیال ہو جائیں گی۔
سعدیہ
(کراچی)

میں گھر میں داخل ہوئی تو تھکن اور گرمی سے برا حال تھا۔ اسکول وین اتنا گھما کر گھر تک لاتی تھی کہ کئی بار میں نے سوچا اس سے بہتر ہے میں پیدل ہی گھر آجایا کروں۔ میرا اسکول گھر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ مگر میں مجبور تھی، اپنے فیصلے پر عمل نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اس وقت میں صرف دس سال کی اور پانچویں کلاس میں تھی۔ مگر صرف فیصلے کرنے کی حد تک چھوٹی تھی ورنہ دوسرے تمام معاملات میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی میں ہی تھی۔ بہت سے ایسے کام جو گھر میں بڑے بھائی یا بہنیں کرتی ہیں وہ مجھے کرنے کو کہے جاتے تھے اور جو کام میں ایک بار کرلیتی پھر وہ جیسے میرے لیے ہی مخصوص ہو کر رہ جاتا تھا۔ جیسا کہ دوپہر میں امی کے پاؤں کی مالش کرنا۔ امی کو چند سال سے پیروں میں شدید درد رہنے لگا تھا۔ بہت علاج کرایا مگر فرق نہیں پڑا۔

ایک دن امی درد سے بے حال تھیں اور مجھ سے ان کی تکلیف دیکھی نہیں جارہی تھی۔ میں نے بے قرار ہو کر امی سے کہا کہ میں ان کی مالش کر دیتی ہوں۔ امی نے مجھے زیتون کے تیل کی بوتل دی اور میں نے بہت دل سے امی کے پیروں کی مالش کی۔ درد ٹخنوں سے گھٹنے تک پنڈلیوں میں ہوتا تھا۔ میرے نرم ہاتھوں سے کی جانے والی مالش نے امی کو اتنا سکون دیا کہ جب میں نے مالش روکی تو وہ سو چکی تھیں۔ حالانکہ درد کی وجہ سے انہیں رات میں بھی بہت مشکل سے نیند آتی تھی۔ کئی گھنٹے بعد امی جاگیں تو انہوں نے مجھے گلے لگا کر اتنا پیار کیا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا پیار نہیں کیا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کے باوجود میرے ساتھ کبھی خصوصی سلوک نہیں ہوا بلکہ خصوصی کیا عمومی سلوک بھی نہیں ہوا تھا۔ سب مجھے بہت بے پروائی سے لیتے تھے اور میں کسی کے لیے خاص حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

بہن بھائیوں میں سب سے بڑے دو بھائی صائم اور رائم بھائی ہیں۔ ان کے بعد دو بہنیں ندا اور فضا باجی ہیں۔ میں سعدیہ سب سے چھوٹی ہوں اور تقریباً بڑھاپے کی اولاد ہوں۔ جب میں پیدا ہوئی تو ابو اڑتالیس برس کے تھے اور امی بیالیس سال کی تھیں۔ صائم بھائی مجھ سے پورے

انیس سال بڑے ہیں اور جس سال میں پیدا ہوئی وہ این ای ڈی یونیورسٹی میں سول انجینئرنگ کے پہلے سال میں تھے۔ فضا باجی بھی مجھ سے تیرہ سال بڑی تھیں۔ ان چار بہن بھائیوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں ہے مگر میرا ان سب سے فرق بہت زیادہ ہو گیا تھا اور شاید اسی وجہ سے وہ ذہنی طور پر کبھی میرے پاس نہیں آئے اور نہ ہمارے درمیان بہن بھائیوں والی بے تکلفی ہوئی۔ حد یہ کہ بہنوں کے درمیان تو عمر کا فرق اتنا اثر انگیز نہیں ہوتا ہے مگر میری دونوں بڑی بہنوں سے بے تکلفی نہ ہونے کے برابر تھی۔

بچپن میں تو ایسی باتوں کا احساس نہیں ہوتا ہے لیکن جب ہوش سنبھالا تو مجھے احساس ہونے لگا جیسے میں سب گھر والوں سے ہٹ کر کوئی فرد ہوں۔ بہن بھائی تو ایک طرف رہے امی ابو بھی مجھے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ابو شام کو دفتر سے آتے تو انہوں نے شاید ہی کبھی مجھے آواز دی ہو جب کہ باقی بہن بھائیوں کو پوچھتے تھے۔ اگر کوئی نظر نہ آتا تو اسے آواز دے کر بلاتے تھے مگر سوائے میرے۔ جب وہ آتے تو میں خود بھاگ کر جاتی اور سلام کرتی تھی۔ وہ بس میرا سر تھپتھپاتے اور دوسرے بہن بھائیوں سے بات کرنے لگ جاتے۔ یہی حال امی کا تھا وہ سارا دن میرے بڑے بھائیوں بہنوں کے لیے ہلکان رہتی تھیں کہ اس نے یہ نہیں کھایا، اس کے کپڑے میلے ہیں کتابیں سیٹ نہیں۔ فلاں کی فلاں ضرورت ہے۔ میری کالج جانے والی بہنوں کو امی خود ناشتا بنا کر اور لگا کر دیتی تھیں۔ صبح سب سے پہلے ابو ناشتا کرتے تھے کہ انہیں جلدی دفتر جانا ہوتا تھا۔ اس کے بعد بھائی بہنوں کی باری آتی۔ مسلسل چھ افراد کو ناشتا کرانا آسان نہیں ہوتا ہے اور جب میری باری آتی تو امی تھک چکی ہوتی تھیں۔

میں امی کا احساس کرتے ہوئے چھ سات سال کی عمر سے خود سے ناشتا لینے لگی تھی۔ اپنے لیے ڈبل روٹی پر خود مارملیڈ یا جیم لگاتی۔ امی مجھے چائے نکال کر دیتی تھیں مگر میں کپ اور اپنے برتن خود سنک میں رکھتی تھی۔ جب کہ ابو سے لے کر باقی بہن بھائیوں میں سے کوئی اس کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ وہ سب کھا پی کر اپنے بیگ اور بستے وغیرہ اٹھاتے اور گھر سے نکل جاتے تھے۔ رائم بھائی نے ایم بی بی ایس کے لیے میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا۔ جس سال میں اسکول میں داخل ہوئی صائم بھائی نے ایم ای کر لیا تھا۔ جب میں دوسری کلاس میں تھی تو رائم بھائی نے ایم بی بی ایس مکمل کر لیا اور سرجن بننے کی تیاری کرنے لگے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ہارٹ سرجن بنیں۔ اس سے اگلے سال میں تیسری میں گئی اور ندا باجی نے ایم بی اے کر لیا۔ جس سال میں نے پرائمری پاس کی فضا باجی نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر مکمل کیا تھا۔

یعنی میرے چاروں بہن بھائیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ پھر انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ صائم بھائی کینیڈا چلے گئے۔ وہاں انہوں نے سول انجینئرنگ سے متعلق مزید کورس کیے اور ان کو بہت اچھی جاب مل گئی۔ میں دس سال کی تھی جب وہ واپس پاکستان آئے اور شادی کر کے دوبارہ چلے گئے۔ اگرچہ ان کے لیے دلہن امی اور بہنوں نے تلاش کی تھی مگر ان کی شرط تھی کہ وہ بہت خوب صورت ہو۔ سیما بھابی سچ مچ بے پناہ حسین تھیں، مگر ان کے نخرے اور خود پسندی بھی اسی حساب سے تھی۔ صائم بھائی

کے بعد رائم بھائی نے بھی کینیڈا جانے کا ارادہ کیا اور ان کو بھی وہاں نوکری مل گئی۔ وہیں انہوں نے ہارٹ سرجری میں اسپیشلائزیشن کی۔ پہلے صائم بھائی اور پھر رائم بھائی کو بھی کینیڈا کی شہریت مل گئی تھی۔ انہوں نے پاکستان کی شہریت چھوڑ دی تھی۔

ان ہی دنوں امی کو پنڈلیوں میں تکلیف شروع ہوئی اور جب تک میں مالش نہیں کرتی انہیں آرام نہیں آتا تھا۔ یہ عرق النسا کا درد تھا جو عورتوں کو بہت کم ہوتا ہے مگر امی کو ہو گیا تھا۔ ویسے تو درد ہر وقت ہوتا تھا مگر جب اس میں شدت آتی اور دورے والی کیفیت ہوتی تو امی ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھیں۔ ندا اور فضا باجی پریشان ہوتی تھیں مگر انہوں نے کبھی ایک حد سے زیادہ فکر نہیں کی۔ کم سے کم انہوں نے امی کے درد کے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں ان سے زیادہ بے قرار رہتی تھی اور اسی لیے میرے چھوٹے سے ذہن میں مالش کا خیال آیا۔ ایک بار میں نے یہ کام کیا تو امی نے سراہا تو بہت مگر اس کے بعد یہ میری ہی ذمے داری بن گئی۔ حالانکہ جب میں اسکول سے آتی تو اس وقت ندا اور فضا باجی بھی اپنی یونیورسٹیز سے آجاتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایک دن کے لیے بھی یہ ذمے داری نہیں اٹھائی اور نہ ہی امی نے ان سے کبھی کہا۔

دوسری طرف اسکول سے تھکی ہوئی آتے ہی امی مجھے بلالیتی تھیں اور میں مروت میں ایک گلاس پانی پیے بغیر امی کی مالش کرنے میں لگ جاتی تھی۔ ان کے سامنے ہی میں پسینے میں شرابور ہوتی تھی مگر امی نے کبھی نہیں کہا کہ میں ذرا آرام کر لوں یا چینج کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر آجاؤں اور پھر ان کے پیروں کی مالش کروں۔ اس کے برعکس ایک دو بار میں کپڑے بدل کر اور منہ ہاتھ دھو کر آئی اور اس کام میں مجھے مشکل سے چند منٹ لگے مگر امی مجھ پر یوں برس پڑیں جیسے میں نہ جانے کتنی دیر بعد آئی ہوں۔ اتنی سننے کے بعد میں نے بہتر سمجھا کہ اسکول سے آتے ہی مالش کر دیا کروں۔ ورنہ مالش کرنے کے دوران باتیں بھی سننا پڑتیں۔

مالش بھی تقریباً آدھے گھنٹے کرنا پڑتی تھی۔ ایک دس سال کی لڑکی کے لیے اتنی دیر تک مالش کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ میں پہلے ہی تھکی ہوئی آتی تھی اور مالش مجھے بے حال کر دیتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ میں امی کے پاس سے ہٹ کر کمرے میں جاتی اور بستر پر گر کر بے خبر ہو جاتی۔ مجھے کھانے تو کیا کپڑے بدلنے کا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ دوپہر کا کھانا سب خود کھاتے تھے اس لیے کسی کو پتا نہیں چلتا کہ میں نے کھانا ہی نہیں کھایا ہے۔ ایک دو گھنٹے بعد جب طبیعت بحال ہوتی اور ہمت آتی تو اٹھ کر یونیفارم چینج کرتی اور پھر کھانا کھاتی تھی۔ اس کے بعد دوپہر کے کھانے کے سارے برتن دھوتی تھی کیونکہ یہ بھی میری ذمے داری بن گئے تھے۔ اب تک ہمارے ہاں سوائے کھانا بنانے کے سارے کام کے لیے ماسی تھی۔ وہ پہلے دوپہر کے برتن بھی دھوتی تھی مگر ایک بار وہ بیمار ہوئی اور چند دن کام پر نہیں آئی تو مجھے اس کی جگہ دھونے پڑے اور پھر امی نے اسے اس کام سے روک دیا اور میری مستقل ذمے داری لگا دی۔

ندا اور فضا باجی نے پچیس سال کی ہو کر بھی کوئی ذمے داری نہیں اٹھائی تھی۔ چھوٹے موٹے کام کر لیتی تھیں۔ اسی طرح اپنے کام کر لیتی تھیں۔ امی کے نزدیک یہی بہت تھے۔ انہیں بہت فخر تھا کہ ان کے بیٹے اور بیٹیاں پروفیشنل تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ندا باجی نے ایم بی اے کے بعد جاب شروع کر دی تھی اور اسی دوران میں ان کا رشتہ آ گیا۔ ظہیر بھائی انگلینڈ میں ہوتے تھے۔ وہ پڑھنے کے لیے یہاں سے گئے اور پھر وہیں رہ گئے۔ ندا باجی رخصت ہوئیں۔ ان کے دو سال بعد فضا باجی بھی انگلینڈ چلی گئیں مگر وہ شادی کر کے نہیں گئی تھیں بلکہ وہ جس ملٹی نیشنل موبائل کمپنی میں جاب کرتی تھیں اس نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انہیں انگلینڈ جانے کی پیشکش کی اور انہوں نے قبول کر لی۔ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اب گھر میں وہی سب سے بڑی تھیں۔ مگر ان کا استدلال یہ تھا کہ سوچنے کے لیے ان سے تین بڑے موجود ہیں جب انہوں نے نہیں سوچا تو وہ کیوں سوچیں اور اپنا کیریئر چھوڑیں۔

یوں بارہ سال کی عمر میں میں گھر کی بڑی بن گئی۔ اندر کی بہت سی ذمے داریاں میں پہلے ہی سنبھال رہی تھی اب باہر کی ذمے داریاں بھی مجھ پر آ پڑیں۔ اسی سال ابو جاب سے ریٹائر ہوئے۔ وہ کے ڈی اے میں اچھے گریڈ کے آفیسر تھے۔ ابو کی تنخواہ اچھی رہی تھی۔ مگر ابو کی اچھی جاب سے قطع نظر ہماری فیملی مالی لحاظ سے مستحکم تھی۔ میرے دادا جب انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تو وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لائے تھے اور اس سے انہوں نے شہر کے مختلف علاقوں میں زمین اور جائیدادیں خرید کر ڈال دی تھیں۔ یہ اتنی زمین اور جائیداد تھی کہ اس کا کرایہ بھی ان کے اور ان کے خاندان کے لیے کافی رہا تھا۔ دادا جان کے بعد جب بٹوارہ ہوا تو ابو کے حصے میں ایک کوٹھی اور مین شہر میں دو پلاٹ آئے

تھے۔ ابو نے اس جائیداد میں اضافہ کیا۔ انہوں نے شہر کے ایک پوش علاقے میں چار بیڈ رومز کا فلیٹ لیا۔ گلشن اقبال میں ایک چھوٹی کوٹھی تھی۔ جو انہوں نے ملازمت کے دوران ملنے والے پلاٹ پر بنائی تھی۔ فلیٹ اور دو کوٹھیاں کرائے پر تھیں اور ان سے اچھا خاصا کرایہ آتا تھا۔

یعنی مالی لحاظ سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ خود ہم گلشن اقبال میں ایک دو منزلہ مکان میں رہتے تھے۔ یہ کرائے کا تھا مگر اس کے مالک ابو کے بہت اچھے دوست تھے اور وہ پورے خاندان سمیت بیرونِ ملک شفٹ ہو گئے تھے۔ انہوں نے جاتے ہوئے بہت اصرار کر کے ابو کو یہ مکان دیا تھا اور ہم تقریباً پندرہ سال سے یہاں تھے۔ اس میں اوپر نیچے چھ بیڈ رومز تھے جو ہماری ضرورت کے لحاظ سے خاصے زیادہ تھے۔ جب تک چاروں بہن بھائی یہاں تھے تو سارے ہی بیڈ رومز استعمال ہوتے تھے مگر ان کے جانے کے بعد مکان کا اوپری پورشن خالی ہو گیا تھا۔ اس لیے اسے بند کر دیا گیا اور ہم تینوں اب نیچے کے پورشن میں رہتے تھے۔ ہاں کبھی ان میں سے کوئی آجاتا تو امی اوپر کا کوئی بیڈ روم کھلوا لیتی تھیں۔ سال میں دو تین بار اوپری پورشن کی تفصیلی صفائی کراتی تھیں۔

گھر کی صفائی، کپڑے اور برتن دھونے کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ آتی تھی۔ اب وہ صرف رات اور صبح ناشتے کے برتن دھو کر چلی جاتی اور دوپہر کے مجھے دھونا پڑتے تھے۔ خیر اب وہ اتنے نہیں تھے تین افراد کے برتن ہی کتنے ہوتے ہیں۔ درحقیقت میرے بہن بھائیوں کے جانے کے بعد کام بہت کم ہو گیا تھا کیونکہ وہ پھیلاوا بہت کرتے تھے اور انہیں اپنا پھیلایا ہوا سمیٹنے کی عادت بھی نہیں تھی۔ کھانا امی خود بناتی تھیں کہ انہیں اور باقی سب گھر والوں کو بھی کسی اور کے ہاتھ کا کھانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ جس زمانے میں امی کو عرق النسا کی تکلیف شروع ہوئی اور ان کے لیے زیادہ دیر کھڑے رہنا بھی مشکل ہوتا تھا تب بھی انہوں نے خود ہی کھانا بنایا۔ اگر ندا یا فضا باجی نے ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی تو انہوں نے منع کر دیا۔ وہ ان سے کہتیں کہ وہ صرف پڑھیں اور اپنا کیریئر بنانے پر توجہ دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اپنا کیریئر بنا لیا۔ وہ فطری طور پر کام سے جی چراتی تھیں اور اگر کبھی سر پر پڑنے کی وجہ سے کچھ کرنا پڑ جاتا تو ان کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ بات امی بھی سمجھتی تھیں۔ اس لیے وہ ان سے کام کا کہتی بھی نہیں تھیں۔

بڑی بہنوں کے برعکس مجھے کام کرنے میں کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ بچپن سے شاید دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے میں بھاگ بھاگ کر کام کرتی تھی۔ بھائیوں کی چھوٹی موٹی چیزیں لانا اور ان کے کام کر کے دینا اسی طرح جو بہنیں کہتیں وہ بھی کرتی۔ کبھی کسی کام سے انکار نہیں کرنا اور منہ بنانا مجھے آتا ہی نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے کام میرے ذمے فرض کر لیے گئے تھے اور از خود نہ کرنے پر مجھ سے ان کی باز پرس ہوتی تھی۔ بھائیوں کے جوتے، موزے یا رومال نہیں مل رہے ہوں تو مجھ سے پوچھا جاتا۔ اسی طرح کچن کی چیزیں اِدھر اُدھر ہوں تو مجھے آواز دی جاتی تھی۔ گھر کے صحن میں لگے پودے اگر خشک ہو رہے ہوں تو مجھ سے سوال کیا جاتا۔ کبھی کبھار تو حد ہی کر دی جاتی اور ان سوالوں کے جواب بھی مجھ سے طلب کیے جاتے جن سے میرا کوئی واسطہ ہی نہیں تھا جیسے گاڑی کی چابی کہاں ہے اور گیزر کا پوائنٹ کس نے بند کیا۔

جب سارے بہن بھائی ایک ایک کر کے چلے گئے تب بھی میں اتنی سمجھدار نہیں تھی کہ سوچ سکتی کہ انہوں نے مجھے کس طرح استعمال کیا۔ کبھی میری اور میرے کیریئر کی پرواہ نہیں کی۔ خود وہ جب امتحان کے دنوں میں پڑھتے تو لگتا کہ مقدس گائے بن گئے ہوں جس کے سامنے سر ہلانا بھی گناہ سے کم نہیں ہوتا تھا۔ کام کا کہنے اور کسی بھی طرح سے ڈسٹرب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس میرے پیپرز کو کبھی اہمیت نہیں دی گئی۔ مدد کرنا تو ایک طرف رہا انہیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ اگلے روز میرا پیپر ہے اور مجھے پڑھنے کے دوران کوئی کام تھما دیا جاتا اور فوراً کرنے کی فرمائش کی جاتی۔ حالانکہ یہ کام وہ خود یا دوسرا کوئی آسانی سے کر سکتا تھا۔ مگر مجھے ہی کہا جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ دوسرا کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا تھا اور میں سب کے کاموں کے لیے بھاگتی تھی۔

پھر سب چلے گئے اور اپنا بوجھ میرے لیے چھوڑ گئے۔ وہ بوجھ جو انہوں نے کبھی اٹھایا نہیں اور شاید اب اٹھانے کا وقت آیا تھا تو انہوں نے اس سے پہلے نکل جانا مناسب سمجھا۔ پھر یک دم ہی سب مجھ پر آ گیا۔ ابو جاب کے آخری دنوں میں بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کے پھیپھڑے کمزور تھے اور وہ حد سے زیادہ اسموکنگ کرتے تھے۔ اگر انہیں چین اسموکر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس کمزوری کی وجہ سے ان سے کوئی محنت والا کام نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ذرا سا چلتے پھرتے تو سانس پھول جاتا تھا۔ دفتر تو وہ جیسے تیسے جاتے رہے تھے

مگر ریٹائرمنٹ کے بعد وہ گھر اور بیڈ کے ہو کر رہ گئے یا پھر ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے لیے باہر جانا اور کوئی کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ باہر کے کام وہ پہلے بھی بہت کم کرتے تھے مگر پہلے بھائی اور بہنیں تھیں باہر کے کچھ نہ کچھ وہ نمٹا دیتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

امی کو شروع سے باہر کے کاموں کی عادت نہیں تھی۔ وہ بس اپنی اور گھر کے سامان کی شاپنگ کے لیے جاتی تھیں۔ اس سے ہٹ کر انہیں باہر کے کاموں کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر گھر کی عورت تھیں۔ مگر ایک گھر کی ضرورت صرف سودا سلف نہیں ہوتا ہے۔ دسیوں دوسرے کام ہوتے ہیں جن کے لیے نکلنا پڑتا ہے اور دوسروں سے ملنا پڑتا ہے۔ جب تک ابو دفتر جاتے تھے وہ یہ کام کر لیتے یا کسی سے کرا لیا کرتے تھے۔ جب گھر بیٹھے تو وہ خود بھی نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی اب کسی سے کرا سکتے تھے۔ حالانکہ گھر میں گاڑی موجود تھی مگر وہ طبیعت خرابی کا کہہ کر باہر کے ہر کام سے انکار کر دیتے تھے۔ امی کر نہیں سکتی تھیں اس لیے یہ کام میرے سر آ گئے اور بارہ تیرہ سال کی عمر سے میں پانی بجلی اور گیس کے بلوں کو جمع کرانے سے لے کر ان میں تبدیلی جیسے کام کرانے لگی تھی۔

روزمرہ کا سامان لانا پہلے ہی میرے ذمے داری تھی۔ امی صبح اسکول جاتے ہوئے مجھے سودے کی فہرست اور پیسے تھما دیتی تھیں۔ میں اسکول سے واپسی پروین سے نزدیکی مارکیٹ میں اتر جاتی۔ فہرست کے مطابق سامان لے کر گھر آتی، اپنے بیگ کے ساتھ مجھے سامان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ایمرجنسی میں چاہیے ہوتو میں ہی جاتی تھی۔ میں نے امی سے کئی بار کہا کہ وہ ان کاموں کے لیے کوئی چھوٹا لڑکا ملازم رکھ لیں جیسا کہ آج کل رواج ہے۔ مگر وہ نہیں مانتی تھیں، ان کے دل میں وہم بیٹھا ہوا تھا کہ اس قسم کے بچے مخبری کرتے ہیں اور گھروں میں ڈاکے پڑواتے ہیں۔ ڈاکے مارنے والے ان کے ہی بڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے امی کسی صورت ملازم لڑکا رکھنے کو تیار نہیں تھیں۔ گھر کے کاموں کے لیے آنے والی ماسی چیزیں لانے کا کام نہیں کرتی تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ وہ پیسے مار لے گی۔ اس لیے میں ہی کرتی رہی۔

شروع میں تو لڑکی تھی پھر چند سال میں جوان لڑکی ہو گئی تب مجھے باہر جانا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ حالانکہ ہم جس علاقے میں رہتے تھے وہاں لڑکیوں کا باہر جانا اور خود سے شاپنگ کرنا عام سی بات تھی۔ محلے کی، آس پاس کی خواتین اور لڑکیاں خود جا کر سامان لے آتی تھیں۔ بلکہ اس وقت حالات اتنے اچھے تھے کہ اکیلی لڑکی یا عورت بھی شام کے بعد آرام سے باہر آتی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے مجھے بھی ڈر نہیں لگتا تھا مگر میری فطرت میں ایک قسم کی مزاحمت تھی۔

اگرچہ میں جب باہر جاتی اور غیر مردوں سے بات کرتی تو میرے انداز میں اعتماد ہوتا تھا۔ میں اجنبی لوگوں سے بھی بنا کسی جھجک کے بات کر لیتی تھی۔ مگر اندر سے مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ آدمی کو اپنی فطرت کے خلاف کام کرنا پڑے تو اسے جو جھنجلاہٹ ہوتی ہے اس سے وہی واقف ہوتا ہے۔ مگر مجبوری تھی باہر کے مردانہ کام بھی مجھے کرنا پڑتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں صرف چودہ سال کی تھی جب ہمارا بجلی کا بل بہت زیادہ آ گیا تھا۔ میٹر چیک کیے بغیر بل بھیج دیا گیا تھا۔ اگرچہ ہم ادا کر سکتے تھے مگر امی نے کہا کہ اسے ٹھیک کرانا ہوگا اور یہ کام مجھے کرنا ہوگا۔ میں نے آج تک کوئی دفتر نہیں دیکھا تھا اس لیے ذرا گھبرا گئی۔

''امی میں کیسے کروں گی؟''

''جیسے سنبل نے کیا اس کا بجلی کا بل زیادہ آیا تو اس نے بھی تو جا کر ٹھیک کرایا تھا۔''

سنبل باجی کے میاں دبئی میں ہوتے تھے اور وہ خود اپنے تین بیٹوں کے ساتھ یہاں رہتی تھیں۔ بیٹے دس، سات اور پانچ سال کے تھے اس لیے وہ چھوٹے موٹے کام کر لیتے تھے مگر اس قسم کے کام سنبل باجی خود کرتی تھیں۔ مگر وہ تیس برس کی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھیں، انہوں نے یونیورسٹی سے ماسٹر کیا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''امی وہ تو بڑی ہیں اور شادی شدہ بھی ہیں۔''

''تم بھی اب بچی نہیں رہی ہو۔ یہ کام تم نے ہی کرنا ہے۔'' امی نے حتمی لہجے میں کہا تو مجبوراً مجھے یہ کام ذمے لینا پڑا تھا۔ سب سے پہلے میں نے سنبل باجی سے پوچھا کہ وہ کہاں گئی تھیں اور انہوں نے بل کیسے ادا کیا؟ مگر انہوں نے مجھے ٹھیک سے نہیں بتایا۔ ٹالتی رہیں اور بہ مشکل میں نے ان سے اس جگہ کا پتا نکلوایا جہاں وہ گئی تھیں۔ مزے کی بات ہے کہ بل کی پشت پر اس آفس کا پتا موجود تھا اس ہدایت کے ساتھ کہ بل میں کسی قسم کی درستگی یا شکایت کے لیے یہاں رجوع کریں۔ میں پہلے دیکھ لیتی تو سنبل باجی سے دماغ نہ کھپانا پڑتا۔ یہ جگہ میرے اسکول سے کچھ ہی فاصلے پر تھی۔

ان دنوں میں نویں کلاس میں تھی۔ چھٹی کے بعد میں بجلی والوں کے دفتر پہنچی اور کاؤنٹر سے معلوم کیا کہ بل کی درستگی کے لیے مجھے کس سے ملنا ہوگا۔ وہاں سے بتایا کہ یہ کام جو صاحب کرتے ہیں وہ آج آئے نہیں ہیں اس لیے میں کل آؤں اور دو بجے تک وہ صاحب دفتر سے اٹھ جاتے ہیں۔ اس لیے میں ایک گھنٹا پہلے آؤں۔

میری چھٹی ایک بجے ہوتی تھی اور پندرہ منٹ کا راستہ تھا۔ لہٰذا میں ایک بجے کسی صورت وہاں نہیں پہنچ سکتی تھی اس لیے میں نے اگلے دن اسکول میں پرنسپل سے بات کر کے پہلے چھٹی لی۔ وہ اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ ان کو بل دکھایا تب کہیں جا کر مجھے ساڑھے بارہ بجے اسکول سے نکلنے کی اجازت ملی۔ میں بجلی کے دفتر پہنچی اور اتفاق سے وہ صاحب موجود تھے۔ شاید انہیں میری عمر دیکھ کر ترس آ گیا اور انہوں نے بہت جتاتے ہوئے بل کو ان یونٹس کے مطابق کر دیا جو میں نوٹ کر کے لائی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''بے بی ہم ایسا کرتے نہیں ہیں مگر آپ چھوٹی ہیں اس لیے آپ کے ساتھ رعایت کر رہے ہیں ویسے آپ کے ہاں کوئی بڑا نہیں ہے جو اس قسم کے معاملات کو دیکھے۔''

میں کام ہو جانے پر ان کی شکر گزار تھی۔ میں نے بتایا کہ میری کیا مجبوری ہے جو میں اتنی سی عمر میں اس قسم کے کاموں کے لیے سرکاری دفتر میں آئی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ یہ بل فوراً جمع کرا دیں تا کہ کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ میں آجائے اور اگلا بل جنریٹ نہ ہو۔ ویسے بھی بل جمع کرانے کی آخری تاریخ تھی۔ وہاں سے نکل کر میں گھر آئی اور پھر امی سے پیسے لے کر نزدیکی بینک میں جا کر بل جمع کرایا۔ یوں یہ مسئلہ حل ہوا۔ مگر صرف ایک مسئلہ نہیں تھا۔ آئے دن نت نئے مسئلے ہماری زندگی کا ایک حصہ ہیں اور ان میں اضافہ ہی ہوتا ہے میں نے کبھی کمی ہوتے نہیں دیکھی۔

جن دنوں میں نویں کے پیپرز کی تیاری کر رہی تھی۔ پانی کے بل کی عدم ادائیگی پر ہماری لائن کاٹ دی گئی۔ بل پورا محلہ بلکہ علاقہ ادا نہیں کرتا تھا اور کرتا بھی کیسے جب سال سال بعد بل آتا تھا۔ اس میں آخری تاریخ بھی گزر چکی ہوتی تھی۔

ایک بار جمع نہیں کرایا تو پھر بل جمع ہوتا رہا۔ پورے علاقے کا بل جمع ہوتا رہا تھا مگر لائن صرف ہماری کاٹی گئی۔ پانی کی کمی بجلی اور گیس کی کمی سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں ان دنوں ہوا تھا۔ ہمارے علاقے میں پانی کھلا آتا تھا۔ چند دن تو پڑوسیوں سے لے کر کام چلاتے رہے مگر یہ مسئلے کا مستقل حل نہیں تھا۔ روز روز کون پانی دیتا اور اس کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ ایک بار ٹینکر ڈلوایا مگر ٹینکر والے نے ایک تو مکس پانی دیا اور اوپر سے اس میں مٹی بہت زیادہ تھی۔ پورا ٹینک مٹی سے بھر گیا تھا۔ اسے بھی بعد میں صاف کرانا پڑا تھا۔ امی نے مجھ سے بل جمع کرانے کو کہا تا کہ لائن تو کھلے۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ میرے پیپرز ہونے والے ہیں اور میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے امی نے غصے سے کہا۔ ''تب بیٹھی رہو پانی کے بغیر اور تمہیں ماں باپ کا احساس بھی نہیں ہے۔''

حالانکہ میں اس وقت سے ان کا احساس کر رہی تھی کہ جب بچوں کو خود اپنا احساس نہیں ہوتا ہے۔ مگر امی کا کہنا تھا کہ میں ان کا احساس نہیں کر رہی تھی۔ غصے میں، میں نے کتابیں ایک طرف رکھیں۔ امی سے بل لیا۔ اسے جمع کرایا اور اس کی پشت پر لکھے ہوئے دفتر پہنچ گئی۔ ان دنوں پیپرز کی وجہ سے اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ واٹر بورڈ کا دفتر بھی ہمارے علاقے میں تھا مگر اتنا اندر گھسا ہوا اور غیر معروف سی جگہ تھا کہ جب میں وہاں پہنچی تو اس کی ویرانی اور سناٹے سے مجھے خوف آنے لگا۔ ایک بڑا سا احاطہ تھا جس میں کوئی گیٹ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہ مشکل ایک فقیر سے پوچھ کر میں اس گلی تک پہنچی جس میں اندر جانے والا گیٹ تھا اور وہاں کوئی چوکیدار تک نہیں تھا۔ البتہ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اب میرا خوف بڑھ گیا تھا۔ بے شک باہر کے کام کرتی تھی مگر تھی تو نوعمر لڑکی۔ میں ہمت کر کے اندر آئی جہاں ایک کونے میں دفتر کی چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی۔ اگر مجھے اندر جانا پڑتا تو میں وہیں سے پلٹ جاتی مگر خوش قسمتی سے ایک کھڑکی پر کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ میں نے وہاں لے کر جا کر بل دکھایا۔ اندر ایک سرخ آنکھوں والا آدمی کھڑا تھا اور وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے سہم کر کہا۔

''دیکھیں یہ بل ہم نے جمع کرا دیا ہے۔ ہماری لائن کاٹ دی ہے پلیز اسے پھر سے لگا دیں۔ ہم پانی کے لیے بہت پریشان ہیں۔''

اس نے مجھ سے بل لے کر دیکھا اور پھر بولا۔ ''آپ کو اندر آنا ہوگا۔''

''میں اندر نہیں آ رہی۔'' میں نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ بل دیکھیں اور ہماری پانی کی لائن بحال کریں۔ ورنہ بل مجھے دیں میں واٹر بورڈ کے مین آفس جاتی

ہوں۔"

مین آفس کی دھمکی نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "تم باہر رہو میں اسے اندر دکھا کر آتا ہوں۔"

وہ اندر کہیں چلا گیا اور میں خوفزدہ انداز میں اپنے آس پاس کا جائزہ لیتی رہی اور سوچتی رہی کہ اگر مجھے دوبارہ یہاں آنا پڑا تو میں کسی صورت اکیلی نہیں آؤں گی۔ مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ یہ دفتر ایسی جگہ ہے تو میں پہلے ہی انکار کر دیتی۔ اس وقت مجھے امی اور ابو دونوں پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا جو بے فکری سے مجھے یوں ایسی جگہوں پر بھیج رہے تھے۔ مجھے نہ سہی ابو کو تو پتا ہوگا کہ یہ دفتر کہاں ہے اور یہاں دن کے وقت بھی کیسی ویرانی تھی۔ اگر وہ میرے ساتھ آ جاتے تو کیا تھا۔ آدمی کو گئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی اور میرے وسوسے بڑھنے لگے تو میں نے سوچ لیا کہ اگر وہ پانچ منٹ میں نہیں آیا تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ بھاڑ میں جائے بل اور پانی کا کنکشن۔ مگر خوش قسمتی سے وہ دو منٹ بعد ہی آ گیا۔ اس نے بل مجھے واپس کیا اور خوش خبری سنائی۔ "آپ کا کام ہو گیا ہے۔ کل لائن مین آ کر آپ کا کنکشن بحال کر دے گا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ "آپ کا بہت شکریہ۔"

"شکریہ کیسا جی۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "یہ تو ہمارا فرض ہے آپ اندر آئیں کچھ ٹھنڈا پییں۔ آج موسم بہت گرم ہے۔"

"نہیں شکریہ، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" میں نے کہا اور تیز قدموں سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اس نے عقب سے کچھ کہا مگر میں نے سنا نہیں۔ جب تک میں گیٹ سے باہر نہیں نکل آئی مجھے لگتا رہا جیسے میرے پیچھے کوئی آ رہا ہے اور مجھے آواز دے رہا ہے۔ آخری کچھ فاصلہ تو میں نے دوڑتے ہوئے طے کیا تھا۔ گیٹ اور اس چھوٹی سی گلی سے باہر آ کر میں اپنا سانس اور پوری رفتار سے دھڑکتا دل نارمل کرتی رہی۔ مگر گھر کی طرف جاتے ہوئے مجھے رونا آ رہا تھا۔ اس عمر میں لڑکیوں کو گھر سے باہر کے کسی مسئلے کا علم نہیں ہوتا اور میں یوں بے حال پھر رہی تھی۔ گھر آتے ہوئے مجھے اتنا غصہ تھا کہ میں نے بل امی کو تھمایا اور کہا۔ "یہ کام ہو گیا ہے اب لائن لگے یا نہ لگے دوبارہ مجھ سے مت کہیے گا۔"

میرا موڈ دیکھ کر امی خاموش رہیں۔ ورنہ عام طور سے کسی کام سے انکار پر مجھے بے بھاؤ کی سننے کو ملتی تھیں۔ میں کمرے میں آ کر بہت دیر روتی رہی۔ جب دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے ماں باپ اب کس سے توقع کریں۔ میرے بہن بھائی تو اپنا اچھا وقت گزار کر باہر ملک جا چکے تھے اور وہ وہاں سے پیسے بھیج کر سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ ان کو یہ علم نہیں تھا کہ یہاں اور کتنے مسئلے مسائل ہیں۔ مزے کی بات ہے غیر ملک میں ان کو ان مسائل سے واسطہ ہی نہیں تھا۔ وہاں نہ بجلی جاتی تھی اور نہ اوور بلنگ ہوتی تھی۔ پانی کا مسئلہ نہیں تھا نہ گیس کا مسئلہ تھا۔ حد یہ کہ وہاں صحت اور امن عامہ کا بھی مسئلہ نہیں تھا۔ ذرا سی تکلیف پر ایک کال کرنے پر ایمبولینس معہ ڈاکٹر پندرہ منٹ میں آ جاتی تھی اور آدمی کو فوری طبی امداد ملتی تھی۔ ذرا سے خدشے پر پولیس کو کال کرو تو چند منٹ میں پولیس آ جاتی ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں کیا ہوتا ہے اس کا پتا مجھے کچھ عرصے بعد چل گیا تھا۔

شکر ہے کہ میٹرک کے پیپرز تک پھر مجھے کسی غیر متوقع مسئلے سے سامنا نہیں پڑا۔ مجھے اس لیے نہیں پڑا کہ گھر والوں کو نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میری ذمے داریاں کم ہو گئی تھیں۔ بلکہ ان میں تو اضافہ ہی ہو رہا تھا مگر باہر کے جو کام جن سے میری جان جاتی تھی وہ بس لگے بندھے رہ گئے تھے۔ ایسا ہوتا تھا کہ عید بقر عید پر بہن بھائیوں کی طرف سے فرمائش آ جاتی کہ ان کے لیے یہاں سے شاپنگ کر کے بھیجی جائے اور لمبی لسٹ آ جاتی۔ ٹھیک ہے وہاں سے بھی سامان آتا ہے مگر ایک تو وہ آرام سے شاپنگ کرتے تھے جب جاتے کوئی ایک چیز لی پھر دوسری لے لی، اس طرح وہ تھوڑی تھوڑی کر کے خاصی چیزیں جمع کر لیتے اور پھر ہمیں بھیج دیتے۔ دوسرے تین افراد کے لیے سامان ہی کتنا ہوتا تھا۔ جب کہ یہاں عام طور سے سیزن میں لسٹ آتی تو سب کی شاپنگ ایک ساتھ کرنی پڑتی۔ اور بہت سا سامان لینا پڑتا۔ اس کے لیے مارکیٹوں کے چکر لگانے پڑتے اور درجنوں دکانوں پر جانا پڑتا۔

لوگ بھی بہت سے ہوتے تھے۔ چار تو بہن بھائی تھے پھر ان کی بیویاں، شوہر اور بچے تھے۔ صائم بھائی کے چار بچے تھے۔ رائم بھائی کے بھی چار بچے تھے۔ ندا باجی کے تین بچے تھے اور فضا باجی کے دو بچے تھے۔ پھر کچھ اور لوگ بھی تھے مل ملا کر دو درجن سے زیادہ افراد کی شاپنگ کرنا پڑتی تھی اور پھر ہر چیز اور معیار کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ فضا باجی کی شادی بھی انگلینڈ میں ہو گئی تھی۔ انہوں نے پسند کی شادی کی

تھی اور ان کی شادی میں یہاں سے صرف امی گئی تھیں۔ ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور ان کی وجہ سے میں بھی نہیں جاسکی تھی۔ حالانکہ میرا دل بہت چاہ رہا تھا۔ ان دنوں میں نے آٹھویں کے پیپرز دیئے تھے اور اسکول کی چھٹیاں تھیں مگر امی نے لے جانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''تمہارے بابا کو کون دیکھے گا۔''

''بابا بھی ہمارے ساتھ چلیں۔''

''وہ وہاں کی سردی برداشت نہیں کرسکیں گے۔'' امی نے کہا۔

''بابا کو کون سا باہر بیٹھنا ہوگا۔ اندر تو گھر سینٹرلی ہیٹڈ ہوتے ہیں۔''

''کہہ دیا نا تمہارے بابا نہیں جا رہے۔'' امی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم بھی یہیں رہو گی۔''

یوں میری باہر جانے اور انگلینڈ دیکھنے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ جب سے میرے بہن بھائی باہر گئے تھے میری بھی خواہش تھی کہ باہر جاؤں مگر مجھے ایک بار بھی کسی نے آنے کو نہیں کہا۔ امی ایک بار کینیڈا اور ایک بار انگلینڈ ہو آئی تھیں مگر مجھے لے کر نہیں گئیں۔ مجھے کیا وہ ابو کو بھی لے کر نہیں گئیں۔ حالانکہ جب وہ کینیڈا گئیں تب ابو کی طبیعت اتنی خراب نہیں تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ امی مجھے اور ابو کو دوسرے بہن بھائیوں سے الگ رکھتی تھیں۔ جیسے ان کا فون آتا تو امی خود بات کرتی رہتیں اور مجھے یا ابو کی بات صرف اس وقت کراتیں جب دوسری طرف سے کوئی بات کرنے کو کہتا، اگر میں یا ابو بات کرنے کو کہتے تو امی ہماری بات نظر انداز کر کے خود باتوں میں مصروف رہتیں۔ پہلے ہمارے ہاں فون تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے کبھی کبھی میری بہن بھائیوں سے بات ہو جاتی تھی مگر ایک بار جب موبائل آیا اور لائن والا فون کٹ گیا تو میں بات کرنے کو ترس گئی تھی۔

اکثر تو مجھے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کسی بھائی یا بہن کا فون آیا ہوا ہے۔ اس وقت بھی مجھے اتنی سمجھ نہیں تھی کہ میرے بہن بھائی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے بس مجھ سے سلام دعا کی حد تک رکھی ہوئی تھی۔ ورنہ وہ جس طرح امی سے دیر تک بات کرتے تھے مجھ سے بھی کچھ نہ کچھ بات تو کر سکتے تھے۔ مگر مہینے میں ایک آدھ بار ان سے بس اس حد تک بات ہوتی تھی۔ وہ بھی نہایت رسمی قسم کی۔ ''سادی کیسی ہو...... ؟ کیا ہو رہا ہے آج کل......؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟''

اور بس اس سے زیادہ کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔

ایک ویڈیو چیٹ میسنجر میں سب نے اپنا اکاؤنٹ بنایا ہوا تھا اور اس میں ہمارا گروپ تھا جو ہمہ وقت آن رہتا تھا۔ جس کو فرصت ہوتی وہ گروپ میں آجاتا اور ایک دوسرے سے گپ شپ ہوتی تھی۔ جب میں آٹھویں میں تھی تو ہمارے گھر پہلی بار کمپیوٹر آیا تھا اور میں بھی اس میسنجر پر ہوتی تھی۔ مگر مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ بہن بھائی آپس میں لگے رہتے۔ اپنے گھر کی اپنی جاب کی اور دلچسپیوں کی باتیں کرتے تھے۔ اپنی تفریحات کو شیئر کرتے تھے۔ مستقبل کے پروگرام اور ارادے بتاتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ گھنٹوں لگے رہتے لیکن جہاں میں درمیان میں آتی سب بس چند باتیں کرتے اور اس کے بعد دوبارہ اپنی باتوں میں لگ جاتے یا پھر غائب ہو جاتے۔ لگتا تھا کہ میں ان کی بہن اور ان کے خاندان کا حصہ ہی نہیں ہوں۔ کئی بار میرے ساتھ ایسا ہوا کہ میں نے پھر اس میسنجر کو آن کرنا ہی چھوڑ دیا تھا جب امی نے ان سے بات کرنا ہوتی تو میں آن کر دیا کرتی تھی۔ مگر جب موبائل آیا تو امی نے میسنجر استعمال کرنا بھی بند کر دیا۔

میٹرک کے پیپرز کے بعد میں فارغ تھی۔ ابھی انٹر کی کلاسز شروع ہونے میں وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ انگلش لینگویج کا کورس کر لوں۔ برٹش کونسل سے یہ کورس ہو رہا تھا میں نے امی سے کہا تو وہ بولیں۔ ''چھوڑو کیا کرو گی انگلش لینگویج کورس کر کے؟''

''امی یہ تو آج کی ضرورت ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''باہر جانے کے لیے لازمی شرط ہے۔ پھر کچھ سیکھنا تو اچھی بات ہے۔''

امی نے مخالفت کی تھی مگر بہت زیادہ نہیں اور اس شرط پر مان گئیں کہ میں کورس کے ساتھ ساتھ اپنی گھر کی ذمے داریاں پوری کروں گی۔ میں مان گئی کیونکہ مجھے کام کرنے میں کبھی مشکل نہیں ہوئی۔ مجھ سے امی جتنا کام لیتیں میں خوشی خوشی کرتی تھی۔ بس مجھے ان کے رویے سے تکلیف ہوتی تھی۔ میرے بڑے بہن بھائیوں کے لیے ان کا رویہ کچھ اور ہوتا تھا اور ٹھیک اسی معاملے میں میرے ساتھ دوسرا رویہ ہوتا تھا۔ اس کی ایک مثال انگلش لینگویج کورس تھا۔ امی نے تمام بہن بھائیوں کو زور دے کر یہ کورس کرایا تھا اور وہ اس کی وجہ سے بھی اتنی آسانی سے باہر چلے گئے تھے۔ خاص

طور سے فضا باجی بالکل راضی نہیں تھیں مگر امی نے تقریباً پیچھے پڑ کر انہیں کورس کرنے کے لیے راضی کیا تھا۔ جب میں نے انگلش لینگویج کورس کرنے کو کہا تو امی نے ایک طرح سے مخالفت کی تھی۔

شاید وہ اسی وجہ سے مان گئی تھیں کہ میرے سارے بہن بھائیوں نے یہ کورس کیا تھا اور انہوں نے زور دے کر کرایا تھا اگر وہ زیادہ مخالفت کرتیں تو میں ان سے کہہ سکتی تھی کہ جب دیگر بہن بھائیوں نے کیا اور انہوں نے کرایا تب تو انہیں خیال نہیں آیا اور میری باری میں وہ کہہ رہی ہیں کہ یہ بیکار ہے۔

میں نے کورس میں داخلہ لیا اور جانا شروع کر دیا۔ اب مجھے باہر جانے کی عادت ہوگئی تھی اور مجھ میں اعتماد آ گیا تھا۔ میں دور جگہوں پر بھی آرام سے چلی جاتی تھی۔ اس کورس کے دوران مجھے بہت سی چیزیں سیکھنے کا موقع ملا۔ برٹش کونسلیٹ میں ایک بہت شاندار لائبریری ہے میں اس سے فائدہ اٹھانے لگی۔ یہاں بہت سی کتابوں کے علاوہ نئے رسائل بھی آتے تھے۔ میں انگریزی سیکھنے کے ساتھ ساتھ ان کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کرنے لگی تھی۔ کلاس کے بعد میں ایک دو گھنٹے لائبریری میں گزارتی تھی۔ اس کی وجہ سے دیر ہوتی تو امی کو مسئلہ ہوتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں جلد از جلد گھر آ جایا کروں مگر میں چاہتی تھی کہ کورس کے دوران میں اس لائبریری سے جتنا استفادہ کر سکتی تھی کر لوں کیونکہ اس کے بعد تو شاید مجھے موقع نہیں ملے گا۔ ایک تو اسکول شروع ہو جائے گا اور پھر مجھے گھر کے کاموں سے فرصت کہاں ملے گی۔

میں جس اسکول میں پڑھتی تھی وہ بہت اچھے معیار کا اور انٹرمیڈیٹ تک تھا۔ میرے سارے بہن بھائیوں نے یہیں سے پڑھا تھا۔ دیکھا جائے کہ مجھ میں کسی معاملے میں اپنے بہن بھائیوں سے کوئی مماثلت تھی تو وہ یہی اسکول تھا۔ باقی اور کسی معاملے میں میری اور ان کی زندگی میں مماثلت بہت کیا اس کے الٹ تھی۔ جن دنوں میں نے اسکول جانا شروع کیا تو امی کچھ بے چین سی ہو گئی تھیں۔ کیونکہ اتنے عرصے تک میں گھر میں رہی تھی صرف دوپہر کے وقت دو سے ڈھائی گھنٹے کے لیے لینگویج کورس کے لیے جاتی تھی۔ چھٹیوں میں ناشتے اور کھانے کی ذمے داری بھی میں نے سنبھال لی تھی۔ امی کو اب صرف رات کا کھانا بنانا پڑتا تھا وہ بھی صرف سالن ورنہ روٹی یا اگر چاول ہوتے تو میں ہی بناتی تھی۔ اسکول دوبارہ شروع ہوا تو اب امی کو ناشتا اور دوپہر کا کھانا پھر خود بنانا پڑتا۔

شاید اسی لیے وہ بے چین تھیں۔ انہوں نے دو تین بار دبے لفظوں میں مجھ سے کہا کہ میں اسکول چھوڑ دوں اور پرائیویٹ انٹر کرلوں۔ مگر میں نے ان کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی۔ جواب دینے یا بحث کرنے کی صورت میں امی کو اپنی بات کھل کر کہنے کا موقع مل جاتا اور وہ پھر پیچھے پڑ کر اپنی بات منوا لیا کرتی تھیں۔ اس لیے میں جو بات ماننا نہیں چاہتی اس پر امی سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔ نہ بولنے کے باوجود مجھے دکھ ہوا تھا۔ امی کو میری تعلیم اور کیریئر کی کوئی فکر نہیں رہی تھی جب کہ میرے بہن بھائیوں کے کیریئر کی فکر کر کر کے انہوں نے خود کو بیمار کرلیا تھا۔ ان کی پنڈلیوں کا درد اسی زمانے میں شروع ہوا تھا جب سارے بہن بھائی یہیں تھے اور امی ان کی خاطر صبح سے شام تک مسلسل مصروف رہتی تھیں۔ اگر وہ ہل کر پانی بھی نہ پیتے تو امی اف نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ امی نے انہیں اتنا کاہل بنایا تھا۔

دوسری طرف وہ چاہتی تھیں کہ میں صرف دو وقت کے کھانے کے لیے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دوں۔ میں نے یہ بات محسوس کی تو اب یہ کرنے لگی کہ رات کو ہی اگلے دن کا سالن بنا دیتی تھی۔ ہمیں تینوں وقت نیا کھانے کی عادت تھی۔ گھر میں کوئی بھی ایک وقت کا رکھا ہوا کھانا نہیں کھاتا تھا جو بچتا تھا وہ امی ماسی یا کسی ضرورت مند کو دے دیتی تھیں۔ گھر میں نیا ہی بنتا تھا۔ اس لیے میں رات میں دو ہانڈیاں بنا لیتی تھی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے اپنے لیے ناشتا خود بناتی تھی۔ اب امی آرام سے اٹھتیں اور اپنا ابو کا ناشتا بنا لیتی تھیں۔ یعنی ایمرجنسی بھی نہیں تھی۔ دوپہر میں آ کر میں روٹی ڈال لیتی، ہاں اگر چاول بننے ہوتے تو امی بنا لیتی تھیں اور اس کے بعد باقی ذمے داری میری تھی۔ اس کے باوجود امی میرے اسکول جانے سے خوش نہیں تھیں اور کسی نہ کسی طرح اپنی ناخوشی کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔

پھر ان ہی دنوں ابو کی طبیعت خرابی کا واقعہ پیش آیا اور امی کو جیسے موقع مل گیا۔ ابو کی طبیعت تو عرصے سے خراب تھی کیونکہ وہ سگریٹ چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ امی ان سے چھپاتیں تو وہ جا کر باہر سے دوسری لے آتے اور اسے امی سے چھپا کر رکھتے تھے۔ چھت پر جا کر پی لیتے یا واش روم میں پیتے تھے۔ نتیجے میں ان کے پھیپھڑے کمزور ہوتے گئے

اور اس کا اثر دل پر بھی پڑا۔ ایک دن میں اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی اور ابھی گیٹ سے نکل رہی تھی کہ امی کے چیخنے کی آواز آئی۔ ''سعدیہ...... سعدیہ دیکھ تیرے ابو کو کیا ہوا ہے؟''

میں واپس اندر بھاگی تو ابو نیم بے ہوش سے بستر پر پڑے تھے اور ان کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی مجھے لگا کہ انہیں اسپتال لے جانا بہت ضروری تھا ورنہ ان کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ میں اب باہر کی طرف بھاگی۔ ہمارے پڑوس میں کچھ لوگ تھے جن سے ہماری اچھی سلام دعا تھی اور وہ ہماری مدد کر سکتے تھے۔ ان کے پاس گاڑیاں تھیں یا وہ گاڑی چلانا جانتے تھے۔ مگر بد قسمتی سے ان میں سے کوئی گھر پر نہیں تھا سب دفتروں کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ گاڑی چلانے والا بھی کوئی دستیاب نہیں تھا ورنہ ہماری گاڑی تھی۔ مجھے نزدیکی ٹیکسی اسٹینڈ کا خیال آیا اور میں وہاں بھاگی گئی۔ ٹیکسیاں کئی تھیں مگر مریض کا سن کر وہ انکار کرنے لگے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انکار کیوں کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ایک عمر رسیدہ ڈرائیور تیار ہوا اور میں اسے گھر تک لائی۔ اس کی مدد سے ابو کو ٹیکسی میں ڈالا اور ہم ایک نزدیکی بڑے اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھے شبہ تھا کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ امی ابو کو سنبھالے پیچھے بیٹھی تھیں اور میں انہیں بتا رہی تھی کہ کوئی ٹیکسی والا راضی نہیں ہوا تھا سوائے ان بابا کے۔ ڈرائیور نے کہا۔

''بی بی وہ اس لیے نہیں مان رہے تھے کہ اسپتالوں کے باہر پولیس انہیں تنگ کرتی ہے۔ مریض لانے پر روک لیتی ہے کہ ایکسی ڈینٹ کر کے تو نہیں لائے ہیں۔''

میں حیران ہوئی۔ ''ساتھ جانے والے نہیں بتاتے؟''

''انہیں اتنا ہوش ہی کہاں ہوتا ہے اور پھر وہ اندر چلے جاتے ہیں، وہاں ہر ایک کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔ پر بات یہ ہے کہ یہ سب کھانے کے دھندے ہیں۔ دو ڈھائی سو دو تو جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اب آدمی اتنا کرایہ لے اور وہ رشوت میں دے دے تو پاگل ہوا نا۔''

''تم فکر مت کرو بابا میں دیکھوں گی۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ پھر میں نے اسے ابو کو اندر ایمرجنسی میں لے جانے کے بعد خود رخصت کیا اور پھر اندر آئی جہاں ڈاکٹر ابو کو دیکھ رہے تھے اور امی ایک طرف بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟''

''مجھے نہیں پتا تم جا کر پوچھو۔'' امی نے کہا۔ مجھے اندر آنے میں پانچ چھ منٹ لگے تھے اور اتنی دیر میں امی نے ڈاکٹر سے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ مجھے غصہ آیا مگر یہ غصے کا موقع نہیں تھا۔ میں ڈاکٹر کے پاس آئی جو ابو کے جسم سے مشینیں لگوا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔

''ہارٹ اٹیک ہے، ابھی ہم جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ نقصان کتنا ہوا ہے۔ پھر ٹریٹ منٹ کا آغاز کریں گے۔'' ڈاکٹر کہہ کر اپنے کام میں لگ گیا اور ایک نرس نے آ کر مجھ سے پوچھا۔

''یہ آپ کے ساتھ ہیں؟''

''جی میرے والد ہیں۔''

''پلیز کاؤنٹر پر جائیں اور ابتدائی فیس جمع کرا دیں۔''

گھر میں رقم کا سارا حساب کتاب امی کے پاس ہوتا تھا۔ باہر سے بہن بھائی جو بھیجتے وہ بھی امی کے اکاؤنٹس میں آتا تھا اور ان کے پاس ڈیبٹ کارڈ تھا۔ اس زمانے میں نیا آیا تھا مگر بہت سی جگہوں پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں اسپتال میں بھی اس سے ادائیگی ہو سکتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ امی پرس میں رقم اور ڈیبٹ کارڈ ساتھ لائی ہوں گی۔ لیکن جب میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے اطمینان سے کہا۔ ''وہ تو نہیں لائی اس کا کیا کرنا تھا؟''

''آپ کا خیال ہے ہم کسی خیراتی اسپتال میں آئے ہیں۔'' میں نے جل کر کہا۔ ''یہ بہت مہنگا اسپتال ہے اور انہوں نے مہربانی کی ہے کہ ابو کو فوری ٹریٹ منٹ دی ہے۔''

''تب تم ایسا کرو گھر جاؤ اور چیک بک لے آؤ۔''

''امی یہ چیک نہیں لیتے ان کو کیش ادائیگی کی جاتی ہے۔''

''ڈیبٹ کارڈ تو میں کسی صورت نہیں دوں گی۔'' امی نے صاف انکار کر دیا۔ ''پتا نہیں کتنی رقم کاٹ لیں ہمیں کیا پتا چلے گا؟''

''امی ایسا نہیں ہے یہ جتنی رقم کاٹیں گے اس کے رسید دیں گے اور ہم بھی چیک کر سکتے ہیں اگر انہوں نے زیادہ رقم کاٹی ہوگی تو ایک منٹ میں پتا چل جائے گا۔''

مگر امی کے دماغ میں جو بات بیٹھ جائے وہ کہاں نکلتی ہے۔ وہ چیک دینے پر مصر رہیں اور مجبوراً میں نے پہلے

کاؤنٹر سے پوچھا۔ انہوں نے ایک لاکھ جمع کرانے کو کہا۔ میں امی کو لے کر نکلی پہلے ہم رکشے میں گھر گئے اور وہاں سے امی نے چیک بک لی۔ بینک گھر کے نزدیک تھا۔ امی نے چیک سے ایک لاکھ روپے نکلوائے میں نے مجبور کر کے ان سے پچاس ہزار اور نکلوائے کہ آگے ضرورت ہو تو کیا ہم دوبارہ بھاگیں گے اور بینک بھی شام پانچ بجے تک کھلے ہوتے ہیں۔ ہم بھاگے دوڑے اسپتال آئے تو ڈاکٹر نے اچھی خبر سنائی کہ ہارٹ اٹیک تھا مگر اس نے زیادہ نقصان نہیں کیا تھا اور اب ابو کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ میں نے اور امی نے سکون کا سانس لیا۔ ہم نے ایک لاکھ روپے جمع کرا دیے۔ ڈاکٹر نے ابو کو مزید دو دن اسپتال میں رکھنے کو کہا تھا اور وہاں ان کی دیکھ بھال کا مکمل انتظام تھا اس لیے میں اور امی شام تک واپس گھر آ گئے۔

اس دوران بہن بھائیوں اور دوسرے رشتے داروں کو پتا چل گیا تھا۔ بہن بھائی تو کال کر سکتے تھے مگر اب رشتے دار گھر آنا شروع ہو گئے اور میں جو صبح سے تھکی ہوئی تھی ان کی خاطر تواضع میں لگ گئی۔ حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بس لیٹ کر سو جاؤں۔ امی میری حالت دیکھ کر بھی ان سے باتوں میں لگ گئی تھیں۔ رات گئے جب سب رخصت ہوئے تو مجھے سکون کا سانس لینے کا موقع ملا اور امی نے پاؤں کی مالش کے لیے بلا لیا۔ میں نے فریاد کی۔ ”تھکن سے برا حال ہے۔“

”باپ کے لیے تو دوڑی گئیں اور سارا دن دوڑتی رہیں۔“ امی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ماں کے لیے ذرا سا کرتے ہوئے تھکن کا خیال آ جاتا ہے۔“

امی کے طعنے سننے کی ہمت نہیں تھی اس لیے تیل کی بوتل اٹھا کر مالش میں لگ گئی مگر جان اس میں بھی نہیں چھوٹی امی نے نیا شوشہ تراش لیا تھا۔ اچانک بولیں۔ ”یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے؟“

میں دنگ رہ گئی۔ ”آپ کا مطلب ہے ابو کو ہارٹ اٹیک میری وجہ سے ہوا ہے؟“

”تو اور کیا تجھے ماں باپ کا خیال کہاں ہے بس اپنی پڑھائی کی پڑی ہے۔ تم اسکول جاؤ بے شک ماں باپ بھاڑ میں جائیں۔“

”امی کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ سب لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں، کیا میں انوکھی پڑھ رہی ہوں اور میرے بہن بھائیوں نے بھی تو پڑھا ہے۔ ان کی وجہ سے تو کسی کو کچھ نہیں ہوا۔“

امی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے انہوں نے دوسرا اعتراض کیا۔ ”اگر تو ڈرائیونگ سیکھ لے تو کتنے کام آسان ہو جائیں۔ ہمیں آج کی طرح خوار نہ ہونا پڑے۔“

”ابھی میں اٹھارہ کی نہیں ہوئی ہوں۔ جب تک میرا آئی ڈی کارڈ نہیں بنے گا ڈرائیونگ لائسنس کیسے بنے گا؟“

”ڈرائیونگ لائسنس بن جاتا ہے۔“ امی نے کہا۔ ”بس تم جلدی سے ڈرائیونگ سیکھ لو۔“

میں خود بھی ڈرائیونگ سیکھنا چاہتی تھی مگر اپنی کم عمری کی وجہ سے سوچ کر رہ جاتی اب امی نے کہا تو مجھے بھی خیال آیا۔ ”ٹھیک ہے میں سیکھ لوں گی۔“

اگلے دن امی کے پیروں میں تکلیف تھی اور مجھے اکیلے ہی اسپتال ابو کے پاس جانا پڑا۔ جو رشتے دار کل آئے اور رات تک بیٹھے رہے ان میں سے کسی نے اسپتال میں جھانکنے اور یہ معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی کہ ہمیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے، کسی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اس دن بھی مجھے ابو کی وجہ سے بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی۔ ان کے دو ٹیسٹ ہوئے اور مجھے بلڈ لے کر لیب جانا پڑا تھا۔ یہ خاصے مہنگے ٹیسٹ تھے اور میں امی سے پیسے لے آئی تھی ورنہ مجھے پھر سے گھر جانا پڑتا۔ ابو دو دن اسپتال میں رہے اور میں دو دن پیروں پر کھڑی رہی۔ میرا خیال تھا کہ بہن بھائیوں میں سے کوئی آئے گا مگر وہ صرف فون کرتے رہے اور امی سے لمبی لمبی باتیں کرتے رہے۔ مزے کی بات ہے کہ کسی نے ابو سے بات نہیں کی حالانکہ ہارٹ اٹیک تو انہیں ہوا تھا۔ دو دن بعد وہ بہت سی احتیاطوں، شرائط اور دواؤں کے ساتھ گھر آ گئے۔

ابو کو اٹیک کیا ہوا میری نئے سرے سے شامت آ گئی۔ اب مجھے ہر دو منٹ بعد ابو کی آواز پر دوڑنا پڑتا تھا اور وہ کوئی معمولی یا بیکار سا کام بتا دیتے جو ان کے خیال میں کرنا بہت ضروری ہوتا تھا اور مجھے کرنا پڑتا۔ اگر میں انکار کرتی یا کچھ دیر بعد کرنے کو کہتی تو مجھے بہت کچھ سننا پڑتا۔ اس لیے اب میں کوشش کرتی کہ انکار یا بحث نہ کروں۔ مگر اس کوشش میں میں مزید گھن چکر بن گئی۔ صبح کا ناشتا بھی اب میں بنا کر اسکول جاتی اور وہاں سے تھکی ہاری آ کر دوبارہ کچن میں لگ جاتی۔ ماسی جو پہلے رات اور صبح کے برتن اکھٹے دھو جاتی تھی اور مجھے صرف دوپہر اور شام کے کچھ برتن

دھونا پڑتے تھے اس نے اچانک برتن چھوڑ دیئے اور اب سارے برتن مجھے ہی دھونا پڑتے تھے۔ میں نے امی سے احتجاج کیا کہ ماسی نے کام کیوں چھوڑا ہے مگر وہ کوئی جواب نہ دیتیں۔ میں نے امی سے کہا کہ برتن دھونے کے لیے دوسری ماسی لگا دیں تو وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھیں۔ دوپہر میں کچن سے فارغ ہوتی تو ابو کی آوازیں شروع ہو جاتیں۔ وہ کیونکہ ہمہ وقت لیٹے رہتے تھے اس لیے انہیں نیند بہت کم آتی تھی۔ جاگنے کی وجہ سے وہ مجھے مشغول رکھتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی امی بھی بلاوجہ کے کام بتانے لگ جاتی تھیں۔

اس قید با مشقت سے بچنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا اور میں نے امی سے کہا کہ میں ڈرائیونگ سیکھنا چاہتی ہوں۔ امی تو خود بھی یہی چاہتی تھیں۔ انہوں نے خوشی سے اجازت دے دی۔ میں نے ڈرائیونگ سکھانے والے ایک مقامی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ یہ فیس زیادہ لے رہے تھے مگر وہ ڈرائیونگ سکھانے کے ساتھ ساتھ لائسنس بنوا کر بھی دے رہے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کی لیڈی انسٹرکٹر نے مجھے دو مہینے میں ڈرائیونگ میں ماہر کر دیا۔ اب میں اعتماد سے نہ صرف گلیوں بلکہ مصروف سڑکوں پر بھی ڈرائیو کرنے لگی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد تین بجے میں ڈرائیونگ کلاس لینے جاتی تھی۔ پانچ بجے وہاں سے واپسی ہوتی تو اس کے بعد گھر کی گاڑی پر آس پاس پریکٹس کرتی تھی۔ گھر کی گاڑی سے بھی مجھے یہ سہولت ہوئی کہ میں نے بہت تیزی سے ڈرائیونگ سیکھ لی اور دو مہینے بعد میرا لرننگ لائسنس بھی بن گیا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ذمے دار نے وعدہ کیا تھا کہ چھ مہینے بعد وہ میرا مکمل لائسنس بنوا دیں گے۔ بعد میں انہوں نے حسبِ وعدہ مجھے لائسنس بنوا دیا۔

مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ڈرائیونگ سیکھنے کے بعد میری مزید شامت آ جائے گی۔ اب ہر روز ہی امی یا ابو مجھے ساتھ لیتے اور کہیں نکل جاتے۔ انہوں نے کسی رشتے دار سے ملنا ہوتا تھا یا کسی کام سے جانا ہوتا تھا۔ ہارٹ اٹیک کے بعد ابو مسلسل علاج اور پرہیز کی وجہ سے پہلے سے کہیں ایکٹو ہو گئے تھے اور شاید مسلسل بستر پر پڑے رہنے کی وجہ سے اب انہیں گھومنے پھرنے کا شوق ہوا تھا۔ ہارٹ اٹیک کے بعد ڈاکٹروں نے انہیں ڈرائیونگ سے منع کیا تھا۔ یہ احتیاط طبیعت بہتر ہونے تک تھی مگر انہوں نے مستقل ہی ڈرائیونگ چھوڑ دی۔ وہ شام کو عزیز بھٹی پارک جانے لگے اور ظاہر ہے ان کے ساتھ جانے کی ڈیوٹی میری تھی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ابو کو پارک لے جاتے وقت امی کوئی کام بھی بتا دیتیں اور میں ابو کو پارک میں چھوڑ کر وہ کام کرنے جاتی تھی۔ کام نمٹا کر واپس آتی اور پھر ابو کو لے کر واپس گھر آتی تھی۔ یوں میں تقریباً روز ہی امی ابو کے ساتھ کہیں نہ کہیں آنے جانے لگی اور مجھے اپنے کاموں اور پڑھائی کے لیے اتنا وقت نہیں ملتا تھا۔

ان دنوں میں سیکنڈ ایئر میں تھی اور میرا ارادہ بزنس کمیونیکیشن میں ماسٹر کرنے کا تھا۔ جب میں انگلش لینگویج کورس کر رہی تھی تو میں.... کیریئر گائیڈ نامی ایک رسالہ بھی باقاعدگی سے دیکھتی تھی اور اس میں مختلف شعبوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا ہوا تھا۔ مجھے بزنس کمیونیکیشن سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ کسی زمانے میں یہ فیلڈ صرف خط و کتابت تک محدود تھی لیکن جدید دور میں اس میں بہت زیادہ وسعت آئی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کی اتنی اہمیت نہیں ہے لیکن بیرونِ ملک اس شعبے اور اس کی ڈگری کی بہت اہمیت ہے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس

جامعہ الزہر

قاہرہ (مصر) کی مسجد اور یونیورسٹی۔ (1) مسجد: بنو فاطمہ نے جب مصر کو فتح کر کے قاہرہ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو جوہر الکاتب صقلبی نے جو ابوتمیم کا سپہ سالار تھا۔ 359ء میں اس مسجد کی بنیاد رکھی اور یہ دو برس بعد 361ھ (973ئ) میں تیار ہو گئی۔ اس کے بعد مختلف بادشاہوں نے اس میں اضافہ کیا۔ (2) یونیورسٹی، مسجد میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا گیا جو کچھ مدت بعد دینی اور دنیاوی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا چونکہ یہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے اس لیے اس کی حیثیت اقامتی درس گاہ کی ہو گئی۔ آج بھی نصف سے زیادہ لڑکے اقامت گاہوں میں رہتے ہیں۔ شروع میں یہاں صرف دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ 1930ء میں پرائمری، ثانوی، ڈگری اور عالم (ایم اے) کے مدارج قائم ہوئے اور تعلیم کو مسجد سے نکال کر کالجوں میں منتقل کر دیا گیا۔ اب صرف دینیات کا شعبہ مسجد سے وابستہ ہے۔ تدریس کے لیے دوسرے ممالک کے ہر سال سینکڑوں طلباء یہاں آتے ہیں۔

مرسلہ: ابوزین طاہری۔ لاہور

شعبے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں گی۔ مگر میں نے یہ بات امی یا ابو کو نہیں بتائی تھی۔ مجھے میٹرک کے دنوں میں احساس ہوا گیا تھا کہ انہیں میری تعلیم سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ بلکہ امی نے تو جتا بھی دیا کہ انہیں میرا مزید پڑھنا پسند نہیں ہے۔ اس لیے میں خاموشی سے انٹرنیٹ پر اور دوسرے طریقوں سے معلوم کرتی رہی کہ کون سی یونیورسٹی اس شعبے میں ماسٹر کی ڈگری دے رہی تھی۔ مجھے چند ایک اچھی نجی یونیورسٹیز کا پتا چلا جو اس شعبے میں ڈگری دے رہی تھیں۔ اگر چہ ان کی فیسیں بہت زیادہ تھیں۔ فی سمسٹر فیس سوا سے ڈیڑھ لاکھ روپے تھی اور دوسرے اخراجات اس کے علاوہ تھے۔

مگر مجھے معلوم تھا کہ امی ابو یہ فیس ادا کر سکتے ہیں اس لیے اس طرف سے مجھے اطمینان تھا۔ اب میں چاہتی تھی کہ ایف ایس سی میں میرے اتنے اچھے نمبرز ہوں کہ مجھے آگے داخلہ لینے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ مگر اس کے لیے پڑھنے کی ضرورت تھی اور اس کے لیے میرے پاس وقت کم بچتا تھا۔ ڈرائیونگ سیکھنا میرے لیے مشکل بن گئی تھی۔ امی ابو جہاں جاتے تھے وہاں میرا کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور ویسے بھی مجھے رشتے داروں کے ہاں جانا اور زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں تھا۔ اپنے سگے چچاؤں، پھپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کے گھر مہینوں بعد جاتی تھی۔ ہمارا خاندان امی ابو دونوں کی طرف سے بہت بڑا ہے۔ بہت سے لوگ ہیں اور اتفاق سے تقریباً سب بہت دولت مند ہیں۔ بلکہ تمام گھرانوں میں سب سے کم حیثیت شاید ہماری ہی ہے۔ باقی سب رشتے دار، ڈیفنس، کلفٹن اور اسکیم نمبر دن میں رہتے ہیں۔ گلشن میں صرف ایک خالہ ہیں اور ان کا بھی یہاں ہزار گز کا بنگلا ہے۔

شاید یہی وجہ تھی کہ میرے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی طرح رشتے دار بھی مجھے اہمیت نہیں دیتے تھے۔ میرے بھائیوں اور بہنوں کی اپنی کزنز سے اچھی بات تھی اور وہ آپس میں بے تکلف تھے مگر مجھ سے سب لیے دیئے انداز میں اور بہت ہی کم بات کرتے تھے۔ حالانکہ کئی میرے ہم عمر تھے۔ میں جب کسی رشتے دار کے ہاں جاتی تو زیادہ تر وقت کہیں اکیلی اور خاموش بیٹھی رہتی تھی۔ مزے کی بات ہے مجھے منہ نہ لگانے والے امی ابو سے میری بے رخی اور تنہائی پسندی کی شکایت کرتے تھے۔ جس پر مجھے گھر آ کر سننی پڑتی تھی۔ تنگ آ کر میں نے جانا چھوڑ دیا۔ جب تک

مجبوری تھی تب تک مجبوری تھی مگر جب بڑی ہوئی تو میں کسی بہانے سے جانے سے انکار کر دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ امی ابو نے بھی مجھے لے جانا چھوڑ دیا۔ مگر اب میں نے ڈرائیونگ سیکھی تو جانے لگی تھی اور یہ میری مجبوری تھی۔ ورنہ اب مجھے بچپن سے زیادہ کوفت ہوتی تھی۔

مگر بڑے ہونے کے بعد آدمی منافق ہو جاتا ہے اور اب میں جاتی تو یوں ظاہر کرتی جیسے مجھے ان کے ہاں آنا اچھا لگتا ہے۔ البتہ میرے کزنز اور دوسرے رشتے دار ذرا بھی منافق نہیں ہوئے تھے انہوں نے کبھی رسماً بھی اظہار نہیں کیا کہ ان کو میرا آنا اچھا لگتا ہے یا وہ مجھ سے گھلے ملے ہوں۔ وہ مجھے اسی طرح نظر انداز کرتے تھے جیسے بچپن میں نظر انداز کرتے تھے۔ میرا بس چلتا تو ایک لمحے کے لیے بھی نہ جاتی مگر امی ابو کی وجہ سے مجبور تھی۔ پھر مجھے لانگ روٹ پر گاڑی لے کر اکیلے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یعنی اگر میں اپنے علاقے سے باہر نکلتی تو گاڑی میں لازمی امی یا ابو میں سے کوئی ایک ہوتا تھا۔ صرف اپنے علاقے میں مجھے گاڑی اکیلے ڈرائیو کرنے کی اجازت تھی۔ امی ابو کے خیال میں میں ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ شہر کے دوسرے علاقوں میں اکیلے جا سکوں۔ اسی وجہ سے مجھے برٹش کونسلیٹ بھی گاڑی میں جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں میں اکثر لائبریری کے لیے جاتی تھی۔ امی ابو کو سیر و تفریح کا جنون کوئی ایک سال جاری رہا اور یہ ایک سال میرے لیے تعلیم کا اہم ترین سال تھا۔ میں جس طرح پڑھنا چاہتی تھی اس طرح نہ پڑھ سکی۔ پڑھنا تو ایک طرف رہا میں جیسے پیپرز دینا چاہتی تھی وہ بھی نہیں دے سکی کیونکہ پیپرز کے دنوں میں بھی آنے جانے کا یہ سلسلہ جاری رہا تھا۔ حد یہ کہ ایک دن گرمی بہت تھی تو شام کے وقت امی ابو نے ساحل سمندر پر چلنے کو کہا جب کہ اگلے روز میرا انگریزی کا پیپر تھا۔ میں نے احتجاج کیا۔ ''امی میرا پیپر ہے۔''

''تو آ کر پڑھ لینا۔'' وہ بے پروائی سے بولیں۔ ''ہمیں کون سارات گئے وہاں رہنا ہے بس ایک دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔''

''دو گھنٹے تو صرف آنے اور جانے میں لگیں گے۔'' میں نے فریاد کی۔ ''امی میرا بہت اہم پیپر ہے اور مجھے بہت سارا ریوائز کرنا ہے۔''

''ابھی جو دو دن پہلے تم چار گھنٹے برٹش کونسلیٹ ہو کر آئیں اس وقت پیپر کا خیال نہیں تھا۔''

''وہاں بھی پیپر کے سلسلے میں گئی تھی۔'' میں نے کہا۔
''تو کتابیں ساتھ لے لو تم گاڑی میں بیٹھ کر پڑھتی رہنا۔'' امی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اب اٹھو بحث میں وقت ضائع مت کرو۔''

میں سارے راستے اس بات پر کڑھتی رہی کہ یہی امی میرے بہن بھائیوں کو ان کے پیپرز کے دنوں میں کمرے سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ اگر انہیں کسی انتہائی ضرورت کی وجہ سے باہر آنا ہوتا تو اس کے لیے بھی باقاعدہ اجازت لینی پڑتی تھی۔ امی ان دنوں ان کا کھانا پینا تک ان کے کمرے میں پہنچاتی تھیں کہ انہیں اتنے سے کام کے لیے بھی باہر نہ آنا پڑے اور میرے ساتھ الٹا سلوک تھا۔ میں سچ مچ کتابیں ساتھ لے گئی تھی اور جب امی ابو ساحل پر ٹہل رہے تھے تو میں کتابیں لیے گاڑی میں بیٹھی پڑھ رہی تھی اور آتے جاتے لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں کوشش کر رہی تھی مگر ظاہر ہے انسان اس طرح کیسے پڑھ سکتا ہے۔ امی ابو مغرب تک ساحل پر رہے اور واپس آئے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھے تو میں نے کہا۔ ''گھر چلیں؟''
''نہیں آج ہم یہیں ڈنر کریں گے۔'' امی نے کہا۔ ''بہت دن ہو گئے ہیں ہم نے یہاں ڈنر نہیں کیا ہے۔''
''امی میرا پیپر......'' میں نے احتجاج کرنا چاہا جو ہمیشہ کی طرح رائیگاں گیا اور ہم ڈنر کر کے جب گھر واپس پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ میرے سر میں شدید درد تھا اور اسی وجہ سے مجھ سے ٹھیک سے پڑھا نہیں گیا۔ صبح پیپر ویسا نہیں ہوا جیسا کہ میں چاہتی تھی۔ اس دن میں گھر آ کر بہت روئی تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھی۔ مجھے صبر ہی کرنا پڑا۔ اس کے بعد باقی کے تین پیپرز کے لیے میں نے یہ کیا کہ صبح ناشتے کے بعد کمرا اندر سے بند کر لیتی اور پھر رات ڈنر سے پہلے نہیں کھولتی تھی۔ ٹھیک سے پڑھنے کی خاطر میں نے دوپہر کا کھانا گول کر دیا تھا۔ امی کسی کام سے دروازہ بجاتی بھی تو میں باہر آنے سے انکار کر دیتی۔ اس پر وہ مجھے برا بھلا کہتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ ابو کو براہِ راست مجھ سے کام کہنے کی عادت نہیں تھی وہ امی کے توسط سے کہلواتے تھے اور امی میرے پیچھے پڑ کر بات منوا لیتی تھیں۔
اس ترکیب سے میں باقی تین پیپرز کی تیاری کرنے میں کامیاب ہوئی اور باقی کے تین پیپرز میں نے بہت سکون سے اور بہت اچھے دیے۔ مجھے اُمید تھی کہ ان میں میرے نمبرز بہت اچھے آئیں گے۔ کسی اچھی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کم سے کم ستر فیصد نمبرز ضروری تھے۔ گزشتہ سال میری پرسنٹیج سیونٹی تو تھی۔ انگریزی کا پیپر اچھا نہیں ہوا اس کے باوجود مجھے اُمید تھی کہ میں ستر فیصد سے اوپر ہی نمبر لوں گی۔ آخری پیپر دے کر آئی تو جتنی میں خوش تھی اس سے زیادہ امی خوش تھیں انہوں نے اپنی خوشی چھپانے کی کوشش نہیں کی اور مجھے اس کی وجہ بھی بتا دی۔ ''شکر ہے اب تم گھر میں رہا کرو گی۔''
''میں گھر میں تو ہوتی ہوں کون سا باہر جاتی ہوں۔''
''میرا مطلب ہے کہ اب تم اسکول نہیں جاؤ گی۔''
میں نے دل میں سوچا کہ یہ بس چند مہینے کی بات ہے۔ اور پھر میں کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں گی۔ مگر مجھے یہ علم نہیں تھا کہ امی نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں آنے والے دنوں کی سوچ میں مگن اپنی گھریلو ذمے داریاں پوری کر رہی تھی۔ اس دوران میں انٹرنیٹ پر چیک کرتی رہتی تھی اور جیسے ہی داخلے کے لیے پراسپیکٹس کا اعلان ہوا۔ میں نے جا کر پراسپیکٹس لانے کا سوچا۔ مجھے کئی جگہوں پر جانا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ ایک ہی دن میں سب جگہوں سے لے آؤں گی۔ اگلے دن میں نے ناشتا بنانے کے دوران امی سے کہا۔ ''آج میں جا کر یونیورسٹیز سے پراسپیکٹس لاؤں گی۔''
''وہ کس لیے؟'' امی نے پوچھا۔
میں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''آگے پڑھنے کے لیے۔''
''چھوڑو کیا ضرورت ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولیں۔ ''تم نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اب کیا کرو گی آگے پڑھ کر؟''
''میں نے صرف اسکول کی تعلیم مکمل کی ہے۔ ابھی تو تعلیم کا آغاز ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور جہاں تک یہ سوال ہے کہ میں کیا کروں گی تو جو میرے بہن بھائیوں نے کیا وہی کروں گی۔''
''وہ بڑے ہیں انہوں نے اپنا کیریئر بنانا تھا۔ مگر تیرے سر پر تیرے چار بہن بھائی ہیں اور چاروں سیٹل ہیں۔ وہ تجھے سپورٹ کریں گے۔ تیرا کیریئر وہ بنائیں گے۔''
''امی مجھے اپنا کیریئر خود بنانا ہے۔'' میں نے کہا۔
اس وقت میری عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگرچہ امی ڈھکے

چھپے انداز میں میری تعلیم کی مخالفت کرتی آئی تھیں لیکن میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اس قدر کھل کر مخالفت کریں گی اور سرے سے مجھے آگے پڑھنے سے منع کر دیں گی۔

''تب پرائیویٹ پڑھ لو۔'' وہ بولیں۔

''پرائیویٹ کیا پڑھ لوں۔ بی اے کرلوں؟'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''اس کی کیا ویلیو ہوگی۔ میں بزنس کمیونیکیشن میں ماسٹر کرنا چاہتی ہوں۔ یہ پروفیشنل ڈگری ہے۔''

''بی اے کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔''

''تب آپ نے رائم، صائم بھائی اور ندا اور فضا باجی میں سے کسی کو پرائیویٹ بی اے کیوں نہیں کرایا؟'' میں نے پیر پٹخ کر کہا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ مگر امی پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

''سعدیہ تم جذباتی ہو رہی ہو مگر میں نے اور تمہارے ابو نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے کہ اب تم آگے پڑھنے کے لیے باہر نہیں جاؤ گی۔ گھر میں رہ کر پڑھنا چاہو تو پڑھ لو۔''

اس بار میں بلبلا کر رو دی تھی۔ ''امی پلیز مجھ پر یہ ظلم نہ کریں...... مجھے پڑھنے دیں...... میں آپ کو یقین دلاتی ہوں...... اپنی کسی ذمے داری میں کمی نہیں آنے دوں گی۔''

''مجھے افسوس ہے میری بچی لیکن ہم نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے؟''

''یہ کیسا فیصلہ ہے...... اس کی لوجک کیا ہے...... آپ مجھے بتائیں تو میں مان لوں گی۔''

امی نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ میں روتی رہی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ امی نے مجھے چپ کرانے یا روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ساکت کرسی پر بیٹھی رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے وجہ پتا چل گئی۔ مگر امی نے نہیں بتائی تھی۔ رو رو کر میرا گلا خشک ہو گیا اور میں پانی پینے کے لیے باہر نکلی تو میں نے امی ابو کو آپس میں بات کرتے سنا۔ امی کہہ رہی تھیں۔ ''یہ سمجھتی کہاں ہے؟ اسے احساس ہی نہیں ہے کہ اگر یہ پڑھ لکھ کر باہر چلی گئی تو یہاں ہم بڈھا بڈھیا کے پاس کون رہے گا کون ہماری دیکھ بھال کرے گا؟''

''بس کیا کہیں بیگم اب زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے اولاد کو ماں باپ کی پروا کہاں رہی ہے۔'' ابو نے بھی سرد آہ بھر کر کہا۔ ''جب تم نے اسے منع کیا تو اس نے کیا کہا؟''

''رو رہی تھی۔'' امی بولیں۔ ''مگر مان جائے گی۔ اجازت تو ہم نے کسی صورت نہیں دینی ہے۔''

میں دروازے کے پاس سن سی کھڑی تھی۔ میرے ماں باپ صرف اپنی خاطر مجھے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے کہ میں بھی پڑھ لکھ کر اپنے بہن بھائیوں کی طرح ملک سے باہر چلی جاؤں گی اور وہ یہاں اکیلے بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔ صبح سے دل کا جو بوجھ تھا وہ امی ابو کی باتوں سے اور بڑھ گیا۔ شام تک میں کمرے میں رہی۔ پھر امی آئیں اور مجھے پیار کر کے اور چمکار کر باہر لے آئیں۔ میں باہر آ گئی مگر ان پر ظاہر نہیں کیا کہ میں ان کی اور ابو کی گفتگو سن چکی ہوں۔ امی وہی باتیں اب نرمی سے اور پیار میں لپیٹ کے کر رہی تھیں جو کچھ دیر پہلے ابو سے کھل کر اور دوسرے لہجے میں کر رہی تھیں اور اس میں انہوں نے کئی بار حتمی انداز میں کہہ دیا کہ وہ مجھے آگے پڑھنے کی اجازت کسی صورت نہیں دیں گی۔ اس لیے بہتر ہے میں ان کی بات مان لوں اور گھر رہ کر پڑھنا چاہوں تو پڑھ لوں۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ''مجھے اب پڑھنا ہی نہیں ہے۔''

امی کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی تھی۔ مگر انہوں نے اسے چھپاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو ہم تمہیں پڑھنے سے منع نہیں کر رہے۔ تم جانتی ہو آج کل ماحول کتنا خراب ہو گیا ہے اکیلی لڑکی کا باہر جانا مناسب نہیں رہا ہے۔''

میں خاموش رہی اور یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہی اکیلی لڑکی دن میں ایک دو بار گھر کے کاموں سے باہر جاتی ہے تو کیا اس وقت ماحول اچھا اور مناسب ہو جاتا ہے؟ مگر میں اندر سے اتنی خالی ہو رہی تھی کہ میرا کچھ کہنے یا پوچھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنا وجود اتنا بیکار اور مہمل لگ رہا تھا جیسے میں انسان نہیں کوئی لکڑی کا شوپیس ہوں جسے سجانے والا اپنی مرضی سے سجاتا ہے اور جب اسے اچھا نہیں لگتا تو اسے اٹھا کر اسٹور روم میں ڈال دیتا ہے۔ میرے ماں باپ مجھے کسی شوپیس کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ امی میری چپ اور موڈ سے سمجھ گئیں کہ ابھی میں ان کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گی۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ مجھے بڑا جھٹکا لگا ہے اور مجھے اس سے سنبھلنے میں وقت لگے گا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ اصل جھٹکا مجھے ان کی اور ابو کی باتوں سے لگا ہے جو میں نے اتفاق سے سن لی تھیں۔

جب میں مسلسل خاموش رہی تو امی نے بہن بھائیوں سے کہا اور باہر جانے کے بعد پہلی بار انہوں نے از خود مجھ سے بات کی۔ وہ امی والی باتیں ذرا مختلف انداز میں کر رہے تھے اور اپنے طور پر دلائل دے رہے تھے کہ میرا گھر

میں رہنا ہی مناسب ہے۔ ساتھ ہی وہ سب یقین دلا رہے تھے کہ وہ ساری عمر میرا خیال رکھیں گے اور رائم بھائی نے ڈھکے چھپے انداز میں کہا کہ امی ابو کے بعد وہ مجھے باہر اپنے پاس بلا لیں گے۔ ندا اور فضا باجی نے مجھے کہا کہ مجھے جس چیز کی ضرورت ہو میں انہیں بتاؤں وہ مجھے باہر سے بھیجیں گی۔ میں ان کی باتیں سنتی رہی اور ہوں ہاں کر کے جواب دیتی رہی۔ اس گفتگو کے چند دن بعد مجھے پتا چلا کہ امی کینیڈا جا رہی ہیں۔ انہیں بھائیوں نے بلوایا تھا۔ وہی بھائی جو چند دن پہلے مجھے ہمیشہ کے لیے کینیڈا بلوانے کی بات کر رہے تھے اس وقت انہوں نے اشارتاً بھی مجھے امی کے ساتھ آنے یا امی کو مجھے ساتھ لانے کو نہیں کہا۔

امی کا پاسپورٹ بنا ہوا تھا اور ان کے پاس کینیڈا کا ملٹی پل ویزا تھا اس لیے بس ٹکٹ اور سیٹ کنفرم کرنا تھی۔ امی تیسرے دن چلی گئیں۔ میں اور ابو رہ گئے تھے۔ سچی بات ہے کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ کسی نے مجھے پوچھا نہیں۔ اگر وہ مجھے بلاتے تب بھی میں نہ جاتی یا اگر چلی جاتی تب بھی مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔ آدمی میں تبدیلی تو اس کے اندر کے موسم سے آتی ہے اور مجھے لگ رہا تھا کہ میرے اندر خزاں کے موسم نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ میں کم عمری سے خود کو بہلاتی آئی تھی کہ میرے ماں باپ بہن بھائی مجھ سے مخلص ہیں۔ بس ان کا رویہ ذرا مختلف ہے۔ مگر اب یہ آس بھی ٹوٹ گئی تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میں صرف کاموں کے لیے تھی۔ میری کوئی ذاتی حیثیت نہیں تھی اور نہ ہی کسی کو میری پروا تھی۔ جیسے ایک ملازمہ کو تنخواہ دی جاتی ہے اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مگر اس سے ہٹ کر اس کے کیا مسائل ہیں اور وہ کیا چاہتی ہے یہ مالکوں کا مسئلہ نہیں ہوتا ہے۔ انہیں بس اپنے کاموں سے غرض ہوتی ہے۔

ایسا ہی میرے ساتھ تھا۔ امی چلی گئیں اور ابو بھی ان دنوں زیادہ تر ٹی وی میں لگے رہتے تھے۔ گھر میں کرنے کو خاص کام نہیں تھا اور اب باہر بھی کئی دن بعد جانا ہوتا تھا اس لیے میرے پاس بہت وقت تھا اور یہ وقت میں نے سوچوں میں گزارا۔ میں نے بہت سوچا کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا اور دوسروں کے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوا۔ مگر سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہر ایک نے اپنے مفاد کا ایک دائرہ بنا رکھا تھا اور اس دائرے میں کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ سب کے لیے اولیت اپنے مفاد کی تھی۔ میں ان سب سے الگ تھی۔ میں نے ایسا کوئی دائرہ نہیں بنایا تھا اور سب میرے معاملے میں دخل دیتے تھے کیونکہ میں نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ اجازت دے دی تو یہ ہمیشہ کے لیے ہو گئی اور میں اسے واپس نہیں لے سکتی تھی۔ اب مجھے ساری عمر ان لوگوں کی مداخلت برداشت کرنا تھی۔

کینیڈا سے آنے کے بعد امی کا رویہ پھر پہلے جیسا ہو گیا۔ گھر تو میں دیکھ رہی تھی۔ باہر کے سارے کام بھی میری ذمے داری تھے۔ ابو کی طبیعت ہر چھ سات دن میں ایک بار خراب ہوتی اور ان کو اسپتال میں داخل کرانا پڑتا تھا۔ وجہ وہی تھی کہ وہ کچھ عرصے سگریٹ سے پرہیز کرتے اور جیسے ہی حالت اچھی ہوتی پھر سے پینا شروع کر دیتے تھے۔ آنے والے کئی سالوں تک یہی چکر چلتا رہا۔ نو سال پہلے ابو کو آخری اٹیک ہوا اور ہم انہیں اسپتال لے جا رہے تھے کہ راستے میں ٹریفک جام میں پھنس گئے۔ اسپتال پہنچنے میں دیر ہوئی اور ابو نے راستے میں دم توڑ دیا۔ ایک تو بے پناہ ٹریفک اور اوپر سے پیچھے ابو کے ساتھ بیٹھی امی کا شور جو مجھے بار بار یہاں سے نکلنے کو کہہ رہی تھیں مگر میں کہاں سے نکلتی۔ اسی چکر میں گاڑی کئی جگہوں پر لگی اور لوگوں نے باتیں سنائیں۔ جب ہم اسپتال پہنچے تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ ابو تو ایک گھنٹا پہلے دنیا سے گزر چکے تھے۔

یہ سن کر میرے اور امی کے ہوش اڑ گئے تھے۔ مگر امی نے ابو کی تدفین کے بعد میرے ہوش یہ کہہ کر مزید اڑا دیے کہ یہ سانحہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس راستے سے کیوں گئی جس پر رش تھا۔ حالانکہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ باقی جو دوسری سڑکیں تھیں ان پر بھی شام کے وقت ایسا ہی رش ہو جاتا تھا۔ مگر امی یہ سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے یہ بات سب لوگوں سے اور خاص طور سے بہن بھائیوں سے اتنی بار کہی کہ ان کا رویہ مجھ سے بدل گیا۔ وہ مجھ سے پہلے جو تھوڑی بہت بات کر لیتے تھے اب وہ بھی چھوڑ دی۔ بس عید بڑی عید پر جب کال کرتے تو مجھے بھی مبارک باد دے دیتے تھے۔ مگر بہت اجنبی سے انداز میں۔ ابو کی آخری سفر کی ساری تیاری میں نے کی۔ کفن لینے سے لے کر قبر کے لیے جگہ تک میں نے کی۔ حالانکہ میں قبرستان میں نہیں گئی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح مصروف رہی اور مجھے ابو کا غم منانے کا موقع بھی نہیں ملا۔ دیکھنے والوں نے یہ تک کہا کہ مجھے اپنے باپ کے مرنے کا دکھ نہیں تھا۔ سب امی کا دکھ دیکھ رہے تھے کیونکہ وہ صرف رو دھو رہی تھیں۔

ابو کے انتقال کے وقت میں بائیس سال کی تھی اور ہمارے ہاں لڑکیوں کی شادی بھی عجلت میں نہیں کی جاتی ہے۔ ندا اور نفضا باجی کی شادی پچیس کے بعد ہی ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کے وقت تاخیر کی وجہ ان کی اعلیٰ تعلیم اور پھر کیریئر سازی تھی جب کہ میرے معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ایف ایس سی کے بعد میں نے پچ نہیں پڑھا تھا۔ اگر چہ میں چاہتی تو پرائیویٹ پڑھ سکتی تھی مگر میرا دل ہی نہیں کیا۔ ہاں اس کے علاوہ میں نے بہت پڑھا۔ برٹش کونسل کی لائبریری کے ساتھ ساتھ شہر کی اور کئی اچھی لائبریریاں جوائن کرلیں۔ اس کے علاوہ کتابیں لیتی رہتی تھی کہ میری واحد دل چسپی اب کتابوں سے رہ گئی تھی۔ مجھے شادی سے بھی دل چسپی نہیں تھی جو اس عمر میں لڑکیوں کی سب سے بڑی دل چسپی ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا ہی نہیں کہ امی میری شادی کے موضوع پر کبھی بات نہیں کرتی ہیں۔ میں نے ان کے منہ سے اس بارے میں ایک بار بھی نہیں سنا۔

مگر دوسروں کو تو دل چسپی ہوتی ہے۔ امی سے جو ملنے آتا وہ لازمی ان سے پوچھتا کہ سعدیہ کی شادی کا کیا سوچا اور امی بے پروائی سے کہتیں کہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کوئی زیادہ ہی اصرار کرتا تو امی چڑ جاتیں اور اسے جتا دیتیں کہ وہ زیادہ ہی دخل اندازی کر رہا ہے۔ امی اور آنے والیوں کے آس پاس گھومتے ہوئے میں بھی یہ سب سن لیتی تھی۔ مگر میں نے کبھی ان باتوں پر غور نہیں کیا۔ کئی آنے جانے والیوں نے مجھ سے بھی اس موضوع پر بات کرنا چاہی مگر میں نے بات نہیں کی۔ میں ٹال دیتی کہ یہ امی کا معاملہ ہے ان سے بات کریں۔ اس پر ایک پڑوسن آنٹی نے جل کر کہا۔ ”اس سے کیا بات کروں اس کا تو سرے سے ارادہ ہی نہیں ہے۔“

”تب میرا ابھی ارادہ نہیں ہے۔“

”دونوں ماں بیٹی نفسیاتی ہو۔“ وہ کہتے ہوئے چلی گئیں۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ اپنے بھتیجے کے لیے مجھ میں دل چسپی لے رہی تھیں۔ ان کا بھتیجا موبائل فرنچائز کا بزنس کر رہا تھا اور اچھا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ خاندان بھی اچھا تھا۔ میں نے اس وقت بھی توجہ نہیں دی۔ وقت گزرتا رہا۔ امی سال میں ایک چکر کینیڈا اور انگلینڈ کا لگاتی تھیں۔ انہوں نے کئی بار مجھے لے جانے کی کوشش کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ بلکہ آخری سالوں میں وہ کوشش کرتی رہیں کہ مجھے کینیڈا چل کر رہنے پر آمادہ کریں۔ اصل میں وہ خود اب وہاں جا کر رہنا چاہتی تھیں اور ظاہر ہے مجھے مستقل یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔ مگر میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ غصہ کرتیں اور باتیں سناتیں کہ یہاں کیا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ بھی کسی دن بغیر طبی امداد کے مر جائیں۔ میں ان سے کہتی۔

”میں نے آپ کو نہیں روکا ہے آپ جائیں۔“

”تو اکیلے کیسے رہے گی؟“

”رہ لوں گی۔“ میں جواب دیتی۔ ”آپ کے بعد مجھے اکیلے ہی رہنا ہے۔“

”اللہ نہ کرے تیرے بہن بھائی ہیں وہ تیرا خیال رکھیں گے۔“

امی کی اس بات کے جواب میں میرے ہونٹوں پر صرف ایک طنزیہ مسکراہٹ آجاتی۔ جو بہن بھائی ان کی زندگی میں مجھے نہیں پوچھ رہے تھے وہ ان کے بعد کہاں سے پوچھتے۔ پھر دو سال پہلے امی اچانک ہی دنیا سے گزر گئیں۔ انہیں ڈینگی بخار ہوا جو بگڑ گیا اور وہ دو دن اسپتال میں رہ کر انتقال کر گئیں۔ ان کی بیماری کے دوران کوئی نہیں آیا تھا سب ان کے مرنے پر آئے اور تین دن ان کو سرد خانے میں رکھنے کے بعد دفنایا گیا۔ کوئی ہفتہ رکا اور کوئی دس دن اور کسی نے ایک بار جھوٹے منہ مجھ سے نہیں کہا کہ وہ مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ اگر چہ مجھے توقع نہیں تھی اور کوئی کہتا تب بھی میں ساتھ نہ جاتی۔ میری بات درست ثابت ہوئی امی کے بعد میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ بہن بھائیوں نے اتنا کیا کہ جایداد کا بٹوارہ فی الحال نہیں کیا ہے اور اس کی جو آمدنی آتی ہے وہ ساری مجھے ملتی ہے۔

مالی لحاظ سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مگر اکیلے رہنے کی عادت کے باوجود اب بالکل تنہائی میں ڈر لگتا ہے۔ دن بھر ایک ماسی ساتھ رہتی ہے مگر شام کو وہ بھی چلی جاتی ہے اور تب میں دروازے کھڑکیاں بند کر کے بیٹھی رہتی ہوں۔ ذرا سے کھٹکے پر جا کر دیکھتی ہوں۔ میں اکتیس برس کی ہوں اور شکل صورت کی بھی بری نہیں ہوں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب مجھے باقی عمر اسی طرح اکیلا رہنا پڑے گا کیونکہ عجیب دستور چل نکلا ہے جو دوسروں کی پروا کرتا ہے اس کی پرواہ کوئی نہیں کرتا ہے۔ جو دوسروں کے لیے جیتا ہے اس کے لیے کوئی نہیں جیتا۔

ذمہ دار کون

محترم مدیر

السلام علیکم

میں اس وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں اور یہ زندگی کی شاید آخری تحریر ثابت ہو۔ میرے ساتھ کیا ہوا، کیوں مجھے پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔یہ باتیں میں کھل کر لکھ رہا ہوں۔ ایک مزدہ کی آخری خواہش سمجھ کر اسے چھاپ دیں۔

الف ف

(کوئٹہ)

میں ایک ایسا مجرم ہوں جس کا ڈیتھ وارنٹ جاری ہو چکا ہے۔ اس لیے میں اس وقت کال کوٹھری میں بیٹھا اپنی جیون کتھا لکھ رہا ہوں۔ جب یہ کہانی آپ تک پہنچے گی اس سے پہلے میں سولی پر جھول کر موت کی ابدی نیند سو چکا ہوں گا۔ میرا جرم واقعی اسی سزا کا مستحق تھا۔ میں خونی ہوں، قاتل ہوں۔ میں نے ایک نہیں کئی زندگیوں کا چراغ گل کیا ہے مگر کیوں؟ اس کیوں کے جواب ہی کے طور پر مرنے سے پہلے اپنی روداد لکھ رہا ہوں۔

کہتے ہیں کہ میاں بیوی کے رشتے آسمانوں پر بنائے جاتے ہیں۔ میں 32 سال کا ہوگیا تھا مگر آسمان والے کو میری جوڑ کے لیے کوئی عورت نہیں ملی۔ جب کہ اس کی زمین پر جدھر دیکھو عورت ہی عورت نظر آتی ہے۔ گھر سے باہر نکلو، گلی کوچوں میں، سڑکوں، شاہراہوں پر، پیدل چلتے ہوئے گاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے۔ دکانوں میں شاپنگ کرتے ہوئے۔ پارکوں میں تفریح کرتے ہوئے، درس گاہوں میں پڑھتے پڑھاتے ہوئے۔ جلسے جلوس میں شریک ہوتے ہوئے۔ ٹی وی آن کرو تو ہر چینل کے ہر پروگرام میں عورت اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نظر آئے۔ تعجب ہے عورتوں سے بھری دنیا میں آسمان والے کو میرے لیے کوئی عورت نہیں ملی۔

عورت میری ضرورت تھی۔ اس لیے مجھے اس کی شدت کے ساتھ تلاش تھی۔ مکان کرائے پر لینا چاہو تو پہلا سوال ''بال بچے دار ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر تو ہم کسی چھڑے چھانٹ کو مکان کرائے پر نہیں دیں گے۔''

رشتے کے لیے کہیں پیغام بھیجو تو ماں باپ اور بھائی بہنوں کی تفصیل طلب کی جائے مگر جب بتایا جائے کہ کوئی نہیں ہے تو صاف انکار۔ ایسا بندہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ کون جانے کل ہماری بیٹی کے ساتھ کیا برتاؤ کرے۔

کچھ لوگوں نے تنخواہ کے بارے میں بھی پوچھا۔ ''اوپر کی آمدنی کتنی ہے؟'' جب انہیں معلوم ہو کہ تنخواہ بہت واجبی ہے اور اوپر کی کوئی آمدنی نہیں تو یہ تبصرہ۔

''پھر کس برتے پر شادی کرنا چاہتا ہے؟ ہماری لڑکی ہم پر بھاری نہیں کہ ہم اسے تمہارے پلے باندھ کر اسے زندگی بھر کے لیے تڑپنے اور سسکنے کے لیے چھوڑ دیں۔''

میں ایک کچی آبادی میں ایک کمرے کے ایک گھر میں رہتا تھا۔ میری طرح بستی والے بھی غریب تھے۔ مگر ہر وقت مجھ پر نظر رکھتے تھے۔ جیسے میں کوئی شریف آدمی نہیں۔ چور، اچکا اور غنڈہ ہوں کہ کسی وقت بھی ان کی بہو بیٹی کے لیے خطرے کا سبب بن سکتا ہوں۔ میرے آنے جانے کی خفیہ نگرانی کرتے تھے۔ مجھے ان کی حرکتوں کا علم تھا مگر میں کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

ایک دن میں نے اپنے ایک دوست کو ایسا پرابلم بتایا اور اس سے اس کا حل پوچھا۔ اس پر اس نے کہا۔ ''ایک تو تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ دوسرے تمہاری آمدنی بہت معمولی ہے۔''

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''اپنی آمدن بڑھاؤ۔ جب تک تمہاری مالی حالت اچھی نہیں ہوگی تمہاری زندگی میں بہتری نہیں آسکتی۔''

اب میں اس بات کے لیے فکرمند رہنے لگا کہ آمدنی کیسے بڑھائی جائے۔ جس دفتر میں، میں جاب کرتا تھا اس میں شام ڈھلے چھٹی ہوتی تھی اور میں تھک کر چور ہو چکا ہوتا تھا۔ اس دوران ایک بندے سے ملاقات ہوئی، دیکھنے میں ہی چلتا پرزہ لگتا تھا۔ دو ہی دن میں اس نے مجھ پر اثر غالب کرلیا پھر ایک دن اس نے کہا۔ ''یار! تم یہ کیا دو ٹکے کی نوکری کرتے ہو۔ کچھ ایسا کام کرو کہ زندگی سدھر جائے۔ مجھے دیکھو میرے پاس گاڑی بھی ہے۔ بنگلا نما مکان بھی ہے۔ بینک میں بہت بڑی رقم بھی محفوظ ہے۔''

''تو پھر مجھے بھی ایسی کوئی نوکری دلا دو نا۔''

''دلا دوں گا۔ بشرطیکہ تم کرسکو۔''

''کیوں۔ کیا کوئی بہت مشکل کام ہے؟''

''ہاں مشکل بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔ ذرا وضاحت سے بتاؤ۔''

''دیکھو بھئی! جو لوگ تمہیں تمہاری توقعات سے بڑھ کر معاوضہ دیں گے وہ تم سے اپنی مرضی کا کام بھی لیں گے۔''

''اس کام کی نوعیت کیا ہوگی؟''

''یوں سمجھ لو کبھی کسی کی ٹارگٹ کلنگ کا بابابا۔ کبھی کسی جگہ دھماکا کروانا......''

''بس......بس......بس۔'' میں نے اسے مزید کچھ کہنے کی اجازت نہیں دی۔ ''میں ایسا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اگر یہ بات مذاق میں کہی ہے تو بھی مجھے برا لگا ہے۔ میں ایسا کوئی انسانیت سوز کام......''

''تو پھر تم دو ٹکے کی نوکری ہی کرتے رہو۔'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے یہ بات کہی اور آگے بڑھ گیا۔ رات اپنی کھولی میں، میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ میں تو اس مچھر کو بھی نہیں مارتا ہوں جو میرے ہاتھ پر بیٹھا میرا خون چوس رہا ہوتا ہے۔ ان چونٹیوں پر بھی جراثیم کش دوائی نہیں ڈالتا جو کمرے میں ہر طرف رینگتی رہتی ہیں۔ چیزوں میں لپٹ کر ان کا ستیاناس کردیتی ہیں۔ مجھ سے اس بے وقوف نے بے گناہ آدمیوں کو قتل کرنے کی جاب دلوانا چاہا۔ ایسے پیسے پر

لعنت ہے، ایسے عیش و آرام سے بہتر ہے زندگی اس جبر کے عالم میں گزر جائے۔

اور اسی جبر کے عالم میں میری زندگی گزرتی رہی۔ میرے پاس وقت گزاری کا کوئی ساز و سامان تھا نہ ذریعہ بس ایک ٹی وی تھا جو میری دلبستگی کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔ مگر تفریح کا یہ ذریعہ بھی آہستہ آہستہ میرے دل و دماغ میں انتشار پھیلانے لگا۔ ہر چینل کے ہر پروگرام میں عورتوں کی موجودگی اور عورتیں بھی کیسی، پھولوں کی طرح کھلے ہوئے چہرے، آنکھوں سے لپکتی ہوئی بجلیاں، رسیلے ہونٹ، چکنی کلائیاں اور کشادہ گریبانوں سے کچھ چھپی کچھ دکھائی دیتی حشر سامانیاں...... یہ سب کچھ تو ان پروگراموں کا تحفہ ہے جو بڑے مہذب اور شائستہ نوعیت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ وہ جو تفریح کے نام پر دکھائے جاتے ہیں جن میں رقص و موسیقی، کھیل تماشوں اور ڈراموں اور فلموں پر مشتمل پروگرامز ہیں ان میں تو جذبات و احساسات کو برانگیختہ کرنے والے ایسے مناظر ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے کے لیے اپنے آپ پر قابو رکھنا مشکل ہو جائے۔ سنگ مرمر کی طرح ترشے ہوئے ننگے بازو، ننگ دھڑنگ ٹانگیں۔ اوپر سے نیچے تک کھلی ہوئی پیٹھ۔ جس پر چولیوں کو کس کر باندھنے والی چند ڈوریوں کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ گردن سے لے کر ناف تک گویا یہ دعوت دیتے ہوئے کہ یہ دیکھنے کی چیز ہے انہیں بار بار دیکھ۔ فلموں میں تو ان کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ ہر فلم میں ایک آئٹم سانگ جس کے بارے میں کسی نے کہا تھا۔

آئٹم سانگ ستانے کے لیے آئے ہیں
جو بچا تھا وہ دکھانے کے لیے آئے ہیں

آئٹم سانگز میں حسینوں کی پوری ایک فوج ظفر موج ہوتی ہے جو مختصر لباس میں اپنے حسن اور اپنی جوانی کی ترجمانی ہر انگ اور ہر رنگ میں کرتی ہے۔ ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں سب کچھ دیکھ لیں۔ کسی کی نگاہوں سے کچھ پوشیدہ نہ رہے۔

فلموں میں ہیرو ہیروئن کے جذباتی مناظر تو دیکھنے والوں کے اعصاب پر شعلوں میں تیل ڈالنے کے مترادف ہوتے ہیں۔

نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر میرے اندر ایک انتقامی جذبہ سر ابھارنے لگا۔ کچھ لوگوں کو تو اتنا کچھ حاصل ہے جب کہ ایک میں ہوں جسے ان بے شمار عورتوں میں سے ایک بھی نصیب نہیں۔ عورتوں کی کوئی کمی نہیں، ایک

جالوت

حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا ایک بادشاہ۔ عرب مورخ مسعودی کا بیان ہے کہ فلسطین میں بربر قوم آباد تھی اور یہ ان کا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام مولود تھا۔ اس نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور اردن کے علاقے میں لڑائی ہوئی۔ بنی اسرائیل کے بادشاہ طالوت نے اعلان کیا کہ جو کوئی جالوت کو مارے گا اسے آدھی سلطنت انعام میں دی جائے گی اور شہزادی سے نکاح کر دیا جائے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے گوپھن سے پتھر مار کر اس کو ہلاک کر دیا۔ مورخ طبری کے نزدیک وہ عاد و ثمود کی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اسرائیلیوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ تبرکات اور تابوت سکینہ بھی بنی اسرائیل سے چھین کر لے گیا تھا۔ اسلامی روایات بائبل کے مطابق ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بائبل میں اس کا نام گولیتھ (Goliath) ہے۔

مرسلہ: زارا احمد۔ کراچی

ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں مگر مجھے نہیں دوسروں کو ملتی ہیں۔ قصور ان عورتوں کا نہیں تھا۔ میری تقدیر کا تھا مگر میں حسین اور جوان عورتوں کا دشمن بن گیا۔ میں جو ایک مچھر اور ایک چیونٹی کو مارنے کا روادار نہیں تھا، جوان اور حسین عورتوں کو مارنے لگا۔ ان کی زندگی کے چراغ گل کرنے لگا۔ تم اگر میرے لیے نہیں تو کسی اور کے لیے کیوں؟ جب بھی مجھے موقع ملتا اور صاف بچ نکلنے کے آثار ہوتے اپنے سائلنسر لگے پستول سے فائر کر کے کھسک جاتا۔ مجھے اس درندگی سے بڑا لطف آتا۔ میں مرنے والی سے دل ہی دل میں کہتا۔ تیرا جرم یہی ہے کہ میرے لیے نہیں ہے۔ ایک بے قصور اور نہتی عورت کو مار کر میں ہفتوں خوشی سے سرشار رہتا۔ وہ میرے خواب و خیال میں میرے ساتھ رہتی۔ پھر جب اس عورت کا نشہ اتر جاتا تو میں کسی نئے شکار کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا۔

وہ جو کہاوت ہے کہ سو دن چور کے ایک دن شاہ کا۔ تو یہ کہاوت مجھ پر بھی صادق ہوئی۔ ایک دن ایک عورت پر فائر کر کے مجھے بھاگنے کا موقع نہیں ملا۔ میں کسی کے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا گیا تھا۔ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور اس سے بارود کی بو آرہی تھی۔

اس کے بعد پہلا عقوبت خانہ تھانہ تھا۔ جہاں پہنچ کر میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ اس سے پہلے بھی ایسی کئی واردات کر چکا ہوں۔ سچ بولنے کا فائدہ یہ ہوا کہ پولیس کو مشقت کم کرنی پڑی اور میری درگت بھی زیادہ نہیں بنی۔ دوسرا مرحلہ کوٹ کچہری کا تھا۔ جہاں مجھ سے عجیب دغریب سوال کیے گئے۔

"آخر ان عورتوں سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں تو انہیں جانتا بھی نہیں تھا۔ ان کے نام سے بھی آشنا نہیں تھا۔"

"تو پھر کسی کے کہنے پر قتل کیا؟"

"جی ہاں۔"

"کس کے کہنے پر اور کتنے میں سودا طے ہوا۔ ہر عورت کے قتل پر وہ تمہیں کیا دیتا تھا؟"

"میں اپنے دل کے کہنے پر قتل کرتا تھا۔ قتل کرنے کے بعد وہ مجھے کچھ دیتا نہیں تھا۔ میں ہی اسے بڑا سکون اور طمانیت پہنچاتا تھا۔ ہر قتل کے بعد وہ ہفتوں موج مستی کی حالت میں جھومتا رہتا تھا۔"

"تم تو عجیب گھن چکر ہو۔ جن عورتوں کو تم جانتے پہچانتے نہیں تھے، جن سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ تم انہیں اپنے دل کے کہنے پر مار دیتے تھے۔"

"جی ہاں۔"

"مگر تمہارا دل یہ کیوں کہتا تھا؟ ان عورتوں کے مرنے پر کیوں خوش ہوتا تھا؟"

"انسانوں کے جوڑے تو آسمانوں میں بنتے ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"مگر آسمان والے نے میرے جوڑ کی کوئی عورت نہیں بنائی تھی۔ اس بھری دنیا میں عورتوں سے کھچا کھچ بھری دنیا میں میرے لیے کوئی عورت نہیں تھی۔ اس لیے عورتیں اب مجھے زہر لگنے لگی تھیں۔"

"اوہ! تم تو نفسیاتی مریض لگتے ہو۔ مگر...... مگر ایسے لوگ تو اکثر اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اپنی نفسیاتی خواہشوں کی تکمیل کے لیے ناپسندیدہ کام کرتے ہیں لیکن پولیس رپورٹ کے مطابق تو تم نے کبھی بھی ایسا کوئی جرم نہیں کیا۔"

"جی ہاں، میں نے کبھی بھی کسی کی بہو بیٹی پر بری نظر نہیں ڈالی۔ کسی سے کبھی کوئی ناجائز رشتہ جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔"

"مگر یہ تو ایک غیر فطری بات ہے۔ تم جیسی کچلی ہوئی خواہشوں کے لوگ جو برائی کرتے ہیں۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ تم نے ایسا کچھ کیوں نہیں کیا؟"

"شاید اس لیے کہ میں بزدل تھا۔"

"جو قتل کر سکتا ہے وہ بزدل کیسے ہو سکتا ہے؟"

"قتل تو بہت بعد کی بات ہے۔ میں بنیادی طور پر بزدل ہوں۔ وہ لوگ جو پہلے بچپن میں ماں باپ کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں، وہ فطرتاً کمزور اور بزدل ہوتے ہیں۔"

"اچھا...... تو تم بچپن میں یتیم ہو گئے تھے؟"

"جی ہاں! ایک حادثے میں دونوں موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔ میں معجزاتی طور پر بچ گیا تھا۔ بس سر میں تھوڑی چوٹ لگی تھی۔ ایک نیک دل شخص نے مجھے گود لے لیا تھا مگر میں جب ذرا بڑا ہوا تو میں نے محسوس کیا اس گھر میں میری حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں تھی۔ بس ایک نوری ہی تھی جو میری دوست تھی۔ میرے ساتھ کھیلتی تھی اور مجھے نوکر نہیں سمجھتی تھی۔ وہ سب سے چھپ کر مجھے پڑھاتی لکھاتی بھی تھی۔ جو کچھ وہ اسکول سے سیکھ کر آتی تھی مجھے بھی بتاتی تھی۔ وہ کہتی تھی ہم بڑے ہو کر شادی کریں گے۔ شادی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم پڑھے لکھے ہو لیکن جب ہم کچھ بڑے ہوئے اور ہماری دوستی محبت میں بدل گئی تو شاید نوری کے ماں باپ کو اس کی بھنک مل گئی۔ ایک دن انہوں نے ایک چٹھی دے کر مجھے اپنے ایک عزیز کے گھر بھیجا جو ملیر میں رہتے تھے۔ تلاشِ بسیار کے باوجود بھی جب اس پتے پر ان کے عزیز نہیں ملے ہاں یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں کوئی اور رہتا ہے۔ میں بہت دیر کے بعد جب ناکام گھر لوٹا تو گھر میں تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اڑوس پڑوس سے پوچھا۔ یہ لوگ کہاں گئے؟ تو مجھے بتایا۔ شیخ صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے کسی اور شہر چلے گئے ہیں مگر کس شہر میں، یہ نہیں بتایا اور یہ بھی پوچھا کہ تمہیں اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے۔"

"میں ایک بار پھر بے آسرا ہو گیا تھا۔ ایک دو دن تک تو اِدھر اُدھر مارا مارا پھرا پھر ایک چائے خانے میں ملازمت کر لی۔ صبح سے رات گئے تک کام کرتا۔ کھانے پینے کو بھی مل جاتا تھا اور سونے کے لیے جگہ بھی۔ مجھے نوری بہت یاد آتی تھی۔ جانے میری جدائی میں اس بے چاری کا کیا حال ہوا ہوگا۔ اس کی یاد آتی تو اس کی بات بھی یاد آتی۔ وہ کہتی تھی۔

اصغر! تمہارے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ بات اس نے اس حوالے سے کہی تھی کہ جب ہم بڑے ہو جائیں گے تو شادی کرلیں گے اور شادی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم پڑھے لکھے ہو۔ اب اگرچہ اس سے شادی کی کوئی امید نہیں تھی مگر محض اس کی خواہش کے پیشِ نظر میں نے لکھنے پڑھنے کا کام دوبارہ شروع کردیا۔ چائے خانے کے کاؤنٹر پر بیٹھنے والے مینیجر سے جب بھی موقع ملتا۔ رہنمائی حاصل کرتا رہتا۔ چائے خانے کے پٹھان مالک نے میرے شوق کو دیکھا تو بولا تم کسی ٹیوشن سینٹر میں داخلہ لے لو۔ میں تمہیں شام کو چھٹی دے دیا کروں گا وہاں پڑھ کر تم پرائیویٹ طور پر امتحان دو اور اپنے علم کی پیاس بجھاؤ۔ خان بابا کی مہربانیوں سے میں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور نائٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس دوران چائے خانے میں۔۔۔ ترقی بھی ہوتی گئی۔ میں ٹیبل بوائے کی بجائے کاؤنٹر پر مینیجر کے عہدے پر فائز کردیا گیا۔ جب مجھے بی اے پاس کرنے کی خوشی حاصل ہوئی تو دوسری طرف مجھے میرے خان بابا کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ خان بابا کے بعد ان کے کاروبار کی باگ ڈور ان کے بیٹے نے سنبھال لی۔ اس نے میری چھٹی کردی۔ بولا۔ میرا پیچھا چھوڑو۔ یہ کوئی ایدھی ہوم نہیں ہے کہ ہم تم جیسے لوگوں کو شلٹر فراہم کریں۔ ایک بار میں پھر یتیم ہوگیا تھا مگر اب میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اللہ نے میری مدد کی۔ مجھے جلد ہی ایک دفتر میں ملازمت مل گئی اور میں نے ایک غریبوں کی بستی میں رہائش گاہ حاصل کرلی۔“

”یہاں تک تو تمہاری داستان بہت صاف ستھری ہے۔ تم نے اپنی محنت، لگن اور جدوجہد سے معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل کیا مگر پھر تم میں منفی رجحانات کیوں پیدا ہوگئے؟“

”ایک آدمی کو زندہ رہنے کے لیے جہاں روٹی اور ایک چھت کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ایک عورت کی رفاقت بھی ضروری ہوتی ہے۔ مگر میرے لیے تو آسمان اور زمین والوں نے عورت کو شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا تھا۔ میں ٹی وی دیکھ دیکھ کر سوچتا تھا کہ یہ دنیا تو اس قدر خوب صورت اور جوان عورتوں سے بھری ہوئی ہے پھر مجھے کسی ایسی عورت کا قرب کیوں حاصل نہیں۔ ٹی وی کا کوئی پروگرام ہو یا اشتہارات، ہر جگہ جذبات کو مشتعل کردینے والے جلوے۔ ایسا کوئی جلوہ ایسی کوئی عورت میرے لیے کیوں نہیں؟“

”تمہاری سوچ پر، فہم و فراست پر تعجب ہوتا ہے گریجویشن کرنے کے بعد بھی تم نرے جاہل کے جاہل رہے۔ کیا پرائیویٹ طور پر امتحانات پاس کرنے والے تمہاری طرح ناقص العقل ہوتے ہیں۔ ٹی وی والے اپنی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے اپنے ہر شعبہ کے لیے جوان اور جاذبِ نظر لڑکیوں اور عورتوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ تم نے اشتہارات کا بھی ذکر کیا ہے، کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ پروڈکٹس کی پبلسٹی کے لیے ماڈلز اور شوبز اسٹارز کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے کہ ہر پروگرام اور ہر اشتہار گلیمرائز ہو، ناظرین کے لیے پُرکشش ہو۔ انہیں شوق سے دیکھا جائے۔ تم نے خوب صورت اور پرشباب عورتوں کے جلوؤں کی بات کی ہے۔ یہ جلوے تو کاروباری لوگوں کے ہتھکنڈے ہیں، یہ لوگ اگر ایسا نہ کریں تو ان کا مال کیسے بکے؟ تم نے ٹی وی دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ بس پوری دنیا میں یہی سب کچھ ہے۔ یہ محبت اور یہ عیش و عشرت کی زندگی تمہیں کیوں حاصل نہیں؟ تم کیسے پڑھے لکھے ہو کہ تمہیں یہ تک معلوم نہیں کہ فلموں میں جس محبت کی نمائش کی جاتی ہے اس کے لیے فلمی اداکار اور اداکارائیں بڑے بڑے معاوضے لیتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں اس کی آرزو کرنا بے وقوفی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ تم تو غریبوں کی بستی میں رہتے تھے تم نے وہاں کی عورتوں کو دیکھ کر ان کے حالات پر غور و فکر کیوں نہیں کیا؟ یہ کیوں نہیں سوچا کہ زندہ رہنے کے لیے لوگ کیسی تکلیف دہ زندگی گزارتے ہیں۔ تم نے ٹی وی پر نظر آنے والی، اپنے حسن و جوانی کے جلوے لٹانے والی، شوبز سے تعلق رکھنے والی خواتین کو دیکھ کر یہ سوچ لیا کہ ایسی کوئی عورت تمہیں کیوں حاصل نہیں؟ ہر چیز ہر ایک کی دسترس میں نہیں ہوتی۔ تم نے اپنی اس محرومی کا ذمہ دار ہر خوب صورت اور جوان عورت کو قرار دے کر انہیں مارنا شروع کردیا۔ ان سے انتقام لینا شروع کردیا۔ قانون ایسے مجرم کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ تمہاری سزا تو موت ہے، پھانسی کا پھندا ہے۔“

وکیلوں کی جرح اور ججوں کے فیصلے کے بعد مجھے پھانسی پانے والے مجرموں کی کال کوٹھری میں قید کردیا گیا۔ مجھے تو مزید کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت حاصل نہیں ہے۔ آپ میری اس جیون کہانی کو پڑھ کر سوچیے گا کہ مجھے پھانسی گھاٹ تک پہنچانے کا ذمہ دار کون ہے؟

ست رنگی دنیا

محترم معراج رسول
سلام تہنیت
میں سرگزشت کا پرانا قاری ہوں لیکن پہلی بار ایک سرگزشت ارسال کررہا ہوں۔ یہ سرگزشت میرے ایک قریبی دوست کی ہے جسے انعام میں بہت بڑی رقم ملی تھی لیکن آج پھر اسی طرح مفلوک الحالی کی زندگی گزار رہا ہے۔ لفظ بہ لفظ سچ لکھا ہے تاکہ دوسرے بھی سبق حاصل کریں۔

ابوعاطر
(کراچی)

اُس روز ایک نئے دفتر میں ملازمت کا پہلا دن تھا۔ یہاں میں بطور ایریا مینیجر ملازم ہو کر آیا تھا۔ چونکہ آج میرا پہلا دن تھا اس لیے وقت سے ذرا پہلے ہی دفتر پہنچ گیا، ابھی پورا اسٹاف پہنچا بھی نہیں تھا لہٰذا سامنے چائے خانے میں بیٹھ کر چائے کی چسکیوں کے ساتھ ساتھ ماضی کے دھندلکوں میں کھوسا گیا کہ کس طرح ایک معمولی اسسٹنٹ سیلز مین کی حیثیت سے اس شعبہ میں آیا کیونکہ میری منزل ایک کامیاب سیلز مین بننا تھی۔ وہ دن مجھے خوب اچھی طرح یاد

ہے جب پہلی بار مجھے بطور سیلز مین ایک مخصوص ایریا دیا گیا تو اس روز شام میں میرے ساتھیوں نے مجھ سے زبردستی چائے سموسے کی دعوت وصول کی تھی اور میں نے کتنی خوشی خوشی یہ دعوت دی تھی۔ لیکن اس کے بعد مجھے سیلز مین سے آرڈر بکر کی پوزیشن اچھی لگنے لگی۔ یوں وقت کی سوئیوں پر زینہ بزینہ سفر کرتے کرتے، خدا جانے کتنی کمپنیاں بدلنے کے بعد آج میں اس مقام پر پہنچ گیا تھا کہ بطور ایریا مینیجر نہ صرف پورے شہر کی سیلز کی ذمہ داری مجھ پر تھی بلکہ اس شہر میں کمپنی کے سیلز ملازمین سے لے کر میرے ڈسٹری بیوٹر کے ملازمین بھی اپنی کارکردگی کے لحاظ سے مجھے جوابدہ تھے۔ اور میں ڈائریکٹ ہیڈ آفس کو جوابدہ تھا۔

ابھی میں ماضی کے جھروکوں سے جھانک رہا تھا کہ دفتر سے ایک لڑکا پیغام لے کر آگیا کہ سب لوگ آچکے ہیں اور آپ کا انتظار ہے۔ یہ سن کر میں ہڑبڑا کر ماضی سے کنارہ کشی کرتے ہوئے مستقبل کی طرف دوڑ پڑا۔ میرا معمول تھا کہ جب بھی میں کوئی نئی کمپنی جوائن کرتا سب سے پہلے وہاں کی ٹیم سے ایک اجتماعی ملاقات کے ذریعے سب سے فرداً فرداً ابتدائی تعارف حاصل کرتا، اسی دوران مختصر بات چیت کے ذریعے ٹیم کے مورال کا اندازہ بھی لگاتا جاتا اور دل ہی دل میں اُن کو مارک کرتا جاتا جو کم محنت میں زیادہ نتائج دینے کی اہلیت رکھتے تھے اور اُن کو الگ مارک کرتا تھا جن پر زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ ایک کمرے میں تمام اسٹاف جمع ہو چکا تھا۔ وقت کی کمی کے باعث پہلے میں نے اپنا تعارف کروایا اس کے بعد میرے سیلز آفیسر نے ڈسٹری بیوٹر کا اور تمام اسٹاف کا تعارف کروانا شروع کر دیا۔ بالکل آخر میں جن صاحب کا تعارف کروانے سے پہلے میرے سیلز آفیسر نے حسب معمول جونہی ابتدائی کلمات ادا کیے کہ سر یہ ہمارے ڈسٹری بیوٹر کے انتہائی تجربہ کار سیلز مین جناب راشد حسین صاحب ہیں۔

سیلز آفیسر کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول پڑا کہ میرا ان کا لمبا عرصہ تک ساتھ رہا ہے، ان کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں..... لیکن راشد تم یہاں...... یہ سب کیا ہے؟

"یہ سب وہی ہے سر جو آپ دیکھ رہے ہیں، آپ بے فکر رہیں سر، جس طرح پہلے محنت کیا کرتا تھا بالکل اسی طرح آئندہ بھی محنت جاری رکھوں گا، اچھے نتائج دینے کی بھرپور کوشش کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں لکھی یہ التجا بخوبی پڑھ لی تھی کہ ماضی کا قصہ وہیں رہنے دو، اس راکھ کو مزید مت کریدنا، دبے ماضی کو دبا ہی رہنے دینا۔ ظاہر ہے ایک تو یوں بھی وقت کم تھا اور دوسرے ماضی کو کھنگالنے کا یہ موقع بھی نہ تھا لہٰذا میٹنگ برخواست ہوئی، سب اپنے اپنے کام پر جت گئے۔ میں اس وقت تو کچھ راشد کی التجائی نگاہوں کے باعث اور کچھ وقت کی کمی کی باعث خاموش رہا، لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ راشد کے ساتھ کیا بیتی ہے، اس کو تو میں بہت آگے دیکھنے کی توقع میں تھا، یہ آج کوئی پندرہ سال بعد پھر اسی مقام پر مل رہا ہے جہاں سے ہم بچھڑے تھے۔

☆☆☆

دیکھو راشد میں مانتا ہوں کہ تم ایک محنتی انسان ہو، اپنا کام بہت اچھے طریقے سے کرتے ہو، مجھے بھی تمہارے حساب کتاب میں گڑبڑ کی شکایت نہیں ملی۔ نہ تو کسی سے ایک پیسا ناجائز لیتے ہو اور نہ ہی اپنا کوئی پائی پیسا کسی پر چھوڑتے ہو، چھٹیاں بھی بہت کم کرتے ہو، بس یہ تمہاری ہر مہینے تنخواہ سے ایڈوانس مانگنے کی عادت بہت بری ہے۔

یہ وہ لیکچر تھا جو آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے میں جس پرائیویٹ کمپنی میں کام کرتا تھا اس کے مالک میرے ایک ساتھی راشد کو دے رہے تھے۔ اور میں چونکہ وہیں بیٹھا اپنا حساب کتاب بنا رہا تھا اس لیے یہ ساری باتیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ حالات تو میرے اور راشد کے تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ ہم دونوں ایک کمپنی میں عہدے کے حساب سے تو سیلز آفیسر تھے لیکن حقیقت میں ہمارا کام سیلز مین والا ہی تھا۔ دکان دکان گھومنا، وہاں سے اپنی کمپنی کے پاس موجود پراڈکٹس کا آرڈر جمع کرنا اور پھر اگلے روز ان آرڈرز کے مطابق سپلائی پہنچانا ہماری بنیادی ذمے داری تھی۔ اب ہماری کمپنی کوئی ملٹی نیشنل کیا نیشنل کمپنی بھی نہیں تھی۔ اور اس کے بھی دیگر کمپنیوں کی طرح وہی زریں اصول تھے، اوّل تو یہ کہ صبح سیٹھ کے منہ سے جو احکامات نکل گئے وہی کمپنی پالیسی ٹھہرے اور دوسرے یہ کہ اگر کوئی ملازم اپنا کام کسی دن مقررہ وقت سے ایک گھنٹا پہلے ہی نمٹا لیتا تو اس کو فارغ دیکھ کر سیٹھ کے پیٹ میں اپھارہ شروع ہو جاتا، اور اس کی کوشش یہی ہوتی کہ کوئی اضافی کام لے کر اس کو دی جانے والی تنخواہ کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جائے۔ ان حالات میں اسٹاف کی اکثریت کی کوشش یہ ہوتی کہ اگر کام وقت سے پہلے نمٹ بھی گیا ہے تو فالتو وقت مارکٹ کے کسی چائے خانے میں صرف کر کے مقررہ وقت پر ہی دفتر پہنچے

تاکہ کسی بھی قسم کی اضافی ذمے داری سے بچ سکے۔ لیکن راشد ان لوگوں میں سے تھا جو وقت سے پہلے دفتر پہنچنے میں بالکل عار نہیں سمجھتے تھے۔ کچھ اسی قسم کی عادت میری بھی تھی، نتیجہ یہ کہ اکثر آرڈر والے دن سپلائی بھی دینی پڑتی اور سپلائی والے دن آرڈر بھی جمع کرنے پڑتے۔ اس سے پورے ہفتے کا شیڈول ضرور تباہ ہوتا لیکن شیڈول کی ایسی کی تیسی ہمیں شیڈول سے زیادہ سیٹھ کی خوشی عزیز تھی۔

☆☆☆

اُس روز میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ سیٹھ صاحب راشد کی کلاس لے رہے ہیں اور اس میں یقیناً اتنی دیر تو ہو ہی جائے گی کہ میں کسی بھی طرح کی اضافی ذمے داری سے بچ جاؤں گا۔ سیٹھ صاحب کا لیکچر جاری تھا کہ ہر ماہ تم ایڈوانس لیتے ہو، یہ صحیح ہے کہ تم اسے اگلے ماہ اپنی تنخواہ سے ایڈجسٹ بھی کروا دیتے ہو، اگر تم صرف ایک ماہ ذرا تنگی ترشی سے گزارہ کر لو تو تمہیں ہر ماہ کے ایڈوانس سے چھٹکارہ مل جائے گا۔ راشد بولا بات تو آپ کی صحیح ہے لیکن جتنی تنگی ترشی سے اس وقت گزارہ کر رہا ہوں اس سے زیادہ تنگی ترشی اور کیا ہوگی؟ مکان کا کرایہ، بجلی کا بل، تین وقت کا کھانا، بچوں کی فیس، صابن واشنگ پاؤڈر کے علاوہ صرف ایک کمیٹی ڈال رکھی ہے جو سال میں ایک دفعہ ملتی ہے جس سے بچوں کی نئے سال کی کتابیں اور یونیفارم ہی بمشکل خرید پاتا ہوں۔ سیر و تفریح یا شادی رسالگرہ میں شرکت کی عیاشی کیے تو کئی سال بیت گئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کون سا خرچا روک کر اس ماہانہ قرضے سے جان چھڑاؤں؟

سیٹھ صاحب بولے۔ ”یہ میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ لیکن بہر حال یہ سوچنا تمہارا ہی کام ہے، ہر انسان اپنے گھریلو حالات کے بارے میں اپنا برا یا بھلا فیصلہ خود ہی کر سکتا ہے۔ لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا ہے کہ تم جیسا ایک اچھا کارکن ہر ماہ قرضے کے لیے کھڑا ہو، بندہ بشر ہوں کسی روز میرا متھا گھوم گیا تو اسی بات پر نوکری سے فارغ کر دوں گا، اور بلاوجہ میرا اور تمہارا دونوں کا نقصان ہو جائے گا۔“

راشد بولا۔ ”اس خطرے سے نمٹنے کی ایک ترکیب ہے میرے پاس، اگر آپ برا نہ مانیں تو پیش کروں؟“

مجھے معلوم تھا راشد کیا تجویز پیش کرے گا، اور اس کے بعد جو آتش فشاں پھٹنے والا تھا مجھے اس کا بھی اچھی طرح اندازہ تھا، لہٰذا میں نے وقتی طور پر وہاں سے کھسک جانے میں ہی عافیت سمجھی تا کہ آتش فشاں کے بہنے والے لاوے کی زد میں آنے سے محفوظ رہوں۔ میرا کمرے سے نکلنا تھا کہ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ سیٹھ صاحب کے کمرے سے ایک دم سے چیخنے چنگھاڑنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

”میں اگر تمہارا خیال رکھتا ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم سر پر ہی چڑھنا شروع کر دو۔ اپنی اوقات دیکھو اور اپنی تجویز دیکھو، کچھ تو خیال کیا ہوتا۔ کاروباری حالات تم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، اخراجات بڑھتے ہی جا رہے ہیں، کمپنیاں کمیشن میں کوئی اضافہ کر نہیں رہی ہیں اور آپ جناب ہیں کہ ایسی اعلیٰ تجویز دے رہے ہیں......“

سیٹھ صاحب کے کمرے سے کچھ دیر اسی طرح چیخنے چنگھاڑنے اور منمنانے کی آوازیں آتی رہیں اور کچھ دیر میں راشد سیٹھ صاحب کے کمرے سے منہ بسورے ہوئے برآمد ہوا تو میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یار تم سیٹھ صاحب کی عادت تو جانتے ہی ہو، اس کے باوجود یہی تجویز دی ہوگی کہ ہر ماہ تین ہزار ہی تو ایڈوانس مانگتا ہوں، اور پھر ہر پہلی پر ایڈجسٹ بھی کروا دیتا ہوں آپ اگر ایک بار مہربانی کر کے وہ تین ہزار معاف کر دیں تو اس ہر ماہ کی جھنجھٹ سے جان ہی چھوٹ جائے گی۔ وہ تو ایک بار گھر میں بیماری کی وجہ سے ایڈوانس لینا پڑ گیا تھا جس سے آج تک جان نہیں چھوٹ پائی، اور اسی بات پر سیٹھ صاحب کا پارہ چڑھ گیا ہوگا؟

راشد بڑی مردہ دلی سے بولا۔ ”ہاں بات تو یہی ہے، اب تم خود ہی دیکھو کتنی ایمانداری سے کام کرتا ہوں، وقت ضائع نہ کرنے کی سزا اضافی کام کی صورت میں بھگتتا ہوں، اس کے باوجود سیٹھ کا رویہ اتنا تلخ ہے۔ میں نے تو اب فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہاں مزید نوکری کرنی ہی نہیں ہے۔ اگر سیٹھ کو محنتی آدمی کا خیال نہیں ہے تو مجھے بھی سیٹھ کی کوئی فکر نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا زیادہ غصہ نہ کرو، اگر ہم زیادہ کام کرتے ہیں تو زیادہ کمیشن بھی لیتے ہیں۔ لیکن چلو چھوڑو اس بحث کو، تم سکون سے بیٹھو میں ذرا سیٹھ کو حساب دے کر آؤں پھر بات کرتے ہیں اس مسئلے پر۔“

میں اپنا حساب لے کر سیٹھ کے پاس پہنچا، مجھے معلوم تھا کہ سیٹھ کا موڈ آف ہوگا۔ ایسے میں پیسے پائی کی غلطی بھی راشد پر آنے والے سارے غصے کا نزلہ مجھ پر گرا دے گی، میں اسی لیے پورا حساب اچھی طرح چیک کر کے لے گیا تھا، لہٰذا وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ سیٹھ کا

موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کسی ایک بڑے آرڈر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، میں نے سیٹھ کو وہ مژدہ بھی سنا دیا۔ یہ سن کر سیٹھ کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا تو اس نے خود مجھ سے کہا کہ ذرا راشد کو منالو، میرا تو تم کو معلوم ہی ہے کہ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں، کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا، میں تو خود اس کی بہت قدر کرتا ہوں، لیکن تم خود ہی دیکھو اگر آج اس کو تین ہزار معاف کر دیئے تو کل سے لائین لگ جائے گی ایڈوانس لینے والوں کی۔

مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ سیٹھ کو اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ اگر راشد کہیں غصے میں نوکری چھوڑ کر چلا گیا تو اتنا اچھا ملازم مشکل سے ہی ملے گا۔ اب باری میری تھی چوٹ مارنے کی۔ میں نے بڑی مہارت سے چاپلوسی کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے کہا کہ سیٹھ صاحب آپ فکر نہ کریں، میں اس کو سمجھاتا ہوں۔ آخر یہ ہماری ہی تو کمپنی ہے، اس کا بھلا ہم نہیں چاہیں گے تو اور کون چاہے گا؟ آخر ہم یہاں سے اپنے بچوں کا رزق کماتے ہیں، آپ فکر نہ کریں۔

میرے یہ جملے سنتے تھے کہ سیٹھ کا غصہ کچھ مزید نرم ہو گیا۔ موقع مناسب دیکھ کر میں دروازے کی طرف پلٹا اور باہر نکلتے ہوئے کہا کہ میں اس کو سمجھا تو لوں گا لیکن آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ راشد ایک غریب آدمی ہے، ہمیں کچھ تو اس کی مجبوری کا خیال بھی کرنا ہی پڑے گا، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی طرف سے اس کو یہ کہہ دیتا ہوں کہ تمہارا قرض معاف ہوگا اور نہ ہی تمہیں ہر ماہ قرضہ ملے گا، بلکہ تمہارا اس مہینے کا لیا ہوا قرض پانچ سو روپے ماہانہ کر کے چھ ماہ تک تمہاری تنخواہ سے کٹے گا اور اس کے بعد کوئی قرضہ نہیں ملے گا۔ راشد کو قرضہ معاف نہ کرنے اور آیندہ قرض نہ دینے کی تکرار نے سیٹھ پر ایسا جادوئی اثر کیا کہ اس نے بغیر کچھ سوچے مجھے اس منصوبے کی منظوری دے دی۔

میں واپس راشد کے پاس پہنچا تو وہ منہ بسورے ہوئے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں اس کو اپنے ساتھ قریبی چائے کے ہوٹل پر لے گیا۔ پہلے ٹھنڈا پانی پلا کر اس کے غصے کی شدت کم کی اور پھر اس کو دنیا کی اونچ نیچ سمجھا کر کہا کہ نوکری چھوڑنے کی حماقت نہ کرنا، سارے سیٹھ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، ہمارے سیٹھ میں خامیاں بھی ہیں تو خوبیاں بھی ہیں۔ نئی جگہ پر اس بات کی کیا ضمانت کہ اس سے اچھا تو کیا اس جیسا سیٹھ بھی ملتا ہے یا نہیں۔

راشد بولا ”اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ مجھے بھی اچھا تھوڑا ہی لگتا ہے کہ ہر ماہ قرض بھی مانگوں اور ہر ماہ کٹوتی بھی کرواؤں۔

میں نے کہا۔ ”تم اس کی فکر نہ کرو میں نے اس کا حل بھی نکال لیا ہے اور سیٹھ سے منظوری بھی لے لی ہے، اب تمہاری یکمشت کوئی کٹوتی نہیں ہوگی اور تمہیں ہر ماہ قرض مانگنے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ یہ تین ہزار روپے اگلے چھ ماہ تک تمہاری تنخواہ سے پانچ سو روپے ماہانہ کر کے کٹیں گے۔“

یہ سننا تھا کہ راشد نے سکون کا سانس لیا اور بولا۔
”یار تم نے میرا یہ بڑا کام کر دیا ہے، میں تمہارا یہ احسان ساری عمر یاد رکھوں گا۔“

میں نے کہا دوست بھی کہتے ہو اور احسان احسان بھی کھیلتے ہو، شرم نہیں آتی ہے تمہیں۔

ہم کچھ دیر اسی طرح گپ شپ کرتے رہے۔ جب وہاں سے اٹھنے لگے تو میں نے چائے والے کو ادائیگی کی اور خوشگوار شکوے کے انداز میں راشد سے کہا ابے یار یہ پھڈا تمہارا اور سیٹھ کا ہوا، حل میں نے کروایا اور چائے کا نقصان بھی میرا ہی، یہ پیسے تو تم کو دینے چاہیے تھے۔

راشد بولا۔ ”بیٹا جی اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے، اگر میں نوکری چھوڑ جاتا تو تم اپنے ایک دوست سے محروم نہ ہو جاتے۔“

کچھ روز کے بعد ایک دن جو میں صبح دفتر پہنچا تو میری شکل دیکھتے ہی سیٹھ صاحب کا رنگ کھل اٹھا، اور کہنے لگے آج تمہارا تو بکنگ کا دن ہے لیکن آج ذرا سی محنت زیادہ کر لینا، یہ لسٹ لے لو، یہ راشد کی سپلائی کی لسٹ ہے، آج وہ آیا نہیں ہے، اس کے ایریا کی سپلائی بھی کر دینا۔

ظاہر ہے راشد کا نام سن کر میرے پاس ہامی بھر لینے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس دن مجھے دوگنا کام کرنا پڑا لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ یہ میرے دوست راشد کا معاملہ تھا۔ اگلے دن راشد پھر نہیں آیا اور مجھے پھر دوگنا کام کرنا پڑا۔ شام کو حساب دیتے ہوئے میں نے سیٹھ صاحب سے پوچھا کہ یہ راشد کیوں نہیں آرہا ہے؟

سیٹھ صاحب بولے مجھے خود معلوم نہیں ہے۔ راشد اتنا غیر ذمہ دار تو نہیں ہے، یقیناً کوئی سنجیدہ مسئلہ ہی ہوگا جبھی نہیں آرہا ہے۔

تیسرے دن راشد پھر غیر حاضر تھا، اب سیٹھ صاحب کا موڈ آف تھا اور میں فکرمند تھا کہ اللہ خیر کرے کہیں راشد

بیمار نہ ہو گیا ہو۔ یہ کوئی موبائل فون کی فراوانی کا زمانہ تو تھا نہیں کہ اس سے فون پر ہی پوچھ لیا جاتا۔ شام کو چھٹی کے وقت میں نے سیٹھ صاحب کو تسلی دی کہ فکر نہ کریں میں ابھی سیدھا راشد کے گھر جا کر معلوم کرتا ہوں کہ کیا مسئلہ ہے؟

جب دو بسیں بدل کر میں راشد کے گھر پہنچا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ پڑوسیوں سے معلوم کیا تو انہوں نے کہا کہ تین چار دن سے تالا لگا ہوا ہے، ایک روز شام کو تمام گھر والے ٹیکسی میں بیٹھ کر گئے تھے، اس کے بعد واپس نہیں آئے۔ اب میری پریشانی بڑھ چکی تھی کہ اللہ خیر کرے اس کی والدہ کی طبیعت خراب چل رہی تھی، کہیں خدانخواستہ اُن کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو، یا سُسر کے آپریشن میں کوئی پیچیدگی نہ ہو گئی ہو، یا کہیں..... یا کہیں..... میں ان ہی سوچوں میں غلطاں اپنے گھر کی بجائے راشد کے بھائی کے گھر کی طرف چل پڑا، ایک بار راشد نے باتوں ہی باتوں میں مجھے ان کا پتا سمجھایا تھا۔ جب پوچھتا پچھاتا وہاں تک پہنچا تو وہاں بھی گھر پر تالا ہی تھا اور وہاں بھی یہی پتا چلا کہ تین چار دن سے گھر پر تالا ہے، اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی والدہ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے اسی لیے تمام گھر والے چلے گئے ہیں۔ والدہ چونکہ سکھر میں رہتی تھیں اس لیے وہاں جانا ممکن نہیں تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ مزید بیت گیا، راشد بھی دفتر نہیں آیا۔ میں اس کے حصے کا کام کر تو رہا تھا لیکن میری اپنی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ انسان عارضی طور پر تو ڈبل کام کر سکتا ہے یا شاید کچھ مزید طویل عرصے تک بھی دوگنا کام کرنے پر راضی ہو جائے، بشرطیکہ کوئی معقول وجہ ہو۔ یہاں تو راشد کا کچھ پتا ہی نہیں تھا کہ کب واپس آئے گا۔ اور بہرحال ایک آدمی دوگنا کام کر کے بہتر نتائج تو دے سکتا ہے لیکن کوئی بھی تنہا انسان دو افراد کے برابر نتائج نہیں دے سکتا۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میں تھکن سے چُور الگ ہو رہا تھا اور سیل پر بُرا اثر الگ... پڑنے کے علاوہ سیٹھ صاحب پر کمپنی کی طرف سے دباؤ بھی پڑ رہا تھا کہ افرادی قوت پوری کرو۔ بالآخر ایک روز شام کو مجھے سیٹھ صاحب نے مطلع کیا کہ میں کل تک راشد کا مزید انتظار کروں گا، اگر وہ نہ آیا تو میں اس کی جگہ دوسرا ملازم رکھ لوں گا۔ میں نے بھی با دلِ نخواستہ ہاں کر دی، ظاہر ہے میں بھی ایک ملازم ہی تھا، کب تک ایسی غیر یقینی صورتِ حال میں کسی کی نوکری بچا سکتا تھا۔

☆☆☆

گھر آ کر رات کے کھانے اور دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر ابھی بستر پر لیٹا ہی تھا اور میری سوچوں کا محور بھی راشد ہی تھا کہ خدا جانے اس کے ساتھ کیا معاملہ ہو گیا ہے؟ کیوں غائب ہے؟ اتنے میں گھر کا دروازہ بجا، باہر نکل کر دیکھا تو راشد عجب حال میں کھڑا تھا، شیو بڑھی ہوئی، رنگت بھی کچھ بدلی ہوئی، سر پر عمامہ بندھا ہوا، ہاتھ میں تسبیح اور جیب میں مسواک ٹھنسی ہوئی اور ہاتھ میں ایک کالے رنگ کا شاپنگ بیگ پکڑا ہوا۔ میں نے خوشی، حیرت اور ناراضگی کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اس سے پوچھا کہ کہاں ہو؟ کیا ہو گیا تھا؟ اتنے دن سے غائب ہو۔ اماں کا کیا حال ہے؟ سسر کے آپریشن کا کیا بنا؟ غرض میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ذہن کی کٹھالی میں پکنے والے تمام سوالات کو پگھلتے سیسے کی طرح اس پر انڈیل دوں۔

راشد بولا سب خیریت ہے، ہر ایک بالکل ٹھیک ہے، لیکن بات ذرا تفصیلی ہے چلو کسی چائے خانے میں چل کر چائے پیتے ہیں اور میں تم کو تمام تفصیلات سے آگاہ بھی کرتا ہوں۔

ہم دونوں قریبی ایک پٹھان کے ہوٹل میں جا کر چارپائی پر بیٹھ گئے، مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہی کہا ہاں اب بتاؤ کہاں غائب تھے؟ تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے میں نے کس طرح تمہاری نوکری بچا کر رکھی ہوئی ہے؟

راشد نے ایک لمبی سی سانس لی، جیسے سوچ رہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا، اس میں سے کچھ رقم گن کر نکالی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے سے مٹھائی کا ایک ڈبہ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولا کہ یہ مٹھائی تو ایڈوانس میں اس خوشخبری کی لے لو جو میں تمہیں سنانے لگا ہوں، یہ لفافہ سیٹھ صاحب کو دے دینا اس میں میرا استعفیٰ ہے، اب مجھے نوکری کی ضرورت نہیں رہی، اور یہ ڈھائی ہزار سیٹھ صاحب کو دے دینا، یہ وہ رقم ہے جو میں نے تین ہزار کا ایڈوانس لیا ہوا تھا اور جس کی اس مہینے میں صرف پانچ سو کی کٹوتی ہوئی اور یوں میرے ذمہ یہ ڈھائی ہزار بقایا تھے، مارکیٹ میں میرا کوئی لینا دینا ہے ہی نہیں، رہ گیا تنخواہ کا حساب کتاب تو جیسے ہی موقع ملے گا آ کر کر لوں گا۔

میں حیران پریشان اُس کو تکے جا رہا تھا، اسی عالم میں اس سے پوچھا کیسی خوشخبری؟ حلیہ تو بتا رہا ہے کہ تم ابھی کسی

''دس روزہ'' سے واپس آئے ہو، یا شاید کسی ''چلے'' پر جانے کو تیار ہو۔
وہ بولا ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ سب تو عارضی طور پر حلیہ بدلا ہوا ہے، تاکہ پہلی نظر میں پہچانا نہ جا سکوں، مجبوری ہی کچھ ایسی ہے، ابھی کچھ دن اسی حلیے میں رہوں گا، جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو دوبارہ نارمل حالت میں آجاؤں گا۔
''لیکن ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔''
میرے اس سوال کے جواب میں راشد نے جو کہانی سنائی، مجھے ایسا لگا کہ یا تو خدانخواستہ اس کا دماغ بہک چکا ہے یا میں کسی زندہ (Live) فلم کا کوئی ایسا سین دیکھ رہا ہوں جس کے بارے میں عموماً فلم ڈائریکٹر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس سین کے بعد کہانی ٹرن لیتی ہے۔

☆☆☆

راشد نے بتانا شروع کیا کہ اس ماہ چونکہ ایڈوانس کی صرف پانچ سو روپے کٹوتی ہوئی تو مجھے اس حساب سے ڈھائی ہزار زیادہ ملے، میں نے سوچا کافی عرصے بعد تنخواہ میں اتنی زیادہ رقم ملی ہے۔ چلو کیوں ناں گھر والوں کو تھوڑی سی تفریح کروائی جائے۔ ایک دوست سے موٹر سائیکل مانگی اور بیوی بچوں کو بٹھا کر سمندر کنارے چلا گیا، وہاں ایک دو گھنٹے تفریح کرنے کے بعد واپس آتے ہوئے بورڈ آفس کے پاس ایک کولڈ اسپاٹ سے ایک ایک بوتل سب کے لیے لی اور وہیں قریبی گھاس پر بیٹھ کر ہم سب نے بوتلیں پیں، میرے چھوٹے بیٹے نے ان بوتلوں کے ڈھکن جمع کر لیے، ظاہر ہے غریب آدمی کے بچے کو ایسے کھلونے ہی میسر ہو سکتے ہیں، اور کئی برسوں بعد یہی ہم سب کی واحد عیاشی تھی کہ ہم نے اکٹھا خرید کر کولڈ ڈرنک پی تھی اور میرے بچوں نے اس کے ڈھکن بھی جمع کیے۔ ابھی ہم بوتل پی کر وہاں سے نکل ہی رہے تھے کہ مجھے ایک اجنبی آواز نے روکا، پلٹ کر دیکھا تو عمدہ لباس میں ملبوس کچھ افراد ایک جگہ کھڑے ہیں، جو آپس میں ہی باتیں کر رہے تھے، دیکھنے میں اچھی پوزیشن کے افراد لگتے تھے، اُنہی میں سے ایک نے آواز دے کر مجھے روکا تھا، میں جونہی ان کی طرف متوجہ ہوا تو ان میں سے ایک نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا، میں حیرت سے ان کی طرف بڑھا کہ ان میں سے کوئی بھی چہرہ مجھے شناسا نظر نہیں آتا تھا، ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا میرا نام جاوید برنی ہے، اور یہ ہیں وکٹر صاحب جو آسٹریلیا سے ہیں اور اس کمپنی کے پورے ایشیاء کے چیف ہیں جس کی بوتلیں ابھی آپ نے اپنے گھر والوں کے ہمراہ پی ہیں، ہم اسی سلسلے میں کچھ دیر آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں، زیادہ نہیں صرف پانچ منٹ لگیں گے۔
میں نے کہا ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔
پہلے ان سب نے اپنا اپنا تعارف کروایا، وہ سب ہی کمپنی کے مقامی اور بین الاقوامی اعلیٰ عہدیدار تھے۔ پہلے تو وہ ہلکی پھلکی گفتگو کر کے بے تکلفی کا ماحول بناتے رہے، اسی دوران ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا کیا آپ جب بھی کولڈ ڈرنک پیتے ہیں تو ہمارے ہی برانڈ کی پیتے ہیں؟
میں نے ذو معنی انداز میں کہا کہ جی ہاں جب بھی پی اس برانڈ کی پی، یار! ان کو میں کیا بتاتا کہ آج میں نے خدا جانے کتنے سال بعد تو بوتل خرید کر پی ہے ورنہ کسی تقریب میں مل گئی تو چکھ لی، اس میں بھی انتخاب کا اختیار کہاں کہ یہ والی پیوں گا، وہ نہیں۔
بہرحال شاید میرے لہجے کی مایوسی کو سمجھتے ہوئے ان میں سے ایک صاحب بولے کہ کیا آپ کو پتا ہے ہماری بوتلوں کے ڈھکن میں پوشیدہ انعامات کی اسکیم چل رہی ہے؟
میں نے کہا جی سنا تو ہے لیکن کبھی توجہ نہیں دی۔
وہ بولے آپ کے بچوں نے یقیناً توجہ دی ہوگی تب ہی تو انہوں نے ڈھکن جمع کیے ہیں۔
میں نے کہا جی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ڈھکن صرف کھلونے کی حیثیت سے جمع کیے ہوں، بہتر ہوگا آپ خود انہی سے معلوم کر لیں، یہ کہہ کر میں نے اپنے بچوں کو اشارے سے اپنے پاس بلایا تو وہ دوڑے چلے آئے۔ ان میں سے ایک صاحب نے پوچھا، بچو! ابھی آپ نے کولڈ ڈرنک کے جو ڈھکن جمع کیے ہیں ان کا کیا کریں گے؟ بچوں نے کہا ہمارے پاس ایک گتے کا ڈبہ ہے، ہم اس میں ان کا پہیا لگا کر گاڑی بنائیں گے۔
انہوں نے پھر پوچھا کہ کیا آپ کو پتا ہے ان ڈھکنوں میں کوئی انعام بھی تو ہو سکتا ہے۔ بچوں نے کہا ہر ڈھکن میں صرف ایک ہی لفظ لکھا ہوتا ہے (Try Again) اس لیے اب ہم نے ڈھکن دیکھنا ہی چھوڑ دیے ہیں۔
ان میں سے ایک صاحب بولے اچھا یہ بات ہے تو چلیں آپ اپنے ڈھکنے مجھے بیچ دیں، میں ان کے بدلے آپ کو ایک ایک بوتل اور پلاؤں گا، بولو منظور؟

بچوں نے جوش سے کہا منظور ہے۔ اسی دوران ان میں سے ایک صاحب جو زیادہ سینیئر نظر آرہے تھے وہ بولے بچوں کو ایک ایک بوتل اور پلا دیں اور فی ڈھکن سو سو روپے بھی دے دیں۔ ایک صاحب نے فوراً جیب سے سو سو روپے نکال کر بچوں سے ڈھکن خرید لیے اور دوسرے صاحب جا کر سامنے والی دکان سے بچوں کے لیے ایک ایک بوتل اور لے آئے۔ بچوں کو بوتل پکڑا کر کہا کہ بچو! اب آپ اپنی امی کے ساتھ جا کر کھڑے ہو جائیں ہم آپ کے ابا سے کچھ باتیں کرلیں۔

جب بچے اپنی ماں کے پاس چلے گئے تو اُن میں سے ایک صاحب بولے، راشد صاحب جیسا کہ ہم آپ کو بتا ہی چکے ہیں کہ ہم سب کا اسی کمپنی سے تعلق ہے۔ ہم نے سامنے والی دکان پر کچھ بوتلوں پر ایک مخصوص نشان لگا کر ان میں ایک بڑا انعام ڈال دیا تھا تا کہ وہ انعام جس کسی کو بھی ملے اس کو اپنی پوری نگرانی میں ذمہ داری کے ساتھ حق دار تک پہنچایا جاسکے۔ اور یہ دیکھیں یہ ہیں ان بوتلوں پر لگے مخصوص نشانات جو آپ لوگوں نے پی تھیں، اور جن کے ڈھکن ہم نے آپ کے بچوں سے اس لیے خریدے ہیں کہ ہمیں یقین ہے ان میں سے کسی میں ایک بڑا انعام پوشیدہ ہے۔

میں نے زہر آلود انداز میں کہا تو اب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں آپ تو یہ ڈھکن چھ سو روپے اور چھ بوتلوں کے بدلے خرید ہی چکے ہیں۔

وہ بولے نہیں یہ ڈھکن اب بھی آپ ہی کی ملکیت ہیں وہ تو بچوں کو مٹھائی کے پیسے دیے تھے۔

راشد نے کچھ توقف کیا پھر بولا، میری کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، کیا یہ مذاق ہو رہا ہے یا کچھ حقیقت بھی ہے اس میں؟ بہر حال میں نے اسی یقین اور بے یقینی کے عالم میں پوچھا کہ اب کیا کرنا ہے؟

وہ بولے آپ کو بھی دیر ہو رہی ہے اور ہمیں بھی دیر ہو رہی ہے ایسا کرتے ہیں یہ ہیں وہ چھ ڈھکن جو ہم نے آپ کے بچوں سے خریدے تھے، ایسا کرتے ہیں ان سب کو ایک تھیلی میں سیل بند کر کے اس پر ہم بھی دستخط کر دیتے ہیں اور آپ بھی اپنے دستخط کر دیں، کل دن میں بارہ بجے کے قریب ہمارے دفتر آجائیے گا، ہم وہاں آپ کے سامنے ان ڈھکنوں کو کھرچ کر دیکھیں گے جو انعام اس پر لکھا ہوگا آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔

راشد بولے جا رہا تھا اور میں گنگ یہ ماورائی باتیں سن سن کر سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ یا خدا یہ راشد کے ساتھ کیا حادثہ بیتا ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔

راشد میری اس ہیجانی کیفیت کو دیکھ کر بولا، جو کیفیت اِس وقت تمہاری ہو رہی ہے اُس وقت میری بھی یہی کیفیت تھی، میں نے اسی یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں ڈھکنوں والے لفافے پر دستخط کیے، ان کا وزیٹنگ کارڈ لیا، دفتر کا پتا سمجھا، اگلے دن بارہ بجے ان کے دفتر میں ملنے کا وعدہ کیا اور واپس بیوی بچوں کے ہمراہ گھر چلا آیا۔ گھر پہنچ کر بیوی بچوں نے پوچھا کہ انہوں نے سو سو روپے کے ڈھکن کیوں خریدے تھے؟ اور وہ آپ سے کیا باتیں کر رہے تھے۔ میں خود کنفیوژ ہو رہا تھا کیا جواب دیتا؟ یوں ہی ٹال گیا اور ان کو یہ نہیں بتایا کہ مجھے انہوں کل دن میں اپنے دفتر میں انعام دینے کو بلایا ہے۔

☆☆☆

جراحی Surgery

علم الجراحت۔ جسم کے زخموں یا جسمانی بیماریوں کا علاج چیرنے (آپریشن) کے ذریعے۔ علم جراحت میں قدیم اطباء نے نہایت بنیادی اور مثبت خدمات انجام دی ہیں۔ اس ضمن میں ابوالقاسم زہراوی کی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب الید (التعریف)، علی بن عباسی مجوسی کی ''الملکی'' (کامل الصناعۃ) اور الرازی کی اعمال جراحی وغیرہ مشہور ہیں۔ مشرق میں یہ فن انحطاط پذیر ہو کر نادان جراحوں کے ہاتھوں میں چلا گیا لیکن یورپ کے دانشوروں نے اس کی بنیادوں پر بڑی ترقی کی۔ آج کل سرجری میں جو اعمال مستعمل ہیں ان میں سے بہت سے اطبائے قدیم نے ایجاد کیے تھے۔ کامیاب آپریشن کے راستے میں تین دشواریاں ہوتی ہیں خون کا بہنا، صدمہ اور جراثیم۔ زخم کو جراثیم سے بچانے کے لیے آلاتِ جراحی کو ابال کر اسپرٹ سے صاف کرلیا جاتا ہے۔ دوران آپریشن خون کا بہنا مختلف آلات سے روکا جاتا ہے۔ صدمہ دور کرنے کے لیے گلوکوز، نمک کا پانی یا بعض اوقات خون تک دینا پڑتا ہے۔

مرسلہ: ناہید فرزانہ۔ سیالکوٹ

اگلے دن جب میں مقررہ وقت پر ان کے دفتر پہنچا تو مجھے ایک خوبصورت سے ائر کنڈیشنڈ میٹنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہی رات والے صاحبان اور ان کے علاوہ کچھ مزید افراد اور ایک فوٹو گرافر بھی آ گیا۔ ایک صاحب نے اپنے بیگ سے وہی ڈھکنوں والا لفافہ نکالا اور مجھ سمیت سب سے ان کے دستخط کی تصدیق کروا کے یہ ثابت کیا کہ یہ اصلی لفافہ ہی ہے، پھر وہیں موجود انہی آسٹریلین وکٹر صاحب کی اجازت سے وہ لفافہ کھول کر ڈھکن باہر نکال لیے گئے، فوٹو گرافر بڑی مستعدی سے تمام مناظر اپنے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرتا رہا۔ اب پوزیشن کچھ یوں تھی کہ وہ تمام افسران میز کے ایک طرف اور ایک ساتھ بیٹھے تھے اور میں ان کے بالکل مقابل میز کی دوسری طرف، میں بالکل تنہا ان کے سامنے ایسے بیٹھا تھا جیسے میں یا تو کوئی بہت بڑا مجرم ہوں جس پر یہ جیوری جرح کرنے والی ہے یا کوئی بہت بڑا سرمایہ کار جس کو یہ سب اپنی کمپنی میں سرمایہ کاری پر راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ بہر حال کچھ دیر بعد تمام غیر متعلقہ افراد کو باہر بھیج دیا گیا اور کمرے میں صرف میں اور چند افسران رہ گئے، اب وہ لوگ ان ڈھکنوں کو باری باری کھرچ کر دیکھتے اور وہیں الٹا کر کے رکھتے جا رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ جب تمام ڈھکن کھرچے جا چکے تو وکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کیا خیال ہے آپ کا راشد صاحب، کیا انعام نکلا ہوگا آپ کا؟ میں نے جواب دیا کہ جناب اس کا تو مجھے بالکل اندازہ نہیں ہے، ہاں یقیناً کوئی بڑا انعام ہی ہوگا جو اتنا تردو کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا۔ جی بالکل صحیح اندازہ ہے آپ کا اس سے پہلے کہ ہم آپ کو انعامی رقم سے آگاہ کریں چند شرائط سے آگاہ کر دینا ضروری ہے، اوّل تو یہ کہ جو بھی انعامی رقم ہے اس کا دس فیصد قانون کے مطابق سرکاری خزانے میں بطور ٹیکس جمع ہوگا، اس کا مطلب یہ کہ ہم وہ ٹیکس کی رقم کاٹ کر سرکاری خزانے میں جمع کروائیں گے اور باقی نوّے فیصد رقم بذریعہ چیک آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہوگی، اور ہاں ٹیکس کی ادائیگی کا ثبوت آپ کو فراہم کر دیا جائے گا تاکہ آپ کے لیے قانونی مسائل پیدا نہ ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ایک باقاعدہ تحریری معاہدے کے تحت اس انعام کی ادائیگی کی ایک اشتہاری فلم بنے گی جس میں آپ کو بطور انعام یافتہ پیش کیا جائے گا، اس فلم کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جائے اور وہ فلم ہم ٹی وی کے علاوہ اس کے منتخب جے جہاں ضروری ہوا آپ کی آواز یا تصویر کے ساتھ ریڈیو، اخبارات اور پوسٹر وغیرہ میں استعمال کر سکیں گے، کیا آپ کو یہ شرائط منظور ہیں۔

جی مجھے منظور ہیں...... لیکن بھائی وہ رقم کتنی ہے؟ راشد کی اتنی لمبی کہانی سننے کے بعد مجھ سے صبر نہ ہوا اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

وہی بتانے لگا ہوں، راشد بولا، وہ انعامی رقم ہے پورے ایک کروڑ روپے۔

''کیا کہا ایک کروڑ روپے نقد؟'' میرے منہ سے بے ساختہ با آوازِ بلند مسرت آمیز لہجے میں نکلا تو راشد نے ایک دم میرا ہاتھ دبا کر مجھ سے کہا خاموشی سے سنتے رہو، زیادہ اونچا نہ بولو، مصلحت کا تقاضہ یہی ہے۔

میں نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے مزید تفصیل سننے کو ترجیح دی۔

راشد بولا، گذشتہ جو کئی دن سے کام پر نہیں آ رہا تھا اس کی وجہ بھی یہی معاملات تھے، سب سے پہلے تو اپنا بینک اکاؤنٹ کھلوانا تھا تاکہ اس میں انعامی رقم آ سکے پھر معاہدے کے مطابق اشتہاری فلم کی شوٹنگ میں مصروف رہا، اب تک ان تمام معاملات کی میری بیوی کے علاوہ صرف تم کو خبر ہے، نوّے لاکھ روپے کی رقم میرے اکاؤنٹ میں آ چکی ہے، اشتہاری فلم بھی مکمل ہو چکی ہے، دو تین دن میں ٹی وی پر میرے تعارف کے ساتھ آنا شروع ہو جائے گی، اسی وجہ سے میں نے رہائش بھی بدل لی ہے اور کچھ حلیہ بھی بدلنے کی کوشش کی ہے، تم کو تو حالات کا اندازہ ہے ہی، جب ٹی وی پر اشتہاری فلم آنا شروع ہوگی تو لوگ مجھے پہچاننا شروع کر دیں گے جس کی وجہ سے میرے لیے سیکیورٹی کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، مجھے اس حلیے میں پہلی بار دیکھنے والا شاید ٹی وی اشتہار میں دیکھ کر پہچان نہ پائے، اب کل میں یہ شہر چھوڑ کر ایک دوسرے شہر میں رہنے لگوں گا، تاکہ میری اور میرے گھر والوں کی زندگی کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔ ایک دو مہینے بعد جب لوگ وہ اشتہار بھول چکے ہوں گے تو واپس اسی شہر میں آ کر نئے سرے سے زندگی کی شروعات کروں گا۔ اس کے بعد کافی دیر راشد میرے ساتھ بیٹھا مستقبل کی پلاننگ کرتا رہا کہ کس طرح سب سے پہلے تمام اہل خانہ اور خاندان کے بزرگوں سمیت عمرہ ادا کروں گا، پھر کوئی مناسب سا مکان خریدوں گا، والدین کا علاج کرواؤں گا، کسی اچھی سی لوکیشن پر دکان خرید کر سکون سے

دکانداری شروع کردوں گا۔

☆☆☆

اس کے بعد وقتاً فوقتاً مجھے راشد کے بارے میں یہ اطلاعات تو ملتی رہیں کہ اس نے عمرہ کرلیا، اس نے فلاں علاقے میں دکان خریدی ہے، لیکن اس کے بعد راشد سے براہ راست نہ تو کوئی رابطہ ہوا اور نہ ہی مزید اطلاعات ملیں، ہاں آج پھر تقریباً پندرہ سال بعد وہ مجھے جن حالات میں ملا مجھے ایک جھٹکا سا لگا کہ وہی راشد جس کا ایک کروڑ روپے کا نقد انعام نکلا آج پھر چند ہزار روپے ماہانہ کی نوکری کرنے پر مجبور ہے، آخر ایسا کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ یہ سب کیا ہے؟

اس میٹنگ کے فوراً بعد راشد نے مجھ سے میرا موبائل نمبر لیا اور وعدہ کیا شام کو رابطہ کر کے ملاقات کروں گا اور سب بتاؤں گا کہ کیا ہوا ہے۔

شام کو راشد نے فون کر کے میرے گھر کا پتا لیا اور کچھ ہی دیر میں میرے گھر آن پہنچا۔ آتے ہی بولا ، مجھے معلوم ہے سر! آپ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہے ہوں گے۔

میں نے کہا، ہاں بالکل لیکن پہلی شرط یہ ہے کہ تم مجھ کو سر کہہ کر نہ پکارو، تم اس وقت میرے گھر پر ہو، میرے وہی دوست ہو جو حالات کی وجہ سے پندرہ سال پہلے بچھڑ گیا تھا، اگر مجھے سر کہو گے تو وہ بے تکلفی نہیں ہوگی اور ہوسکتا ہے میرے عہدے کے احترام میں تم کچھ باتیں سنسر کر جاؤ جبکہ میں پوری کہانی سننا چاہتا ہوں کہ کروڑ روپے کے انعام کے بعد تم پھر اُسی حال میں کیسے پہنچے، کہ آج پھر تم چند ہزار ماہانہ کی نوکری پر مجبور ہو، کیا ہوا اس پلاننگ کا کہ کوئی دکان کھولوں گا، کوئی کاروبار کروں گا، بہت محنت کرلی اب ذرا آرام سے رزق کماؤں گا؟

راشد بولا ہاں میں اپنے ایک سچے دوست کی حیثیت سے ''تم'' کو سب بتاؤں گا، راشد کا ایک دم سے ''سر'' کی بجائے ''تم'' کہنا مجھے اچھا لگا کہ چلو تکلفات کی دیوار گری، اب یہ بے تکلفی سے سب کچھ بتا دے گا۔ راشد کہنے لگا کہ یہ تو سنا تھا دولت کا کمانا یا خوش قسمتی سے آجانا تو آسان سی بات ہے لیکن اصل کمال آئی دولت کو سنبھالنا ہے، مجھے اعتراف ہے کہ میں اس فن سے بے بہرہ نکلا۔ ٹیکس کاٹ کر مجھے کل نوّے لاکھ روپے ملے تھے، تمہیں تو معلوم ہی ہے اُس زمانے میں میری آمدنی تنخواہ اور کمیشن وغیرہ ملا کر سولہ سے بیس ہزار ماہانہ بنتی تھی، اگر ہم اوسطاً اٹھارہ ہزار ماہانہ بھی رکھ لیں تو یوں سمجھو تقریباً دولاکھ پندرہ ہزار سالانہ گویا مجھے تقریباً بیالیس سال کی آمدنی یکمشت مل گئی، اتنی رقم اکٹھا مل جانے کے بعد میرا وہی حال ہوا جو تین دن کے فاقہ زدہ انسان کے سامنے ایک دم کھانا آجانے کی صورت میں ہوتا ہے، پہلے اس کی فاقے سے موت کا خطرہ ہوتا ہے اور بعد میں وہ ہیضے سے مرجاتا ہے۔

سب سے پہلے تو تم کو معلوم ہی ہے اپنی اور اپنے گھر والوں کی سیکیورٹی کی وجہ سے اپنے تمام گھر والوں کے ہمراہ تقریباً تین ماہ دوسرے شہر میں بھیس بدل کر رہنا پڑا، ٹی وی تو میرے گھر میں پہلے بھی نہیں تھا اب مجھے ایسی جگہ رہنا تھا جہاں میرے بچے پڑوس میں بھی ٹی وی نہ دیکھ سکیں، کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ اگر میرے اپنے ہی بچوں نے مجھے ٹی وی کے اشتہار میں دیکھ لیا تو وہ کہیں محلے میں نہ بتانا شروع کردیں کہ یہ جس کو ایک کروڑ کا انعام ملا ہے یہ ہمارے ابا ہیں، بچوں کو اس خوشی کے پیچھے لاحق خطرے کا کیا پتا؟ بہرحال اس تین ماہ میں صحیح معنوں میں خود اختیاری جلاء وطنی پر میرے تقریباً دولاکھ روپے خرچ ہوگئے، مجھے اپنے بھائی کو بھی دوسرے علاقے میں مکان لے کر دینا پڑا کیونکہ وہاں کے محلے دار بھی تو مجھے پہچانتے تھے۔ اس کے بعد اپنے والدین اور ساس سسر کے ہمراہ پورے گھر کو لے کر پندرہ روزہ عمرے پر چلا گیا، اس پر تقریباً دس لاکھ خرچ ہوئے، واپس آکر اپنے لیے ایک مناسب سا مکان ڈھونڈ کر خرید لیا تاکہ ساری عمر کی کرایہ داری سے جان چھوٹے ، مجھے وہ مکان تقریباً بیس لاکھ کا ملا۔ اس میں ضروری ساز و سامان ڈلوانے پر مزید تقریباً تین لاکھ روپے خرچ ہوگئے۔ اپنی خوشیوں میں شریک کرنے کی خاطر اپنے بھائی کو بھی چار پانچ لاکھ روپے تحفتاً دے دیے، آخر اس نے بھی تو میری سیکیورٹی کی خاطر کچھ دن جلاء وطنی کاٹی تھی۔ یوں جب تقریباً چار ماہ بعد حساب کیا تو نوّے میں سے چالیس لاکھ روپے خرچ ہوچکے تھے اور ابھی باقاعدہ روزگار کا کوئی سلسلہ نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے بڑی سنجیدگی سے فوری طور پر ایک مناسب سی جگہ پر دکان ڈھونڈنی شروع کردی تقریباً مزید ایک ماہ میں بیس لاکھ کی دکان خریدی اور اس میں دس لاکھ کا سامان ڈال کر ایک اچھا سا کولڈ اسپاٹ کھول لیا کیونکہ یہی ایک ایسا کام سمجھ میں آیا تھا جو میں بچوں کے بڑے ہونے تک تنہا کرسکتا تھا۔ لیکن اب جو حساب کیا تو میرے پاس نوّے میں سے نقد صرف اٹھارہ لاکھ ہی بچے تھے، میں نے اس میں سے پانچ لاکھ کا زیور تمہاری بھابی کو بنوا دیا، اس بے چاری نے بھی

میری خاطر بہت فاقے برداشت کیے تھے۔
دکان تو میں نے اچھی موقع کی جگہ پر لی تھی اور سامان بھی اچھا ڈالا تھا نتیجہ یہ کہ دکانداری بھی اچھی چل نکلی۔ ایک روز دکان پر بیٹھا کہ ایک سیاسی جماعت کے کچھ لوگ آئے اور مجھ سے جلسے کے لیے پچاس ہزار کا مطالبہ کیا، رو پیٹ کر دس ہزار دے کر جان چھڑائی۔ کچھ دن بعد دوسری جماعت والے آئے اور انہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم ہے تم نے ہماری مخالف پارٹی کو دس ہزار کا چندہ دیا ہے اب ہم کم از کم پچیس ہزار لیں گے، شرافت سے دے دو ورنہ اپنی دکان کی خیر مناؤ، ہنگاموں میں دکان کو آگ لگ گئی تو کہاں شکایت کرو گے؟ بمشکل ان کو بھی پندرہ ہزار دے کر جان چھڑائی۔ اس کے بعد ایک مذہبی تنظیم کے لوگ آگئے، پانچ ہزار اُن کو بھی دینے پڑے۔ اصل میں میری دکان تھی تو موقع کی جگہ پر لیکن اس علاقے کی لوکیشن کچھ ایسی تھی کہ اس کے چاروں طرف چار مختلف پارٹیوں کا گڑھ تھا اور میں چکی کے ان چار پاٹوں کے بیچ پس رہا تھا۔ ایک ماہ بعد جب حساب کیا تو سارا خرچ نکال کر دکان سے صرف پچیس ہزار کی آمدنی ہوئی اور لاکھ روپے سے اوپر بھتے میں چلے گئے۔ اگلے ماہ پھر جب چندوں کی ڈیمانڈ آنی شروع ہوئی تو میں نے ان سب سے علیحدہ علیحدہ ماہانہ پانچ ہزار کا چندہ باندھ دیا اور شرط یہ تھی کہ اس کے علاوہ مجھ سے نہ تو کوئی الگ رقم مانگی جائے گی اور نہ ہی میری دکان کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔ یوں مہینے بعد جب حساب کیا تو دکان کے اخراجات نکال کر وہی پچیس ہزار کمائے جو اس ماہ کے چندوں کی صورت میں چلے گئے۔ میں یہ سوچ سوچ کر برداشت کرتا رہا کہ چلو آگے چل کر سیل میں کچھ اضافہ ہوگا تو منافع بھی شروع ہو جائے گا۔ اگلے چند ماہ بھی یہی صورتِ حال رہی کسی ماہ میں پانچ سات ہزار کا منافع ہوا بھی تو گھر کا خرچ پھر بھی پورا نہیں ہوا اور وہ انعامی رقم سے ہی پورا کرنا پڑتا۔ اب میں پریشان ہوتا جا رہا تھا۔
نوّے لاکھ میں سے دکان کی مالیت اور کاروباری رقم اور بیوی کے زیورات کے علاوہ محض سات لاکھ ہی بچے ہوئے تھے اور اکثر ان رشتہ داروں کی ناراضگی الگ سہنا پڑتی جو ایک کروڑ کے انعام کا سن کر پندرہ بیس لاکھ کا قرض مانگنے اس طرح آجاتے تھے جیسے وہ اپنا ہی دیا ہوا قرض واپس مانگ رہے ہوں۔ خواہ میری غربت کے زمانے میں دس سال تک میری خیریت بھی لینا گوارہ نہ کی ہو۔ تقریباً ایک سال تو اسی چکر میں گزر گیا کہ کسی مہینے تو اچھا بھلا منافع ہوا اور کسی مہینے گھر کا خرچ پورا کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن اب میں سیاسی جماعتوں کی ڈیمانڈ سے تنگ آتا جا رہا تھا، ماہانہ چندے کے علاوہ بھی ہر تیسرے چوتھے دن کوئی نہ کوئی گروپ میری دکان پر آتا، بوتلیں وغیرہ پیتا، کوئی آئسکریم کھا لیتا اور جاتے ہوئے اگر کسی نے احسان کیا تو ہزار روپے کا سامان کھا پی کر دو تین سو دیے اور احسان الگ جتلا دیا کہ مفت میں نہیں کھا رہے ہیں۔
تنگ آکر میں نے وہاں سے دکان ختم کر کے جب کسی سکون والی جگہ پر جانے کا سوچا تو پتا چلا جو دکان میں نے بیس لاکھ کی خریدی تھی اس کے اب پانچ لاکھ سے زیادہ دینے کو کوئی تیار نہیں ہے کیونکہ اس علاقے کی شہرت امن و امان کے حوالے سے بہت خراب ہو چکی تھی۔ کافی کوشش کے بعد میں نے وہ دکان جو مجھے سامان تیس لاکھ کی پڑی تھے وہیں کے ایک سیاسی کھڑپنچ کو سامان سمیت دس لاکھ میں دے دی۔ اس کے بعد دکانداری یا کسی بھی تجارت سے توبہ کی، سیدھے سیدھے وہ دس لاکھ روپے لے جا کر ایک بینک میں فکسڈ ڈپازٹ کروا دیے کہ بُرے وقت کا کیا پتا کب آجائے اس لیے کچھ تو بچت ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اور اب وہی اٹھارہ بیس ہزار کی نوکریاں کر رہا ہوں مکان چونکہ اپنا ہے اس لیے کرایہ سے جان بچی ہوئی ہے اور گھر کے ایک کمرے میں ایک چھوٹی سی دکان بنائی ہوئی جس میں بچوں کی گولیاں ٹافیاں رکھی ہوئی ہیں، وہ دکان میری بیوی کی نگرانی میں میرے چھوٹے بچے چلاتے ہیں جس سے گھر کا چھوٹا موٹا خرچ نکل آتا ہے، بڑے خرچے میری تنخواہ سے پورے ہو جاتے ہیں، بس یوں اللہ عزت کے ساتھ دن پورے کر رہا ہے۔
راشد کی یہ پوری داستان سننے کے بعد میں کچھ دیر تو مبہوت سا رہا پھر میں نے اُس سے صرف ایک ہی سوال کیا کہ راشد یہ بتاؤ تم نے اپنی انعام سے پہلے والی زندگی اور بعد والی زندگی میں کیا فرق محسوس کیا ہے؟
راشد بڑی بے بسی سے بولا۔ اب تک صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ اب مجھے ہر ماہ سیٹھ سے تین ہزار روپے قرض مانگ کر اگلی تنخواہ میں بیباق نہیں کروانا پڑتے ہیں، ورنہ پوری زندگی میں تقریباً صرف ایک سال کا پیریڈ ایسی آسودگی والا دیکھا جیسے طویل حبس کے بعد کچھ دیر کو ساون کے خوشگوار دن آئیں اور اس کے بعد پھر بھادوں کا حبس والا موسم آجائے۔

میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھی۔ گول چہرہ، بڑی بڑی پُرکشش آنکھیں، رنگت ایسی کہ جیسے میدے میں سرخی ملادی گئی ہو۔ جسم انتہائی متناسب، ریشمی سیاہ دراز زلفیں۔

''سبحان اللہ! کیا تم ہی گلناز ہو؟'' بے ساختہ میرے لبوں سے داد نکل گئی۔

ایک لمحے کے لیے گلناز کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام مسنون

میں سرگزشت کا قاری ہوں اور ہر ماہ دیکھتا ہوں کہ لوگ دوسروں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ میں نے بھی ہمت کرلی ہے کہ کہانی لکھوں لیکن یہ میری اپنی روداد نہیں ہے۔ میرے ایک پڑوسی کی ہے۔ ایک لڑکی نے کس طرح اس کی زندگی کو غموں سے بھر دیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

خالد باری

(کراچی)
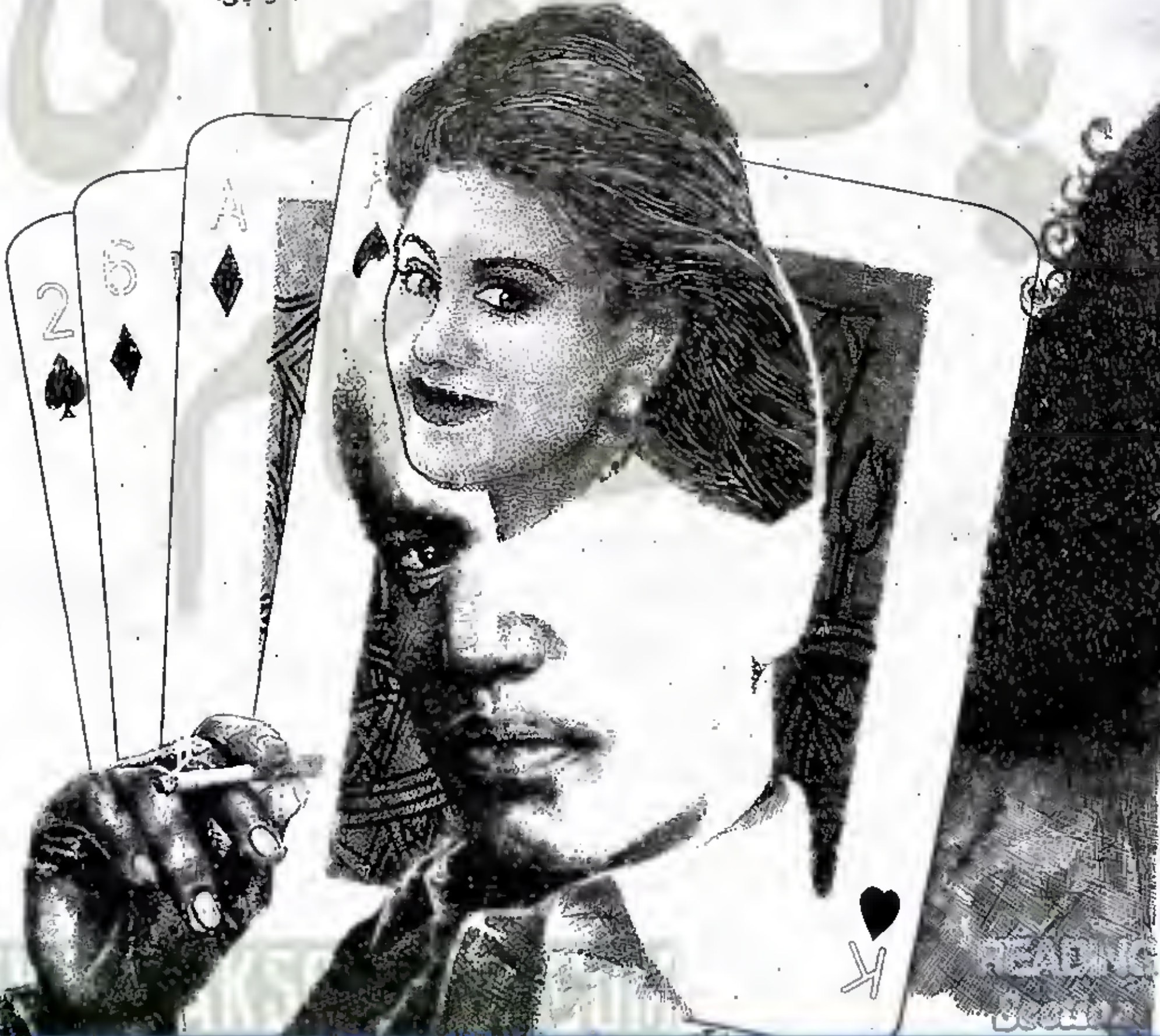
پلکیں حیا سے بوجھل نظر آنے لگیں۔ سانسوں کا زیروبم تیز ہو گیا۔ غالباً اسے اس تعریف کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ گویا کہہ رہی ہو کہ میں ہی گلناز ہوں۔ میرے علاوہ کوئی اور گلناز ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی اس کے نام کی مناسبت سے گلوں کو بھی اس پر ناز ہوگا۔

''اور...... آ...... آپ۔ غالباً حسن بھائی ہیں۔'' وہ ہکلائی۔

اس کے بھائی کہنے پر میرا دل بجھ سا گیا۔ پھر میں نے خود کو تسلی دی۔ شروع میں تو سب ہی بھائی کہتی ہیں۔

میری عمر اس وقت چالیس سال تھی۔ جب کہ گلناز نے ابھی سولہویں سال میں قدم رکھا تھا۔ عمر کا ایک طویل حصہ میں نے آئیڈیل کی تلاش میں ضائع کر دیا تھا مگر میں نے گلناز کو دیکھا تو دل مچل گیا۔ ''ہاں یہی تو ہے وہ لڑکی جس کی تلاش میں، میں تھا۔''

☆......☆

پچھلے دنوں ہماری ایک رشتے دار خاتون نے میری امی کو اطلاع دی تھی۔ ''اے بہن! کیا اپنے اکلوتے بیٹے کو بوڑھا کر دو گی۔ صلو کی بیٹی گلناز بھی تو جوان ہو گئی ہے۔ ماشاء اللہ کیا رنگ روپ نکالا ہے۔ مجھے اُمید ہے یہ لڑکی تمہارے بیٹے کو ضرور پسند آ جائے گی۔''

''کیا سہیل کی بیٹی! وہ غربت کے مارے لوگ جن کی شکلوں پر بھی پھٹکار برستی ہے۔ حسن کے ابا تو ان لوگوں سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔'' امی نے کہا۔ ''شاید ان دونوں کی آپس میں کوئی ناچاقی بھی تھی۔''

''بہن! حسن کے ابا کو گزرے دو سال ہو گئے اور پچھلے مہینے گلناز کے والد بھی چل بسے۔ بس سمجھ لو وہ جھگڑا ان دونوں کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔'' انہوں نے امی کو سمجھایا مگر امی راضی نہیں ہو رہی تھیں۔ میں نے ہی اسے ایک نظر دیکھ لینے کے لیے امی کو راضی کیا مگر انہوں نے ان کے یہاں خود جانا پسند نہیں کیا۔ ہاں، مجھے تایا سہیل کے چہلم میں شرکت کے بہانے بھیج دیا۔

گلناز کے ابو تایا سہیل میرے والد صاحب کے چچا زاد بھائی تھے۔ گلناز کی والدہ کا نام صالحہ تھا لیکن صلو سے زیادہ مشہور تھیں۔ یہ لوگ حیدرآباد میں رہتے تھے۔ گلناز کو ایک نظر دیکھنے میں بھی حیدرآباد آ گیا تھا اور اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔

☆......☆

گلناز نے میرے پیچھے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ شاید امی بھی میرے ہمراہ ہوں گی۔

''مابدولت اس دنیا میں تنہا آئے ہیں۔ تنہا ہی جانا ہے تو میں نے سوچا تمہارے یہاں بھی تنہا ہی آیا جائے۔ کیا گھر کے اندر داخل ہونے کے لیے ویزا لینا پڑے گا۔'' میں نے شوخی سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''مم معاف...... کیجیے گا۔ آیئے۔'' اس نے خجل ہو کر ایک طرف ہٹتے ہوئے مجھے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

گھر کے کونے کونے سے غربت ٹپک رہی تھی۔ چھوٹا سا صحن عبور کر کے جب ہم کھنڈر نما کمرے میں پہنچے تو وہاں تائی اماں میری منتظر تھیں۔ میرے سلام کے جواب کے ساتھ انہوں نے بمشکل تمام اٹھ کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ وہ لوگ محبت کو ترسے ہوئے تھے۔ اسی لیے میرے خلوص و محبت کی پذیرائی حد سے زیادہ کر رہے تھے۔ تائی اماں تو مجھ پر صدقے واری جا رہی تھیں۔

تایا سہیل کا بیٹا انور اپنے ماموں کے یہاں رہتا تھا۔ انہوں نے ہی.... اس کی پڑھائی کے اخراجات برداشت کیے تھے۔ تایا کی محدود آمدنی میں بے چاری گلناز نے کسی نہ کسی طرح میٹرک کر لیا تھا۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر اس کے ابو کے انتقال کی وجہ سے اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اب انہیں تایا سہیل کی پنشن پر گزارہ کرنا تھا۔

میں نے تائی صلو کی خوب دلجوئی کی۔ گلناز کے ساتھ بھی خوب وقت گزر رہا تھا۔ میں نے اپنی [illegible] کے قصے خوب بڑھا چڑھا کر سنائے۔

چہلم وہ لوگ انتہائی سادگی سے کرنا چاہتے تھے مگر میں نے ضد کر کے اعلیٰ پیمانے پر چہلم کیا۔ گلناز میری اس محبت و اپنائیت پر بہت خوش تھی۔ چہلم کے موقع پر انور سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے شک کی نظر سے دیکھا۔ طعنہ بھی دیا کہ خیریت تو ہے اب ہم غریبوں کی یاد کیسے آ گئی۔

تائی صلو نے اسے ڈانٹا۔ گلناز نے غصے سے گھورا۔ انور کو میرا اس اعلیٰ پیمانے پر چہلم کرنا سخت ناگوار گزرا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ میں نے ان لوگوں کی غربت کا مذاق اڑایا ہے۔ ہماری جتنی چادر ہے اتنے ہی پیر پھیلانے چاہئیں۔ چہلم گزار کر وہ اپنے ماموں کے ساتھ واپس چلا گیا۔

''مجھے انور بھائی زہر لگتے ہیں۔ انہوں نے خود بھی تو

اپنے بہتر مستقبل کی خاطر ہمیں فراموش کر دیا۔ وہ ماموں جو کہ بینک آفیسر ہیں ان کے یہاں عیش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ چاہیں تو ہر ہفتے ہم لوگوں سے ملنے کے لیے آسکتے ہیں مگر مہینوں بعد ملنے آتے ہیں اور ماموں بھی انور پر کوئی احسان نہیں کر رہے۔ دراصل ان کی صرف تین بیٹیاں ہیں دو کی وہ شادی کر چکے اب تیسری کے لیے انہیں گھر داماد چاہیے۔ اگر تیسری بیٹی کو بھی رخصت کر دیا تو ان کا گھر سونا سونا ہو جانا ہے۔ امی نے بھی اپنا اکلوتا بیٹا اسی لیے قربان کر دیا کہ یہاں مستقبل تاریک تھا۔'' گلناز جو بھائی سے ویسے ہی جلی ہوئی تھی اس نے دل کی بھڑاس نکالی۔

چہلم کے بعد جب میں نے واپسی کا قصد کیا تو رزلٹ میری توقع سے بڑھ کر تھا۔ اپنے حسن اخلاق، خلوص اور خوش گفتاری سے میں تائی صلو کو شیشے میں اتار چکا تھا۔ گلناز بھی میری دولت، خلوص و محبت سے پوری طرح متاثر تھی۔ اب یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے وابستہ ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی یا محض اس نے مجھے دوست کا درجہ دیا تھا۔

ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے سگے بھائی کے رویے سے سخت دلبرداشتہ تھی۔ کہیں اس بے وقوف نے مجھے سگے بھائی کا درجہ تو نہیں دے دیا۔ اس بات کا تصور ہی میرے لیے بڑا ہولناک تھا۔ جو رشتہ ہم دونوں کے مابین قائم ہوا تھا اس کی نوعیت معلوم کرنا اشد ضروری تھا۔ اس دوران کئی بار مواقع بھی ملے مگر کوششوں کے باوجود اظہارِ عشق نہ کر سکا لیکن واپسی سے قبل اظہارِ مدعا ضروری تھا۔ اگر میں اس کے بغیر امی کو بھیجتا اور انکار ہو جاتا تو امی میری جان عذاب کر دیتیں۔ سب سے پہلے میں نے تائی صلو کو کریدا۔

''تائی اماں! ماشاء اللہ گلناز بڑی ہی پیاری بچی ہے اگر ہم لوگ اس کے رشتے کے سلسلے میں کوشش کریں تو آپ کی ڈیمانڈ کیا ہیں۔''

وہ تذبذب میں پڑ گئیں۔ ''بیٹا! بس لڑکا کھاتا پیتا ہو اور اس کا اپنا گھر ہو۔''

''لڑکے کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ عمر کیا ہونی چاہیے؟''

''پچیس سال سے کم نہ ہو اور چالیس سال سے زیادہ نہ ہو۔'' انہوں نے بغور میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ خود مجھے اس معیار پر پرکھ رہی ہوں۔ ان کا جواب حوصلہ افزا تھا۔ میں نے ایک معرکہ سر کر لیا تھا اور دوسرے معرکے کے لیے کچھ جرأت پیدا ہوگئی تھی۔

آج میری روانگی تھی۔ تائی صلو بستر پر لیٹی تھیں۔ گلناز کچن میں مصروف تھی۔ اچھا موقع تھا میں فوراً کچن میں جا دھمکا۔

''دل تو نہیں چاہتا یہاں سے جانے کو مگر جانا تو ہے۔ بائی داوے، ایک بات پوچھنی ہے تم سے۔ کیا تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟''

گلناز شرم سے گلنار ہوگئی۔ اس نے انکار میں سر ہلایا اور شرماتے ہوئے اپنا چاند سا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

''ارے...... ارے! محترمہ اس سوال میں شرم کیسی، شرم تو شاید میرے اگلے سوال پر آنی چاہیے۔ میں تمہیں یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ مابدولت کو ایک لڑکی سے پیار ہو گیا ہے لیکن میں اس سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے ڈر رہا ہوں۔ لیکن تم میری یہ مشکل آسان کر سکتی ہو۔ وہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ اتفاق سے تمہاری ہی ہم عمر ہو گی۔''

گلناز نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''اب میں یہ چاہتا ہوں کہ فرض کر لو اس لڑکی کی جگہ تم ہوتیں اور میں تم سے اظہارِ محبت کرتا تو تمہارا جواب کیا ہوتا۔ انکار میں یا اقرار میں۔''

شرم و حیا کی زیادتی سے اس کی نگاہیں فرش پر گڑ گئیں۔ وہ اپنے دوپٹے کے پلو کو خوامخواہ اپنی انگلی پر بل دینے لگی اور کچن سے نکلنے کی کوشش کی۔

''ڈیئر! ہم صرف فرض کر رہے ہیں۔'' میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''جب تک تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گی میں تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔''

اس نے ہامی میں سر ہلایا اور نگاہیں چراتی ہوئی کچن سے نکل گئی۔ مجھے کسی حد تک جواب مل گیا تھا۔ یہاں گزارے ہوئے شب و روز میری زندگی کے یادگار دن تھے۔ میں گلناز کو گھر اور آفس کے فون نمبر دے آیا۔

☆......☆

ایک ماہ تک میں نے کسی نہ کسی طرح صبر کیا پھر امی کو رشتے کے لیے بھیجا۔ چند دن بعد امی کا فون پر یہ انکشاف میرے لیے سوہانِ روح بن گیا کہ تائی اماں تو راضی تھیں مگر ان کے تمام رشتے داروں نے اس رشتے کی مخالفت کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لڑکی کی عمر بہت کم ہے۔ باپ کی عمر

کے شخص سے اس کی شادی مناسب نہیں۔ اس بوڑھے سے شادی کردی تو وہ جلد ہی مر مرا جائے گا اور گلناز بیوہ ہوکو گھر بیٹھ جائے گی۔

گلناز کے ماموں نے تو انتہا کردی۔ یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ان لوگوں سے ملنا جلنا ختم کردے گا۔ گلناز کا بھائی بھی کچھ کم نہ تھا۔ اس نے بھی آسمان سر پر اٹھالیا۔ امی تو خود بقول ان کے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ لہٰذا وہ خوشی خوشی گھر لوٹ آئیں۔

اس انکار سے میں حد درجہ دلبرداشتہ ہوگیا۔ جینے کی امنگ ختم ہوگئی۔ دنیا میرے لیے جہنم سے کم نہیں تھی۔ میں نے فیکٹری کی مصروفیات سے بھی لاتعلقی اختیار کرلی۔ امی نے مجھے لاکھ سمجھایا کہ رشتے تو آسمانوں پر بنتے ہیں جب خدا ہی کو منظور نہیں تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ بیٹا میں تیرے لیے چند دن میں گلناز سے زیادہ خوب صورت لڑکی تلاش کرلوں گی۔ دو ٹکے کی عورت صلو خود کو سمجھتی کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

''امی کان کھول کر سن لیں۔ میری شادی اگر ہوگی تو گلناز سے ہی ہوگی۔ ورنہ میرا اٹل فیصلہ ہے کہ میں تمام عمر شادی نہیں کروں گا۔'' میری دھمکی نے امی کے ہوش اڑا دیے۔

مجھے گلناز سے موہوم سی اُمید تھی۔ اسی لیے آخری کوشش کے طور پر حیدرآباد جانے کا فیصلہ کرلیا۔

میں گھر سے فیکٹری جانے کا بہانہ کرکے نکلا حیدرآباد پہنچ گیا جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ خطرہ موجود تھا کہ تائی صلو مجھے دیکھتے ہی چراغ پا ہوجائیں گی اور مجھے دروازے ہی سے لوٹنا پڑے گا۔

دروازہ گلناز نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ پھر مسکرائی اور پُرمسرت لہجے میں بولی۔ ''ارے! احسن صاحب آپ آیئے اندر تشریف لایئے۔''

تائی صلو بھی بڑے تپاک سے ملیں۔ میری اس طرح پذیرائی بالکل غیر متوقع تھی۔ میں تائی اماں کے برابر میں پلنگ پر ہی بیٹھ گیا۔ گلناز چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی تو تائی اماں نے کہا۔ ''بیٹا! مجھے تو گلناز کے ساتھ تمہارے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ گو کہ تمام رشتے داروں نے مخالفت کی تھی۔ میرے بھائی نے بھی عمر کے بہت زیادہ فرق پر ہنگامہ کھڑا کیا تھا مگر وہ میرا سگا بھائی ہے میں نے اسے کسی نہ کسی طور پر منا ہی لیا لیکن تمہاری امی کا رویہ شروع ہی سے انتہائی ہتک آمیز تھا۔ انہوں نے رشتہ بھی اس انداز میں مانگا تھا کہ جیسے قرض دینے والا اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ پھر انہوں نے رشتہ داروں کی مخالفت کو بنیاد بنا کر ہمیں لعن طعن کرنا شروع کردیا۔'' انہوں نے ایک سرد آہ بھری اور گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

شاید کوئی ایسی بات تھی جسے بتانا ان کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ میرے اصرار پر خدا خدا کرکے انہوں نے لب کھولے۔ ''بیٹا! پھر انہوں نے میری معصوم بچی پر ایک ایسا بے ہودہ الزام لگایا جسے کوئی بھی شریف آدمی برداشت نہیں کرسکتا۔ انہوں نے فرمایا کہ میری بچی نے اپنے ناز و انداز سے تمہیں پھانس لیا ہے۔ میں نے اس پر سخت احتجاج کیا کہ میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے پیسے پر، مجھے تو اپنی بچی کی خوشی چاہیے۔ خدا کے لیے تم بچوں کی خوشیوں میں رکاوٹ مت ڈالو'' تو وہ بولی۔ ''تمہارے رشتے داروں نے میری توہین کی ہے۔ اگر تم نے میرے بیٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی یا کسی ذریعے سے یہ سب باتیں اس تک پہنچائیں تو تمہاری گلناز کو اتنا بدنام کروں گی کہ تم دونوں ماں بیٹی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ تو بیٹا! تمہاری امی کی ان دھمکیوں کے بعد ہمارا چپ سادھ لینا ہی بہتر تھا۔ ان حالات میں خود بھی میں اپنی بچی کو اس جہنم میں جھونکنا پسند نہیں کروں گی۔''

تائی صلو کے اس انکشاف پر میرے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ماں جس کے پیروں تلے جنت ہوتی ہے اس طرح اپنے اکلوتے بیٹے کی مسرتوں کا گلا گھونٹ دے گی جب کہ میں نے ان پر واضح کردیا تھا کہ اگر میری شادی ہوگی تو صرف گلناز سے ورنہ تمام عمر شادی نہیں کروں گا۔ ان کی اس بے حسی نے مجھے بغاوت پر مجبور کردیا۔ ''تائی اماں! اگر گلناز راضی ہے اور آپ کی بھی رضامندی ہو تو میں ابھی اور اسی وقت شادی کے لیے تیار ہوں۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں ہر طرح سے گلناز کو خوش رکھوں گا۔ اگر یہ امی کے عتاب کا نشانہ بنی تو اسے الگ گھر لے کر دوں گا اور بھی کسی طرح کی ضمانت چاہتی ہیں تو وہ بھی دینے کے لیے تیار ہوں۔'' میرے فیصلے پر تائی صلو ششدر رہ گئیں۔

پہلے انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ میرا فیصلہ اٹل پا کر انہوں نے فوراً اپنے بھائی بھابی اور بیٹے کو بلالیا۔ بھائی سے مشورہ کرنے کے بعد ہمارا فوری طور پر نکاح ہو

گیا۔ گلناز کے ماموں نے گیارہ لاکھ حق مہر رکھوایا جو میں نے بلاحیل و حجت کے قبول کرلیا۔ گلناز مختصر سے جہیز کے ساتھ رخصت ہوکر اسی دن میرے گھر آگئی۔ گلناز کی ممانی ساتھ آئی تھیں۔ آنے والے کٹھن حالات مجھے مضطرب کیے ہوئے تھے۔

امی کے لیے میرا یہ عمل ناقابلِ برداشت تھا۔ انہوں نے ایک طوفان کھڑا کردیا۔ گلناز کی ممانی نے بھی ترکی بہ ترکی ان کے ہر الزام کا جواب دیا۔ جس پر امی مزید بھڑک اٹھیں مگر جب میں نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی تو ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

امی نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ اب یہ علم نہیں تھا کہ یہ سمجھوتا عارضی تھا یا مستقل یا پھر وہ گلناز کے خلاف کسی سازش کی منصوبہ بندی کررہی تھیں۔ پھر بھی ان کا رویہ گلناز کے ساتھ نہ بہت اچھا تھا اور نہ ہی بہت برا۔ وہ اس سے غیر ضروری بات نہیں کرتی تھیں۔ گلناز ان کا سر یا پیر دبانا چاہتی تو وہ اسے اس قسم کی خدمت سے روک دیتیں۔

گلناز نے میرے زندگی کو گل و گلزار بنا دیا تھا۔ وہ میری زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ وہ ایک سگھڑ لڑکی تھی۔ اس نے گھر کا انتظام جس خوبی سے سنبھالا سبھی اس کے سگھڑاپے کی تعریف کرتے تھے۔ سب سے بڑا کارنامہ اس نے یہ انجام دیا کہ انتہائی مختصر عرصے میں اپنی فہم و فراست اور حسن اخلاق سے امی کا دل جیت لیا۔ اب وہ اپنی بہو کی گرویدہ ہوچکی تھیں۔

”حسن بیٹے! واقعی تیرا انتخاب صحیح تھا۔ اتنی کم سن حسین اور خوش اخلاق لڑکی ڈھونڈنا میرے لیے تو ممکن نہیں تھا۔ اس سلسلے میں تم سے جو نافرمانی ہوئی میں نے اس پر تمہیں معاف کیا۔“

امی کا اعتراف میرے لیے سکون و اطمینان کا باعث بنا۔ پھر زندگی کے ماہ و سال تیزی سے بیتنے لگے۔ جب ہر طرف خوشیوں کے شادیانے بج رہے ہوں، محبت کا دریا بہہ رہا ہو، سکونِ قلب کا سمندر موجزن ہو تو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ پلک جھپکتے ہی پانچ سال بیت گئے۔

اچانک ہماری محبت بھری زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ اس دوران ہماری زندگی میں جو ہلکی سی خلش پیدا ہوئی وہ اولاد کے سلسلے میں تھی۔ دو سال تک تو ہم نے کوئی پروا ہی نہیں کی۔ تیسرے سال ہم دونوں ہی نے اپنا اپنا چیک اپ کروایا۔ دونوں ہی خدا کے فضل و کرم سے فٹ تھے۔ اس اطمینان کے بعد ہم لوگ رضائے الٰہی پر شاکر ہوگئے۔ کہ جب خدا کو منظور ہوگا اولاد بھی ہوجائے گی۔

مگر پانچ سال بعد جب گلناز اپنی والدہ کے یہاں ایک ہفتے کے لیے گئی تو جاتے وقت بڑی خوش و خرم تھی لیکن واپسی پر اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔

”خیریت تو ہے۔ یہ مزاج گلناز کیوں بدلے بدلے سے ہیں۔ نصیب دشمناں کس نے ہماری گلناز کے نازک جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔“

”جذبات کو ٹھیس آپ ہی نے پہنچائی ہے۔“ اس کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

پہلی مرتبہ اس کا یہ لہجہ میرے حواس منتشر کرنے لگا۔ میں نے وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھا تو وہ نفرت سے منہ پھیر کر کمرے میں چلی گئی۔ شکر ہے امی نے گلناز کا یہ جملہ نہیں سنا۔ وہ اس وقت نوکر کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔ اس کے بعد تو گلناز نے چپ کا روزہ رکھ لیا۔

کمرے میں آکر میں نے گلناز کو بہت کریدا کہ آخر اصل بات کیا ہے مگر اس کے لب گویا کسی نے سی دیے تھے۔ اکثر کچھ کینہ پرور رشتے دار گلناز کو یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ ہم تو سمجھے تھے کہ تم کنواری ہو۔ یہ تمہارا شوہر تو کہیں سے بھی نہیں لگتا۔ بیٹی تمہاری تو قسمت ہی پھوٹ گئی، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے سوچا یقیناً ایسی ہی کوئی بات ہوگی۔ وقتی غصہ ہے چند دن میں اس کا مزاج اعتدال پر آجائے گا مگر جب ایک ہفتہ گزر گیا اور گلناز نے چپ کا روزہ نہیں توڑا تو مجھے تشویش لاحق ہوئی۔

خدا خدا کرکے میری سر توڑ کوششوں کے بعد اس نے منہ کھولا مگر اس کے لبوں سے یہ زہریلے جملے سن کر یوں لگا گویا کسی نے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں ڈال دیا ہو۔ ”حسن صاحب! آپ نے مجھے دھوکا دیا۔ اب ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ کبھی بھی قائم نہیں ہوسکتا لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ مجھے طلاق دے دیں۔“

میرے دل و دماغ میں ایک ہیجان سا برپا ہوگیا۔ طلاق کا لفظ ہتھوڑا بن کر میرے وجود کو چکنا چور کررہا تھا۔

”تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا۔ مذاق میں بھی تمہیں ایسی بات لبوں سے نہیں نکالنی چاہیے۔“ میرے لہجے میں حیرت کے ساتھ یاسیت اتر آئی۔

پھر اس کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ مجھ سے لپٹتی ہوئی بولی۔

''دیکھا حسن! میں نے تمہیں کیسا اُلو بنایا۔ ہاں یہ مذاق ہی تو تھا۔''

میری جان میں جان آئی۔ میں نے فرطِ محبت میں اس کو بھینچ لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''خدا کے لیے آیندہ ایسا سنگین مذاق مت کرنا۔ غضب خدا کا، میری تو جان ہی نکل جاتی۔''

امی، ماموں کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ کل شام تک ان کی واپسی متوقع تھی۔ وہ رات بھی ہماری زندگی کی حسین رات تھی۔ گلناز کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کا مذاق بہت سنگین تھا۔ اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی محبت اور خود سپردگی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

اگلے روز میں فیکٹری کے لیے روانہ ہوا تو الوداعی پیار کر کے خوشی خوشی اس نے مجھے رخصت کیا اور جلدی آنے کی تاکید کی۔ فیکٹری پہنچ کر میں نے گلناز کو ہمیشہ کی طرح فون کیا تو وہ محبت سے سرشار تھی۔ اس کا پیار بھرا لہجہ، خلوص سے لبریز باتیں گویا اس کا انداز ہی نرالا تھا۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

وقت سے کچھ پہلے سر شام گھر پہنچا تو دروازہ لاک تھا۔ دوسری چابی میرے پاس ہوتی تھی۔ میں اطمینان سے لاک کھول کر اندر داخل ہوا اور چونک پڑا گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ گھر میں ڈاکا پڑا ہے۔ میں نے گھبرا کر جائزہ لیا۔ سامان بکھرا پڑا تھا۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ چیک کیا تو زیورات اور نقدی تقریباً دو لاکھ روپے جو ہم آڑے وقت کے لیے رکھتے تھے غائب تھی۔ شادی کی ویڈیو، گلناز کے تمام قیمتی کپڑے بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ اور قیمتی اشیاء غائب تھیں۔ معاملہ تشویش ناک اور الجھا ہوا تھا۔

اگر یہ ڈاکا تھا تو ڈاکو لوٹ مار کر کے گھر کو باہر سے تالا کیوں لگا گئے اور پھر گلناز کا گھر سے غائب ہو جانا بھی اچنبھے کی بات تھی۔ پڑوسیوں سے جو بات معلوم ہوئی اس نے مزید میرے ہوش اڑا دیے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے جانے کے ایک گھنٹے بعد گلناز کا بھائی آیا اور عجلت میں سامان پیک کر کے گلناز کو لے گیا۔ پڑوسیوں کے استفسار پر صرف اتنا بتایا کہ ان کی والدہ کی حالت اچانک خراب ہو گئی ہے۔

میں نے موبائل پر رابطہ کیا تو وہ مسلسل آف جا رہا تھا۔ گلناز کے ماموں کا فون بھی ڈیڈ تھا۔ حالات و واقعات سے خطرے کی بُو آ رہی تھی۔ یقیناً یہی بات سچ ہو گی کہ

اچانک گلناز کی والدہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے، میں نے دل کو تسلی دی مگر اندیشے میرے وجود کے گرد کسی مکڑی کے جالے کی طرح لپٹتے جا رہے تھے۔ طبیعت خراب ہونے کی صورت میں نقدی اور قیمتی سامان لے جانے کی کیا تک تھی۔

رات کو امی واپس آ گئیں۔ جب اس سنگین صورتِ حال سے میں نے انہیں باخبر کیا تو مجھے محسوس ہوا جیسے ان کے چہرے پر اطمینان چھا گیا ہو مگر دوسرے ہی لمحے ان کا چہرہ فکر و تشویش سے متغیر ہو گیا۔ شاید میرا دل رکھنے کے لیے یہ تغیر برپا کیا گیا۔

''امی! اگر کل تک ان لوگوں سے ٹیلی فونک رابطہ نہ ہو سکا تو مجھے فوری طور پر حیدرآباد جانا ہو گا۔ نہ جانے وہ لوگ کس مصیبت میں مبتلا ہیں۔'' میرے لہجے میں گہری تشویش تھی۔

قدرے تذبذب کے بعد امی نے اجازت دے دی۔ وہ رات میرے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ بستر میں گویا کسی نے کانٹے بھر دیے تھے۔ کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ کان ٹیلی فون کی گھنٹی کے منتظر تھے۔ ایک موہوم سی اُمید تھی کہ گلناز جس افراتفری میں گئی ہے ویسے ہی واپس آ جائے گی مگر تمام تر توقعات فجر کی اذان کے ساتھ ہی دم توڑ گئیں۔ میں نے حسبِ معمول فجر کی نماز باجماعت ادا کی اور امی کو آگاہ کر کے پہلی بس سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گیا۔

حیدرآباد پہنچ کر دل میں اندیشوں کا طوفان لیے میں نے مضطربانہ بیل بجائی۔ دروازہ تائی صلو نے کھولا۔ گھر میں خلافِ توقع انور اور گلناز کے ماموں بھی موجود تھے۔ سب کا رویہ یکسر بدلا ہوا تھا لیکن گلناز نظر نہیں آ رہی تھی۔ تائی صلو خیریت سے تھیں اس لیے اندیشوں کا طوفان تھم گیا۔

سب مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ انور کی نظروں میں تو میرے لیے شدید نفرت تھی۔

''گلناز کہاں ہے؟ میں اسے لینے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''دھوکے باز بڈھے وہ تیری پہنچ سے بہت دور ہے۔ اب وہ تیری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ اسے فوری طور پر طلاق چاہیے۔ یقین نہیں آتا تو اس کا لکھا ہوا یہ خط پڑھ لے۔'' اس نے غضب ناک انداز میں ایک پرچا بڑھایا۔

میں نے مضطربانہ اسے اٹھایا اور دھڑکتے دل کے

ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ تحریر گلناز ہی کی تھی لکھا تھا۔

''حسن صاحب!''

محبت تو مجھے آپ سے کبھی تھی ہی نہیں۔ بس دولت کی چکا چوند اور میری محرومی نے مجھے اندھا کر دیا تھا مگر اولاد کے نہ ہونے سے مجھے یہ دولت بھی اپنے ہاتھ سے جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر ہم دونوں کی مثبت رپورٹ نے اُمید دلائی اور مزید دو سال اسی اُمید پر گزر گئے۔

مگر پچھلے دنوں جب میں حیدرآباد آئی اور طبیعت خراب ہونے پر قریبی کلینک پر گئی جو نیا نیا کھلا تھا تو آپ کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔ آپ نے مجھ سے صریحاً دھوکا کیا تھا۔ اعتماد کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ اب میں آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔

دراصل یہ وہی ڈاکٹر تھا جس کے ذریعے آپ کی مثبت رپورٹ ملی تھی۔ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس نے وہ لیبارٹری چھوڑ دی تھی اور حیدرآباد میں اپنا ذاتی کلینک کھول لیا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ آپ مکمل طور پر بانجھ ہیں۔ علاج بھی ممکن نہیں۔ آپ نے اس ڈاکٹر کو رشوت دے کر اپنے حق میں جعلی رپورٹ حاصل کی تھی۔ وہ اصلی رپورٹ اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔

اس انکشاف پر میں لرز کر رہ گئی۔ اب جو رہی سہی محبت شادی کے بعد پیدا ہوئی تھی وہ بھی نفرت میں بدل گئی ہے۔ میں آپ جیسے فریبی کے ساتھ زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا مجھے فوری طور پر طلاق چاہیے۔

فقط: گلناز

خط پڑھ کر مجھ پر ایک ہیجان سا طاری ہو گیا۔ گلناز جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا تھا اس نے زہریلے لفظوں کے خنجر میرے دل میں اتار دیے تھے اور ستم تو یہ کہ میں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس ڈاکٹر نے جھوٹ کیوں بولا۔ رپورٹ صحیح اور مثبت ہی تھی۔ مجھے رشوت دے کر بدلوانے کی ضرورت نہیں تھی۔

''وہ ڈاکٹر جھوٹا ہے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر حلفیہ کہتا ہوں کہ میں نے نہ اس ڈاکٹر کو رشوت دی نہ رپورٹ بدلوائی۔ آپ لوگ چاہیں تو میں آپ لوگوں کی تجویز کردہ لیبارٹری سے دوبارہ ٹیسٹ کروانے کے لیے تیار ہوں۔'' میں چلایا۔

''چور کبھی خود کو چور نہیں کہتا۔ بس ہمیں اب تمہارا اعتبار نہیں رہا۔ لہٰذا شرافت سے طلاق دے دو۔ ورنہ ہمیں ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالنا پڑے گا۔'' ماموں نے دھمکی دی۔

''پلیز! مجھے ایک مرتبہ گلناز سے ملنے تو دیں۔ میں اسے اس جھوٹے ڈاکٹر کے روبرو لے جا کر آپ لوگوں کی موجودگی میں اس جھوٹ کا پول کھولنا چاہتا ہوں۔'' میں نے التجا کی۔

''چلو پہلے تم اس ڈاکٹر کو جھوٹا ثابت کر دو۔ پھر گلناز سے ملاقات بھی کرا دیں گے۔'' ماموں قدرے دھیمے لہجے میں بولے۔

مگر یہ میری بدقسمتی تھی کہ وہ ڈاکٹر اپنی بات پر اڑا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے جھوٹا حلف بھی اٹھا لیا۔ نہ جانے وہ بدبخت ڈاکٹر میرا دشمن کیوں بن گیا تھا۔ پھر بھی میں نے اصرار کیا کہ کم از کم فون پر ہی میرا گلناز سے رابطہ کرا دیں۔ گھر آ کر انہوں نے نمبر ملایا اور ریسیور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''ہیلو گلناز! خدا کے لیے جلد بازی میں کوئی غلط قدم مت اٹھانا جس پر تمہیں ہمیشہ پچھتانا پڑے۔ میں جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گا۔ حلفیہ کہتا ہوں کہ رپورٹ بالکل درست تھی۔ میں نے اس ڈاکٹر کو کوئی رشوت نہیں دی۔ خدا کی قسم وہ ڈاکٹر جھوٹا ہے۔'' میں تقریباً رو پڑا۔

انور نے ریسیور میرے ہاتھ سے چھین لیا اور بولا۔ ''گلناز! اس دغاباز کی باتوں میں مت آنا۔ ڈاکٹر بھی اپنے بیان پر اڑا ہوا ہے۔ اس نے بھی اپنی صداقت ثابت کرنے کے لیے حلف اٹھا لیا ہے۔ وہ بھی قسمیں کھا رہا ہے بس اب تم.....''

میں نے بھی ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور بولا۔ ''خدا کے لیے گلناز! میری زبان کا اعتبار کرو۔ ڈاکٹر واقعی جھوٹا ہے۔ نامعلوم وہ کیا گیم کھیل رہا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ بہرحال میں تم سے سچی اور بے لوث محبت کرتا ہوں۔ اولاد بھی انشاء اللہ ہو ہی جائے گی اللہ سے ناامیدی گناہ ہے۔ اگر خدانخواستہ اولاد نہ بھی ہو سکی تب بھی میں اپنی تمام جائیداد تمہارے نام کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے خلوص نیت سے کہا۔

گلناز ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ پانسہ پلٹتے دیکھ کر اس مرتبہ ماموں نے ریسیور زبردستی میرے ہاتھ سے لے کر کہا۔ ''بیٹی۔ اس چالباز کی چالوں سے بچو اگر یہ سنجیدہ

ہے تو اس سے کہو کہ اولاد کے سلسلے میں اب مزید وقت ضائع نہ کرے اور آج ہی تمام جایداد تمہارے نام کردے اولاد ہوئی بھی تو ماں کی وراثت میں بھی تو اولاد ہی کا حق ہوتا ہے۔'' ماموں نے چال چلی اور ریسیور مجھے تھما دیا۔

''ہاں! ماموں کی یہ تجویز اچھی ہے۔ بولو تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ ہوگی تمہاری محبت کی اصل آزمائش۔'' گلناز بولی۔

گلناز کا ماموں بڑا کائیاں تھا۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ یہ خطرہ موجود تھا کہ دولت گلناز کے نام ہوتے ہی ہم دونوں ان لوگوں کی نظروں میں کھٹکنے لگتے اور وہ لوگ خود یا کرائے کے قاتلوں کے ذریعے ہمیں راستے سے ہٹا دیتے۔ لالچ بری بلا ہے۔

''مجھے افسوس ہے۔ یہ ممکن نہیں ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ میں اسٹامپ پیپر پر یہ لکھ کر رجسٹرڈ کرادوں کہ اگر اولاد نہ ہو سکی اور خدانخواستہ ای بھی اس دنیا میں نہ رہیں تو میری تمام جایداد گلناز کی ہوگی اور اس اسٹامپ پیپر ہی کو میری وصیت سمجھا جائے۔ اس صورت میں تم میری زندگی ہی میں میری تمام جایداد کی وارث ہو جاؤ گی۔ اسٹامپ پیپر پر میرا یہ عہد بھی ہوگا کہ میں تمام زندگی اس وصیت کو کینسل نہیں کرسکوں گا۔'' میں نے اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کی آخری کوشش کی۔

''یہ سب حیلے بہانے ہیں۔ جایداد فوراً میرے نام ٹرانسفر کردو ورنہ ثابت ہو جائے گا کہ تمہیں مجھ سے نہیں دولت سے محبت ہے اور ہاں کان کھول کر سن لو اگر تمہیں ماموں کی تجویز قبول نہیں تو دوسری صورت میں تم مجھے ابھی اور اسی وقت طلاق دے کر جاؤ گے۔ گلناز کے لہجے میں اتنی نفرت میرے لیے شدید حیرت کا باعث تھی۔ اسے کسی نے بہت سہانے خواب دکھائے تھے۔''

مجھے گلناز کے رویے سے گہرا صدمہ پہنچا۔ اب یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ وہ حد درجہ لالچی اور خود غرض تھی۔ اس کے باوجود میں گلناز کی محبت کو اپنے دل سے کھرچ نہیں پا رہا تھا۔

''تمہاری طویل خاموشی نے فیصلہ سنا دیا ہے۔ اب پلیز ریسیور ماموں کو دے دو۔'' گلناز کی آواز پر میں چونکا اور چپ چاپ ریسیور ماموں کے حوالے کردیا۔

ماموں کچھ دیر گلناز سے صلاح مشورہ کرتے رہے پھر ریسیور رکھ کر سخت لہجے میں بولے۔ ''بیٹا جی! اب تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم ہماری بچی کو طلاق دے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ، ہمیں مہر بھی نہیں چاہیے۔''

''م...... میں...... گلناز...... کک...... کو طلاق نہیں دوں گا۔''

''تمہارے تو اچھے بھی ایسا کریں گے۔ اگر زندگی چاہتے ہو تو اسی وقت گلناز کو طلاق دے دو۔ طلاق نامہ موجود ہے۔ انور! فوراً وکیل کو فون کرو۔''

انور نے وکیل کو فون کیا۔ ان لوگوں کے تیور مجھے خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔ لہٰذا میں نہ چاہتے ہوئے بھی گلناز کو طلاق دینے پر مجبور ہوگیا۔

گھر پہنچا تو ای نے اس بری خبر پر اطمینان کا سانس لیا۔ ''چلو اچھا ہوا میرے بچے کی جان اس بلا سے چھوٹ گئی۔'' انہوں نے میری بلائیں لیں۔

میری تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ گو کہ یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ وہ لالچی لڑکی تھی۔ اسے مجھ سے نہیں میری دولت سے محبت تھی۔ پھر بھی اس کی یادیں، اس کی باتیں، اس کی ایک ایک ادا، اس کا حسین چہرہ رہ رہ کر مجھے یاد آرہا تھا۔ تڑپا رہا تھا۔ آہ! یہ پہاڑ جیسی زندگی اس کے بغیر کیسے گزرے گی۔ میں تو اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں یہ زندگی ختم کرلیتا۔

ای نے بہت کوشش کی کہ میں فوری طور پر شادی کرلوں مگر میرا دل میرا دماغ میری سوچ صرف اور صرف گلناز پر اٹکی ہوئی تھی۔ وہ میری آئیڈیل تھی۔ نہ اس سے پہلے کوئی تھی۔ نہ اس کے بعد کوئی ہوگی۔ اب بھی میرا محور میرا مرکز وہی بے وفا گلناز تھی۔ میرے شب و روز بڑی اذیت میں گزرنے لگے۔

اکثر مجھے محسوس ہوتا کہ گلناز سنگھار میز کے مقابل کھڑی میک اپ کر رہی ہے یا بیڈ پر محوِ خرام ہے یا مین گیٹ پر میری منتظر ہے۔ میں گلناز کہتا ہوا بے تابانہ اس کی طرف لپکتا اور اس کا تصوراتی ہیولا یک دم غائب ہو جاتا۔ گلناز کی جدائی میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میں فیکٹری سے بالکل لاتعلق ہوگیا تھا۔ گھر میں پڑا گلناز کے شادی اور اس کے بعد کے یادگار فوٹو دیکھتا رہتا تھا۔ فوٹو دیکھتے دیکھتے نیند آجاتی تو خواب میں بھی گلناز ہی نظر آتی۔ بعض اوقات گلناز کا کوئی حسین خواب دیکھتے دیکھتے بیدار ہوتا اور گلناز کو نہ پا کر چیخنے چلانے لگتا۔ پھر میری حالت اتنی بگڑی کہ ای کو مجھے نفسیاتی اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ میری حالت

قدرے بہتر ہوئی زنانہ وارڈ کے سامنے سے ہوتا ہوا چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ وہاں سے لوٹ رہا تھا کہ میں نے گلناز کو دیکھا۔ وہ پیٹھ موڑے باہر ریلنگ پکڑے کھڑی تھی۔

''گلناز!'' میں چلایا۔

وہ میری آواز پر گھبرا کر پلٹی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے لباس گلناز جیسا پہنا ہوا تھا۔ اس کے بال بالکل گلناز جیسے گھنے لانبے اور سیاہ تھے۔ ہیئر اسٹائل بھی بالکل اسی کی طرح بنایا ہوا تھا۔ وہ بے انتہا حسین تھی مگر گلناز نہیں تھی۔ میرا دل بجھ کر رہ گیا۔ میں نے حسرت و یاس کے عالم میں اپنا سر پکڑ لیا۔

''مسٹر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' وہ لڑکی گھبرا گئی۔

''سوری مس! آپ کی پشت سے مجھے ایسا لگا جیسے میری بیوی گلناز لوٹ آئی ہو۔'' میں خجالت سے بولا۔

''اوہ! تو یہ بات ہے جناب، کیا بیوی نے دھوکا دیا ہے۔'' وہ لڑکی شوخی سے بولی۔

اسی اثناء میں امی لوٹ آئیں۔ مجھے روم کے باہر پا کر گھبرا گئیں۔

''ماں جی! یہ حضرت آپ کے صاحبزادے ہیں؟'' اس لڑکی نے پوچھا۔

امی نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ پھر ہنستے ہوئے بولی۔ ''محترم بیوی کو پکارتے ہوئے میری طرف لپکے تھے۔''

امی بھی ہنسنے لگیں۔ میں بوکھلا گیا۔ عجیب لڑکی تھی۔ برا منانے کی بجائے میری حرکت پر انجوائے کر رہی تھی۔

''بیٹی! کیا تمہاری شادی ہوگئی؟'' امی نے پوچھا۔

لڑکی نے قدرے شرماتے ہوئے انکار میں گردن ہلائی۔

''تو کیا واقعی تم میری بہو بننا پسند کرو گی؟ ہم لوگ اچھے حسب نسب کے ہیں۔ میرا بیٹا اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ ہمارا اپنا بنگلا اور چلتی ہوئی بہت بڑی گارمنٹ فیکٹری ہے۔ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے سب کچھ اسی کا ہے۔'' امی نے ایک سانس میں رشتہ بھی مانگ لیا اور تمام صفات بھی بیان کر دیں۔

لڑکی امی کو تکنے لگی۔ میں بھی حیرت سے امی کو تکنے لگا۔ میں امی کو آگاہ کر چکا تھا کہ میں اب تمام زندگی شادی نہیں

کروں گا بلکہ گلناز کی یاد میں تمام زندگی گزار دوں گا۔ اس وقت میرا انکار اس ہنس مکھ لڑکی پر ظلم ہوتا لہٰذا مصلحت یہی تھی کہ میں خاموش رہوں۔ ''یا اللہ! یہ لڑکی خود ہی انکار کر دے۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

''قبول ہے... لیکن نہیں، یہ تو مجھے بعد میں نکاح کے وقت کہنا ہے۔ منظور ہے منظور ہے...... مم...... مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔'' لڑکی خوشی سے تقریباً چلاّتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ کیا یہ لڑکی پاگل ہے۔

امی کی تو خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر اسے سینے سے لگا لیا۔

''مم...... مگر آنٹی...... آپ نے گھاٹے کا سودا کیا ہے۔ بعد میں پچھتائیں گی تو نہیں۔ وہی نہ ہو کہ اب پچھتاوے سے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئیں کھیت، لہٰذا پہلے ہی آگاہ کر دیتی ہوں کہ میں ایک یتیم لڑکی ہوں۔ یتیم خانے میں رہتے ہوئے میٹرک کیا۔ پھر وہاں سے فرار ہو گئی اور نوکری کی تلاش میں اس اسپتال میں آ گئی ہوں، کیا اب بھی آپ کو یہ رشتہ قبول ہے۔'' اس کے حسین چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔

امی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور شفقت بھرے لہجے میں بولیں۔ ''بیٹی! بس اسی وقت سے یہ رشتہ پکا سمجھو۔ اب تو یہ ثواب کا کام بھی ہو گیا۔''

میں نے تعجب سے امی کی طرف دیکھا۔ مجھے حیرت تھی۔ اب ان کا وہ نظریہ کیا ہوا کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ لڑکی کی باچھیں خوشی سے کھلی پڑ رہی تھیں۔ پھر وہ فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر امی سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ امی نے پیار سے اس کی پشت کو سہلایا۔ ڈرائیور جو کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اشارے سے بلایا۔

''بیٹی! آج سے تم ہمارے گھر کو ہی اپنا گھر سمجھو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ڈرائیور تمہیں گھر پہنچا دے گا۔ جونہی میرا بیٹا اسپتال سے ڈسچارج ہو گا اسی دن تمہاری شادی اس کے ساتھ کر دی جائے گی۔''

امی کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کا نام یاسمین ہے۔

امی سے الگ ہو کر وہ ڈرائیور کے پیچھے چل دی۔ جاتے جاتے اس نے کئی بار مڑ مڑ کر کن انکھیوں سے مجھے دیکھا اور مجھ سے نظریں ملنے پر شرمگیں انداز میں مسکرا دی۔

''امی! یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ اول تو میں اس سے شادی کروں گا ہی نہیں۔ اگر آپ نے زیادہ مجبور کیا تو وہ لڑکی ہمیشہ میرے پیار کو ترسے گی اور یہ اس یتیم لڑکی کے ساتھ ظلم ہو گا جس کا گناہ آپ کے سر جائے گا۔'' کمرے میں آ کر میں امی پر برس پڑا۔

''بیٹا! ابھی تم ٹھیک ہو جاؤ۔ گھر آؤ گے تو میں تمہیں ایک ایسی حقیقت بتاؤں گی جس کے بعد تمہیں گلناز سے نفرت ہو جائے گی اور تم بہ خوشی یاسمین سے شادی کر لو گے۔'' امی کی اس بات نے مجھے مزید الجھن میں ڈال دیا۔

امی نے بتایا کہ یاسمین نے کئی بار میری عیادت کے لیے آنا چاہا مگر انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ پانچ دن بعد میں ڈسچارج ہو کر گھر آ گیا۔ گھر میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ کوئی رشتہ دار تو ہمارا تھا نہیں پڑوس کے چند لوگ گھر میں موجود تھے۔ شکر ہے کہ یاسمین میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ میں اس دوران دعا مانگتا رہا تھا کہ وہ لڑکی چوری کر کے فرار ہو گئی ہو اور اس طرح میری اس سے جان چھوٹ جائے۔

''بیٹا اب دل تھام کر بیٹھو، راز سے پردہ اٹھا رہی ہوں۔ تمہاری گلناز کو تم سے طلاق لیے پچھلے ہفتے چار مہینے دس دن گزر چکے ہیں۔ تمہیں یقیناً یہ سن کر صدمہ پہنچے گا کہ عدت کے دن گزرتے ہی اس حرافہ نے دوسری شادی کر لی۔ ان لوگوں کے ایک دور کے رشتے دار یہاں رہتے ہیں۔ میں ان کے ذریعے مسلسل گلناز کی ٹوہ میں لگی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ڈائن نے اسی ڈاکٹر سے شادی کی ہے جس نے تم پر جھوٹی تہمت لگائی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس ڈاکٹر سے گلناز کا چکر اس وقت سے چل رہا تھا جب وہ کراچی کی لیبارٹری میں تھا۔ خدا غارت کرے اس کو۔''

امی کے انکشاف نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بے وفا تھی مگر پھر بھی کم بخت اس دل سے نہیں نکل رہی تھی۔ اس کو بھولنا اب بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

''بیٹا! اب اس حرافہ کے لیے اپنی زندگی برباد مت کرو۔ قاضی صاحب آتے ہی ہوں گے۔ آج ہی تمہاری یاسمین سے شادی ہے۔ بس اب انکار مت کرنا۔ ورنہ میرا مرا ہوا منہ دیکھو گے۔''

امی کی یہ دھمکی کام کر گئی۔ مجھے مجبوراً یاسمین سے شادی کرنا پڑی۔ انتہائی سادگی سے نکاح ہوا۔ گھر کے نوکر، چند پڑوسی شریک ہوئے۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ یاسمین سے نکاح تو میری مجبوری تھی مگر وہ گلناز کی جگہ کبھی نہ لے سکے

کی۔

پھر حجلۂ عروسی میں ایک معجزہ ہو گیا۔ امی نے مجھے زبردستی اندر دھکیل دیا۔ مجبوراً میں اس دلہن کی طرف بڑھا جسے زبردستی میرے سر منڈھ دیا گیا تھا۔ وہ سکڑی سمٹی گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے وہ گلناز ہے۔ میں نے تو ہا کر ہا ہیرے کی وہ انگوٹھی یاسمین کی انگلی میں پہنادی جو امی نے اس موقع کے لیے دی تھی۔

''تھینک یو۔'' گھونگھٹ میں سے آواز آئی۔

میں چونک پڑا۔ آواز ہو بہو گلناز کی تھی۔ شاید میری سماعت مجھے گمراہ کررہی ہے۔

''کیا گھونگھٹ مجھے خود پلٹنا ہو گا۔'' شرمگیں آواز آئی۔

میں پھر چونک گیا۔ یہ تو بلاشبہ گلناز ہی کی آواز تھی میں نے بوکھلا کر اس کا گھونگٹ پلٹ دیا۔ میرے وجود پر یک لخت ہیجان سا طاری ہوگیا۔ وہ سو فی صد گلناز ہی تھی۔ کہیں یہ میری نظروں کا دھوکا تو نہیں۔ ڈرتے ڈرتے میں نے اسے چھوا۔ وہ حقیقتاً گلناز تھی۔ میرا تصور ہوتا تو چھوتے ہی کسی ہیولے کی طرح غائب ہو جاتا۔

''گلناز تم!'' میں ہذیانی لہجے میں بولا۔

''ہاں حسن! یہ میں ہی ہوں۔ تمہاری ابھی وہ سب تو ایک خواب تھا۔ آنکھ کھلی تو میں حقیقتاً تمہارے روبرو ہوں۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر اسے اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ پھر وہ بھی وارفتگی اور خود سپردگی کا مظاہرہ کرنے لگی اور پھر وقت ٹھہر گیا اور ہم دونوں ایک دوسرے میں یوں گم ہو گئے گویا ایک جان دو قالب ہوں اور وہ رات میری زندگی کی حسین راتوں میں ایک اور یادگار رات بن گئی۔ آخر کار ہم دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں سو گئے۔

لیکن اگلے روز جب آنکھ کھلی تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گلناز پھر غائب ہو چکی تھی اور میری بانہوں میں یاسمین سو رہی تھی۔

''گلناز! گلناز! میری جان تم کہاں چلی گئیں۔'' میں عالم وحشت میں چلانے لگا۔

یاسمین گھبرا کر اٹھ گئی۔ امی بھی بوکھلا کر دوڑتی ہوئی آئیں اور زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے لگیں۔ یاسمین نے اٹھ کر پھرتی سے دروازہ کھولا۔ امی ڈری ڈری سی میرے نزدیک آئیں۔

''بیٹے! مجھے معاف کردو۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ دراصل ڈاکٹر کے ساتھ مل کر میں نے ہی یہ پلان بنایا تھا۔ میں خود یاسمین کو یتیم خانے سے لے کر آئی تھی۔ مجھے ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی جو میری احسان مند بھی رہے اور اشاروں پر چلے۔ پھر اسپتال میں یاسمین سے تمہاری پہلی ملاقات سے لے کر اب تک سب کچھ ہمارے پلان کے مطابق ہوا۔''

''دراصل ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ویسے تو تم نارمل ہو گئے ہو مگر گھر کی تنہائی میں پھر تم گلناز کے بارے میں سوچنا شروع کردو گے۔ اس لیے تمہاری فوری طور پر شادی ضروری ہے اور شادی بھی ایسی کہ مکمل ازدواجی تعلق قائم ہو جائے۔ اسی پلان کے تحت میں نے کسی حد تک گلناز کا اندازِ گفتگو اور لہجہ یاسمین کو سکھایا۔ پھر یاسمین کا میک اپ ایک ماہر میک اپ آرٹسٹ سے گلناز کا ویسے والا فوٹو سامنے رکھ کر کیا گیا۔ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا ڈاکٹر نے تمہیں ایک ایسا انجکشن دیا جو تمہیں کچھ نشے کی سی کیفیت میں رکھے۔ جب تم سو گئے تو یاسمین نے پلان کی کامیابی کی اطلاع اپنے موبائل سے کال کر کے دے دی تھی۔ خدا کا شکر ہے ہمارا پلان مکمل طور پر کامیاب رہا تھا۔''

''مگر امی یہ دھوکا ہے۔ اپنے پلان کے چکر میں آپ نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد کردی۔ آئندہ میں محتاط رہوں گا اور یہ لڑکی میری محبت اور اس تعلق کو ترسے گی جو میاں بیوی میں لازم ہے۔'' میں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

پھر بے چاری یاسمین میری نفرت کا نشانہ بنتی رہی مگر آفرین ہے اس لڑکی پر وہ امی کا بھی ہر طرح سے خیال رکھتی۔ میرے ہتک آمیز رویے کے باوجود ایک فرماں بردار بیوی کی طرح نہ صرف میری دلجوئی کی کوشش کرتی بلکہ میری ڈانٹ ڈپٹ پر بھی مسکراتی رہتی اور وہ تمام فرائض بحسن و خوبی ادا کرتی جو بہ حیثیت بیوی اس پر فرض تھے۔ ایک ماہ بعد میں نے فیکٹری جانا شروع کردیا۔

شادی کے دو ماہ بعد بھی یاسمین میرے دل سے گلناز کو نہ نکال سکی پھر اچانک میری زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ یاسمین میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ ٹیسٹ مثبت تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے بھی تصدیق کردی۔ امی کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں بھی بے انتہا مسرور تھا۔ جو خوشی مجھے گلناز پانچ سال میں نہ دے سکی تھی وہ یاسمین نے خدا کے

فضل سے صرف ایک رات کے تعلق سے بیٹی ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ میں نے یاسمین کو محبت سے گلے لگا لیا اور یاسمین مارے خوشی کے دیوانی سی ہو گئی۔ اب میرا رویہ یاسمین سے یکسر بدل چکا تھا۔ بالآخر یاسمین اپنی کوششوں میں کامیاب رہی تھی۔

اور پھر شادی کے نو ماہ بعد اس نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ ہمارے گھر میں ایک بار پھر خوشیوں کا ڈیرہ تھا۔ مسرتوں کا ہجوم اور قہقہوں کا اژدحام۔

ادھر یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی کہ گلناز کا شوہر ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ میں تڑپ اٹھا۔ بدقسمتی سے میں گلناز کو اب تک بھلا نہیں سکا تھا۔ دل چاہا کہ اڑ کر گلناز کے پاس چلا جاؤں اور اس کے دکھ درد بانٹ لوں مگر یہ کسی طور ممکن نہیں تھا۔

''بیٹا! حادثہ تو افسوس ناک ہے مگر خدا کا انصاف دیکھو وہ لوگ کہتے تھے کہ میرا بیٹا عمر رسیدہ ہے۔ جلد ہی مر مرا جائے گا اور ان کی بیٹی بیوہ ہو جائے گی۔ عبرت کا مقام ہے کہ میرا بچہ خدا اسے عمر دراز عطا کرے زندہ سلامت ہے اور گلناز کو اس کا جوان شوہر بیوہ کر گیا۔''

میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے کسی ردعمل سے یاسمین کی دل آزاری ہو۔ گلناز کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ جس بنیادی وجہ سے اس نے مجھ سے طلاق لی تھی۔ اس کے یہاں اولاد دوسرے شوہر سے بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بے چاری اپنے شوہر کی پہلی بیوی کے دو بچے پال رہی تھی۔ اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ واقعی خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ قدرت کی طرف سے اسے مجھ جیسے محبت کرنے والے شوہر کو ٹھکرانے کی بڑی ہی عبرتناک سزا ملی تھی۔

عورت مرد کو اپنی محبت، ناز و انداز اور اپنے متناسب جسم کے لمس سے بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بیٹے کی پیدائش کی وجہ سے میرے رویے میں جو یاسمین کے لیے نرمی پیدا ہوئی تھی میری اس کمزوری کا یاسمین نے خوب فائدہ اٹھایا اور مجھے آخر کار حقِ زوجیت ادا کرنے پر مجبور کر دیا اور پھر خدا کے فضل و کرم سے یاسمین کی وجہ سے میری ایک اور خواہش پوری ہو گئی۔ اب میری سب سے بڑی تمنا ایک بیٹی کی تھی جو یاسمین نے بیٹے کی پیدائش کے تقریباً ایک سال بعد پوری کر دی۔ بڑی ہی پیاری بچی تھی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

مگر جب بھی ہمارے یہاں کوئی خوشی کی خبر دستک دیتی تھی گلناز کے یہاں کوئی المناک سانحہ ہو جاتا تھا۔

اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ پوسٹ مین نے دروازے پر دستک دی اور ایک رجسٹری مجھے پکڑا کر پلٹ گیا۔ میں نے بے تابانہ وہ لفافہ چاک کیا۔ میں اس جانی پہچانی تحریر کو پہچان گیا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ کہیں یہ میرے منتشر خیالات کا فریب تو نہیں۔ گلناز بھلا کیوں مجھے خط لکھنے لگی۔ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے وہ خط پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا۔

احسن صاحب! آپ کو سلام آخر

آپ جیسے محبت کرنے والے شخص کو ٹھکرا کر میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی۔ اس گناہِ عظیم کی پاداش میں، میں گھٹ گھٹ کر جیتی رہی۔ پل پل مرتی رہی۔

شادی کی پہلی رات ہی کو ڈاکٹر دانش سعید نے یہ دھماکا خیز انکشاف کیا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے مگر اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس بیوی کے بطن سے اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک تین سال کا اور دوسرا پانچ سال کا۔ میں نے آپ کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی اور اس ڈاکٹر کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی تھی۔ اس ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تم جیسی حسین اور کم سن لڑکی کیوں اس بڈھے کے ساتھ اپنی زندگی برباد کر رہی ہے تم اس سے فوراً طلاق لے لو، یہ ہینڈسم اور کنوارہ نوجوان تم سے شادی کے لیے بے قرار ہے۔ یہ پہلی نقب تھی جو اس نے مجھ پر لگائی۔

لیکن بعض اوقات حالات بھی انسان کو مجبوریوں کی گہری دلدل میں ڈال دیتے ہیں۔ جہاں سے انسان نکلنے کے لیے جتنے زیادہ ہاتھ پیر مارتا ہے اتنی ہی تیزی سے دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ اب یہ میری بدنصیبی ہی تھی کہ پانچ سال تک کوئی اولاد نہ ہو سکی اسی وجہ سے میں تم سے کچھ بدظن سی ہو گئی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ وہ چالباز ڈاکٹر مختلف اوقات میں دانستہ مجھ سے ملتا رہا اور حیدرآباد میں ایک خطرناک منصوبے کے تحت آ گیا۔ وہ ذلیل انسان مجھے اپنی جھوٹی محبت کے حسین جال میں پھنسانے کے لیے ہمارے گھر کے قریب ہی کلینک کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

اس بار اس کا وار کاری تھا۔ اس نے وہ اوریجنل رپورٹ مجھے دکھائی جس کے تحت آپ کبھی باپ نہیں بن سکتے تھے۔ اس نے قسمیں کھا کر مجھے یقین دلایا کہ یہ حقیقت ہے کہ تم نے اسے بھاری رقم رشوت کے طور پر دے کر وہ

تھی۔ حقیقت ہوئی تھی کہ اولاد کے سلسلے میں تم ہر طرح سے فٹ ہو۔

اب یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تمہارے اس عمل سے وفا اور اعتماد کا رشتہ کسی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا اور پھر وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تم سے طلاق لے کر اس ڈاکٹر سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

یہاں سے میری بدنصیبیوں کا آغاز ہوا۔ سادگی سے نکاح ہوا اور رخصتی عمل میں آ گئی۔ دل میں ہزاروں ارمان لیے میں حجلۂ عروسی میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی مگر دوسرے ہی لمحے میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔

''مائی سوئیٹ ہارٹ! سہاگ رات کا تحفہ قبول کرو۔ بھئی تم تو بڑی ہی نصیبوں والی ہو۔ شادی کی پہلی ہی رات دو بیٹوں کی ماں بن گئیں۔'' اس نے دو بچے میری گود میں دیتے ہوئے کہا۔

''کک...... کیا...... مم...... مطلب۔'' میں ہکلائی۔

''ڈیئر گلناز! یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔ میں نے مصلحتاً شادی سے پہلے یہ بات تم سے چھپائی۔ ورنہ یہ پیاری معصوم سی چڑیا ہمارے آنگن میں کبھی نہ آتی۔ پھر سے اڑ جاتی۔''

اس انکشاف پر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ اس نے جو تفصیل بتائی اس کے مطابق وہ دھوکے باز اپنی بیوی کے انتقال کے بعد گھر کے کام کاج کے لیے نوکرانی اور بچوں کی پرورش کے لیے ایک آیا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے کھلا دھوکا دیا تھا۔ اس کی جھوٹی محبت کا پردہ چاک ہو چکا تھا۔ مجھے تم سے بے وفائی کی خوب سزا ملی تھی۔ باپ کی طرح دونوں بچے بھی بہت بگڑے ہوئے اور حد درجہ بدتمیز تھے۔ باپ بیٹوں نے مل کر میری زندگی اجیرن کر دی نت نئے طریقوں سے مجھے ہراساں کیا جاتا۔ طرح طرح سے اذیتیں دی جاتیں۔

مجھ پر مزید ستم یہ ٹوٹا کہ ڈاکٹر دانش سعید سے بھی میرے یہاں کوئی اولاد نہ ہو سکی۔ کاش اس سے میرے یہاں کوئی اولاد ہو جاتی تو میں اس کے سہارے یہ اذیت ناک اور ذلت آمیز زندگی آسانی سے گزار لیتی۔ میں نے ٹیسٹ کروانے کے لیے کہا تو اس نے ہنستے ہوئے طنز کیا۔

''میں کیوں ٹیسٹ کرواؤں، کیا یہ دو لائسنس اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی نہیں۔''

میں اب ستم سہتے سہتے عاجز آ چکی تھی۔ چیونٹی کو بھی بے جا چھیڑا جائے تو وہ کاٹ لیتی ہے۔ میں بھی اب مقابلے پر اتر آئی۔ میں چاہتی تھی کہ اس کی زندگی کچھ اس طرح اجیرن کر دوں کہ وہ مجھے طلاق دینے پر مجبور ہو جائے اور پھر میں تم سے دوبارہ شادی کر کے اپنے گناہ کی تلافی کر سکوں گی۔ مجھے قوی امید تھی کہ تم نے واقعی مجھ سے سچی محبت کی تھی لہٰذا بہ خوشی مجھ سے دوبارہ شادی کر لو گے۔ میں واقعی اب اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر تمہارا خلوص تمہاری محبت یاد آتی تھی۔ تڑپاتی تھی۔

مگر افسوس الٹی گنتی شروع ہو چکی تھی۔ انہی دنوں یہ بات میرے علم میں آ گئی کہ تم نے امی کے مجبور کرنے پر ایک یتیم لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ یہ کیسی محبت تھی جس نے دنیا والوں کے دباؤ میں آ کر اپنے عہد و پیماں توڑ دیے۔ بہرحال میری بے وفائی کے بعد تمہیں اس کا حق بھی تھا۔ آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ میرا دل ٹوٹ... چکا تھا۔ ان حالات میں صبر کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا لہٰذا میں نے قسمت پر شاکر ہو کر خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ مجھے میرے گناہوں کی سزا تو ملنی ہی چاہیے تھی۔

ہر نئے دکھ پر تم بہت یاد آتے۔ رونا اور سسک سسک کر جینا میرا مقدر بن چکا تھا۔ عاجز آ کر اپنی موت کی دعا کرتی مگر وہ بھی قبول نہ ہوتی پھر یہ خوش خبری ملی کہ تم ایک بیٹے کے باپ بن چکے ہو۔ خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی کیوں کہ اوریجنل رپورٹ کے مطابق تو تم کسی بھی صورت میں باپ نہیں بن سکتے تھے۔

میں نے اس سلسلے میں جب دانش سے استفسار کیا تو وہ چراغ پا ہو گیا اور مغلظات بکنے لگا۔

اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں، ویسے بھی تو نے میری اور میرے بچوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ اب میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ اس انکشاف کے بعد تیری زندگی موت سے بدتر ہو جائے تو سن آج تجھے حقیقت بتا ہی دیتا ہوں۔ دراصل تیرے یار کی رپورٹ جعلی نہیں اصلی ہی تھی۔ بانجھ وہ نہیں بلکہ تو خود ہے۔ پہلی نظر میں، میں تجھ پر فدا ہو گیا تھا لہٰذا تجھے تیرے شوہر سے جدا کرنے کے لیے میں نے تیری رپورٹ جو منفی تھی بدل دی تھی۔ دراصل مجھے اپنے بچوں کی پرورش کے لیے ایک بانجھ عورت ہی چاہیے تھی۔ اس طرح وہ جعلی رپورٹ اور اس سلسلے میں جھوٹ پر جھوٹ بول کر میں جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا وہ تمہاری بیوقوفی کی وجہ سے مجھے توقع کے عین مطابق حاصل ہو گیا۔

اس ہولناک انکشاف پر میرے تن بدن میں آگ

لگ گئی۔ اپنے مطلب کے لیے اس شیطان نے میری ہنستی بستی زندگی برباد کردی تھی۔ ’’کمینے، دغا باز! اب میں تیرے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ تو فوراً مجھے طلاق دے دے۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی یا تیرے غلیظ وجود سے اس دنیا کو پاک کردوں گی۔‘‘ میں نے فیصلہ کرلیا کہ تم سے دوبارہ شادی تو اب ممکن نہیں مگر اس کمینے سے چھٹکارا حاصل کر کے رہوں گی۔ حقیقتِ حال واضح ہونے کے بعد اس کی نوکرانی اور بچوں کی آیا بن کر رہنا بے وقوفی ہوتی۔ مجھے تمہاری محبت پر یقین تھا کہ میرے بانجھ ہونے کے باوجود تم مجھے کبھی نہ ٹھکراتے۔

’’تیری جان لے لوں گا مگر تجھے طلاق ہرگز نہیں دوں گا۔ آج سے تو بھروسے کے قابل نہیں رہی۔ کیا پتا تیرا یار میری غیر موجودگی میں چوری چھپے تجھ سے ملنے آتا ہو۔ آج سے تیرے برے دن شروع ہوگئے۔ اب تو سدا قید بھگتے گی۔‘‘ وہ چلایا۔

اس نے پہلی مرتبہ دروازہ لاک کیا اور عالم طیش میں گاڑی اسٹارٹ کر کے کہیں نکل گیا۔ برے دن میرے نہیں اس کے شروع ہو چکے تھے۔ غصے میں فاسٹ ڈرائیونگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی گاڑی بے قابو ہو کر ایک ٹرک سے ٹکرا گئی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ اس نے اس دن مجھے قید کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زندگی کی قید سے آزاد کردیا تھا۔ یہ قدرت کا انصاف تھا اور ہم لوگوں کے لیے عبرت کا مقام بھی کہ سابقہ شوہر زندہ تھا جب کہ جوان شوہر مجھے بیوہ کر گیا تھا۔ بیوگی تو میرا مقدر بھی۔ واقعی خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔

سوم کے فوراً بعد اس کی اکلوتی بہن نے گھر اور جایداد پر قبضہ کرلیا۔ مجھے عدت بھی نہیں کرنے دی۔ اس کی حرافہ بہن نے جایداد میں جو میرا شرعی حق تھا۔ اس سے بھی محروم کردیا اور صرف تن کے کپڑوں میں مجھے گھر سے باہر نکال دیا۔ حد تو یہ ہے کہ جہیز میں سے بھی مجھے ایک تنکا تک نہیں دیا۔ میں نے آپ کا دل دکھایا تھا لالچ کیا تھا۔ خدا نے مجھے اس کی خوب سزا دی۔

میں اپنا سامنہ لے کر امی کے گھر آگئی۔ ماموں بڑے غضب ناک ہوئے۔ جہیز اور میرے حق کے لیے وہ قانونی چارا جوئی کرنا چاہتے تھے مگر میرا اب اس دنیا سے دل بھر گیا تھا۔ میں نے انہیں منع کردیا۔ یہاں آئی تو گھر کے حالات دگرگوں تھے۔ بے چاری امی مسلسل بیمار رہتی تھیں۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود دنیا میں میری سزا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ آخرت کی سزا کے تو تصور ہی سے مجھے جھرجھری سی آجاتی تھی۔

دانش کے یہاں چلنے کڑھنے کی وجہ سے ٹی بی کا آغاز تو ہو چکا تھا۔ یہاں آکر یہ مرض مزید پھلنے پھولنے لگا۔ ابو کی پنشن سے تنگی ترشی کے ساتھ کسی نہ کسی طور گزارہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں میرا علاج ممکن ہی نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اپنی بیماری ان لوگوں سے مخفی رکھی۔ امی کو مزید پریشان کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اب میں اس زندگی سے اکتا گئی تھی۔ یہاں سے دل اٹھ گیا تھا۔ آپ کا خلوص آپ کی بے لوث محبت، آپ کی یادیں، آپ کی باتیں مجھے رہ رہ کر یاد آتیں، تڑپاتیں، گھٹ گھٹ کر جینے سے تو موت بہتر تھی غرض یہ کہ میری باقی ماندہ زندگی آنسوؤں کی شکل میں قطرہ قطرہ بہتی جارہی تھی۔ پھر نتیجہ یہ نکلا کہ جب آخری اسٹیج پر کھانستے کھانستے میں نے خون اگلا تو امی کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ میری بیماری ان کے علم میں آچکی تھی۔ بے چارے ماموں نے بہت بھاگ دوڑ کی مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ بس عمر کی نقدی اتنی ہی تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور دنیا کی ہر خوشی آپ کا مقدر ٹھہرے، آمین۔

لرزتے ہاتھوں سے یہ خط اس اُمید پر لکھ رہی ہوں کہ آپ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی ہے۔ اُمید ہے اگر آپ نے مجھے معاف کردیا تو شاید خدا بھی مجھے معاف کردے۔

ماموں بھی آپ سے سخت شرمندہ ہیں۔ انہوں نے بڑا بول بولا تھا۔ کم عمری میں بیوگی تو ان کی بھانجی کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔ اس پر مزید ستم یہ کہ خود ان کی بھانجی بھی اتنی کم عمری میں یہ دنیا چھوڑ کر جارہی ہے۔ میں نے ماموں سے یہ عہد لیا ہے کہ میرے سوم کے بعد اس خط کو ارجنٹ میل سے پوسٹ کردیں۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر آپ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتی ہوں۔ امی اور آپ کی بیوی کو بھی سلامِ پُرخلوص

ہمیشہ کے لیے خدا حافظ
فقط آپ کی بدنصیب گلناز
جو کبھی آپ کی نہ تھی

خط پڑھ کر میں لرز اٹھا۔ وہ پھول سی لڑکی جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا تھا اس قدر عبرت ناک انجام کی مستحق تو ہرگز نہ تھی۔ میری آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو گلناز کے خط میں جذب ہوگئے۔

روایتوں کے اسیر

جناب ایڈیٹر، سرگزشت کراچی
آدابِ عرض
زیرِ نظر روداد میری ایک قریبی سہیلی کی ہے۔ اس کو ایک عجیب بیماری تھی۔ وہ سوتے سوتے چیخ کر اٹھ جاتی تھی۔ ایسا اس کے ساتھ کیوں ہورہا تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے اس کی حالاتِ زندگی رقم کردی ہے۔ اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

سیدہ عطیہ زاہرہ
(لاہور)

''بتائیں ناں آنٹی!'' میں نے ضد کے انداز میں التجا کی۔

''کیا بتاؤں؟'' انہوں نے نظریں چرا کر کہا۔ میری نظریں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ انہوں نے زندگی کا طویل سفر طے کرلیا تھا اس کے باوجود اب تک ان کے گالوں پر گلابوں جیسی تازگی و شگفتگی تھی۔ ''آخر تم پوچھنا کیا چاہتی ہو؟'' انہوں نے دوبارہ انجان بننے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر نظریں چرانے کی سعی کی۔

"میں اپنے ڈراؤنے خوابوں کی بات کر رہی ہوں۔" میں نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں بتا چکی ہوں کہ بچپن میں، میں نے کچھ دیکھا تھا۔ مگر کیا یہ تو یاد نہیں لیکن کچھ ایسا ضرور دیکھا تھا جو ذہن پر بار ہے اور جو آج خواب کی صورت میں خوفزدہ کر رہا ہے۔"

"تم خواب میں کیا دیکھتی ہو، کیوں دیکھتی ہو یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔" آنٹی نے پھر بچنے کی کوشش کی۔

حالانکہ میرا سوال نیا نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی کسی رشتے دار سے اپنے خواب کا ذکر کر چکی ہوں۔ خود آنٹی سے بھی کئی بار خوابوں کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ پھر بھی میں نے اپنا خواب بیان کیا۔ "میں دیکھتی ہوں کہ ایک چھوٹا سا کمرا ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ میں اندھیرے میں قدم بڑھا رہی ہوں اور اس کمرے میں داخل ہو جاتی ہوں۔ وہاں ایسا کچھ ہے جسے دیکھ کر میں چیخ اٹھتی ہوں پھر آنکھ کھل جاتی ہے۔"

"خواب تو خواب ہیں۔ ان سے کیا ڈرنا۔" آنٹی نے پھر طفل تسلی دی۔

"یہ خواب نئے نہیں ہیں۔ اس وقت سے نظر آ رہے ہیں جب میں سحر منزل گئی تھی۔ یعنی تقریباً دس سال سے یہ خواب میرے تعاقب میں ہیں۔ تسلسل سے ایک ہی خواب کا نظر آنا بتا رہا ہے کہ میرے لاشعور میں کوئی منظر کوئی بات دبی ہوئی۔ میں نے جب بھی کسی سے پوچھا کہ سحر منزل میں ایسا کیا تھا جسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گئی تھی تو لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"وہ سچ کہتے ہیں میری بچی! اب تم جوان ہو چکی ہو۔ ان بچکانہ باتوں پر دماغ نہ کھپاؤ۔" آنٹی نے مجھے سمجھایا۔

"کیونکہ اس بچکانہ بات نے ہی مجھے مریض بنا ڈالا ہے۔" میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "میری قوت برداشت جواب دے گئی ہے۔ میں سب سے کتنی ہی بار کہہ چکی ہوں۔ کتنی ہی خوشامدیں کر چکی ہوں کہ خدارا مجھے بتایا جائے وہ کیا تھا جو میں نے سحر منزل میں دیکھا تھا مگر......؟"

انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اگر میں تمہیں ساری باتیں بتا دوں تو تم مجھے گھر واپس جانے دو گی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"نہیں سر ہلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وعدہ کرنا پڑے گا تمہیں۔"

"ہاں...... ہاں آنٹی!" میرے لہجے میں موجود ساری کرختگی نرمی میں تبدیل ہو گئی۔ "میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کو ایک دن کے لیے بھی نہیں روکوں گی۔" کبھی کبھی تو مجھے آنٹی کے غصے پر پیار آنے لگتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں انہیں اپنے ساتھ کیوں لے آتی۔ ممکن ہے کہ اس میں میری خود غرضی کا بھی کچھ عمل دخل ہو۔ میں ان سے گزرے ہوئے دنوں کی باتیں معلوم کرنا چاہتی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ بچپن سے اب تک میں نے جو بھیانک خواب جاگتے یا سوتے میں دیکھے تھے ان سب کا سبب انہیں معلوم ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ میرے اس خواب مسلسل کا سبب کیا ہے؟ انہیں معلوم ہے کہ گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں، میں کیوں پریشان رہتی ہوں؟ بلکہ انہیں تو یہ بھی پتا ہوگا کہ کون سی باتیں میں بھول چکی ہوں۔ اب کئی ہفتوں سے آنٹی میرے پاس تھیں اور میں ان سے اپنے ماضی کے بارے میں سننا چاہتی تھی اسی لیے انہیں پریشان کر رہی تھی۔ کبھی منت سماجت کرتی، کبھی روٹھ جاتی۔ لیکن وہ ہمیشہ موضوع بدل دیتیں اور تب میں نو سالہ بچی کی طرح ضد کرنے لگتی۔

نو سالہ بچی! ہاں جب یہ واقعہ پیش آیا تھا اس وقت میری عمر نو سال تھی۔ اسی واقعے کا بھوت مجھ پر سوار تھا کہ کیا وہ محض ایک بھیانک خواب تھا یا آنٹی کی کہانیوں میں سے ایسی کوئی خوفناک کہانی جو وہ ہمیں بچپن میں سنایا کرتی تھیں؟ اس زمانے میں جب ہمارا خاندان تتر بتر نہیں ہوا تھا۔ تب میں بہت چھوٹی تھی۔ گھر کے بھی افراد کا آپس میں یا تو خونی رشتہ تھا یا شادی کا۔ مجھے وہ لوگ اچھی طرح سے یاد نہیں ہیں تاہم اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ دادا جان کی سرپرستی میں ہم لوگ بڑے خوش و خرم تھے۔ پھر ہمارے خاندان میں رشتے دار کی حیثیت سے ایک شخص داخل ہوا اور دادا جان نے بوڑھا ہونا شروع کر دیا۔ وہ خاموش رہنے لگے۔ انہوں نے فیصلے کرنا چھوڑ دیے۔ وہ تھک چکے تھے اور سب سے الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد ان سے دور ہونے لگی تھی۔ ہمارا خاندان بکھرنے لگا تھا۔ سبھی افراد ادھر ادھر جا چکے تھے۔ نورانی چہرے والے دادا جان جن کی مبہم سی صورت ابھی تک میرے ذہن میں ہے۔ میرے سارے چچا اور پھوپیاں اور ان کے بچے اور بچیاں خاندان کے اصل مرکز کو چھوڑ گئے۔ بہت سی صورتیں مٹی میں مل گئیں۔ بہت سے افراد ملک کے دوسرے حصوں میں منتقل

ہو گئے۔ پھر بھی ان میں سے کئی ایک اب تک میرے ذہن کے کینوس پر زندہ ہیں اور کئی ایک کا چہرہ بالکل ہی دھندلا گیا ہے۔ وہ سب کیوں دور ہو گئے۔ ہمارے اتحاد و یک جہتی کو کیا حادثہ پیش آیا۔ ہمارا خاندان جو ایک مثالی خاندان تھا وہ کیوں بکھر گیا۔ یہ آج تک سمجھ نہیں پائی ہوں۔

ہر شخص جانتا تھا کہ ضرورت یا پریشانی کے وقت خاندان والوں کی ایک ہی میٹنگ سارے مسائل کو حل کر دیتی تھی۔ ہمارے خاندان والوں کا اجتماع ہمیشہ اس قدیم حویلی میں ہوتا تھا جو ایک ٹیلے پر واقع تھی۔ دادا جان ان اجتماعات میں صدارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کی حیثیت ایک ایسے آمر جیسی تھی جو سب ہی سے محبت کرتا تھا۔ سب ہی کے ساتھ انصاف سے پیش آتا تھا اور جس کے فیصلے کو ہر شخص بلا چوں و چرا کیے ہوئے تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔ خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ خاندان کا ہر فرد دادا جان کا ادب کرتا تھا لیکن اچانک ہی سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس قدیم حویلی میں خاندان والوں کا آخری اجتماع اس وقت ہوا جب دادا جان کی موت کو کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ لوگ مکان گرانے اور زمین فروخت کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں تھا۔ چاروں طرف ایک عجیب پُر ہیبت اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ اس روز میں اپنے پالتو جانور کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ بھاگ رہا تھا اور میں چھوٹے بڑے ٹیلوں پر اس کا پیچھا کرنے میں مصروف تھی اور تب بھاگتے بھاگتے میں اچانک پتھروں سے بنے ہوئے چھوٹے سے کیبن تک پہنچ گئی جس میں لوہے کی سلاخوں والی ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ بچوں والے تجسس سے میں کیبن کے اندر جھانکنے لگی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں چیخ مار کر زمین پر گر گئی اور پھر اگلے ہی لمحے بھاگتی، لڑکھڑاتی، گرتی پڑتی اپنے گھر پہنچی۔

میں زور زور سے رو رہی تھی اور چہرے پر خوف و دہشت تھی اسی عالم میں گھر پہنچی تھی اور گھر پہنچتے ہی مجھے غش آ گیا تھا۔ میرے بھیانک خواب اس روز سے میرے ساتھ تھے اور کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتے جا رہے تھے مگر مجھے یہ یاد نہ تھا کہ میں نے پتھروں کے اس کیبن کی سلاخوں والی کھڑکی سے جب اندر جھانکا تھا تو کیا دیکھا تھا۔ یاد کرنے کی کوشش میں مجھے چکر آ جاتا تھا۔ گھر میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو میرے سوالوں کے جواب دیتا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی شخص کچھ کہتا بھی تو یہ کہ میں نے خواب دیکھا ہو گا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ میں سوئی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے جاگتے ہوئے مشاہدہ کیا تھا۔

پچھلے دنوں ممی کی موت کے چند ماہ بعد جب میں آنٹی سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئی تھی تو مجھے پتا چلا کہ وہ پھسل کر گر گئی ہیں۔ انہیں کھانا تیار کرنے میں تکلیف ہو رہی ہے اسی لیے میں انہیں اپنے ساتھ لے آئی۔ نہ جانے کیوں ہمارے ہاں آنے کے بعد ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جب تک وہ مجھے سحر منزل والی بات نہیں بتائیں گی میں انہیں واپس جانے نہیں دوں گی۔

''بتائیں ناں، آنٹی۔'' میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے بتائیں کہ میں نے سحر منزل میں کیا دیکھا تھا۔ میں جاننا چاہتی ہوں اگر مجھے اصل بات معلوم نہ ہوئی تو بھیانک خوابوں کی بدولت کسی روز میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ میری اچھی آنٹی مجھ پر رحم کھائیں۔''

بالآخر آنٹی کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔

''مجھے پتا نہیں۔'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''تمہیں اپنا خاندان اور اس کے طور طریقے کس حد تک یاد ہیں۔ شاید تمہیں کچھ بھی یاد نہ ہو کیوں کہ جس وقت تمہارے خاندان کا اتحاد پارا پارا ہوا تم بہت چھوٹی تھیں۔ تمہارے تمام چچا، تایا اور پھوپیاں تمہارے دادا سے بہت محبت کرتی تھیں۔ رات کو سورج کا طلوع ہونا ممکن ہو یا نا ہو۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی تمہارے دادا کی بات کو ٹال دے۔ وہ اصولی انسان تھے۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون تھا اور باقی سب کو ان کی رہنمائی اور رضا جوئی دل سے عزیز تھی۔ سب سے اہم چیز جو ہم نے سیکھی تھی وہ وفاداری تھی۔ ملک و قوم کی وفاداری نہیں بلکہ خاندان کی وفاداری۔ انہوں نے سب کو تعلیم دی تھی کہ مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آئیں اور اگر خاندان کے کسی فرد میں کوئی خامی دیکھیں تو گھر میں ہی اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ گھر سے باہر زبان پر تالے ہوں۔ انہوں نے یہ بات بھی سب کو اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ خاندان کا یہ اتحاد ہمیشہ قائم رہے اور یہ سب آگے بچوں میں بھی منتقل ہونا چاہیے۔'' وہ سانس لینے کو رکیں۔ ''مگر ایک بات تمہارے دادا جان بھی نہیں جانتے تھے کہ وقت یکساں نہیں رہتا۔ زمانہ بدل جاتا ہے، لوگ بدل جاتے ہیں، نسلیں بدل جاتی ہیں۔ قدریں بدل جاتی ہیں۔ دیکھ لو آج ان کے پوتے پوتیاں ملک کے دور دراز علاقوں میں بکھر گئے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا خاندان

ہے اور وہ اتحاد جس پر تمہارے دادا زور دیا کرتے تھے ختم ہو چکا ہے حالانکہ اس دور میں اتحاد کے ختم ہونے کا تصور بھی محال تھا۔ وہ سب تقریباً ایک طرح کی پناہ گاہ میں تھے۔ سب کی خامیاں اور خوبیاں کسی کی اہمیت کو گھٹا نہیں سکتی تھیں۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی جرم کرے اور اسے خاندان کی جانب سے تحفظ حاصل نہ ہو۔ تمہارے دادا کہتے تھے جرم کی سزا ضرور ملنی چاہیے لیکن ضروری نہیں کہ وہ سزا باہر والے دیں۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکی پھر بولیں۔ ''سب کو سزا دینے کے لیے گھر کی عدالت موجود تھی۔ تحفظ کا یہی احساس تھا جو کہ تباہی اور بربادی کا......!''

''آنٹی!'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''آپ کہہ رہی ہیں کہ میرے بہت سے چچا، تایا، پھوپیاں تھیں جب کہ مجھے تو صرف چند کا پتا ہے شاید یہ سب چھ بہن بھائی تھے۔''

''چھ نہیں......سات تھے۔'' آنٹی آہستہ سے بولیں۔

''یہ ساتواں کون تھا؟''

''اس کا نام شاہ زیب تھا۔'' آنٹی نے بتایا کہ وہ سب سے چھوٹا بھائی تھا اور اتنے طویل عرصے کے بعد جب سب یہ سمجھنے لگے کہ ان کے خاندان کی تکمیل ہوگئی وہ پیدا ہوا تھا۔ تمہاری دادی کی موت اسی کی پیدائش پر ہوئی تھی۔ زچگی کے وقت پیچیدگیاں ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے وہ وفات پا گئیں۔ باقی بہن بھائیوں نے شاہ زیب کی پرورش کی۔ وہ سنہرے بالوں کا بہت ہی خوب صورت بچہ تھا۔ جب وہ ہنستا تھا تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہے۔ سب اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کی دیکھ بھال کرتے تھے لیکن اب سوچتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے شاہ زیب کوئی سراب تھا۔ میں اس کی خالہ زاد تھی۔ اسی حوالے سے اسے بچپن سے دیکھتی آرہی تھی۔

''میں سحر ہاؤس کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔'' میں نے شاہ زیب کی تعریفوں سے گھبرا کر کہا، کیوں کہ اگر آنٹی اسی طرح خاندان کے ہر فرد کی تعریف و توصیف کرتی رہیں تو کئی دن تک مجھے یہ بات معلوم نہ ہو سکے گی جو کہ میرے سر درد اور خوابوں کی ذمہ دار تھی۔ ''آنٹی مجھے سحر ہاؤس کے متعلق بتائیں۔''

''اسی کے بارے میں بتانے کی کوشش کررہی ہوں۔ شاہ زیب سب کو پیارا تھا۔ سب اس کو چاہتے تھے۔ وہ بھی ہمیشہ ہنستا اور مسکراتا رہتا۔ اس کے چہرے پر دھوپ جیسی تازگی چھائی رہتی۔ کبھی کبھار بچوں کی طرح وہ ضد بھی کرنے لگتا تھا لیکن اس کی ضد دیرپا نہیں ہوتی تھی۔ پھر ایسا ایک واقعہ ہوا جس نے شاہ زیب کو یکسر بدل ڈالا۔'' وہ پھر سانس لینے کو رکیں۔ ''ہوا یہ کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ خیال تھا کہ موسمی بخار ہے۔ دو ایک دن میں لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جائے گا لیکن چند روز بعد اس کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگے۔ لوگوں نے بتایا کہ اسے پولیو ہو گیا ہے۔ سب دن رات اس کی خدمت کرتے اور صحت یابی کے لیے دعا مانگتے۔ وہ کئی ماہ تک بیمار رہا۔ اس کا ہر وہ علاج کیا گیا جو کسی نے بتایا بہرحال وہ صحت یاب ہوا تو اس کا بایاں ہاتھ اور بائیں ٹانگ سوکھ چکی تھی۔ اسے بیساکھی کی ضرورت تو نہ پڑی لیکن اس کی صورتِ حال بڑی مضحکہ خیز ہوگئی۔ سب لوگ پہلے بھی اس پر جان چھڑکتے تھے، اس کی بیماری کے بعد اسے مزید چاہنے لگے۔ سب کے لیے اس کی حیثیت ایک خزانے کی سی تھی جس کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنا سب کا اہم فرض منصبی تھا۔ تبھی وہ حادثہ رونما ہو گیا جس کے بارے میں ہم سب نے اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ شاہ زیب اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے والد کے پاس رہتا تھا۔'' آنٹی پھر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئیں ان کی معصوم آنکھیں خلا میں یوں گھورنے لگیں۔ جیسے کچھ دیکھنے کی کوشش کررہی ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''میں ان دنوں تمہاری والدہ کے پاس رہنے آئی ہوئی تھی۔ گاؤں کے کھیتوں میں ایک لڑکی مردہ پائی گئی۔ اس پر مجرمانہ حملہ کر کے گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ لوگوں نے شاہ زیب پر شبہ کا اظہار کیا کیوں کہ وہ آخری شخص تھا جو اس لڑکی سے گفتگو کرتا ہوا دیکھا گیا تھا مگر وہ کسی کو مل نہیں رہا تھا۔ اس لیے گاؤں والوں کو اس پر شبہ ہو رہا تھا لیکن کسی کے پاس ثبوت بھی نہیں تھا اور گھر والے اس کی حفاظت کے لیے بھی تیار تھے۔ اسی لیے سب کے سب اسے ڈھونڈنے نکل پڑے۔ لڑکی والوں نے شاہ زیب پر شک کا اظہار کیا تھا اس لیے پولیس بھی اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ پولیس کے ہاتھ تو نہ آیا مگر گھر والوں نے اسے پہاڑیوں میں تلاش کر لیا اور اسے گھر لے آئے پھر باری باری سے اسے اپنے ہاں پناہ دینا شروع کردیا۔ اسی دوران میری زندگی میں ایک نوجوان داخل ہوا۔ بڑی بڑی گہری آنکھوں اور سیاہ بالوں والا نوجوان۔ وہ قریبی شہر میں وکالت کرتا تھا اور اس نے اپنی زندگی کو اپنے مقدس پیشے کے لیے وقف کردیا تھا۔ ہم دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے فوراً بعد جب میرے شوہر کو یہ

سب معلوم ہوا تو اس نے اس بات کی شدید مخالفت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ سارا معاملہ عدالت پر چھوڑ دینا چاہیے۔ شاہ زیب بے گناہ ہے تو وہ باعزت بری ہو جائے گا اور اگر اس سے واقعی کوئی جرم سرزد ہوا ہے تو اسے اس کی سزا ملنی چاہیے لیکن سب نے ان کی بات کو ہنسی میں ٹال دیا لیکن ایک رات جب میں اور میرا شوہر تمہاری والدہ کے ہاں کھانے پر گئے تو میرے شوہر کو وہاں شاہ زیب کی موجودگی کا علم ہو گیا۔ انہوں نے خفیہ طور پر پولیس کو خبر کر دی وہاں چھاپا پڑا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ شاہ زیب کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ کیس چلنے لگا۔ کسی کے پاس زیادہ رقم نہ تھی۔ سب نے اپنے اپنے سونے کے سیٹ بیچ دیے۔ گھر رہن رکھوا دیے۔ زمینیں بیچ ڈالیں۔ بچوں کی تعلیم منقطع کرا دی اور ہزاروں کے مقروض ہو گئے۔ صرف اس لیے کہ شاہ زیب کو قانون کے شکنجے سے آزاد کرا سکیں۔ سب نے عدالت میں جھوٹے بیانات دیے اور شواہد پیش کیے جن کا حقیقت سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ بڑی بڑی رشوتیں دے کر گواہوں کا انتظام کیا جنہوں نے عدالت کو بتایا کہ مبینہ واقعے کے وقت شاہ زیب ان کے پاس تھا۔ عدالت نے شاہ زیب کو رہا کر دیا لیکن سب بہن بھائی اس وقت تک بالکل تباہ و برباد ہو چکے تھے اور روزگار کی تلاش میں دور دراز کے علاقوں میں منتقل ہوتے چلے گئے۔ خاندان تتر بتر ہو گیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ تمہارے دادا حکم دیتے لیکن کسی کو اس کی پروا نہ ہوتی۔ شاہ زیب ان کے پاس تھا۔ ہرے بھرے کھیتوں اور پہاڑوں پر گھوم پھر کر اس کی وہ صحت بحال ہو گئی تھی جو جیل میں رہ کر برباد ہوئی تھی۔ وہ کبھی کبھی لنگڑاتا ہوا اپنے بہن بھائیوں سے بھی ملنے چلا جاتا تھا۔ اسے اگر کوئی دکھ تھا تو یہ کہ ہمارا مثالی خاندان ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔''

آنٹی پھر خاموش ہو گئیں اور دیر تک اسی طرح بیٹھی رہیں۔ ان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھلک رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے تیر رہے تھے۔ میں نے اپنے رومال سے ان کی پیشانی اور آنکھیں خشک کیں۔ مجھے تکلیف ہو رہی تھی کہ میں نے انہیں ماضی کی باتیں یاد دلائیں مگر میں مجبور تھی۔ مجھے بہرحال اصل صورتِ حال معلوم کرنا تھی۔

''پھر کیا ہوا آنٹی؟''

''گھر کے پاس ہی کچھ خانہ بدوشوں نے قیام کیا تھا۔ ایک شام کو جب تمہارے دادا جان برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کسی لڑکی کی چیخوں کی آواز سنی۔ وہ تیزی سے باہر نکلے اور آوازوں کی طرف دوڑ پڑے۔ آوازیں مکان کے عقب سے آ رہی تھیں جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ لڑکی کے کپڑے ایک طرف پڑے ہیں اور شاہ زیب مجرمانہ حملے کے بعد اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ تمہارے دادا کو معلوم ہو گیا کہ ہماری ساری قربانیاں رائیگاں گئیں۔ خاندان کے افراد ایک ظالم اور گناہ گار شخص کو تحفظ دینے کے جرم میں ایک ایک پائی کے محتاج ہو گئے۔'' آنٹی نے اپنے آنسوؤں کو بہنے دیا۔ ''تمہارے دادا سب سے زیادہ رحم دل شخص تھے۔ لیکن وہ ایک سخت مزاج جج بھی تھے چنانچہ......'' آنٹی نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''چنانچہ انہوں نے شاہ زیب کو پتھر سے بنے ہوئے اس کیبن میں جسے ہم سحر منزل کہتے ہیں قید کر دیا۔ جب سے میرے شوہر نے ان کے اعتماد اور خاندانی تحفظ کو ٹھیس پہنچائی تھی انہیں کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ شاہ زیب کہاں ہے؟ اور اسے کیا سزا دی گئی ہے؟ وہ خود ہی آندھی ہو یا بارش پابندی کے ساتھ اسے کھانا پانی پہنچاتے رہے۔ پھر ایک روز ان پر اچانک فالج گرا، انہیں فوراً ہی اسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ دو ہفتوں تک زندگی اور موت کے درمیان معلق رہے۔ وہ نہ کچھ کہہ سکتے تھے نہ ہل سکتے تھے۔ مرنے سے چند گھنٹے پہلے انہیں ہوش آیا اور انہوں نے ہم سے پہلی اور آخری بات کی۔ ہمیں اس وقت معلوم ہوا کہ شاہ زیب کہاں ہے لیکن تب تک شاہ زیب کھانے اور پانی کے بغیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ چکا تھا۔ خاندان کے سارے افراد اکٹھا ہوئے اور سب نے قسم کھائی کہ کسی شخص سے اس کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ اس وقت میں بھی وہاں موجود تھی ہم نے شاہ زیب کی لاش کو سحر منزل میں ہی دفن کر دیا کیوں کہ اگر ہم اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کرتے تو دنیا کو معلوم ہو جاتا کہ شاہ زیب کتنا خراب شخص تھا۔ میری بیٹی!'' آنٹی نے کہا۔

ان کے آنسو خود بخود خشک ہو گئے تھے اور گالوں پر گہرے نشانات کی لکیریں چھوڑ گئے تھے۔ ''تم نے سحر منزل کی کھڑکی سے شاہ زیب کی لاش کو دیکھا تھا۔''

کاوش

محترم و مکرم معراج رسول صاحب
سلامِ تہنیت

انسان نفسیاتی پیچیدگیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ میرا نہیں میرے امریکن ڈاکٹر زیسکو کا کہنا ہے.... وہی مجھے نفساتی اندھیرے کی دنیا سے واپس کھینچ لایا ہے اس لیے کہ میں ایک عجیب و غریب بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔ اسی کی روداد لکھ رہا ہوں۔

فیصل حامد
(کراچی)

''نوری باجی۔'' میری چیخ نے کئی راہگیروں کو چونکا دیا تھا۔ کئی عورتوں نے مڑ کر دیکھا لیکن جسے دیکھنا تھا اس نے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی ہنڈا اسوک کی طرف بڑھی اور کسی طرف دیکھے بغیر گیٹ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس کا ڈرائیور تیار بیٹھا تھا۔

میں جب تک فٹ پاتھ سے سڑک پر آتا گاڑی نے دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ منظر بھی خوب تھا کہ میں بھاگتی ہوئی گاڑی کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کئی مرتبہ نورین باجی کو آوازیں بھی دی تھیں جو ٹریفک کے شور میں دب گئی

ہوں گی۔

بہترین سوٹ میں ملبوس کسی نوجوان کو اس طرح دوڑتے ہوئے دیکھ کر لوگ حیران ضرور ہوئے ہوں گے۔ میرا حلیہ پاگلوں والا تو نہیں تھا وہ یقیناً یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ گاڑی والا کوئی واردات کرکے بھاگا ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ جب میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا اور گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تھی تو اس وقت ایک ٹریفک سارجنٹ میرے پاس آیا تھا اور مجھ سے میرے بھاگنے کا سبب پوچھا تھا۔ میں نے اسے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا اور سڑک چھوڑ کر فٹ پاتھ پر آگیا تھا۔ فٹ پاتھ پر آتے ہی میں ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا تھا تاکہ سکون سے بیٹھ کر کچھ دیر قبل ہونے والے واقعے پر غور کرسکوں۔

ریسٹورنٹ کے سرد ماحول نے جب ذرا حواس بحال کیے تو میں نے غور کرنا شروع کیا۔ وہ نورین باجی ہی تھیں یا مجھے شبہ ہوا تھا۔ میں نے زور سے سر جھٹکا، ہرگز نہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میری آنکھوں نے دھوکا کھایا ہو۔ ہرچند کہ میں انہیں بیس بائیس برس بعد دیکھ رہا تھا لیکن وہ وہی تھیں۔ میں انہیں بھول ہی نہیں سکتا تھا، پھر انہوں نے مڑ کر کیوں نہیں دیکھا؟ ہوسکتا ہے انہوں نے میری آواز سنی ہی نہ ہو۔ وہ اپنے خیالات میں گم ہوں اور گاڑی میں بیٹھ گئی ہوں۔ میں اتنا بے حواس ہوگیا تھا کہ گاڑی کا نمبر بھی نوٹ نہ کرسکا۔ نمبر پلیٹ کی مدد سے نورین باجی کو تلاش کیا جاسکتا تھا۔ مجھے دوڑنے کی بجائے نمبر نوٹ کرنا چاہیے تھا۔ یہاں تک پہنچ کر میرے سوچنے کی رفتار تھم گئی۔ مجھے اپنی غلطی پر شدت سے افسوس ہو رہا تھا۔

نورین باجی کون تھیں اور میں انہیں کیوں تلاش کررہا تھا۔ یہ جاننے کے لیے آپ کو میرے ساتھ ماضی کی طرف جانا ہوگا، اس کے بغیر یہ گتھی سلجھ نہیں سکتی۔

یہ اب سے بیس بائیس برس پہلے کی بات ہے جب ہم کراچی کے علاقے ناظم آباد میں رہتے تھے۔ اس وقت میری عمر بہ مشکل دس سال ہوگی۔ اس عمر کے بچے کھیل کود کے دیوانے ہوتے ہی ہیں لیکن میں کچھ زیادہ ہی کھلنڈرا تھا اور جس دن سے میرے والد روزگار کے سلسلے میں دبئی گئے تھے اس دن سے تو میرے پر لگ گئے تھے۔ دو چار شرارتی بچے اور میرے ساتھ لگ گئے تھے۔ ہم نے پورے محلے کا ناطقہ بند کررکھا تھا۔ کوئی نہ ملتا تو میں اکیلا ہی چھت پر پتنگ اڑاتا رہتا۔ ایک دن میری پتنگ نورین باجی کی چھت پر گری اور کسی ایسی جگہ گری کہ کوشش کے باوجود میں اسے کھینچ نہ سکا۔ نورین باجی کا گھر میرے گھر سے چھٹا گھر تھا۔ میں خاموشی سے نیچے اترا اور ان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر مجھے نورین باجی کی والدہ کا خیال آیا۔ میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ پورے محلے میں سخت لڑاکا مشہور تھیں۔ بچے تو ان کا نام سن کر کانپتے تھے۔ میں بھی کانپنے لگا۔ اگر دروازے پر وہ آئیں تو پتنگ تو کیا ملے گی میری چٹنی بنادیں گی۔ میں نے سوچا پھر کیا کروں، مجھے فاخر کا خیال آیا اس کا گھر بالکل برابر میں تھا اور چھت سے چھت ملی ہوئی تھی۔ وہ ان کی چھت پر جاکر پتنگ لاسکتا تھا۔ فاخر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔

”خالہ، فاخر کہاں ہے؟“ میں نے اس کی والدہ سے پوچھا۔

”بیٹا، ابھی تو گھر پر ہی تھا۔ تمہاری طرف گیا ہوگا یا چھت پر دیکھ لو، شاید وہاں ہو۔“ میں اسے دیکھنے چھت پر چلا گیا۔ وہاں تو اس کی خوشبو بھی نہیں تھی۔ میں اسے وہاں نہ پاکر پلٹا ہی تھا کہ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا۔ فاخر تو جانے کہاں ہو میں نورین باجی کے گھر خود ہی چلا جاؤں۔ چھت پر ہی تو جانا ہے۔ پتنگ اٹھا کر لے آؤں گا۔ دوپہر کا وقت ہے کوئی دیکھے گا بھی نہیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور چھوٹی سی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گیا۔ میری شامت آئی تھی کہ نورین کی والدہ اسی وقت کپڑے پھیلانے چھت پر آگئیں۔ لڑکوں نے ان کا نام خالہ چراندی صحیح رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی چور چور کا شور مچانا شروع کردیا اور مجھے پکڑ لیا۔ نورین باجی نے شور سنا تو وہ بھی اوپر آگئیں۔ بے اختیار ان کی ہنسی نکل گئی۔ ”امی، یہ تو فیصل ہے کوئی چور وور نہیں ہے۔“

”ارے کیا چوروں کے نام نہیں ہوتے۔ اس کا نام فیصل ہوگا مگر یہ ہے چور ورنہ یہ ہماری چھت پر کیا کررہا ہے؟“

اب میں نے ضروری سمجھا کہ اپنی صفائی میں کچھ کہوں۔ ”میں تو اپنی پتنگ لینے آیا تھا وہ دیکھو وہ پڑی ہے۔“

”پہلے پتنگ گرادی پھر چوری کرنے چھت پر آگیا۔ میں خوب جانتی ہوں چوروں کی حرکتیں۔ ابھی رسی سے باندھ کر ماروں گی تو سب اگل دو گے۔“

نورین باجی میرے آنسوؤں سے پگھل گئی تھیں۔ وہ اپنی ماں سے باقاعدہ الجھ پڑیں۔ ''امی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیوں معصوم پر چوری کا الزام لگا رہی ہیں۔ یہ ارسلان صاحب کا بیٹا ہے جو دبئی گئے ہوئے ہیں۔ باپ گھر میں نہ ہو تو بچے اس طرح گلیوں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔''

''اس کا باپ دبئی گیا ہوا ہے؟''

''ہاں۔''

''پھر تو یہ پیسے والے لوگ ہوں گے؟''

''مجھے نہیں معلوم میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ یہ چور نہیں ہے۔ چھوڑ دیں اسے۔''

خالہ پر میرے آنسوؤں کا اثر ہوا تھا یا میرے والد کے دبئی جانے کا کہ انہوں نے فوراً میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں بھاگا اور اپنی پتنگ اٹھائی اور دوبارہ اسی دیوار کی طرف جانے لگا جس طرف سے آیا تھا۔

''فیصل!'' نورین باجی نے مجھے آواز دی۔ ''انسانوں کی طرح زینہ اتر کر جاؤ، چوروں کی طرح دیوار پھلانگ کر نہیں۔'' انہوں نے مجھے زینے کی راہ دکھائی۔

ان کے گھر سے نکل کر جیسے تیسے میں اپنے گھر پہنچا۔ نورین باجی کا خیال میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ان کی مہربانی سے مجھے نجات مل گئی ورنہ چوری کا الزام تو مجھ پر لگ ہی چکا تھا۔ میں یہ سوچ کر ہی کانپنے لگا کہ خالہ اگر میرے ہاتھ پکڑ کر امی کے پاس لے آتیں اور انہیں بتاتیں کہ میں ان کے گھر چوری کی نیت سے داخل ہوا تھا تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ محلے کے سارے لڑکوں میں میری بدنامی الگ ہو جاتی۔

مجھے نورین باجی پر رہ رہ کر پیار آ رہا تھا۔ رات کو سونے کے لیے لیٹا تو انہی کا خیال میرے ساتھ سویا۔ صبح سو کر اٹھا تو ان کی مہربانی کے صلے میں انہیں کوئی تحفہ دینے کا خیال آیا۔ وہ خوش ہو جائیں گی اور پھر کبھی پکڑا گیا تو وہ مجھے پھر بچا لیں گی۔ انہیں کیا تحفہ دیا جائے؟ میں نے امی کی چیزوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ ابو پچھلی مرتبہ آئے تھے تو امی کے لیے کئی گھڑیاں لے کر آئے تھے۔ ایک گھڑی ایسی تھی جو ابھی تک ڈبے میں بند تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ چوری کی، ڈبے کو گھڑی سمیت اٹھا کر اپنے کپڑوں میں چھپا دیا۔ موقع دیکھ کر گھڑی اٹھائی اور نورین باجی کے گھر پہنچ گیا۔ اب مجھے ان کی ماں کی طرف سے کوئی ڈر نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ کچھ کہیں گی تو نورین باجی مجھے بچا لیں گی۔ دروازے پر نورین باجی آئی تھیں۔

''پھر پتنگ لینے آئے ہو؟''

''نہیں نورین باجی، میں تو آپ کے لیے تحفہ لے کر آیا ہوں۔''

''اندر آ کر بتاؤ کیسا تحفہ لائے ہو اور کیوں لائے ہو؟''

''خالہ تو کچھ نہیں کہیں گی؟''

''وہ گھر پر نہیں ہیں اندر آ جاؤ۔''

میں اندر گیا اور گھڑی ان کے سامنے رکھ دی، وہ گھڑی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔

''اتنی قیمتی گھڑی تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟''

''آپ نے بھی تو خالہ سے میری جان چھڑوائی تھی۔''

''گھڑی کہاں سے چرائی ہے؟''

''واہ...... چراتا کیوں یہ تو ابو نے دبئی سے بھیجی تھی۔''

''تمہاری امی کے لیے بھیجی ہو گی؟''

''ہاں۔''

''اور تم میرے لیے لے آئے؟''

''امی کے پاس تو بہت سی گھڑیاں ہیں۔''

''تم اپنی امی سے پوچھ کر لائے ہو؟''

''نہیں پوچھا تو نہیں تھا۔''

''یہ گھڑی فوراً لے جاؤ اور جہاں سے لائے ہو وہیں لے جا کر رکھ دو۔'' اسی وقت خالہ گھر میں داخل ہوئیں اور مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''یہ بے غیرت پھر آ گیا اب کیا چرانے آیا ہے؟''

''ارے امی، تم تو خواہ مخواہ اس بے چارے کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ یہ تو میرے لیے یہ گھڑی لے کر آیا ہے۔'' نورین باجی نے گھڑی ان کے سامنے رکھ دی۔

''ارے گھڑی تو بہت اچھی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس کا باپ دبئی میں ہے، بہت پیسے والے ہوں گے یہ لوگ۔ میں آج اس کے گھر شکریہ ادا کرنے جاؤں گی آخر محلے داری ہے ملتے جلتے رہنا چاہیے۔''

''ہاں ہاں چلی جانا۔''

یہ سنتے ہی میرا تو دم نکل گیا تھا۔ یہ گھڑی میں امی سے پوچھ کر نہیں لایا تھا۔ اگر خالہ نے بتا دیا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا خالہ کے اٹھتے ہی میں نے نورین باجی کے آگے ہاتھ

جوڑ لیے۔

''نورین باجی، مجھے بچالو اگر خالہ نے میری امی کو بتا دیا تو چوری پکڑی جائے گی۔''

''دو فکر مت کرو، میں تمہیں پھنسنے نہیں دوں گی۔ تم یہ گھڑی لے جاؤ اور جہاں سے لی تھی وہیں رکھ دو باقی میں سنبھال لوں گی۔''

''اور خالہ؟''

''میں نے کہا نا کہ میں سنبھال لوں گی۔''

''اچھا میں چلتا ہوں۔''

''تمہارا جب جی چاہے آجایا کرو۔''

''اچھا نورین باجی۔''

میں مطمئن ہو کر گھر آ گیا۔ گھڑی اپنی جگہ رکھ دی اور کھیلنے کے لیے باہر نکل گیا۔

شام کے اس وقت میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا جب نورین باجی کی والدہ میرے گھر میں داخل ہوئیں۔ خطرے کی گھنٹی بڑے زور سے بجی۔ خالہ یقیناً اس گھڑی کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں گی، گھڑی یقیناً گھر میں تھی لیکن یہ تو ظاہر ہو جاتا کہ میں نے گھڑی دی ہے۔ امی سوچ سکتی ہیں کہ کوئی اور گھڑی دی ہو گی۔ اس وقت تو نورین باجی ان کے ساتھ نہیں تھیں۔ بس اتنی ڈھارس ضرور تھی کہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ سب سنبھال لیں گی۔

امی نے خالہ کا استقبال اس طرح کیا جیسے وہ ان سے بہت خوش ہوں حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ خالہ کو اچھی عورت نہیں سمجھتیں۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ اس عورت کے سائے سے بھی بچنا چاہیے، بہت ہی لڑاکا ہے بھئی۔

میں امی کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا تاکہ دونوں کی باتیں سن سکوں۔ خالہ زیادہ تر ابو کی ملازمت اور دبئی وغیرہ کی باتیں کر رہی تھیں یا پھر بات بات پر امی کی تعریف کر رہی تھیں۔ میں انتظار میں تھا کہ شاید گھڑی کی بات نکلے لیکن خالہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میں دل ہی دل میں نورین باجی کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ انہوں نے بات سنبھال لی۔ خالہ کو سمجھا بجھا کر بھیجا ہے۔ جب خالہ جانے لگیں تو امی نے انہیں ایک سوٹ پیس دیا۔

''فیصل کے ابو نے یہ سوٹ پیس میرے لیے بھیجا تھا۔ میرے پاس تو اس کلر کا سوٹ پہلے ہی موجود ہے۔ اس کپڑے کا سوٹ آپ بنوا لیجیے گا۔ میں سمجھوں گی میں نے پہن لیا۔''

خالہ نے کپڑا ہاتھ میں لیتے ہوئے۔ ''اے ہے دبئی کے کپڑے کی تو بات ہی اور ہے۔ ایک یہاں کا کپڑا ہوتا ہے کم بخت ٹاٹ کی طرح۔ کوئی اور سوٹ پیس پڑا ہو تو مجھے دے دینا میں پیسے دے دوں گی۔''

''خالہ پیسوں کی کیا بات ہے، کبھی کوئی ایسا کپڑا آیا تو آپ کو ویسے ہی دے دوں گی۔'' ان کے جاتے ہی امی اصلیت پر آ گئیں۔ خالہ کو غائبانہ طور پر سیکڑوں سنائیں۔

''جب خالہ اتنی بری ہیں تو آپ نے انہیں تحفہ کیوں دیا؟''

''تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ ایسے لوگوں سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔ میں نے بھی ان کا منہ بند کرنے کے لیے انہیں تحفہ دے دیا ورنہ اس عورت سے کوئی بعید نہیں کہ اِدھر اُدھر بیٹھ کر ہمارے خلاف نہ جانے کیا کیا بیان کرتی پھرتی۔''

اس روز کے بعد سے نورین باجی کی والدہ ہر دوسرے تیسرے دن ہمارے گھر آنے لگیں۔ مجھ پر تو وہ واری صدقے تھیں، ایک روز انہوں نے میری امی سے میرے متعلق بات کی۔

''فیصل کو میں دیکھتی ہوں کہ دن بھر کھیلتا پھرتا ہے باپ سر پر نہ ہو بچوں کے ساتھ تو یہی ہوتا ہے۔ تم اگر مناسب سمجھو تو اسے میرے گھر پڑھنے کے لیے بھیج دیا کرو۔ میری بیٹی نے ماشاءاللہ انٹر کیا ہے، وہ فیصل کو پڑھا دیا کرے گی۔''

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ کو خوامخواہ زحمت ہوگی۔''

''بھلا اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ اب تم میرے لیے غیر تو رہی نہیں ہو۔ فیصل میرا اپنا بچہ ہے۔ میں تو اس کا بھلا ہی چاہوں گی۔ میرے گھر دو چار گھنٹے گزارے گا تو محلے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے بچ جائے گا۔''

''میں فیصل کو پڑھنے کے لیے آپ کے گھر بھیج دوں گی لیکن ایک شرط پر، میں نورین کو ٹیوشن فیس دیا کروں گی۔''

''بھئی وہ تمہارا اور نورین کا مسئلہ ہے، میں اس میں کچھ نہیں بولتی۔''

مجھے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں یہ پیشکش سن کر صرف اس لیے خوش ہوا تھا کہ نورین باجی سے روز ملاقات ہوا کرے گی۔

میں پڑھائی کا چور تھا اس لیے امی مجھے سمجھانے بیٹھ گئیں تاکہ میں ٹیوشن پر جانے سے انکار نہ کروں لیکن جب میں فوراً مان گیا تو انہوں نے مجھے شاباش دی۔ ان دنوں اسکول کی چھٹیاں تھیں اس لیے امی مجھے دوسرے دن صبح نورین باجی کے گھر لے کر پہنچ گئیں۔

میں باقاعدگی سے ان کے گھر پڑھنے کے لیے جانے لگا تھا۔

ایک روز نورین باجی کو نہ جانے کیا شرارت سوجھی۔ وہ میرے بالکل قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

''فیصل یہ بتاؤ میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟''

''بہت اچھی۔''

''مگر کیوں...... کیا اس لیے کہ میں تمہاری ٹیچر ہوں؟''

''نہیں بلکہ اس لیے کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''میں تو روز آئینہ دیکھتی ہوں میں تو اپنے آپ کو کہیں سے خوب صورت نہیں لگتی۔''

''کوئی خود کو خوب صورت تھوڑی لگتا ہے، وہ تو دوسروں کو لگتا ہے۔''

''واقعی تم تو بڑے تیز ہو میں تو تمہیں بدھو سمجھتی تھی۔''

اس قسم کی باتیں روز ہی ہونے لگی تھیں۔ گھر جا کر میں دل ہی دل میں ان باتوں کو دہراتا رہتا تھا۔ نورین باجی مجھے روز بروز اچھی سے اچھی لگنے لگی تھیں۔ اکثر خواب میں دیکھا کرتا تھا کہ نورین باجی دلہن بنی ہیں اور میں دولہا پھر ایک دن یہ خواب میں نے جاگتے میں دیکھا۔ خالہ کہیں گئی ہوئی تھیں۔ نورین باجی گھر میں اکیلی تھیں۔ پڑھائی ختم ہوگئی تھی، نورین باجی نے مجھے ضد کر کے روک لیا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ ان پر کوئی دورہ پڑا تھا کہ انہوں نے مجھ سے یہ عجیب سا سوال کر ڈالا۔

''فیصل اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ میں دلہن بنوں اور تم دولہا؟''

''یہ تو شادی میں ہوتا ہے۔''

''یہی تو پوچھ رہی ہوں مجھ سے شادی کرو گے؟''

''ہاں باجی کروں گا۔ بڑا مزہ آئے گا اچھے اچھے کپڑے پہنوں گا۔ سہرا باندھوں گا اور پھر آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ شادی میں تو یہی تو ہوتا ہے۔''

''ارے بدھو یہ بھی تو سوچو کہ تم صرف دس سال کے ہو اور میں اٹھارہ سال کی۔''

''تو کیا ہوا؟''

''دولہا بڑا ہوتا ہے دلہن چھوٹی ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے تو جب میں بڑا ہو جاؤں گا اس وقت شادی کرلوں گا۔''

''تم بڑے ہوگئے تو کیا میں بڑی نہیں ہو جاؤں گی۔ تم چھوٹے ہو تو چھوٹے ہی رہو گے۔''

''پھر ایسا کرتے ہیں شادی نہیں کرتے۔''

''بس اتنی جلدی ہار مان گئے۔ تم کیسے مرد ہو؟''

''پھر کیا کروں؟''

''ایسا کرتے ہیں ہم کچھ دن کے لیے غائب ہو جاتے ہیں جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو میں دوبارہ اٹھارہ سال کی ہو کر آ جاؤں گی پھر شادی کر لینا۔''

''مجھے پتا ہے آپ مذاق کر رہی ہیں۔ ایسا کبھی ہو سکتا ہے جو چھوٹا ہے وہ چھوٹا ہی رہتا ہے چاہے کتنا ہی بڑا ہو جائے۔''

''میں مذاق نہیں کر رہی ہوں دیکھ لینا ایک دن میں غائب ہو جاؤں گی اور پھر اٹھارہ کی ہو کر آ جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں شادی کرلوں گا۔''

ایک خواب میں نے دیکھا تھا جو پورا ہوا۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں دولہا بنا ہوں اور نورین باجی دلہن۔ اس وقت یہی باتیں ان کے اور میرے درمیان ہو رہی تھیں۔ دوسرا خواب وہ دیکھ رہی تھیں کہ وہ کہیں غائب ہو جائیں گی اور جب آئیں گی تو اٹھارہ سال کی ہوں گی۔ یہ دیوانے کا خواب سہی لیکن تھا تو خواب ہی۔ اس کی تعبیر اسی طرح نکلی کی ایک دن اچانک ابو دبئی سے آگئے۔ انہوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ ان کا کاروبار چل نکلا ہے اور اب وہ اس قابل ہوگئے ہیں کہ مجھے اور امی کو بھی دبئی لے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے وہاں اسنیک بار کھولا تھا اور اب دو اسنیک بار ہوگئے تھے۔ اب ان کا ارادہ یہ تھا کہ باقاعدہ ریسٹورنٹ کھولیں گے۔ امی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ فوراً تیار ہوگئیں۔ دبئی جانے کی خوشی نے مجھے بھی بوکھلا دیا تھا۔ میں اسی وقت نورین باجی کے گھر گیا تھا اور انہیں یہ خوش خبری سنادی تھی۔ خبر سنتے ہی میں نے دیکھا تھا کہ وہ دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی تھیں۔ انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں بڑی حسرت سے کہا تھا۔

''تم تو کہہ رہے تھے کہ میں تم سے شادی کروں گا۔''

''میں نے کب! یہ تو آپ نے کہا تھا بلکہ مجھ سے پوچھا تھا۔''

''تو کیا مجھ سے شادی نہیں کرو گے؟''

''اب کیسے کر سکتا ہوں اب تو میں دبئی جا رہا ہوں۔''

''تم بڑے ہو کر واپس آ جانا اور پھر مجھ سے شادی کر لینا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس وقت تک میں کمانے بھی لگوں گا۔''

میں اس وقت شادی کے مفہوم سے تو واقف نہیں تھا بس یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ نورین باجی میری دلہن بن کر میرے گھر چلی آئیں گی۔

دبئی روانگی کی تیاری میں ایک مہینا لگ گیا۔ اس ایک مہینے میں میں نورین باجی کے گھر جا رہا تھا لیکن دبئی جانے کی خوشی میں مجھے نورین باجی سے بچھڑنے کا افسوس بھی نہیں ہو رہا تھا البتہ نورین باجی بجھ کر رہ گئی تھیں۔ ان کا اب بس ایک کام رہ گیا تھا کہ جب تک میں ان کے گھر بیٹھا رہوں وہ مجھے زیادہ سے زیادہ چیزیں کھلاتی رہیں۔

مجھے دبئی جانے کی ایسی خوشی تھی کہ جس دن ہمیں روانہ ہونا تھا اس دن مجھے نورین باجی کا خیال بھی نہیں آیا۔ ہماری ٹیکسی جب ان کے دروازے کے سامنے سے گزری تو میں نے دیکھا وہ اپنے دروازے پر کھڑی ہیں اور ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہہ رہی ہیں۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ نورین باجی سے تو ملا ہی نہیں مگر اب افسوس کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ اگلے چند گھنٹے ائرپورٹ پہنچنے اور جہاز میں بیٹھنے میں گزر گئے۔ نورین باجی کا خیال آیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ آتی ہوتیں تو وہ بھی جہاز دیکھ لیتیں۔ میں اداس ہو گیا۔ مجھے نورین باجی شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ جہاز ہی میں مجھے بخار چڑھ گیا۔ دبئی پہنچ کر جب ہم گھر پہنچے تو بقول شخصے میں ہاتھوں میں آ گیا۔ بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ امی نے مجھے بعد میں بتایا کہ میں بے ہوشی کی حالت میں نورین باجی کا نام لے رہا تھا۔

جب میں ٹھیک ہو گیا اور بدن میں کچھ جان آئی تو ابو مجھے دبئی کی سیر کو لے کر نکلے۔ میں نے ایسا شہر کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ بڑی بڑی عمارتوں اور شاندار سڑکوں کو دیکھ کر میرا دل بہل گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ نورین باجی کا خیال بھی دل سے نکلتا چلا گیا۔ یہاں آنے کے دو تین ماہ بعد ابو ہم سب کو لے کر عمرہ کرنے گئے۔ یہ سعادت بھی حاصل ہو گئی۔

اب میری پڑھائی کا مسئلہ درپیش تھا۔ یہاں کے تعلیمی معیار کے مطابق میں بہت پیچھے تھا بہرحال ایک اسکول میں داخلہ مل گیا۔

اسکول میں داخل ہونے کے بعد مجھے ایک مرتبہ پھر نورین باجی کا خیال آ گیا۔ اگر وہ یہاں ہوتیں تو میں ان سے ٹیوشن پڑھ لیتا۔ اسی وقت میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ میں انہیں خط لکھوں، مجھے اپنے گھر کا نمبر معلوم تھا اسی سے حساب لگایا کہ نورین باجی کے گھر کا نمبر کیا ہوگا۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں خط لکھا اور ان کے نام پوسٹ کر دیا۔ اس خط کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس کے بعد میں نے کوئی خط نہیں لکھا کہ جب کبھی کراچی جانا ہوا ان سے مل لوں گا۔

ابو کی آمدنی اچھی خاصی تھی۔ دبئی جیسے مہنگے شہر میں ہماری بڑے آرام سے گزر ہو رہی تھی۔ میں نے اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ نورین باجی کو میں بالکل ہی بھول چکا تھا۔

میں نے اسکول پاس کر لیا اور کالج میں چلا گیا۔ جب میں نے بی اے پاس کر لیا تو ابو نے اعلیٰ تعلیم کے لیے مجھے لندن بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

کراچی میں نہ تو ابو کی طرف کا کوئی قریبی رشتے دار تھا اور نہ امی کی طرف کا لہٰذا اس عرصے میں کراچی جانا ہی نہیں ہوا۔ ابو نے مجھے اپنے کاروبار سے دور رکھا تھا لہٰذا یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر کراچی کا چکر لگا لیتے۔ کراچی والا مکان ہم ایک معقول آدمی کو کرایے پر دے آئے تھے کہ کسی وقت آ کر فروخت کر دیں گے۔ پھر جانا ہی نہیں ہوا۔ کرایے دار باقاعدگی سے ہمارا کرایہ ابو کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیا کرتے تھے اس لیے بھی فکر نہیں تھی۔

مجھے لندن کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ میں جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ابو کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا۔ سارے خواب دھڑام سے زمین پر گر گئے۔ اب اگر میں لندن چلا جاتا تو کاروبار کی دیکھ بھال کون کرتا، امی کو کون سنبھالتا۔ میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی تھی کہ میں دبئی میں زندگی گزارنے کے لیے ابو کے کاروبار کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاؤں۔

دو اسنیک بار تھے اور دونوں خوب چل رہے تھے۔ ملازمین موجود تھے، مجھے تو صرف وہاں جا کر بیٹھنا تھا اور حساب کتاب رکھنا تھا۔ تجربہ نہیں تھا لیکن مجبوری تھی اپنی دانست میں کاروبار سنبھالتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی ہوتا چلا گیا۔ دو سال گزر گئے تھے کہ اچانک مجھے

پاکستان یاد آنے لگا۔ میں نے سوچا کہ جب مجھے اسنیک بار چلانے کا تجربہ ہو ہی چکا ہے تو پاکستان جا کر یہی کاروبار وہاں کیوں نہ شروع کروں، میں نے امی سے ذکر کیا وہ بھی فوراً تیار ہو گئیں۔ بات یہ ہے کہ آدمی کہیں چلا جائے اسے وطن کی یاد ضرور آتی ہے۔ کتنے ہی عیش مل جائیں اپنا ملک پھر اپنا ہوتا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ کاروبار وائنڈ اپ کرنا شروع کر دیا۔ کراچی میں اپنے کرایے دار کو بھی خط لکھ دیا کہ وہ ہمارا مکان خالی کر دے۔ ایک سال مزید لگ گیا بالآخر ہم کراچی جانے کے لیے جہاز میں بیٹھ گئے۔

میں نے کرایے دار کو خط لکھ دیا تھا کہ مکان خالی کر کے چابی پڑوس میں دے جائے لہٰذا جب ہم کراچی پہنچے تو پڑوس سے چابی لے کر گھر کھولا۔ مکان کی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ ہم اس میں رہ سکتے لیکن کیا کرتے کہاں جاتے لیکن پڑوسی اتنے اچھے نکلے کہ انہوں نے ایک کمرا ہمیں رہنے کے لیے دے دیا کہ جب تک آپ کے گھر کی مرمت وغیرہ نہ ہو جائے آپ یہاں رہ سکتے ہیں۔ میں نے فوراً مزدوروں کو لا کر گھر کی صفائی اور رنگ و روغن کا کام شروع کروا دیا۔ جو چیزیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں انہیں صحیح کروایا اور تقریباً دو ہفتوں بعد اپنے گھر میں شفٹ ہو گئے۔

ہم تیرہ سال بعد اپنے گھر آئے تھے۔ محلے میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ میں نے پرانے دوستوں کو تلاش کیا۔ کچھ کرایے پر تھے اور اب کہیں اور شفٹ ہو گئے تھے۔ کچھ روزی کی تلاش میں ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ کچھ سے ملاقات ہوئی تو اب ان کی باتوں میں پہلے جیسا خلوص نہیں تھا۔ اپنے اپنے دھندوں میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ میرے ساتھ کچھ وقت گزارتے۔ یہ بھی عجیب بات ہوئی کہ جب تک میں اپنے گھر میں شفٹ نہیں ہو گیا تھا مجھے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ کبھی اس محلے میں کوئی نورین باجی بھی رہتی تھیں۔ جب میں اپنے گھر میں شفٹ ہوا اور سونے کے لیے لیٹا تو پہلی ہی رات میں نے نورین باجی کو خواب میں دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ تمہیں آئے ہوئے اتنے دن ہو گئے اور مجھ سے ملنے تک نہیں آئے۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور پھر رات بھر جاگتا رہا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی بے حسی پر غصہ آ رہا تھا۔ نورین باجی بچپن میں میرا کتنا خیال رکھتی تھیں اور میں انہیں دیکھنے تک نہیں گیا۔ میں نے صبح اٹھتے ہی امی سے اس خواب کا ذکر کیا۔

''امی میں نے خواب میں نورین باجی کو دیکھا وہ گلہ کر رہی تھیں کہ میں ان سے ملنے نہیں آیا۔''

''تم اب بچے نہیں رہے ہو جو ملنے چلے جاؤ گے۔''

''جب بچپن میں جاتا تھا تو اب بھی جا سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے پردہ تھوڑی کریں گی۔''

''ذرا یہ بھی تو سوچو۔ انہیں بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم آگئے ہیں کیا وہ اور اس کی ماں ملنے نہیں آسکتی تھیں۔ بات یہ ہے کہ اب انہیں معلوم ہے کہ تم یا تمہارا باپ دبئی میں نہیں ہے وہ تو یہی سمجھ رہی ہوں گی کہ ہم لٹے پٹے آئے ہیں ان سے چار پیسے نہ مانگ لیں، لالچی بڑھیا۔''

''میں خالہ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہتا لیکن نورین باجی ایسی نہیں ہیں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے وہاں جانے کی جیسی ماں ہے ویسی ہی بیٹی ہوگی۔''

''اچھا میں نہیں جاتا آپ چلی جائیں۔ معلوم تو ہو وہ

کیسی ہیں۔ اگر وہ مجھ سے ملنا چاہیں گی تو ملنے آجائیں گی۔''

''میں تو تمہیں جانے سے منع کر رہی ہوں اور خود چلی جاؤں، ہرگز نہیں۔''

''امی آپ کو یہ معلوم نہیں ہوگا، جب ہم دبئی نہیں گئے تھے تو میں نے آپ کی گھڑی چرا کر نورین باجی کو دی تھی۔ انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا تھا اور گھڑی واپس کر دی تھی۔ اگر وہ لالچی ہوتیں تو نہ صرف گھڑی رکھ لیتیں بلکہ مجھے ترغیب دیتیں کہ میں اور چیزیں بھی چراؤں۔''

''وہ لالچی نہ سہی اس کی ماں تو ہے۔ ایسے لوگوں سے تعلق رکھنا ہی نہیں چاہیے۔''

''تعلق رکھنے کو کون کہہ رہا ہے۔ انہوں نے مجھے پڑھایا ہے بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ انہیں دیکھوں۔''

''وہ خود ہی کسی دن آجائیں گی دیکھ لینا۔''

امی نے مجھے زیادہ بات ہی نہیں کرنے دی۔ اب مجھ پر لازم ہوگیا تھا کہ میں امی کو بتائے بغیر نورین باجی کے گھر چلا جاؤں۔ میں چپکے سے نکلا اور نورین باجی کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے پر نیم پلیٹ لگی دیکھ کر میں چونکا۔ جب میں تھا تو کوئی تختی یہاں نہیں لگی تھی۔ ہوسکتا ہے میرے جانے کے بعد انہوں نے یہ تختی لگوالی ہو۔ میں نے باہر گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کوئی صاحب باہر نکلے جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''جی فرمایئے؟'' انہوں نے کہا۔

''یہاں نورین باجی رہتی ہیں؟''

''جی نہیں یہاں تو کوئی نورین نہیں رہتیں آپ غلط پتے پر آگئے ہیں۔''

''میں عرصہ دراز کے بعد آیا ہوں لیکن گھر نہیں بھول سکتا۔ وہ یہیں رہتی تھیں۔''

''آپ ان کی بات تو نہیں کر رہے ہیں جنہوں نے یہ گھر میرے ہاتھ فروخت کیا ہے مگر ان کا نام تو زرینہ خاتون تھا۔''

''جی ہاں میں ان ہی کی بات کر رہا ہوں۔ ان کی بیٹی کا نام نورین تھا مگر آپ کہہ رہے ہیں یہ گھر آپ نے خرید لیا ہے۔''

''جی ہاں، اب میں اس میں رہتا ہوں۔''

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ کہاں شفٹ ہو گئے ہیں؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' انہوں نے کہا اور دروازہ بند کرلیا۔

اس کے بعد میں نے محلے کے لوگوں سے معلوم کیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ نورین باجی کہاں چلی گئیں۔ امی نے بھی محلے کی عورتوں سے معلوم کیا۔ سب نے یہی کہا کہ وہ کسی کو بتا کر نہیں گئیں کب مکان بکا کب وہ یہ گھر چھوڑ گئیں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

نورین باجی کو میں اب تک بھولا ہوا تھا لیکن اس محلے میں آتے ہی ان کی یاد آنے لگی۔ اتنا کچھ معلوم ہونے کے بعد بھی میں بار بار ان کے دروازے پر جاتا تھا کہ شاید اس آدمی نے غلط بتایا ہو شاید وہ دروازے پر کھڑی نظر آجائیں۔ امی بھی بار بار سمجھا رہی تھیں کہ مجھے ان کا خیال چھوڑ دینا چاہیے لیکن نورین باجی میرے اعصاب پر سوار تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے ان کی یاد ستاتی رہتی تھی۔

کراچی میں رہنا تھا تو کچھ نہ کچھ کرنا بھی تھا۔ دبئی سے اتنی رقم ضرور لے آیا تھا کہ یہاں کوئی کاروبار شروع کرسکتا تھا۔ مجھے دبئی میں رہ کر اسنیک بار کا تجربہ حاصل ہوگیا تھا۔ میں نے گھر کے قریب ہی ایک دکان کرایے پر لے لی اور اسنیک بار کھول کر بیٹھ گیا۔ ایسے کاروبار ہر جگہ چل جاتے ہیں یہ بھی چل نکلا۔ اتنی آمدنی ضرور ہونے لگی کہ دکان کا کرایہ اور ملازموں کی تنخواہیں نکال کر بھی میرے پاس کچھ نہ کچھ بچ رہتا تھا۔ ہم دو آدمیوں کے لیے کافی تھا لیکن میرے عزائم اس سے بڑے تھے۔ یہی کام کرنا ہے تو کسی پوش علاقے میں کیا جائے۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ضرور تھی کہ میں اچھے سے اچھے علاقے میں دکان خرید سکتا تھا۔ میں نے طارق روڈ پر ایک دکان لے کر اسنیک بار کھول لیا۔ اللہ نے ایسا ہاتھ پکڑا کہ میری راتیں پیسوں کی برساتیں بن گئیں۔ اب مجھے ناظم آباد والا گھر برا لگنے لگا۔ میں نے گلشن میں اپنا مکان بنوالیا اور گلشن منتقل ہوگیا۔ یہاں سے طارق روڈ قریب بھی تھا۔

یہیں وہ واقعہ پیش آگیا جس نے مجھے ایک مرتبہ پھر نورین باجی کے قریب کر دیا۔

مجھے اس گھر میں آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ میں نے برابر والے گھر میں نورین باجی کو دیکھا۔ جی ہاں نورین باجی کو۔ میں نے اپنی گاڑی گیٹ سے باہر نکالی تو خیال آیا میں والٹ گھر میں ہی بھول آیا ہوں۔ میں نے گاڑی وہیں چھوڑ دی اور والٹ لینے گھر میں چلا گیا واپس آیا تو برابر والے گھر کے سامنے ایک گاڑی آکر رکی۔ گھر کا گیٹ کھلا

اور ایک لڑکی باہر نکلی۔ میری آنکھیں دھوکا کھا ہی نہیں سکتی تھیں۔ یہ نورین باجی تھیں۔ میں اس لڑکی کو غور سے دیکھتا رہا تاکہ مجھے یقین آجائے کہ یہ وہی ہیں۔ وہ لڑکی گاڑی میں بیٹھی ہوئی کسی خاتون سے باتیں کرتی رہی پھر کھڑکی سے باہر گردن نکالی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اب مجھے پورا یقین ہوگیا کہ یہ نورین باجی ہیں۔ میں نے اسے پکارا۔

''نورین باجی۔''

اس نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ میں کس کو پکار رہا ہوں اور پھر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔

میرے تصور کی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی۔ اب میں کہیں جانے کے لائق نہیں رہا تھا۔ گاڑی وہیں چھوڑی اور اندر چلا آیا۔

''امی میں نے نورین باجی کو دیکھا ہے۔'' میں نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

''نورین کا تو بھوت تیرے سر پر سوار ہوگیا ہے۔ وہ یہاں کہاں سے آگئی؟''

''برابر والے گھر میں۔ امی میں نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔''

''تجھے دھوکا ہوا ہوگا۔''

''نہیں امی، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ کسی بہانے سے اس گھر میں جائیں اور خود دیکھ لیں۔''

''لے نہ جان نہ پہچان، ان کے گھر میں گھس جاؤں۔''

''کہہ دیجیے گا کہ میں پڑوس میں رہتی ہوں پڑوسی کے ناتے آگئی اور پھر نورین باجی آپ کو دیکھ لیں گی تو غیریت رہے گی ہی نہیں۔''

''اچھا بھائی شام ہولینے دو چلی جاؤں گی۔''

''شام تو بہت دور ہے ابھی چلی جائیں۔ اب بھی کوئی اتنی صبح نہیں ہے کہ وہ لوگ سو کر نہیں اٹھے ہوں گے۔''

''اچھا بابا چلی جاتی ہوں دم تو لے۔''

''میں گھر میں رہ گیا اور وہ پڑوس میں چلی گئیں۔ وہ واپس آئیں تو بے اختیار ہنستی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں۔''

''اس کا نام مہرین ہے اور وہ کہیں سے بھی نورین نہیں لگتی۔ ناک نقشہ سب الگ ہے۔''

''آپ نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔ میں نے جسے دیکھا تھا وہ نورین باجی ہی تھیں۔''

''میں سب تحقیق کر آئی ہوں۔ اس کی ماں کا انتقال

جانور

یوں تو ہر جاندار اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے لیکن علم الحیوانات کی رو سے اس میں انسان اور پودے شامل نہیں۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ پودے اور جانور ایک ہی اصل سے ہیں لیکن جانوروں میں چلنے پھرنے کی صلاحیت ہے اور پودے اس سے معذور ہیں۔ جانوروں میں آلاتِ تنفس، انہضام و توالد و تناسل و اخراج نمایاں ہیں لیکن پودوں میں یہ کیفیت ظاہری طور پر نمایاں نہیں۔ گو خردبین کی مدد سے اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ علم نباتات کے ماہرین نے بہت سے انکشافات پودوں کی حیات کے متعلق کیے ہیں۔ سانس لینے کے عمل میں جانور اپنے اردگرد کے ماحول سے آکسیجن جذب کرتے ہیں اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ جانوروں میں کسی حد تک شعور اور احساس موجود ہے جو کہ اعلیٰ قسم کے جانوروں میں ذہانت کی صورت میں اور ادنیٰ قسم کے جانوروں میں برہمی، ہیجان زودرنجی، زود حسی اور تنگ مزاجی کی شکل میں پایا جاتا ہے۔

مختلف جانوروں کی عمریں: بڑا کچھوا 190 سال، ہاتھی 84 سال، کستور مچھلی 80 سال، الو 68 سال، عقاب 55 سال، حواصل 51 سال، پالتو گھوڑا 50 سال، ہبون (بندر) 45 سال، قطبی ریچھ 41 سال، چیمپنزی 37 سال، بڑا مینڈک 36 سال، گوریلا 33 سال، ڈولفن 30 سال، زرافہ 28 سال، کالا ریچھ 25 سال، اونٹ 25 سال، شیر 25 سال، زیبرا 25 سال، تیندوا 23 سال، گھریلو بلی 23 سال، گھریلو کتا 22 سال، گائے 20 سال، بھیڑ 20 سال، بکری 17 سال، چیتا 16 سال، کنگرو 16 سال، رینڈیئر 15 سال، بھیڑیا 15 سال، خرگوش 13 سال، خنزیر 10 سال۔

مرسلہ: فراز احمد حقانی۔ لاہور

ہو گیا ہے جس کا نام سائرہ بیگم تھا۔ اب مہرین بھائی بھاوج کے ساتھ رہتی ہے اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ نورین سے تم کچھ نہیں تو دس سال چھوٹے تھے۔ نورین اس وقت سترہ اٹھارہ کی تھی اب اس کی عمر اڑتیس سال تو ہو گئی ہوگی۔ جسے تم نے دیکھا وہ بھی بی اے کر چکی ہے۔ نورین کیسے ہو سکتی ہے۔''

''امی یہ تو میں بھی سوچ رہا ہوں لیکن اس کی شکل صورت بالکل نورین باجی کی طرح تھی۔''

''بالکل نہیں، تم نے نہ جانے کیا دیکھ لیا وہ بالکل نورین کی طرح نہیں۔''

''آپ رہنے دیں۔ میں خود اس سے مل کر تحقیق کرلوں گا۔''

میں امی کی طرف سے مایوس ہو کر اپنے کمرے میں گیا اور منہ لپیٹ کر لیٹ گیا۔ مجھے نورین باجی کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں غائب ہو جاتی ہوں جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو میں آجاؤں گی، تم مجھ سے شادی کر لینا۔ بات مذاق کی تھی، کیا واقعی یہ سچ تو نہیں ہو گیا۔ باجی مر گئی ہوں اور یہ لڑکی ان کی روح ہو مگر امی تو کہتی ہیں وہ لڑکی ان کی ہم شکل نہیں۔ ہو سکتا ہے امی نہ چاہتی ہوں کہ میں اس سے شادی کروں۔ مجھے اپنے طور پر خود تحقیق کر لینی چاہیے۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی میں نے خواب میں نورین باجی کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھیں اب تم بڑے ہو گئے ہو اور آ بھی گئے ہو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ اب تو میری ماں بھی اس دنیا میں نہیں رہیں، کوئی رکاوٹ نہیں بنے گا۔ میں نے پوچھا مگر آپ ہیں کہاں، کوئی جواب سننے سے پہلے میری آنکھ کھل گئی۔ اب مجھے یقین آگیا کہ مہرین جس کا نام ہے وہی نورین ہے اور نورین باجی مجھے شادی کی دعوت دے رہی ہیں۔ میں نے بچپن میں ان سے کہا تھا کہ جب میں واپس آؤں گا تو آپ کو دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اب میں واپس آگیا ہوں اور بڑا بھی ہو گیا ہوں اتنی دولت بھی ہے کہ اسے خوش رکھ سکتا ہوں۔

میں اسے ایک دو مرتبہ دیکھ کر اپنا وہم دور کر لینا چاہتا تھا اس لیے امی سے میں نے کوئی بات نہیں کی اور بظاہر چپ سادھ لی۔ میں اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ مہرین یا نورین جو بھی ہے اسے کہیں دیکھ لوں۔ میں اسی کھوج میں لگا ہوا تھا کہ ایک دن وہ بھی اپنی بھابی کے ساتھ مجھے طارق روڈ پر نظر آگئی۔ میں اپنے اسنیک بار پر بیٹھا ہوا تھا کہ وہ میری دکان کے سامنے سے گزری۔ میں اس چہرے کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ اگر نورین نہیں بھی تھی تو دوسری نورین ضرور تھی۔ میں دکان سے اٹھ کر اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ کپڑے کی ایک دکان میں داخل ہوئیں۔ میں بھی پیچھے ہولیا۔ میں نے دکان دار سے سوٹ کا کپڑا نکالنے کو کہا اور اس لڑکی پر نظریں جمادیں۔ میرے دل کا عجیب حال تھا نورین باجی میرے سامنے بیٹھی تھیں اور بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں نے بھی مجھے پہچاننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار پر بھی ویسا ہی تل ہے جیسا نورین باجی کے رخسار پر تھا۔ میرا سر گھومنے لگا۔

''یاالٰہی! یہ کیا معما ہے۔ میری آنکھیں اتنا بڑا دھوکا کیسے کھا سکتی ہیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں بھرے بازار میں کسی اجنبی لڑکی سے بات نہیں کر سکتا تھا جبکہ اس کے ساتھ اس کی بھابی بھی تھیں۔ میں یہ سوچتا ہوا دکان سے باہر نکل آیا کہ کبھی وہ اکیلی ملی تو اس سے ضرور پوچھوں گا۔

اس دن کے بعد سے میں برابر اس کوشش میں لگا رہا کہ وہ کہیں اکیلی مجھے مل جائے تو اس سے کچھ پوچھوں لیکن وہ ایک آدھ بار نظر بھی آئی تو دروازے پر کھڑی ایک جھلک کی طرح اور ہر مرتبہ میری آنکھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ نورین باجی ہے یا ان کی ہم شکل ہے۔ میں بہت غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ قدرت نے مجھے نورین باجی کی شکل میں ایک لڑکی دے دی ہے مجھے اس سے شادی کر لینی چاہیے۔ میں یہی سمجھ لوں گا کہ اپنے بچپن کے کہے کے مطابق میں نورین باجی کو دلہن بنا کر اپنے گھر لے آیا ہوں۔ مجھے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہی تھی۔ میں نے امی سے تذکرہ کیا انہوں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا۔ لڑکی انہیں بھی پسند آگئی تھی الغرض رشتہ لے کر چلی گئیں۔ مجھ میں بھی کیا کمی تھی۔ خوب صورت تھا، جوان تھا، اچھی آمدنی تھی۔ آگے پیچھے بھی کوئی نہیں تھا اکلوتا تھا۔ رشتہ فوراً منظور ہو گیا اور شادی بھی ہو گئی۔

میں نے چند روز بعد ہی مہرین کو نورین کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

''مہرین نام میں کیا برائی ہے جو آپ نورین کے نام سے پکارنے لگے ہیں۔ کہیں کسی پرانی محبت کی یاد تو تازہ نہیں کر رہے ہیں؟''

''ارے تم میری محبت بھی کہہ سکتی ہو بچپن میں ایک لڑکی مجھے پڑھاتی تھی اس کا نام نورین تھا، میں اسے نورین باجی کہتا تھا پھر ہم دبئی چلے گئے۔ واپس آئے تو وہ کہیں

جا چکی تھیں۔ اتفاق یہ کہ وہ ہو بہو تمہاری طرح تھیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے وہ یاد آ گئیں۔ پھر میں نے تم سے شادی کر لی۔ بس یہ قصہ ہے نام بدلنے کا۔ سب تمہیں مہرین کہہ لیا کریں لیکن میں تمہیں نورین کہا کروں گا۔ یہی سمجھ لینا کہ میں پیار میں تمہیں نورین کہتا ہوں۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے آپ مجھے جس نام سے پکاریں میں ہوں تو آپ کی۔''

میں اس کو نورین کے نام سے پکار کر اپنی تشفی کرتا رہا۔ امی بھی خوش تھیں کہ میں اسے نورین سمجھ کر بہل گیا ہوں۔ اس کی باتیں اس کی ادائیں تمام کی تمام نورین باجی ہی کی طرح تھیں البتہ کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا تھا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی عمر کی کس طرح ہیں۔ میری طرح ان کی عمر کیوں نہ بڑھی۔ رفتہ رفتہ میں نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا بلکہ یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا کہ کبھی کوئی نورین باجی میری زندگی میں آئی تھیں۔ میں نے مہرین کو ایک مرتبہ پھر مہرین ہی کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

مہرین نے مجھے اتنی محبت دی کہ نورین کا لفظ ہی میرے ذہن کی تختی سے کٹ گیا اور جب اس نے میرے بیٹے ارسلان کو جنم دیا اس کے بعد تو وہی میری سب کچھ تھی۔ ارسلان کی پیدائش ایسی خوش نصیب ثابت ہوئی کہ ایک اسنیک بار میں نے کلفٹن پر بھی کھول لیا۔ اس اسنیک بار کی وجہ سے ہم ڈیفنس میں شفٹ ہو گئے۔ کئی کمپنیوں میں میری شراکت داری تھی۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ زندگی مزے میں کٹ رہی تھی کہ اچانک میرے سر میں شدید درد اٹھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ کام کی زیادتی سے سر میں درد ہو ہی جاتا ہے لیکن پھر اس درد نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ دورے پڑنے لگے۔ مجھے اسپتال میں داخل کروایا گیا۔ علاج ہوتا رہا کچھ افاقہ بھی ہوا۔ میں گھر آ گیا لیکن تکلیف پھر بڑھ گئی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ نفسیاتی معالج سے رجوع کیا جائے۔ اس کے لیے میں امریکا چلا گیا۔ امی اور مہرین بھی میرے ساتھ تھیں۔ یہاں میرے نفسیاتی ٹیسٹ ہوئے امی سے اور مجھ سے الگ الگ میرے بچپن سے لے کر اب تک کی ہسٹری معلوم کی گئی۔ اس میں ظاہر ہے نورین باجی کا بھی تذکرہ آیا۔ مہرین نے بھی وہ باتیں بتائیں جو شادی سے اب تک اس نے مجھ میں دیکھی تھیں۔ نورین باجی کا تذکرہ اس کی باتوں میں بھی موجود تھا۔ یہ بھی کہ میں اسے نورین ہی سمجھتا رہا ہوں وغیرہ

جذام Leprosy

کوڑھ۔ ایک موذی مرض جو خاص قسم کے جراثیم کے سبب لاحق ہوتا ہے۔ مریض کی جلد میں خاص قسم کے ابھار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اعصاب متورم ہو جاتے ہیں۔ ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں بے حس ہو جاتی ہیں۔ چہرہ ورم کے باعث بالکل بدل جاتا ہے اور مریض کی شکل مسخ ہو جاتی ہے۔ جذام متعدی مرض ہے۔ جذامیوں کا تندرست آدمیوں کے قریب رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس کی علامات یہ ہیں۔ حرارت کا بڑھنا، لرزہ ہونا، جسم کا بوجھل سا ہو جانا، غنودگی طاری رہنا اور کثرت سے پسینا آنا۔ بعض اوقات یہ علامات اتنی خفیف ہوتی ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مرض کی پختہ علامات تمام جسم پر نہایت مہین سیاہی مائل خشخاشی دانوں کا نکلنا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جسم پر ابھار پیدا ہو جاتے ہیں۔ کانوں کے زیریں حصے سوج جاتے ہیں اور چہرے کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ اس کا علاج صرف ماہر معالج کر سکتے ہیں۔ یہ لاعلاج مرض نہیں ہے البتہ اس کی تشخیص صحیح ہونی چاہیے۔ پاکستان میں ہر دس ہزار میں سے ایک مریض جذام کا شکار ہے۔

مرسلہ: آصفہ اکرام۔ میرپور اے کے

جذباتی دباؤ Distress

یہ اصطلاح مغرب میں دباؤ ہی کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یہ ایک قسم کا اعصابی دھاکا ہوتا ہے اس سے شریانوں کا سکڑاؤ بڑھتا ہے۔ خون کی نالی میں دباؤ چڑھتا ہے اور انجماد خون کا عمل زور پکڑ لیتا ہے۔ اس طرح کا دباؤ برداشت کرنا، بیمار کو تو چھوڑیئے ایک تندرست انسان کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ جذباتی دباؤ کی وجہ سے قلبی نالیوں کے مرض مریضوں اور ان کے لواحقین کے لیے مصائب کا باعث بنتے ہیں۔ اس بیماری کا علاج ممکن ہے۔

مرسلہ: نائلہ فراز۔ فیصل آباد

وغیرہ۔ بہرحال ان معلومات کی روشنی میں میرا علاج شروع ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے میری تحلیل نفسی شروع کردی اور یہ باور کروادیا کہ نورین نام کی لڑکی کا اب کوئی وجود نہیں وہ مرچکی ہے یا کم از کم تمہاری دنیا سے دور جاچکی ہے۔ تم اگر کسی کو نورین سمجھ رہے ہو تو یہ تمہارا وہم ہے۔ دنیا میں کوئی دوبارہ نہیں آتا نورین بھی نہیں آسکتی۔ اگر کبھی آئی بھی تو بوڑھی ہوچکی ہوگی جس سے تمہاری شادی نہیں ہوسکتی۔ یہ باتیں مجھے ہپناٹائز کرکے بھی میرے ذہن میں بٹھادی گئیں۔ تقریباً چھ ماہ کے علاج کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے تندرست قرار دے دیا لیکن یہ تندرستی میرے لیے عذاب بن گئی۔ اب تک میں اپنے خوابوں میں زندہ تھا۔ نورین کی شکل میں مہرین مجھے مل گئی تھی ڈاکٹروں نے یہ خواب میرے اندر سے نکال دیے۔

مجھے اسپتال سے ہوٹل آئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ میں مہرین کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ ''امی یہ لڑکی کون ہے؟''

''تیری بیوی مہرین ہے اور کون ہے۔'' امی کے چہرے پر فکرمندی کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

''امی آپ کمال کرتی ہیں میں اپنی بیوی کو نہیں پہچانوں گا یہ مہرین تو نہیں ہے۔''

''خیر تو ہے تیرا دماغ چل گیا ہے یا آنکھیں خراب ہوگئی ہیں۔ مہرین کو نہیں پہچانتا۔''

''امی یہ کیا مذاق ہے۔ آپ لوگ میرا امتحان کیوں لے رہے ہیں۔ میں آپ کو پہچان رہا ہوں۔ ارسلان کو پہچان رہا ہوں لیکن اس لڑکی کی صورت وہ نہیں ہے جو مہرین کی تھی۔ مہرین کو بلاؤ۔ دفع کرو اس لڑکی کو میرے سامنے سے۔''

مہرین شاید اب تک مذاق سمجھ رہی تھی لیکن مجھے سنجیدہ دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بھی یقین دلا رہی تھی کہ وہ مہرین ہے لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا مجبوراً مجھے ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔

ڈاکٹر نے امی کو مبارک باد دی۔

''مبارک ہو آپ کا بیٹا اب مکمل صحت یاب ہے۔''

''لیکن یہ تو اپنی بیوی کو پہچاننے سے انکار کررہا ہے۔''

''یہ اب تک اسے نورین کی شکل میں دیکھتا رہا تھا۔ نورین کا خیال دل سے نکلتے ہی مہرین کی اصل شکل اس کے سامنے آگئی ہے۔''

''یہ تو بڑی مشکل ہوگئی ہے۔ اب تو یہ اپنی بیوی کو بیوی ہی تسلیم نہیں کرے گا۔''

''کرے گا...... کرے گا اس میں کچھ وقت لگے گا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اچھا ان کی شادی کی کوئی تصویر ہے؟''

تصویریں تو ہم گھر پر ہی چھوڑ گئے تھے تصویریں لے جانے کی ضرورت بھی کیا تھا لیکن مہرین کو یاد آگیا۔ وہ ایک تصویر ہر وقت اپنے پرس میں ہی رکھا کرتی تھی جس پر ہم دولہا دلہن بنے بیٹھے ہیں۔ وہ ہوٹل گئی اور اپنا وہ پرس اٹھا کر لے آئی ڈاکٹر نے وہ تصویر مجھے دکھائی۔

''یہ دیکھیے...... اپنے آپ کو تو آپ پہچانتے ہی ہیں۔ یہ مہرین ہے جس کی شکل اب بھی آپ اس تصویر سے ملا کر دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی زیادہ فرق نہیں ہے اس کو آپ کسی دوسری شکل میں دیکھتے رہے جو آپ کا وہم تھا۔ یہی آپ کی نفسیاتی پرابلم تھی جو اب دور ہوچکی ہے لہٰذا مہرین اصلی شکل میں آپ کے سامنے آگئی۔ دراصل بچپن میں آپ نے جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ آپ کے ذہن پر اس طرح مسلط ہوگئی تھی کہ مہرین کو دیکھتے ہی آپ کو لگا کہ وہ لڑکی یعنی نورین آپ کے سامنے ہے اور آپ نے اس سے شادی کرلی۔ ہمارے علاج سے جب آپ کو افاقہ ہوا اور آپ کا ذہن صحیح سمت چلنے لگا تو مہرین کی اصل شکل آپ کے سامنے آگئی۔ آپ دل سے قبول کرلیجیے کہ یہ نورین نہیں مہرین ہے۔ اب تک آپ ایک مسلسل خواب کی دنیا میں تھے اب حقیقت کی دنیا میں آگئے ہیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ اس حقیقت کی دنیا میں کتنے دن رہتے ہیں۔ آپ بار بار اپنے آپ سے عہد کرتے رہیے کہ نورین آپ کی دنیا سے نکل گئی ہے۔

ایک ماہ مجھے مزید امریکا میں رکنا پڑا اور علاج ہوتا رہا۔ میں اتنا ٹھیک ہوگیا کہ خود پر ہنسی آتی تھی اور سوچتا تھا کہ یہ کس طرح ہوا کہ میری نظروں میں مہرین کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ بہرحال ہم واپس آگئے۔ واپس آنے کے چند ماہ قبل ہی وہ واقعہ پیش آگیا جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا۔ میں نے نورین باجی کو دیکھا اور ان کی کار کے پیچھے بے تحاشا دوڑا۔

میں نے مہرین کو قبول کرلیا ہے لیکن نورین باجی کو میری آنکھیں اب بھی تلاش کرتی رہتی ہیں۔ کاش...... وہ کہیں مل جائیں...... کاش!

گلی

جناب ایڈیٹر
سلام مسنون
ایک بالکل سچا واقعہ جسے میں نے افسانوی رنگ دیا ہے۔ آپ کی خدمت میں ارسال کررہی ہوں۔ اُمید ہے یہ جھنجوڑ دینے والا واقعہ آپ کو اور سرگزشت کے تمام قارئین کو پسند آئے گا۔

شاہین کاظمی
(سوئٹزر لینڈ)

ہر طرف بے نام سی خاموشی کا راج تھا، گھنے درختوں کی اوٹ میں دم سادھ کر بیٹھی ہوا، سورج کی تھکی تھکی کرنیں، تھڑوں کے نیچے دبکے کتے ٹانگوں پر تھوتھنی جمائے نڈھال نظر آرہے تھے، حتیٰ کہ کریانے کی دکان پر سارا دن چہلیں کرنے والے لڑکے بالے بھی غائب تھے، بات ہی کچھ ایسی تھی، استانی نسرین کی بڑی بیٹی رفعت کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی، میرے چاروں طرف جیسے ڈھول اڑنے لگی۔

''ہائے کیسا ظلم کیا اس لڑکی نے، اپنی بیوہ ماں کی عمر

بھر کی محنت سے کمائی عزت پل بھر میں مٹی میں ملادی ؟''

میں کھٹک تو اسی دن گئی تھی جس دن نذیر ٹھیکیدار کے بیٹے کو دیکھ کر رفعت کے قدم ٹھٹکے تھے، اس دن اسکول سے واپسی پر رفعت کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن منی، ٹھیکیدار کے گھر کے آگے بنے تھڑے پر دھرنا دے کر بیٹھ گئی۔

''آپا تھک گئی میں تو۔'' منی نے آپا کو بہت کچھ کہتی نظروں سے دیکھا، اتنے میں ٹھیکیدار کا بیٹا باہر نکل آیا، اور بہت پیار سے منی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بستہ اسے تھمادیا۔

''اچھے بچے ضد نہیں کرتے جاؤ گھر جاؤ۔'' اور منی خاموشی سے اٹھ کر چل دی، اور کسی نے دیکھا ہو یا نہیں مگر ٹھیکیدار کے بیٹے کی مٹھی میں دبا کاغذ منی کے بستے میں سرکتے سے میری نظروں سے بچ نہ سکا، اور پھر یہ روز روز ہونے لگا، کبھی منی تھک جاتی، کبھی اسے پیاس ستانے لگتی، اور کبھی تھڑے کے نیچے دبکے کتوں سے اسے ڈر لگنے لگتا، اور آج یہ خبر۔

''آئے ہائے آپا جانے کس منحوس نے بے پر کی اڑا دی، رفعت اپنی خالہ کے گھر گئی ہے کل تک آجائے گی۔''

استانی جی بہت غصے میں تھیں، آغا جی کی بہو کے منہ سے ہمدردی کے چند بول سن کر الٹا اسی پر برس پڑیں، ہمیشہ کی حلیم طبع استانی کو اتنے غصے میں دیکھ کر آغا جی کی بہو حق دق رہ گئی۔

''تو اس میں اتنا تیخ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

''لے آپا آپ بھی کمال کرتی ہیں اب کیا نظر اتاروں آپ کی؟'' استانی جی چمک کر بولیں۔

''آپ کو کیا حق پہنچتا ہے میری بیٹی کے بارے میں ایسی واہیات بات کرنے کا۔''

بات استانی جی کی بھی سچ تھی سو بہو بیگم ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کو سدھاریں، عجیب بات یہ ہوئی کہ رفعت بی تین دن بعد گھر موجود تھیں، ستے ہوئے چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، لیکن اس سے بھی حیران کن بات یہ ہوئی کہ منی نے اسکول کا رستہ بدل دیا اور ٹھیکیدار کا اکلوتا بیٹا بھی درہم کمانے کی غرض سے دوبئی جا بیٹھا۔

''ہائے! میرے وجود میں دراڑیں سی پڑنے لگیں، کرمو ماچھی کس بیدردی سے اپنی بیوی کو پیٹ رہا تھا۔''

''ارے کوئی ہے بچاؤ اسے بیچاری پیٹ سے ہے۔'' میں مدد کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی، لیکن بند دروازوں کے پیچھے موت کا سا سکوت تھا، سو وہ پٹتی رہی۔

''اوئے خنزیر کی اولاد کیا مار ڈالے گا اسے؟'' آغا جی جانے کہاں سے برآمد ہوئے اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آغا جی آپ درمیان میں نہ آئیں۔'' کرمو ماچھی کے منہ سے کف اڑ رہا تھا۔

''نہ کرے عورت ذات ہے کچھ حیا کر اس کی حالت دیکھ۔'' حاجی صاحب بھی باہر نکل آئے۔

''تو اندر جا بیٹی۔'' حاجی صاحب نے نجو کے سر پر ہاتھ رکھا۔

یہ یہاں کا روز کا معمول تھا، غربت کی دہلیز پر بیٹھی پانچ بیٹیاں کرمو ماچھی کو ڈس رہی تھیں۔

''اس کم جات نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' کرمو وہیں حاجی صاحب کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

''اب تو یار لوگ بھی ہنستے ہیں مجھ پر۔''

''کچھ خدا کا خوف کر کرمو کیا اول فول بک رہا ہے، اس میں اس بچاری کا کیا قصور۔'' آغا جی نے اسے گھورا۔ ''یہ تو اس رب سوہنے کی دین ہے۔''

''اتنا ہی مرد ہے تو... ڈال دیتا نا اس کی کوکھ میں اپنے جیسا ایک۔'' شیدو نائی دانت نکوستا ہوا اس پر فقرہ اچھال گیا۔

''دیکھا آپ نے حاجی صاحب۔'' کرمو غصے سے بل کھا رہا تھا۔

''قصور تیرا ہے تو جو یہاں روز مجرا کرنے آجاتا ہے تماش بین تو آئیں گے۔'' آغا جی کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

''جو بھی ہو اب کی بار نہیں بچے گی رانڈ میرے ہاتھ سے۔'' کرمو اٹھ کھڑا ہوا اور میں تفکر سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

میرا بس چلتا تو میں ایسے تمام مردوں کو لائن میں کھڑا کر کے گولی مار دیتی، یہ مجھے دنیا کی سب سے قابلِ رحم مخلوق لگا کرتے، کسی بھوکے درندے کی طرح دندناتے ہوئے، بھوک کوئی بھی ہو تن، دھن، یا من کی، ان کی رال ٹپکاتی زبانیں ہمیشہ لپلپاتی رہتیں۔

اچانک نکڑ پر سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ یہ شریف مستری کا بیٹا تھا۔ لنڈے کی پرانی گھسی ہوئی جینز پر پیلے رنگ کی شرٹ اور گلے میں لال رومال باندھے خود کو کسی راجا اندر سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ سامنے زینت کے کرائے داروں کی لڑکی سے اس کا آنکھ مٹکا چل رہا تھا۔ دن میں پندرہ بار

اس کے گھر کا طواف ہوتا، اور وہ بھی شوخ رنگوں کے تنگ کپڑے پہنے مستی ادائیں دکھاتے ہوئے ہر بار کسی نئی شے کی فرمائش کر دیتی۔ انہیں یہاں آئے ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے۔ لیکن محلے کے جوانی کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے چھوکروں کو اچھا خاصا مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں پر کسی ہوئی بد رنگ پتلونیں چڑھائے سارا دن محلے کی اکلوتی کریانے کی دکان کے سامنے کھڑے ایک دوسرے سے فحش مذاق کیا کرتے اور نظریں مستقل سامنے والے دروازے پر جمی ہوتیں۔ شریف زادیوں کا وہاں سے گزرنا محال ہو گیا۔ اس دن تو شمیم باجی کی نند نے بے لحاظ ہو کر بے بھاؤ کی سنا بھی دیں۔ چار دن امن رہا اب پھر وہی حال تھا۔

میرے دائیں بائیں اطراف میں بنے ہوئے مکانات کے باہر کو نکلتے ہوئے تھڑے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ ان کے نیچے بہنے والی گندی نالیوں کی بدبو، اور کناروں پر لوٹتے کتے جو ہر آنے جانے والے پر بھونکنا اپنا فرض منصبی خیال کرتے۔ روز لاتیں یا اینٹ کھا کر اپنے ہی زخم چاٹتے پھرتے۔ لیکن مجال ہے جو ان کے معمول میں رتی فرق آیا ہو، گرمیوں کی سلگتی دوپہریں ہوں یا سرما کی ٹھٹھرا دینے والی راتیں ان کی چاؤں چاؤں جاری رہتی۔

خیر چھوڑیں۔ میں بات کر رہی تھی نجو کی۔ کرمو ماچھی اتنا برا نہ تھا۔ نجو سے پیار بھی کرتا تھا لیکن یہ گزرے زمانوں کی بات تھی جب نجو بیاہ کر آئی تھی۔ سانولی رنگت اور خوبصورت چہرے والی نجو کرمو کے دل کا چین تھی۔ یہ چین تیسری بیٹی ہونے تک برقرار رہا۔ جب کرمو کی ماں نے اٹھتے بیٹھتے نجو کو کوسنا شروع کیا تو چین دھیرے دھیرے بے چینی میں ڈھلنے لگا۔ اس پر اس کے چھوٹے بھائی کا ردیہ۔ دو بیٹوں کا باپ کیا بنا۔ پاؤں زمین چھونے سے انکاری ہو گئے۔ کرمو کو ایسے دیکھتا جیسے اچھوت ہو۔ اس بے توقیری کا سارا غصہ نجو پر اترتا، اور نجو بے قصور ہوتے ہوئے بھی روز پٹتی۔ رات ڈھلے جب کرمو نجو کے زخموں پر ہلدی ملا تیل لگاتا تو اس کی آنکھوں سے بوند بوند ٹپکتا پانی کرمو کو اپنے دل پر گرتا محسوس ہوتا۔

''معاف کر دے نجو، مجھے جانے کیا ہو جاتا ہے۔'' وہ ہاتھ جوڑ دیتا، اور نجو تن کا درد من میں اتار کر ہر بار اسے معاف کر دیتی۔ آخر وہ اس کی بیٹیوں کا باپ تھا۔

''عجیب کنارشتہ ہوتا ہے یہ بھی۔'' ساتھ والی خورشید

جبر و قدر

یہ مسئلہ کہ انسان مجبور ہے یا صاحب اختیار ہمیشہ سے فلسفیوں میں زیر بحث رہا ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ انسان اپنی مرضی کا مالک نہیں ہے بلکہ اس کی مرضی اس کی تعلیم و تربیت اور خارجی حالات و تاثرات سے متعین ہوتی ہے۔ عہد قدیم میں یونان کے روایتی فلسفیوں کا یہی نظریہ تھا۔ ابتدا میں مسلمانوں کا رجحان بھی جبر کی طرف تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان کے اعمال و افعال کی تفصیل لوح محفوظ پر رقم ہوتی ہے اور کوئی شخص اس لکھے کو تبدیل نہیں کر سکتا مگر معتزلہ نے اس نظریے کی مخالفت کی۔ وہ انسان کو آزاد اور اپنی مرضی کا مالک خیال کرتے تھے۔ پہلے گروہ کو جبریہ، دوسرے کو قدریہ کہتے ہیں۔ اشاعرہ کے خیال میں انسان کی حالت دونوں کے بین بین ہے۔ یعنی وہ نہ بالکل مجبور ہے نہ بالکل مختار، بعض امور اختیاری ہیں اور بعض اضطراری۔ جزا و سزا اختیاری چیزوں میں ہے اضطراری میں نہیں۔

مرسلہ: اقبال احساس۔ سکھر

جدی Capricorn

منطقۃ البروج میں سے ایک برج جس کی شکل بکری کی سی ہے۔ انگریزی میں اس کو Capricorn کہتے ہیں۔ اس برج کے نام سے ایک فرضی خط، خط استوا سے 1/2-23 درجے جنوب کو اور اس کے متوازی کرۂ زمین کے اردگرد کھینچا گیا ہے۔ ایسا ہی ایک خط خطِ استوا کے شمال میں فرض کیا گیا ہے جس کو خطِ سرطان کہتے ہیں۔ سرطان بھی مذکورہ بروج میں سے ایک برج ہے جس کی شکل کیکڑے کی سی ہے اور انگریزی میں اس کو Cancer کہتے ہیں۔ کرۂ زمین پر جو خطِ سرطان اور خطِ جدی مقرر کیے گئے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ سورج ان کے درمیانی حلقے میں رہتا ہے اور کبھی ان سے باہر شمال یا جنوب کو نہیں جاتا۔ جب سورج خطِ سرطان پر پہنچتا ہے تو شمال میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اور جب خطِ جدی پر پہنچتا ہے تو شمال میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اور جب خطِ جدی پر پہنچتا ہے تو اس نام کے برجوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس لیے خطوط کے بھی یہی نام رکھے گئے ہیں۔

مرسلہ: آصفہ اکرام۔ میر پور آزاد کشمیر

بنسے جاتی۔

''تو سچ کہتی ہے خورشید بندہ مک جاتا ہے اس رشتے کو نبھاتے نبھاتے۔''

''روز روز کی چک چک سے بہت تنگ ہوں خورشید۔''

''لیکن کرمو کو چھوڑ کر میں اس ٹبر کو لے کر جاؤں بھی تو کس کے دروازے پر۔'' نجو کی آنکھیں پھر سے ساون بن جاتیں۔

''تو دل چھوٹا نہ کر رب سوہنا ضرور تیری سنے گا۔''

اور نجو پھولے ہوئے پیٹ اور ذہن میں پلتے وسوسوں میں الجھ جاتی۔

''اگر اب بھی بیٹی ہوئی تو۔'' نجو کی آواز میں جانے کیا تھا خورشید تڑپ اٹھی۔

''ساری عمر خوف اور وسوسوں کی صلیب پر لٹکے رہنا کیا یہی عورت کی زندگی ہے؟'' میں نجو اور خورشید کو دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوگئی۔

بارشوں کے دن تھے۔ نشیبی علاقے میں ہونے کے باعث بستی ہمیشہ جنوب میں بہنے والے برساتی نالے کی زد میں آجاتی۔ بستی والوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک کچا پشتہ تعمیر کر کے سیلابی پانی کا راستہ تو بدل دیا تھا لیکن پشتے کی باقاعدہ دیکھ بھال کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس کام کی ذمہ داری کرمو ماچھی نے سنبھال لی۔ محلے کا ہر گھر حسب توفیق کچھ نہ کچھ دے دیا کرتا۔ جس میں آغا جی اور ٹھیکیدار صاحب اپنے پاس سے کچھ ملا کر کرمو کے ہاتھ پر دھر دیا کرتے۔ کرمو بہت خوش تھا۔ گھر کے حالات بہتر ہوئے تو اس کے مزاج کی کڑواہٹ بھی کم ہونے لگی۔ اس دن شدید بارش تھی۔ کرمو نے پوری رات پشتے پر گزار دی۔ صبح اذانوں کے ساتھ گھر پلٹتے ہوئے کچرا کنڈی سے آنے والی عجیب سی آوازوں نے اس کے قدم روک لئے۔ اندر کا منظر دیکھ کر جی دار ہوتے ہوئے بھی کرمو کے بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔

''بیٹا مبارک ہو کرم دین۔'' نذیر کرمو کو دروازے پر سبز پتے باندھتے دیکھ کر اس کی طرف چلا آیا۔ کرمو کو اس کے منہ سے کرم دین سن کر بہت بھلا لگا۔ اس کا سینہ بے اختیار پھول گیا۔ بیٹے کا باپ ہونا بھی کیسا سرور دیتا ہے۔

''لیکن یہ رکھ۔'' ''کیوں؟''

''بھائیا بڑی منتوں مرادوں کے بعد رب سوہنے نے یہ دن دکھایا ہے۔ اس لیے چالیس دن کی رکھ رہے گی۔ نجو نظر لگ جانے سے ڈرتی ہے۔'' کرمو نے وضاحت کی۔

''تو اس کا مطلب چالیس دن بعد بھتیجے کا دیدار نصیب ہوگا۔''

''اچھا اللہ اسے لمبی عمر دے۔'' نذیر دعا دے کر آگے بڑھ گیا

کرمو بہت خوش تھا۔ گھر گھر مٹھائی بانٹتا پھر رہا تھا۔ استانی جی کی بڑی بیٹی نے مٹھائی وصول کی تو ساتھ ہی ایک تھیلا کرمو کی طرف بڑھا دیا

''چاچا یہ کچھ کپڑے ہیں منے کے لیے۔''

''بیٹے کا بہت خیال رکھنا چاچا۔'' کرمو پلٹنے ہی والا تھا کہ اس کے کانوں سے ہلکی سی سرگوشی ٹکرائی۔ اس دن موسلا دھار برستی بارش میں جب رفعت اپنے نوزائیدہ بیٹے کو کچرا کنڈی میں ڈال کر پلٹی تو کرمو کو آتا دیکھ کر جلدی سے درخت کی اوٹ میں ہوگئی۔ اس کا دل کٹ رہا تھا لیکن کرتی بھی تو کیا۔ ہمیشہ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھانے والا باپ کی ایک للکار پر سہم کر دوبئی جا بیٹھا، اور وہ گناہ اور بدنامی کا بوجھ اٹھائے گھر لوٹ آئی۔ ٹھیکیدار نے رفعت کے ساتھ ساتھ اس کی ماں کو بھی جانے کیا کچھ سنا ڈالا تھا۔ اور صاحبزادے ہونٹ سیئے بس پاؤں سے زمین کریدتے رہے۔ اس وقت رفعت کا دل چاہا کاش وہ اس کو اسی زمین میں گاڑ سکتی۔

کرمو ننھی سی گٹھڑی سینے سے لگائے تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ رفعت کے آنسوؤں کا نمک بارش کے پانی میں گھلتا رہا۔ جلتے ہوئے دل کے کسی ایک گوشے میں ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ شاید وہ بچ جائے۔ اس نے بھیگے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ملتجی نظروں سے روتے بلکتے سیاہ آسمان کو دیکھا اور خاموشی سے گھر کی طرف ہولی۔ بھیگے کپڑے الگنی پر ڈال کر وہ اندر آئی تو استانی جی نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔'' ماں حاجی صاحب جو شریف مستری کے بیٹے کا رشتہ لائے تھے انہیں ہاں کہہ دینا۔''

صبح ہونے کو تھی اس نے بتی بند کی اور بستر پر لیٹ گئی۔

دروازے کی جھریوں سے ہلکا ہلکا اجالا اندر جھانکنے لگا تھا۔

مجھے کرمو کی خوشی بے حد عزیز ہے۔ لیکن اس کے آنگن کے کونے میں دھری پتھر کی بڑی سی سل کے نیچے دبی ننھی سی بے نام لاش مجھے چین نہیں لینے دیتی۔ کیسا باپ تھا بچی کو نام تک نہ دے پایا۔ لیکن میں کہتی بھی تو کس سے کہ میں تو محض ایک گلی ہوں نا۔

تلافی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
اس بار میں لاہور کے ایک مشہور واقعے کو کہانی کی شکل میں لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے پڑھ کر ہر کوئی کچھ دیر کے لیے سکتے میں رہ جائے گا۔ نوشین نے کس طرح اپنی غلطی کی تلافی کی۔
امیمہ
(لاہور)

نوشین کپڑے پھیلانے چھت پر گئی تو بہت مسرور تھی۔ وہ گنگناتی ہوئی کپڑے پھیلا رہی تھی۔ آج اصل میں اس کے بھائی اسد کی منگنی تھی۔ اسد اس کا اکلوتا بھائی تھا۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی۔ نوشین خود بھی اکلوتی تھی، اسد بھی اس پر جان چھڑکتا تھا۔ ایک تو اسے بھائی کی منگنی کی خوشی تھی پھر منگنی بھی اس کی دوست شمسہ سے ہو رہی تھی۔ شمسہ اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی پھر کالج میں اس کے ساتھ ہی گئی تھی۔ شمسہ کا ان کے گھر آنا جانا تھا۔ وہ بہت خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی۔

اسد نے اسے دیکھا تو دل ہار گیا پھر نوشین ہی کے توسط سے شمسہ اور اسد کی ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں ایک دوسرے کے پیار میں ڈوب گئے۔

امی چاہتی تھیں کہ اسد کی شادی ان کی بہن کی بیٹی ثمینہ سے ہو خالہ بشریٰ بھی یہی چاہتی تھیں لیکن نوشین نے امی کو سمجھایا کہ بھیا شمسہ کو پسند کرتے ہیں۔ وہ کسی دوسری لڑکی سے شادی کر کے خوش نہیں رہ سکیں گے۔ آخر اسد کی ضد اور نوشین کی کوششوں کے بعد امی اور ابو نے ہتھیار ڈال دیے اور شمسہ کا رشتہ قبول کر لیا۔

آج اسد کی منگنی تھی نوشین منگنی کی تقریب بہت دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھی لیکن شمسہ کے گھر والے اس پر تیار نہیں ہوئے۔ شمسہ کے ایک ماموں کا انتقال ہوا تھا اس لیے وہ لوگ منگنی بہت سادگی سے کرنا چاہتے تھے۔

نوشین کپڑے پھیلاتے ہوئے اپنے خیالات میں

ایسی گم تھی کہ اسے اردگرد کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اچانک اس کی نظر برابر والی چھت پر پڑی تو وہ بری طرح جھینپ گئی۔ وہاں ایک لڑکا کھڑا تھا اور بہت پُرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نوشین نے اس کی نظروں سے بچنے کے لیے دوپٹا لپیٹنا چاہا لیکن اس کے جسم پر تو دوپٹا تھا ہی نہیں۔ کپڑے پھیلانے کی دھن میں اس نے اپنا دوپٹا نہ جانے کہاں۔۔ اتار دیا تھا۔ وہ گھبرا کر پلٹی اور زینے کی طرف بھاگی پھر اس نے نیچے آ کر ہی دم لیا۔ رہ رہ کر اسے لڑکے کا خیال آ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں نوشین کو ابھی تک اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

گھر میں منگنی کا ہنگامہ تھا اس ہنگامے میں وہ وقتی طور پر سب کچھ بھول گئی۔

دوسرے دن جب وہ کپڑے اتارنے گئی تو وہ لڑکا پھر اسی چھت پر موجود تھا اور ایکسر سائز کر رہا تھا۔ اس وقت اس کی توجہ نوشین کی طرف نہیں تھی۔ اس نے سفید ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ وہ بہت خوب رو لڑکا تھا۔ نکلتے ہوئے قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کے سیاہ چمکیلے بال اور سیاہ مونچھیں سرخ و سفید چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

نوشین بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک نوشی ہی کیا وہ تو کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا تھا۔

لڑکے کو اچانک اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر نوشین کی طرف دیکھا۔ نوشین جلدی سے منڈیر کی اوٹ میں ہو گئی۔

پھر تو نوشین کا روز کا معمول بن گیا وہ شام کو چھت پر جاتی تو وہ لڑکا چھت پر موجود ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے لیکن ابھی تک ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ نوشین کو تو اس لڑکے کا نام بھی معلوم نہیں تھا۔

ایک دن وہ کالج سے آ کر بیٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نوشین.... دروازے کے پاس ہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو تیرہ چودہ سال کی ایک لڑکی اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی۔

''السلام علیکم باجی۔'' اس نے نوشین کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' نوشین نے جواب دیا۔ وہ لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں ساتھ والے گھر سے آئی ہوں باجی۔'' لڑکی نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ نے نیاز دی تھی یہ زردہ آپ کو بھیجا ہے۔''

''کون ہے نوشین؟'' اندر سے امی کی آواز آئی پھر وہ باہر آ گئیں۔

''السلام علیکم بیگم صاحبہ۔'' لڑکی نے جلدی سے انہیں سلام کیا۔

''امی یہ پڑوس سے آئی ہے۔'' نوشین نے کہا۔ ''ان لوگوں نے یہ زردہ بھیجا ہے اور کل ہمیں میلاد اور قرآن خوانی میں بلایا ہے۔''

''اس گھر میں چوہدری دلاور صاحب آئے ہیں۔'' امی نے کہا۔

''جی بیگم صاحبہ۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''میں ان ہی کی ملازمہ ہوں صابرہ۔''

''صابرہ، اپنی بیگم صاحبہ کا بہت شکریہ ادا کرنا۔'' امی نے کہا۔ ''ہم لوگ میلاد میں ضرور آئیں گے۔''

لڑکی کے جانے کے بعد نوشین نے سوچا کہ اس بہانے مجھے اس لڑکے کا نام بھی معلوم ہو جائے گا اور شاید اس سے ملاقات بھی ہو جائے۔

دوسرے دن نوشین کالج سے جلدی گھر آ گئی اسے شام کو میلاد میں جانا تھا۔ شام کو وہ امی کے ساتھ میلاد میں پہنچ گئی۔ صفیہ بیگم نے بہت خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ وہاں محلے کی کچھ دوسری خواتین بھی موجود تھیں۔ میلاد اور قرآن خوانی کے لیے ان لوگوں نے ڈرائنگ روم سے صوفے وغیرہ ہٹا کر فرشی نشست کا اہتمام کر دیا تھا۔

نوشین کو ابھی تک وہ لڑکا دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اسے بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ خواتین کی تقریب تھی۔ وہ لڑکا تو کیا وہاں تو کوئی مرد ہی نہیں تھا۔ نوشین کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ میلاد کے بعد کھانے کا پروگرام تھا۔ اسی وقت صفیہ بیگم نے بتایا کہ ان کا ایک ہی بیٹا ہے فرقان، چوہدری دلاور بہت بڑا زمیندار تھا۔ اس نے حال ہی میں لاہور میں کوٹھی خریدی تھی۔ زمینداری کے ساتھ ساتھ وہ سیاست بھی کرتا تھا اور آج کل الیکشن کی تیاری کر رہا تھا۔

وہاں سے واپسی پر امی ان لوگوں کی دولت اور امارت سے بہت مرعوب تھیں۔ وہ اسد کو بتا رہی تھیں کہ چوہدری دلاور کے گھر میں چار چار تو گاڑیاں ہیں۔ گھر کا تمام فرنیچر بہت اعلیٰ اور بیش قیمت ہے۔ گھر میں نوکروں کی ایک فوج ہے۔

''امی، چوہدری دلاور ایک سیاست داں ہے اور اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے۔'' اسد بھائی نے کہا۔ ''وہ

گزشتہ اسمبلی کا ممبر رہ چکا ہے شاید مشیر بھی تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کروڑوں روپے کی کرپشن کی ہے۔ کروڑوں کے قرضے بینکوں سے معاف کروائے ہیں۔‘‘

’’تم باپ بیٹے کو ہر آدمی پر شک ہوتا ہے۔‘‘ امی نے منہ بنا کر کہا۔

’’بات شک کی نہیں ہے راحت بیگم۔‘‘ ابو نے ہنس کر کہا۔ ’’یہ باتیں ہم نہیں کر رہے بلکہ پوری دنیا کر رہی ہے۔ دلاور زمیندار ضرور ہے لیکن اسے زمینوں سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی جتنی اس نے لوٹ مار کی ہے۔ اس نے اسلام آباد اور گجرات میں بھی بہت بڑی کوٹھیاں خریدی ہیں۔‘‘

’’آپ تو بس رہنے ہی دیں۔‘‘ امی برا مان کر بولیں۔

اتنا سب کچھ سننے کے بعد بھی نوشین پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اب بھی فرحان کو پسند کرتی تھی۔ دوسرے دن چھت پر گئی تو فرحان حسبِ معمول وہاں موجود تھا۔ آج اس نے کاٹن کا کلف والا سفید براق کرتہ شلوار پہن رکھا تھا اور پہلے سے زیادہ پُرکشش لگ رہا تھا۔ وہ نوشین کو دیکھ کر مسکرایا تو نوشین بھی مسکرانے لگی۔ اچانک فرحان نے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کیا۔ آج فرحان نے پہلی دفعہ ایسا کیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر صرف مسکرایا کرتے تھے۔

نوشین نے بھی شرما کر اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

اچانک فرحان جھک گیا اور اس نے چھوٹا سا ایک پتھر اٹھایا پھر اس پتھر پر ایک کاغذ لپیٹ کر نوشین کی طرف پھینک دیا۔

نوشین کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر جھک کر وہ پتھر اٹھا لیا۔ اس نے جو کاغذ لپیٹا تھا اس میں صرف ایک ٹیلی فون نمبر تھا اور لکھا تھا شام کو آٹھ بجے۔

اچانک سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی اور اسد کی آواز آئی۔ ’’نوشین۔‘‘

نوشین بری طرح گھبرا گئی اس نے وہ پرچہ اپنی مٹھی میں دبا لیا اور چلا کے بولی۔ ’’جی بھیا۔‘‘

نوشین کی آواز سن کر فرحان جلدی سے سیڑھیاں اتر گیا اور اسد اوپر آ گیا۔ وہ نوشین سے بولا۔ ’’یہ تو اوپر کیا کر رہی ہے؟‘‘

نوشین گھبرا کر بولی۔ ’’کک..... کچھ نہیں بھیا وہ دراصل میں.....‘‘

اسد اس کی گھبراہٹ پر ہنسنے لگا اور بولا۔ ’’ذرا جلدی سے نیچے آ جا۔ میرے دوست آئے ہیں مجھے ذرا چائے بنا دے۔‘‘

نوشین نے اطمینان کی سانس لی اور بولی۔ ’’تو یہ کہیں کہ آپ کو چائے کی ضرورت ہے۔ آپ چلیں میں آ رہی ہوں۔‘‘

اسد واپس چلا گیا۔ نوشین نے اپنی مٹھی میں دبا ہوا پرچہ دیکھا اور مسکرانے لگی۔ عین اسی وقت اسے پھر فرحان نظر آیا وہ شرارتی نظروں سے نوشین کو دیکھ رہا تھا۔ نوشین اسے دیکھ کر مسکرائی اور جلدی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ اس وقت شام کے پانچ بجے تھے۔ نوشین نے جلدی جلدی اسد کے دوستوں کے لیے چائے بنائی اور بھائی کو خوش کرنے کے لیے پکوڑے بھی تل دیے۔

اسے اب آٹھ بجے کا انتظار تھا۔ اسد اپنے دوستوں کے ساتھ جا چکا تھا۔

نوشین کے والد احمد صاحب دکان پر تھے اور رات کے گیارہ بجے سے پہلے گھر نہیں آتے تھے۔ انہوں نے چھوٹی سی ایک دکان سے کام شروع کیا تھا اور اپنی محنت سے کاروبار کو بڑھایا تھا۔ آج لبرٹی مارکیٹ میں ان کا بہت بڑا ایک جنرل اسٹور اور ریڈی میڈ گارمنٹ کی دکان تھی۔ اسی

میں انہوں نے ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک فیکٹری بھی شروع کی تھی۔ گھر میں دولت کی فراوانی تھی لیکن احمد صاحب نمود و نمائش کے قائل نہیں تھے اس لیے بہت سادہ زندگی گزار رہے تھے۔ گھر میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ وہ روایتی باپوں کی طرح نہیں تھے، نوشین کو ہر طرح کی آزادی تھی لیکن ایک حد میں رہ کر۔ وہ اپنی دوستوں کے گھر بھی جاتی تھی اور سیر و تفریح بھی کرتی تھی لیکن حد سے آگے کبھی نہیں بڑھی تھی۔ اس زمانے میں موبائل فون اور انٹرنیٹ نہیں تھا رابطے کا ذریعہ صرف ٹیلی فون تھا اور ٹیلی فون بھی ہر گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ تفریح کا ذریعہ بھی صرف ٹی وی تھا اس کی نشریات بھی رات کو بارہ بجے ختم ہو جاتی تھیں۔

نوشین نے جیسے تیسے وقت گزارا۔ امی عشا کی نماز پڑھنے چلی گئیں۔ سردیوں کا موسم تھا اس لیے عشا کی اذان بھی جلدی ہو جاتی تھی۔

آٹھ بجے اس نے لاؤنج میں بیٹھ کر ریسیور اٹھایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ فرحان کا نمبر ملا دیا۔

دوسری ہی گھنٹی میں دوسری طرف سے ریسیور اٹھالیا گیا اور ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو۔'' نوشین نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''جی فرمایئے۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''جی...... وہ مجھے ...... آ...... پ کون بول رہے ہیں؟''

دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی پھر وہ بولا۔ ''آپ نوشین ہیں؟''

''ج...... جی ہاں لیکن آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟''

''جیسے تم میرا نام جانتی ہو۔'' وہ اچانک آپ سے تم پر آگیا۔ ''میں فرحان ہوں۔''

''فرحان؟'' نوشین نے آہستہ سے کہا اور خاموش ہوگئی۔

''ہیلو...... نوشین......'' اس کی خاموشی سے گھبرا کر فرحان نے کہا۔ ''کیا تم موجود ہو؟''

''ہاں میں موجود ہوں لیکن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''کس سے ڈر لگ رہا ہے، مجھ سے؟'' فرحان کی آواز میں شوخی تھی پھر وہ آہستہ سے بولا۔ ''نوشین...... تم ایک بات جانتی ہو؟''

''کیا؟'' نوشین نے پوچھا۔

''یہی کہ...... تم بہت خوب صورت ہو۔''

''میں......؟''

''ہاں نوشین تم بہت خوب صورت ہو...... بہت حسین ہو۔ میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تو اپنا دل ہار گیا تھا۔ آئی لو یو نوشین...... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

نوشین کا دل اتنی زور سے دھڑکا گویا اچھل کر باہر آجائے گا۔ سردی کے باوجود اسے پسینا آگیا اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''فرحان...... میں بھی آپ سے...''

اس سے مزید بولا نہیں گیا۔

یہ ان کی پہلی گفتگو تھی۔ اسی بات چیت میں فرحان نے بتایا کہ میں ہر روز رات کو آٹھ بجے تمہارے ٹیلی فون کا انتظار کروں گا۔

امی نماز سے فارغ ہو چکی تھیں نوشین نے دوسرے دن بات کرنے کا وعدہ کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب نوشین شام کو چھت پر جا کر فرحان کو دیکھتی اشاروں میں ان دونوں کی باتیں ہوتیں پھر رات کو ٹیلی فون پر ان کی لمبی لمبی باتیں ہوتیں۔ نوشین نے ٹیلی فون کا ایک ایکسٹینشن اپنے بیڈروم میں بھی لگا لیا تھا۔ وہ چالاکی یہ کرتی کہ آٹھ بجے سے دو چار منٹ پہلے لاؤنج والے ٹیلی فون کا پلگ نکال دیتی تھی۔ اس طرح کوئی دوسرا فون پر اس کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔

انہیں ٹیلی فون پر باتیں کرتے اور چھت پر دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے ایک مہینا ہو گیا تھا۔ نوشین ان دنوں بہت خوش تھی۔ وہ فرحان کی محبت میں ڈوب چکی تھی۔

ایک دن حسبِ معمول اس نے فرحان کا نمبر ملایا دوسری طرف سے کسی عورت نے ریسیور اٹھایا اور بولی۔

''ہیلو...... ہیلو۔''

نوشین کچھ نہ بولی۔

''ارے بھئی بولتے کیوں نہیں۔'' دوسری طرف سے جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

''کون ہے امی؟''

''پتا نہیں کون گونگا ہے کچھ بول ہی نہیں رہا۔'' نوشین کے کانوں میں کسی عورت کی آواز آئی۔

''مجھے دیں۔'' فرحان نے کہا پھر اس کی آواز آئی۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو فرحان۔'' نوشین نے جلدی سے کہا۔

''میں......''

''دس منٹ بعد فون کرنا۔'' فرحان نے سرگوشی کی پھر بلند آواز میں بولا۔ ''کون ہو کچھ بولتے کیوں نہیں؟'' پھر اس نے لائن کاٹ دی۔

نوشین کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہ ریسیور ہاتھ میں لیے بیٹھی رہ گئی پھر اس نے سوچا فرحان بھی مجبور تھا ابھی امی کے سامنے کیسے بات کر سکتا تھا۔ اس کے پاس تو میرا ٹیلی فون نمبر نہیں ہے ورنہ خود ہی کال کر لیتا۔ ان دنوں سی ایل آئی کا وجود نہیں تھا۔

نوشین کچھ دیر انتظار کرتی رہی پھر ٹھیک دس منٹ بعد اس نے دوبارہ فرحان کا نمبر ڈائل کیا اس مرتبہ ٹیلی فون فرحان نے ہی اٹھایا۔ اس کی آواز سن کر نوشین سب کچھ بھول گئی۔

''نوشین!'' فرحان نے کہا۔ ''ہم کب تک یوں چھپ چھپ کر ٹیلی فون پر بات کرتے رہیں گے یا چھت پر دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے؟''

''یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے۔'' نوشین نے کہا۔ ''آپ کب اپنی امی کو بھیج رہے ہیں؟''

''یار اس آپ سے غیریت کی بو آتی ہے۔'' فرحان نے بہت محبت سے اسے پکارا۔ ''کیا ہم کہیں ملاقات کر سکتے ہیں؟''

''نہ بابا...... مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ میرے بھیا غصے کے بہت تیز ہیں وہ......''

''تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے بھیا تمہیں بہت چاہتے ہیں۔'' فرحان نے کہا۔

''ہاں وہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں لیکن کوئی بھی غیرت مند بھائی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بہن چھپ چھپ کر غیروں سے ملے۔''

''میں تمہارے لیے غیر ہوں؟'' فرحان نے کہا۔ ''غیر سمجھتی ہو مجھے؟''

''تم میرے لیے غیر نہیں ہو لیکن...... بھیا اور ابو کی نظروں میں دنیا والوں کی نظروں میں تو غیر ہو۔'' نوشین نے کہا۔

''میں دنیا والوں کو نہیں جانتا نوشین۔'' فرحان نے جذباتی ہو کر کہا۔ ''میں صرف تمہیں اپنے پیار کو جانتا ہوں اور میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''بہت مشکل ہے میرے لیے۔'' نوشین نے کہا۔

''پلیز ابھی ضد مت کرو۔''

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں نوشین۔'' فرحان نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ''مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو۔''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو فرحان میں......''

''ہاں یا نہ؟'' فرحان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''دیکھو فرحان میں......''

''ہاں یا نہ؟'' فرحان نے دوبارہ سخت لہجے میں پوچھا۔ ''اگر تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا تو میں اسے بھی تمہارا انکار ہی سمجھوں گا پھر مجھے ٹیلی فون بھی مت کرنا۔'' یہ کہہ کر فرحان نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

''ہیلو فرحان...... میری بات سنو......'' نوشین چیختی ہی رہ گئی لیکن ٹیلی فون لائن خاموش تھی۔

نوشین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے اضطراری انداز میں دوبارہ فرحان کا نمبر ملایا لیکن ٹیلی فون انگیج تھا شاید فرحان نے ریسیور کریڈل سے اتار کر رکھ دیا تھا۔ نوشین نے کئی بار نمبر ملا کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ اسے انگیج کی ٹون سنائی دی۔ نوشین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بستر پر گر کر بری طرح رونے لگی۔

دوسرے دن تک اسے بخار آ گیا اور وہ کالج نہیں گئی۔ شام تک اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو وہ ہمت کر کے چھت پر پہنچی فرحان وہاں موجود تھا نوشین کو دیکھ کر اس نے بے رخی سے منہ پھیر لیا۔

''میری بات سنو فرحان۔'' نوشین چیخ کر بولی اس وقت وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس کی آواز اردگرد کی دوسری چھتوں تک بھی جا رہی ہوگی۔ ''فرحان!'' وہ پھر چیخی۔

فرحان نے نفرت سے اسے دیکھا اور پیر پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ نوشین بے بسی اور مایوسی کے عالم میں وہیں بیٹھ گئی اور آنسو بہانے لگی۔

وہ نہ جانے کب تک یوں ہی بیٹھی رہی ہوش تو اسے امی کی آواز پر آیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے پکار رہی تھیں۔ ''نوشین...... کہاں ہو تم؟''

نوشین نے جلدی جلدی اپنے دوپٹے سے آنسو صاف کیے اور کپڑے جھاڑتے ہوئے بولی۔ ''جی امی میں یہاں ہوں۔'' اس نے خود پر قابو پا کر بہ مشکل تمام کہا۔

''بیٹا، نیچے آؤ شمسہ آئی ہے۔'' امی نے کہا۔

''شمسہ آئی ہے؟'' اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ''میں آ رہی ہوں امی۔'' اس نے جواب دیا اور نیچے

کی طرف لپکی۔

شمسہ اس کی بہترین دوست تھی۔ وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

شمسہ اس کی حالت دیکھ کر چونک اٹھی اور بولی۔ ''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے نوشین؟''

نوشین اس سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کیا ہوا..... میں ٹھیک تو ہوں۔''

''لگتا ہے تم روئی ہو؟'' شمسہ نے کہا۔ ''تمہاری آنکھوں سے یہی ظاہر ہے مجھے بتاؤ نوشین کیا بات ہے؟''

شمسہ نے اتنی اپنائیت سے پوچھا تو نوشین ایک مرتبہ پھر رونے لگی اور اس نے سب کچھ اسے تفصیل سے بتا دیا۔

اس کی بات سن کر شمسہ نے کہا۔ ''نوشین، اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''تو اتنا تکلف کب سے کرنے لگی؟'' نوشین نے کہا۔ ''میں تیری کسی بات کا برا کیوں مانوں گی۔''

''میں صرف اتنا کہوں گی کہ فرحان اچھا لڑکا نہیں ہے۔ اس سے تعلقات ختم کر دو۔''

''یہ تو کیا کہہ رہی ہے شمسہ؟'' نوشین جھنجلا کر بولی۔ ''تو نے فرحان کو دیکھا نہیں کبھی اس سے ملی نہیں پھر تو یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہے؟''

''کسی کے بارے میں جاننے کے لیے اس سے ملنا ضروری نہیں ہوتا۔'' شمسہ نے کہا۔ ''میں نے تیری باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔ وہ اگر تیرے لیے اتنا ہی بے تاب ہے تو رشتے کے لیے اپنی امی کو یہاں کیوں نہیں بھیجتا؟''

''اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بہت جلد اپنی امی کو یہاں بھیجے گا۔'' نوشین نے کہا۔

''تو پھر اس وقت تک صبر کر۔ آخر وہ تم سے ملنا کیوں چاہتا ہے؟ تم چھت پر جا کر اسے دیکھ لیتی ہو ٹیلی فون پر تمہاری اس سے بات بھی ہو جاتی ہے پھر.....''

''لیکن وہ برا لڑکا نہیں ہے شمسہ۔'' نوشین نے کہا۔

''دیکھو نوشین۔'' شمسہ نے کہا۔ ''میں تیری دوست بھی ہوں اور اب تیری بھابی بھی بننے والی ہوں۔ میں تیری خیر خواہ ہوں۔ اگر فرحان تجھ سے ملنے کی ضد کر رہا ہے تو اس کی بات مت ماننا۔''

''تو نے بھی بھیا سے محبت کی ہے، تو نے بھی بھیا کی بہت سی باتیں مانی ہیں پھر تو مجھے.....''

''محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے نوشین۔'' شمسہ نے کہا۔ ''میں نے اسد سے محبت کی ہے لیکن انہوں نے کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی مجھے ملاقات پر مجبور نہیں کیا حالانکہ اب تو ہماری منگنی بھی ہو چکی ہے۔''

شمسہ، نوشین کو دیر تک سمجھاتی رہی پھر وہ رخصت ہو گئی۔ اس وقت آٹھ بجنے والے تھے۔ گھڑی دیکھ کر نوشین ایک مرتبہ پھر فرحان کی یادوں میں کھو گئی۔ اس نے حسب معمول لاؤنج کے ٹیلی فون کا پلگ نکالا اور اپنے کمرے میں آ کر فرحان کا فون نمبر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر نوشین کو غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہیلو۔'' نوشین نے گھبرا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا پھر اس نے وقفے وقفے سے کئی بار فرحان کے نمبر ڈائل کیے لیکن ہر مرتبہ اسے ناکامی ہوئی۔ کبھی ریسیور فرحان کی امی اٹھا لیتیں کبھی کوئی اور۔

نوشین نے مایوس ہو کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور بری طرح رونے لگی۔

وہ دوسرے دن بھی کالج نہیں گئی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اس سے پہلے وہ چھٹی کرتی تھی تو شمسہ گھر آ جاتی تھی لیکن اب منگنی کے بعد شمسہ نے کالج جانا بہت کم کر دیا تھا اس لیے وہ بھی نوشین کے پاس نہیں آتی۔

وہ شام کو اس امید پر چھت پر چلی گئی کہ ممکن ہے فرحان سے بات ہو جائے، وہ ہاتھ جوڑ کے اسے منا لے گی لیکن اس دن فرحان اسے چھت پر نظر نہیں آیا۔

نوشین کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی اس کی حالت سے امی بھی پریشان تھی اور اسد بھی اور اس نے بار بار اس سے اس کی وجہ پوچھی لیکن نوشین بھلا نہیں کیا بتاتی۔ اسد اسے اپنے ساتھ باہر لے گیا اور دیر تک اسے گاڑی میں گھماتا رہا لیکن نوشین کی اداسی ختم نہیں ہوئی۔

چوتھے دن تو نوشین اپنے حواس کھو بیٹھی۔ وہ پاگلوں کی طرح کبھی چھت پر جاتی اور کبھی اپنے کمرے میں آ جاتی۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ نوشین کو نہ اپنا ہوش تھا نہ اردگرد کا۔ اس کے بس دو ہی کام تھے۔ چھت پر جا کر فرحان کی چھت پر نظریں جمائے بیٹھی رہتی یا پھر ٹیلی فون پر فرحان کا نمبر ڈائل کرتی رہتی۔

اس دن بھی وہ چھت پر بیٹھی تھی شام کا وقت تھا اچانک فرحان چھت پر آ گیا۔ اس نے ایک نظر نوشین کو دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔

اس سے پہلے کہ نوشین چیخ کر اسے آواز دیتی اس نے

اشارے سے کہا کہ آج رات ٹیلی فون پر بات کرنا پھر وہ اسے دیکھتا ہوا زینے کی طرف بڑھ گیا۔

نوشین تو گویا خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ وہ خوشی میں جھومتی ہوئی نیچے آئی اور ایک ہفتے بعد نہا دھو کر پسند کے کپڑے پہنے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فرحان سے ملاقات ہونے والی ہو۔ اس دن نوشین نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ وہ بات بات پر ہنس رہی تھی۔ امی نے سکون کا سانس لیا کہ نوشین کی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔

شام ہوتے ہی اس نے بے صبری سے گھڑی کو دیکھنا شروع کردیا۔ آٹھ بجتے ہی اس نے فرحان کا نمبر ڈائل کیا تو دوسری گھنٹی پر فرحان نے ریسیور اٹھالیا۔

☆☆☆

اس دن اسد خلافِ معمول جلدی گھر آ گیا تھا۔ وہ بھی احمد صاحب کے ساتھ کاروبار میں لگ گیا تھا۔ وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا اور نوشین کو آواز دینے لگا۔ اسے یاد آ گیا کہ مجھے ایک ضروری کال کرنا تھی۔ اس نے جیب سے ٹیلی فون انڈیکس نکالی اور نمبر نکال کر ریسیور اٹھالیا۔ وہ نمبر ڈائل کرنے ہی والا تھا کہ نوشین کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ وہ ٹیلی فون پر کہہ رہی تھی۔

''تم بہت ظالم ہو فرحان...... میں اگر مرجاتی تو......''

''ایسی باتیں مت کرو جان۔'' دوسری طرف سے فرحان کی آواز آئی۔ ''تم نے بھی تو ملاقات سے انکار کر کے مجھے جیتے جی مار دیا تھا۔''

''اچھا یہ بتاؤ ملنا کہاں ہے؟'' نوشین نے پوچھا۔

''یار سب سے محفوظ جگہ تو میری چھت ہی ہے جب سب گھر والے سو جائیں تو تم مجھے فون کر دینا اور صرف ایک گھنٹی بجنے کے بعد لائن کاٹ دینا۔ میں سمجھ لوں گا کہ تم چھت پر آرہی ہو۔ میں بھی چھت پر پہنچ جاؤں گا۔ ہماری اور تمہاری چھت کے درمیان چار فٹ کی ایک دیوار ہی تو ہے۔ میں اپنی چھت سے تمہاری چھت پر پہنچ جاؤں گا۔'' پھر وہ بولا۔ ''سنو میں فون بند کر رہا ہوں میں رات کو بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گا۔ ایسا نہ ہو کہ میں رات بھر جاگتا رہوں اور تم مجھے بھول کر سو جاؤ۔''

''میں خود کو تو بھول سکتی ہوں فرحان تمہیں نہیں بھول سکتی۔'' پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

اسد نے بھی ریسیور رکھ دیا اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی سیدھی اور پاک باز بہن بھی ایسی گفتگو کر سکتی ہے۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی نوشین کو گولی مار دے پھر اس نے یہ سوچ کر ضبط کر لیا کہ قصوروار فرحان بھی ہے۔ میں آج رات ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ فرحان بڑے باپ کا بیٹا ہے، ہوا کرے اس کی جرأت کیسے ہوئی میری بہن پر بری نظر ڈالنے کی۔

وہ دیر تک گاڑی لیے بے مقصد ادھر ادھر گھومتا رہا۔

بارہ بجے کے قریب وہ گھر پہنچا تو دروازہ نوشین نے کھولا۔ اسے دیکھ کر اسد کا خون پھر ابلنے لگا۔ اس نے بہ مشکل تمام خود پر قابو پایا اور نوشین کی طرف دیکھے بغیر اندر کی طرف بڑھا۔

نوشین چہک کر بولی۔ ''بھیا آج آپ نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟''

''کچھ کام تھا۔'' اسد نے کہا۔ اسے اپنی آواز خود بھی اجنبی لگی۔

''کھانا نکالوں؟'' نوشین پھر چہکی۔

''نہیں میں کھانا کھا چکا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بیڈ پر لیٹا تھا کہ نوشین پھر اس کے کمرے میں آگئی۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا وہ ہنس کر بولی۔

''شکر ہے آپ جاگ رہے ہیں میں آپ کو دودھ دینا تو بھول ہی گئی تھی۔''

اس نے دودھ کا گلاس لے کر تپائی پر رکھ دیا۔

اسد نے دودھ پی کر لائٹ آف کر دی۔ اسے لیٹے ہوئے شاید آدھا گھنٹا ہوا تھا۔ اچانک آہستگی سے اس کے کمرے کا دروازہ پھر کھلا اور نوشین نے اندر جھانکا۔ اسد سوتا بن گیا۔ گویا نوشین یہ دیکھنے آئی تھی کہ سو گیا یا نہیں؟ خون ایک مرتبہ پھر اس کی کن پٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور الماری کھول کر اپنا ریوالور نکالا۔ یہ ریوالور اس نے دو مہینے پہلے ہی خریدا تھا۔ اس نے ریوالور لوڈ کیا اور اسے جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ وہ بلی کی طرح دبے پاؤں زینے پر پہنچا تو اسے چھت پر سے نوشین کے ہنسنے کی آواز آئی پھر وہ بولی۔

''فرحان...... تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ مجھے اب تمہارے بغیر ایک پل بھی چین نہیں آتا۔''

''جادو تو تم نے مجھ پر کر دیا ہے جان۔'' فرحان

جذباتی لہجے میں بولا۔

یہ باتیں سن کر اسد مارے غصے کے حواس کھو بیٹھا۔ اس نے ریوالور نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ایک دم کئی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچ گیا وہاں کا منظر دیکھ کر تو وہ غصے سے بالکل اندھا ہو گیا۔ نوشین، فرحان کی بانہوں میں تھی۔

آہٹ محسوس کر کے نوشین نے اس کی طرف دیکھا اور ہلکی سی ایک چیخ مار کر بولی۔ ''بھیا۔''

''بے غیرت ۔ بے حیا لڑکی تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے ریوالور کا رخ نوشین کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''گولی مت چلانا بھیا پہلے میری بات سن لو۔''

''بکواس بند کر بدچلن لڑکی، تجھ جیسی لڑکی کا مر جانا ہی بہتر ہے۔''

''دیکھو اسد۔'' فرحان نے چیخ کر کہا۔ ''قصوروار نوشین نہیں بلکہ میں ہوں۔''

''چل پھر پہلے تیرا ہی قصہ پاک کیے دیتا ہوں۔'' اسد نے کہا اور فرحان کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ گولی فرحان کی کھوپڑی پار کرتی نکل گئی۔ نوشین نے ایک چیخ ماری اور اسد کو دھکا دیتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ گولی کی آواز سن کر احمد صاحب اور ان کی بیگم بوکھلا کر ننگے پاؤں چھت کی طرف بھاگے، اس دور میں شاذ و نادر ہی گولی چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی ۔ آن واحد میں محلے کے کئی لوگ وہاں پہنچ گئے ۔ ان میں فرحان کے والدین بھی تھے۔ انہوں نے بیٹے کی لاش دیکھی تو دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ کسی نے پولیس کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ اس دوران میں اسد نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پولیس نے اسد کو گرفتار کر لیا۔

فرحان کا باپ اثر و رسوخ والا تھا اس نے اسد کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی کہ اسد نے فرحان سے پیسے بٹورنے کے لیے اسے کاروبار کا جھانسا دیا۔ فرحان اس کے جھانسے میں نہیں آیا تو اسد نے اس سے پانچ لاکھ روپے ادھار لے لیے، پانچ لاکھ اس دور میں آج کے ایک کروڑ کے برابر تھے۔ جب فرحان نے رقم کی واپسی کا تقاضا کیا تو اسد اسے مختلف حیلوں بہانوں سے ٹالتا رہا گزشتہ شام ان دونوں میں اچھی خاصی تلخ کلامی بھی ہوئی تھی ۔ اس پر اسد نے فرحان سے کہا تھا کہ آج رات تمہاری رقم ادا کر دوں گا تم اوپر چھت پر آ جانا۔ فرحان کو اس کے ارادوں کا علم نہیں تھا۔ وہ چھت پر پہنچا تو اسد وہاں ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ وہ جیسے ہی اسد کی چھت پر پہنچا اسد نے اسے گولی مار دی۔

چوہدری دلاور نے نوشین کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا اس کا خیال تھا کہ اگر نوشین کا معاملہ سامنے آیا تو عدالت اسے اشتعال کا نتیجہ قرار دے گی اور اسد کو بہت معمولی سزا ہوگی۔

چوہدری دلاور اسد کو سزائے موت دلانا چاہتا تھا۔

چوہدری دلاور کی بنائی ہوئی کہانی میں کئی جھول تھے مثلاً یہ کہ اسد نے اس سے پانچ لاکھ روپے کیوں لیے؟ فرحان اتنا بھولا تھا کہ اس نے بغیر کسی گواہ اور ثبوت کے اتنی خطیر رقم اسد کے حوالے کر دی پھر یہ کہ جب دن میں ان دونوں کی تلخ کلامی ہو چکی تھی تو فرحان اس کی چھت پر کیوں گیا؟ اسے اپنا قرض لینا تھا تو اتنی رازداری کی کیا ضرورت تھی۔

اسد نے بھی نوشین کا نام نہیں لیا۔ جب چوہدری دلاور نے نوشین کا نام نہیں لیا تھا تو اسے اپنی بہن کا تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

یہ تو چوہدری دلاور کی ابتدائی کہانی تھی اس کے وکیل نے بھی یہی کہانی سنائی کہ اسد کو پھانسی نہیں تو عمر قید ضرور ہو جاتی۔

دوسرے دن شمسہ، نوشین کے گھر پہنچی نوشین اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ شمسہ خود نڈھال ہو رہی تھی اس نے نوشین سے پوچھا۔ ''کیا اسد اور فرحان کی دوستی تھی؟''

''میں نہیں جانتی۔'' نوشین نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''اگر ان دونوں کی دوستی تھی تو کبھی فرحان کو اس کے ساتھ نہیں دیکھا۔''

''سچ سچ بتاؤ نوشین۔'' شمسہ نے کہا۔ ''دیکھو اب فرحان نہیں رہا۔ ممکن ہے تمہارے سچ بتانے سے اسد کی جان بچ جائے۔''

نوشین یہ بات شمسہ سے نہیں چھپا سکی اور اس نے رو رو کر شمسہ کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

''دیکھو نوشین۔'' ساری بات سننے کے بعد شمسہ نے کہا۔ ''تم پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتا دو اس طرح اسد کو کم سے کم سزا ہوگی۔''

''اگر میرے کچھ بتانے سے بھیا کی جان بچ سکتی ہے تو میں پولیس کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گی۔'' نوشین نے کہا۔

شمسہ کے جانے کے بعد نوشین احمد صاحب کے کمرے میں پہنچی۔ وہ غم سے نڈھال بیڈ پر نیم دراز تھے۔

باپ کی حالت دیکھ کر نوشین ان سے لپٹ کر بلک بلک کر رو دی۔ احمد صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دینے لگے۔ اس نے اچانک کہا۔ ''ابو اس واقعے کی ذمے دار میں ہوں۔''

احمد صاحب چونک کر بولے۔ ''تو ذمے دار ہے؟''

''جی ابو۔'' نوشین نے سر جھکا کر کہا۔ ''فرحان کے قتل کی ذمے دار بھی میں ہوں۔'' پھر اس نے احمد صاحب کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ احمد صاحب ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے۔

''بے شرم، بے حیا لڑکی میری عزت سے کھیلتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ اب تیرے سچ بولنے سے بھی کیا ہوگا فرحان کا باپ بہت اثر رسوخ والا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اسد کو سزا دلانا چاہے گا۔ تیرے سچ بولنے سے مجھے بیٹا تو واپس نہیں ملے گا۔ ہاں میری عزت ضرور مٹی میں مل جائے گی تو اب تک خاموش رہی ہے تو اب بھی خاموش رہ۔''

☆☆☆

پورے ڈھائی سال بعد اس کیس کا فیصلہ ہوا۔ عدالت نے اسد کو سزائے موت دے دی۔ اسد کے وکیل نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی چھ مہینے بعد ہائی کورٹ نے بھی اپنا فیصلہ دے دیا۔ ہائی کورٹ نے بھی اس فیصلے کی توثیق کر دی۔

احمد صاحب ہار ماننے والے نہیں تھے انہوں نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ مزید ایک سال بعد سپریم کورٹ نے بھی اسد کے خلاف فیصلہ سنا دیا۔

اصل میں پولیس اور وکیلوں کی ملی بھگت سے چوہدری دلاور نے ایسا کیس بنایا تھا کہ اسد کی گلوخلاصی نہیں ہو پا رہی تھی۔

اب صرف ایک ہی صورت باقی تھی صدرِ پاکستان سے رحم کی اپیل اسد کے وکیل نے احمد صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ چوہدری دلاور سے بات کرلیں ممکن ہے وہ خوں بہا لینے پر راضی ہو جائے۔

''مشکل ہے۔'' احمد صاحب نے مایوسی سے کہا۔ ''وہ تو چاہتا ہے کہ اسد پھانسی پر چڑھ جائے۔ وہ بھلا خون بہا کیوں لے گا۔''

''پھر بھی آپ اس سے بات تو کریں ممکن ہے وہ راضی ہو ہی جائے۔''

''چلو یہ بھی کر لیتے ہیں۔'' احمد صاحب نے کہا لیکن

لاہور کے عوام کو انگریز قوم کے ساتھ شدید محبت ہے اور وہ آج بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ میرے لیے یہ بات باعث حیرت ہے کیونکہ انگریزوں نے ڈیڑھ سو برس تک یہاں کے لوگوں کو اپنا غلام بنائے رکھا ہے اور اس دوران ان پر سخت مظالم روا رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ انہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ انگریز دور کے بعض خانساموں اور خان بہادروں سے ہوتی تو انہیں کہتا سنا کہ انگریز کا جواب نہیں' ایک روز ایک گلی میں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے بچے کو گود میں لیے ہلکارے دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ منہ سے کچھ بولے بھی جاتا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بہلانے کے لیے ان کے ساتھ کس قسم کی گفتگو کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ شخص اپنے بچے کو محبت بھری نظر سے دیکھ رہا ہے اور کہہ رہا ہے ''آہا' میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے۔''

اقتباس: ''خندِ مکرر'' از عطاء الحق قاسمی

ان کے لہجے میں مایوسی تھی۔

اس شام کو وہ اپنی بیگم کو لے کر چوہدری دلاور کے گھر پہنچ گئے۔ چوہدری دلاور نے بہت سرد مہری سے ان کا استقبال کیا اور بولا۔ ''اب آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟''

''اپنے بیٹے کی زندگی۔'' احمد صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''جب تمہارے بیٹے نے فرحان کی زندگی چھینی تھی تو جانتے ہو میرے دل پر کیا گزری تھی۔'' چوہدری دلاور نے تلخ لہجے میں کہا۔

''دیکھیے فرحان اور اسد کی کوئی دشمنی نہیں تھی جس صورتِ حال میں اسد نے وہ قدم اٹھایا اس سے آپ بھی واقف ہیں۔''

''ہاں ایک باغیرت نوجوان کو یہی کرنا چاہیے تھا جو اس نے کیا۔'' دلاور نے کہا۔ ''اور ایک باپ کی حیثیت سے بھی میں وہ کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے۔''

''دیکھیے..... میں آپ پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈال سکتا بس آپ سے رحم کی درخواست ہی کر سکتا ہوں۔''

چوہدری دلاور خاموش ہو کر سوچنے لگا پھر بولا۔ ''میں اسد کی جان بخشی کر سکتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''آپ بتائیے چوہدری صاحب۔'' اسد کی امی نے کہا۔ ''آپ کی کیا شرط ہے ہمیں آپ کی ہر شرط منظور

ہے۔"

"اگر آپ میری تمام دولت اور جائداد لے کر بھی میرے بیٹے کی جان بخشی کردیں تو مجھے منظور ہوگا مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔"

"تو پھر میری ایک ہی شرط ہے۔" چوہدری دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کردیں۔"

احمد صاحب سناٹے میں رہ گئے پھر وہ آہستہ سے بولے۔ "یہ......کیسی شرط ہے چوہدری صاحب؟"

"میری یہی شرط ہے اگر آپ کو منظور ہے تو مجھے بتا دو میں پرسوں نکاح خواں کو لے کر آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔"

"لیکن چوہدری صاحب......آپ......"

"بس احمد صاحب۔" چوہدری دلاور نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "آپ نے صدر مملکت سے رحم کی اپیل کر رکھی ہے انہوں نے بہت رحم کیا تو اس کی پھانسی کو عمر قید میں بدل دیں گے اسد کی جان تو بچ جائے گی لیکن اس کی پوری جوانی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزر جائے گی...... مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ اب آپ جاسکتے ہیں۔"

احمد صاحب جانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ اچانک اسد کی امی نے کہا۔ "ہمیں آپ کی شرط منظور ہے۔"

"بیگم......آپ......"

"چوہدری نوشین سے باقاعدہ نکاح کریں گے انہوں نے یہ شرط رکھی ہے تو ہمیں اس پر یقین کرنا پڑے گا کہ وہ نوشین کو خوش رکھیں گے۔"

"نوشین یہاں بہت خوش رہے گی۔" چوہدری دلاور نے کہا۔ "اس طرح نہ صرف آپ کی بیٹی کا گھر آباد ہوجائے گا بلکہ آپ کا بیٹا بھی مل جائے گا میں پرسوں قاضی کو لے کر آپ کے گھر آتا ہوں۔"

احمد صاحب وہاں سے باہر نکلے تو بہت خوش تھے چوہدری دلاور اتنا بوڑھا نہیں تھا وہ قابل رشک صحت کا مالک تھا اور اپنی عمر سے دس بارہ سال کم ہی لگتا تھا۔ نوشین کی وجہ سے فرحان قتل ہوا ہے اسے اتنی تو سزا ملنی چاہیے۔ یہ سب باتیں سوچ کر وہ خود کو بہلا رہے تھے۔

نوشین نے یہ سنا تو اس نے صاف انکار کردیا۔ احمد صاحب نے اسے اپنا اور اسد کا واسطہ دیا۔ اپنے مرجانے کی دھمکی دی تو وہ راضی ہوگئی اور کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ "میں چوہدری دلاور سے نکاح ضرور کروں گی لیکن میری رخصتی اس وقت ہوگی جب بھیا گھر آجائیں گے۔"

احمد صاحب نے اسی وقت چوہدری دلاور کو ٹیلی فون کیا اور اسے بتایا کہ نوشین کیا چاہتی ہے۔

چوہدری دلاور نے کہا۔ "مجھے منظور ہے پرسوں میں صرف نکاح کرنے کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔ رخصتی اسد کی واپسی کے بعد ہوگی۔"

تیسرے دن چوہدری دلاور اپنے دو تین دوستوں اور اپنی بیوی صفیہ بیگم کے ساتھ آیا اور نکاح کرنے کے بعد چلا گیا۔ نوشین کے چہرے پر مردنی تھی وہ یوں چل پھر رہی تھی جیسے نیند کے عالم میں چل رہی ہو۔ ماں باپ تو بیٹے کی رہائی پر اتنے خوش تھے کہ انہیں بیٹی کی زندہ لاش کا احساس بھی نہیں ہوا حتیٰ کہ اس موقع پر اس کی بہترین دوست شمسہ بھی بالکل اجنبی بن گئی تھی۔

نکاح کے تیسرے ہی دن اسد جیل سے رہا ہوکر گھر آگیا، اس کی رہائی پر احمد صاحب نے بہت بڑی تقریب کی اور خوب جشن منایا۔ نوشین کے علاوہ ہر شخص خوش تھا۔ اسد تو اس سے بات بھی نہیں کررہا تھا۔

اسد کی رہائی کے دو روز بعد چوہدری اور نوشین کو رخصت کروانے آگیا۔ شمسہ نے اسے دلہن بنایا اسد اب بھی اس سے بات نہیں کررہا تھا۔ نوشین نے شمسہ سے کہا۔ "ایک دفعہ بھیا کو بلادو میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں اور ان کے سینے سے لپٹ کر رونا چاہتی ہوں۔"

شمسہ کے اصرار پر اسد، نوشین کے کمرے میں پہنچ گیا، نوشین اس سے لپٹ کر بلک بلک کر روئی۔ وہ بری طرح روئی کہ احمد صاحب اور ان کی بیگم بھی وہاں آگئیں۔ نوشین رو رو کر سب سے معافیاں مانگ رہی تھی پھر جوں ہی آنسو تھمے وہ رخصت ہوگئی۔

اسے رخصت کرکے اسد کو پچھتاوے کا احساس ہوا اس نے اپنی قربانی دے کر اسد کی زندگی بچالی تھی۔

رات کو ڈھائی بجے کے قریب احمد صاحب کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے پر چوہدری دلاور تھا اس نے اطلاع دی کہ نوشین نے زہر کھا کر اپنی جان دے دی ہے۔

احمد صاحب سکتے میں آگئے اسد غش کھا کر گر پڑا نوشین نے ماں باپ اور بھائی کو زندگی بھر کے پچھتاوے میں مبتلا کردیا تھا۔

جناب ایڈیٹر صاحب

سلام تہنیت

آپ لوگ جرم و سزا کی کہانیاں بالکل نہیں دیتے اس لیے میں فیصل آباد کے ایک دلچسپ واقعہ کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ اسے بالکل فیکشن کی طرح ترتیب دیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو بھی لطف آئے۔

محمد فاروق انجم
(فیصل آباد)

انسان کی نیت کسی بھی وقت بدل سکتی ہے۔ جانے کب دل میں کھوٹ اپنی جگہ بنا کر بیٹھ جائے اور اس کے دل کا سارا نظام اپنے ہاتھ میں لے کر انسان کو پتلی کی طرح نچانا شروع کر دے، کچھ ایسا ہی حال ظفر کا بھی ہو گیا تھا۔

وہ احمد نواز کے بنگلے میں بارہ سال سے ڈرائیور کی حیثیت سے نوکری کر رہا تھا۔ احمد نواز ایک بڑا بزنس مین تھا۔ ظفر نے اپنی شرافت اور ایمانداری سے احمد نواز کا ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی فریدہ بیگم کا بھی دل جیت لیا تھا۔ یہی

وجہ تھی کہ وہ اس بنگلے کا خاص ملازم بن گیا تھا۔ اس پر اتنا اعتماد کیا جاتا تھا کہ جس سے گھر کے دوسرے ملازمین کو جلن سی ہونے لگی تھی۔ ظفر اب اس گھر کا محض ڈرائیور ہی نہیں تھا بلکہ وہ دونوں میاں بیوی کا ہر وہ کام کرنے چلا جاتا تھا جو اسے حکم ملتا تھا۔ اسے بنگلے میں آنے جانے کی اجازت تھی۔ اور وہ دونوں میاں بیوی سے بے تکلفی سے بات بھی کرتا تھا۔ احمد نواز اور فریدہ بیگم جب بہت زیادہ خوشگوار موڈ میں ہوتے تھے تو اس سے مذاق بھی کر لیتے تھے۔

احمد نواز اور فریدہ بیگم کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ دونوں بیرونِ ملک پڑھائی کے لیے گئے ہوئے تھے۔ بڑا بیٹا اکیس سال کا تھا۔ احمد نواز اپنی بیوی سے کم از کم سات سال بڑا تھا۔ اور فریدہ بیگم نے اپنی صحت کا ایسا خیال رکھا ہوا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے اور بھی کم عمر لگتی تھی۔ فریدہ بیگم روز جم جاتی تھی۔

گھر کا سارا انتظام فریدہ بیگم کے اختیار میں تھا جبکہ احمد نواز اپنے کاروبار میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ کئی دن وہ فریدہ بیگم کی طرف بھی توجہ نہیں دے پاتا تھا۔ احمد نواز ایک اُصول پسند شخص تھا۔ وہ کسی حال میں بھی اپنے اصولوں کی حد عبور نہیں کرتا تھا اور نہ ہی وہ یہ پسند کرتا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف کوئی چلے۔ اپنے اصول کے خلاف کوئی کام ہوتا دیکھ کر احمد نواز بعض اوقات اتنا تیخ پا ہو جاتا تھا کہ اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا تھا، بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ پر قابو پانا پڑتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بھی ہو گیا تھا۔

احمد نواز اکثر اپنی بیوی سے کہتا تھا کہ وہ پیسا کمانے کے لیے دن رات محنت کرتا ہے، اُسے اپنے ایک ایک پیسے کی قدر ہے، لہٰذا وہ فریدہ بیگم کو بھی تاکید کرتا تھا کہ وہ بھی اس کی کمائی کی قدر کرتے ہوئے پیسے کو احتیاط اور سوچ سمجھ کر خرچ کرے۔ بہرحال وہ ایک خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔

اس خوش و خرم زندگی کا حصہ ظفر بھی تھا لیکن اچانک اس کے دل میں ایک عجیب سا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں ایک سوچ نے جڑ پکڑنا شروع کر دی تھی کہ وہ ساری زندگی ڈرائیور ہی رہے گا گیا۔

اس سوچ نے ظفر کو مضطرب کر دیا تھا۔ رات کو سوتے ہوئے اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ اسی بارے میں سوچنے لگ جاتا تھا۔ کام کے دوران اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے اور اپنے مالکان کا حکم ماننے کے لیے بھاگ کھڑا ہو۔

ظفر کئی دنوں سے اس اندرونی جنگ میں مبتلا تھا۔ وہ باقاعدہ اپنی اس زندگی سے خوشحالی کی طرف جانے کا کوئی راستہ سوچنے لگا تھا۔ وہ منصوبہ بندی کرنے لگا تھا کہ کیسے اس کے پاس اچانک پیسا آ سکتا ہے۔

ایک دن اچانک فریدہ بیگم نے ظفر کو بلایا اور اسے سمجھانے لگی۔

''میری گاڑی کا کام ہونے والا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ اسے ورکشاپ میں چھوڑ آؤ۔''

''آپ کے سامنے مجھے فرصت ہی کب مل رہی ہے بیگم صاحبہ۔'' ظفر نے کہا۔

''ہاں یہ بھی بات ہے۔'' فریدہ بیگم کہتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ ''مجھے مسز اکرم کی طرف جانا ہے، ان کا کچھ سامان ہے وہ مجھے دینا ہے۔'' ظفر باہر ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد فریدہ بیگم نے آواز دے کر ظفر کو اندر بلا لیا۔

فریدہ بیگم الماری کا لاک کھول رہی تھی۔ پھر کچھ کپڑے نکال کر بیڈ پر رکھنے لگی۔ ظفر کمرے کے دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ الماری کا رخ اس طرح تھا کہ وہ اس جگہ کھڑا رہ کر بھی الماری کے اندر دیکھ سکتا تھا۔

''تم ایسا کرو کہ کل صاحب کو آفس چھوڑ کر میری گاڑی ورکشاپ دے آنا۔'' فریدہ بیگم نے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے چابیوں کے گچھے سے الماری کے اندر تجوری کی طرز کے بنے کیبن کا لاک کھولا اور جیسے ہی اس نے اس کا پٹ کھولا ظفر کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو گئی۔ وہ کیبن جیولری کے ڈبوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں سے ایک ڈبہ نکال کر فریدہ بیگم نے بیڈ پر رکھا اور پھر سے لاک کرنے لگی۔

''تم بول نہیں رہے۔ مجھے پتا نہیں رہے کہ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں کہ نہیں۔'' فریدہ بیگم نے الماری کو مقفل کرتے ہوئے کہا۔

''جی جی ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔'' ظفر یکدم چونکا۔

''یہ سامان اُٹھاؤ اور گاڑی میں رکھ دو۔'' فریدہ بیگم بولی۔

ظفر جلدی سے آگے بڑھا اور وہ سامان ایک ترتیب سے رکھنے لگا تاکہ اُٹھانے میں آسانی رہے۔ اس دوران غیر دانستہ طور پر فریدہ بیگم نے الماری کی چابی الماری کے

ساتھ ہی رکھے ہوئے ایک گلدان میں ڈال دی۔ شاید فریدہ بیگم نے اس خیال سے چابی اس میں ڈال دی تھی کہ اس کی دانست کے مطابق ظفر کا دھیان اس طرف نہیں تھا، یا پھر فریدہ بیگم نے اپنی طرف سے ہوشیاری دکھائی تھی لیکن ظفر چور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ فریدہ بیگم نے الماری کی چابی کہاں رکھی ہے۔

ظفر نے سامان اُٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فریدہ بیگم بھی تیار ہوکر گاڑی کے پاس آگئی۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی اور ظفر گاڑی بنگلے سے نکال کر باہر لے گیا۔

سارے راستے ظفر کو کچھ ایسی سوچوں نے گھیرے رکھا جس سے وہ مضطرب ہوگیا تھا۔ اس کی نیت بدل چکی تھی اور دل میں کھوٹ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ حلال چھوڑ کر حرام کی طرف راغب ہوگیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرچکا تھا۔ جانے کیسے اس کا دماغ اس منفی سوچ میں دور تک نکل گیا تھا۔

مسز اکرم کا گھر آگیا تھا۔ ظفر نے سارا سامان نکالا اور بولا۔ ''اگر آپ یہاں رکنا چاہتی ہیں تو میں اس دوران آپ کی گاڑی ورکشاپ میں چھوڑ آتا ہوں۔''

''مجھے ڈیڑھ، دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو اس دوران گاڑی چھوڑ آؤ۔'' فریدہ بیگم نے بھی اس کی بات سے اتفاق کیا۔

''گاڑی کی چابی گاڑی کے اندر ہی لگی ہوئی ہے؟''

ظفر نے جان بوجھ کر سوال کیا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ فریدہ بیگم نے کبھی گاڑی کی چابی گاڑی کے اندر نہیں رہنے دی بلکہ وہ چابی کو اپنے بیڈروم میں بنی ایک مخصوص جگہ پر رکھنے کی عادی تھی۔

''نہیں چابی میرے بیڈروم میں ہوتی ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ میں چابی کہاں رکھتی ہوں۔ تم چابی لے کر گاڑی لے جاؤ۔'' فریدہ بیگم نے کہا۔

ظفر نے سامان اندر پہنچایا اور اس جگہ سے کار تیزی سے نکال کر لے گیا۔ زندگی میں پہلی بار واردات کرتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

ظفر نے کار بنگلے کے اندر کھڑی کی اور اندر چلا گیا۔ اس نے اندر جاتے ہی سکینہ کو آواز دی۔ سکینہ اس گھر کی ملازمہ تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔

''میں نے بیگم صاحبہ کی کار ورکشاپ میں چھوڑنی ہے۔ تم ان کے بیڈروم میں جاؤ اور گاڑی کی چابی لے آؤ۔''

سکینہ بھاگتی ہوئی فریدہ بیگم کے بیڈروم میں چلی گئی۔ بیڈروم میں جاکر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور واپس آگئی۔

''کہاں ہے چابی؟'' سکینہ نے پوچھا۔ ظفر کچن میں کھڑا پانی پی رہا تھا۔

''روز ان کا کمرا صاف کرتی ہو اور یہ نہیں پتا کہ چابی کہاں رکھی ہوتی ہے۔''

''مجھے کیا پتا وہ چابی کہاں رکھتی ہیں۔'' سکینہ نے فوراً کہا۔ ایک ساتھ کام کرتے ہوئے وہ سب آپس میں بے تکلف بھی تھے۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' ظفر لے کر اسے بیڈروم میں چلا گیا۔ اس نے جان بوجھ کر دائیں بائیں دیکھا اور سکینہ سے بولا۔ ''دیکھو چابی کار میں تو نہیں لگی ہوئی۔''

سکینہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ظفر نے برق رفتاری سے کمرے کی اس کھڑکی کی چٹخنی کھولنی چاہی جو بنگلے کے عقب کی طرف کھلتی تھی لیکن اس وقت وہ چونکا جب اس نے دیکھا کہ کھڑکی کی چٹخنی پہلے سے ہی کھلی ہوئی تھی۔ شاید بیگم صاحبہ اسے لگانا بھول گئی تھیں۔ وہ پلٹا اور اس نے جلدی سے مخصوص جگہ سے چابی اُٹھائی اور بیڈروم سے باہر آگیا۔ وہ کام ظفر نے اس رفتار سے کیا تھا کہ سکینہ ابھی مین دروازے تک ہی پہنچی تھی۔

''آجاؤ مل گئی ہے چابی۔'' ظفر نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ خانساماں بھی کچن کے دروازے پر کھڑا ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''کہاں جارہے ہو؟'' خانساماں نے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ کی کار ورکشاپ میں چھوڑنے جارہا ہوں۔'' ظفر نے جواب دیا۔

خانساماں مسکراتا ہوا کچن میں چلا گیا اور سکینہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ ظفر باہر نکلا تو چوکیدار گیٹ کے پاس بیٹھا اپنے ہی دھیان میں سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''چھٹی نہیں ملی تجھے؟'' ظفر نے اس سے پوچھا۔

چوکیدار نے سگریٹ پیر کے نیچے رکھ کر ایسے مسلا جیسے وہ اپنا غصہ نکال رہا ہو۔ ''یہ بڑے لوگ بہت سخت دل ہوتے ہیں۔ ان کو کسی کا کوئی احساس نہیں ہوتا ہے۔ آج تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان کا گلا دبا دوں۔''

ظفر اس کی بات سن کر ہنسا۔ جب وہ بات کر رہا تھا تو سکینہ صفائی کرنے والا برش باہر سے اُٹھانے آئی تھی۔

"فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ظفر تسلی دے کر کار صاف کرنے لگا۔ سکینہ بھی برش اُٹھا کر اندر چلی گئی۔

ظفر نے دیکھا کہ چوکیدار اپنی سوچوں میں مستغرق بے نیاز بیٹھا ہے تو وہ فوراً بنگلے کے عقب کی طرف چلا گیا۔ وہ کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا وہ اپنا کام تیزی سے ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کھڑکی کا پٹ کھولا اور جست لگا کر اندر کود گیا۔ اس نے گملے کے اندر سے چابی نکالی اور الماری کھول کر اندر کے کیبن کا قفل کھولا اور تیزی سے جیولری کے ڈبے نکال کر باہر رکھنے لگا۔ پھر اس نے ایک ایک ڈبے سے جیولری نکالی اور اپنی جیب میں رکھے پلاسٹک کے شاپر میں ڈالنے لگا۔ وہ شاپر اس نے پانی پینے کے دوران کچن سے لیا تھا۔

سارے ڈبے خالی ہو گئے تھے۔ خالی ڈبوں کو اس نے اسی ترتیب میں کیبن کے اندر رکھا اور پھر یکدم اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر ایک ایک ڈبے کو صاف کیا تاکہ انگلیوں کے نشان نہ رہیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے الماری لاک کی اور الماری پر بھی جہاں جہاں اس نے ہاتھ لگایا تھا وہاں سے انگلیوں کے نشان ختم کیے اور چابی اسی گملے میں رکھ کر جس طرف سے آیا تھا اسی راستے سے وہ باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر اس نے کھڑکی سے اپنے ہاتھوں کے نشان ختم نہیں کیے تھے بلکہ جلدی میں چلا گیا تھا۔

اس کے کوٹ کی جیب جیولری سے بھری ہوئی تھی۔ چلتے چلتے اس نے ایک طرف سے پانی والا پائپ اُٹھایا اور کار کے پاس چلا گیا۔ چوکیدار ابھی تک اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر ظفر کی طرف دیکھا تھا اور پھر اسی انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ سب اس بنگلے میں پرانے کام کرنے والے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے کام میں کم ہی دخل اندازی کرتے تھے۔

ظفر کار کے پاس آ کر ایسے رکا جیسے اس نے کار دھونے کا ارادہ بدل دیا ہو۔ اور پھر پائپ اسی جگہ رکھ آیا۔

واپس آ کر ابھی ظفر نے کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ احمد نواز کی کال تھی۔

"ظفر کہاں ہو تم؟"

"جی میں گھر میں ہوں اور بیگم صاحبہ کی کار ورکشاپ چھوڑنے جا رہا ہوں۔"

"یہ کام بعد میں کرنا، گاڑی لے کر فوراً میرے آفس پہنچو۔" احمد نواز نے حکم دے کر فون بند کر دیا۔

ظفر سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ اس کی جیب میں اچھی خاصی جیولری ہے۔ وہ اسے لیے پھر نہیں سکتا۔ اسے فوراً آفس پہنچنا ہے۔ وہ جیولری کو راستے میں بھی کہیں ٹھکانے نہیں لگا سکتا ہے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ واپسی پر کار تو اسے ہی ورکشاپ چھوڑنے جانا ہے۔ لہٰذا اس نے فریدہ بیگم کی کار کی ڈگی کھول کر جیولری کا شاپر ایک کونے میں رکھ کر اس کے اوپر ڈگی میں پڑی خالی بوتل رکھ دی اور پھر ڈگی میں موجود کپڑا بھی اس کے اوپر رکھ کر ڈگی بند کر دی۔

اُس نے ایک نظر چوکیدار کی طرف دیکھا اور پھر سکینہ کو آواز دی۔ سکینہ اس کی آواز سن کر۔۔ بھاگتی ہوئی آ گئی۔ ظفر نے کار کی چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے صاحب کا فون آ گیا ہے۔ میں آفس جا رہا ہوں۔ چابی بیگم صاحبہ کے کمرے میں رکھ دو۔ آ کر گاڑی ورکشاپ چھوڑنے جاؤں گا۔"

سکینہ نے چابی لی اور اندر چلی گئی۔ ظفر دوسری گاڑی میں بیٹھا اور چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ ظفر کار بنگلے سے باہر لے گیا لیکن اس کی بے چینی بڑھ چکی تھی اور عجیب سے خوف کی وجہ سے اس کی ہاتھوں میں لرزش بھی پیدا ہو گئی تھی۔

ظفر آفس گیا تو احمد نواز کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ ظفر کے آتے ہی وہ انہیں گاڑی میں بیٹھا کر کافی فاصلے پر موجود ایک فیکٹری میں لے گیا۔ تقریباً اس فیکٹری میں احمد نواز اپنے دوستوں کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹے تک رہا اور اس دوران ظفر کی بے چینی اسے ایک پل کے لیے بھی چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ اس کا دھیان بار بار کار کی ڈگی میں رکھے زیورات کی طرف جا رہا تھا۔

احمد نواز وہاں سے نکلا تو وہ کسی کے آفس میں چلے گئے۔

جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو احمد نواز اپنے دوستوں کے ساتھ واپس آفس میں آ گیا اور ظفر سے کہا۔

"تم گاڑی لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے مجھے رات آنے میں دیر ہو جائے۔ ضرورت پڑی تو تمہیں فون کر دوں گا۔"

ظفر اس جگہ سے ایسے نکلا جیسے کوئی اپنی رسی تڑوا کر بھاگتا ہے۔ اس نے بنگلے کے باہر بریک لگائی۔ چوکیدار نے ہارن کی آواز سن کر دروازہ کھولا اور جونہی ظفر نے کار

کے اگلے دو ٹائر بنگلے کے وسیع گیراج میں داخل کیے اس کی نظر اس جگہ پڑی جہاں فریدہ بیگم کی کار کھڑی تھی تو وہ دنگ رہ گیا، کیونکہ اس جگہ کار موجود نہیں تھی۔

ظفر کار سے باہر نکلا اور اس نے چوکیدار سے سوال کیا۔ ''بیگم صاحبہ کی کار کون لے کر گیا ہے؟''

''بیگم صاحبہ خود لے کر گئی تھیں۔'' چوکیدار نے گیٹ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ ظفر مزید کوئی سوال پوچھنے کی بجائے مضطرب سا اندر چلا گیا۔ سامنے لاؤنج میں فریدہ بیگم کھڑی تھی۔

''بیگم صاحبہ گاڑی کہاں ہے؟ میں گاڑی کو ورکشاپ چھوڑ آتا۔'' ظفر نے پوچھا۔

''میں مسز اکرم کے گھر سے واپس آئی تو سکینہ نے بتایا کہ نواز نے تمہیں ضروری کام سے آفس بلا لیا ہے۔ میرے پاس وقت تھا۔ اور پھر میں نے سوچا کہ روز روز کرتے گاڑی کا کام ہی نہیں ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں خود گاڑی ورکشاپ دے آئی ہوں۔'' فریدہ بیگم نے بتایا۔

ظفر چونکا لیکن اس نے اپنے اندر کی بے چینی کو چہرے سے عیاں نہیں ہونے دیا۔ وہ ان زیورات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے گاڑی کی ڈگی میں چھپائے تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' ظفر مرجھائے سے انداز میں جانے کے لیے مڑا۔

''گاڑی دینے کا مجھے فائدہ کوئی نہیں ہوا۔'' فریدہ بیگم نے ریموٹ سے چینل بدلتے ہوئے خود ہی بتایا۔

''وہ کیوں بیگم صاحبہ؟'' ظفر فوراً گھوما۔

''کیا نام ہے ورکشاپ کے مالک کا...... ہاں نذیر...... اس کی کل شادی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک گھنٹے کے بعد اپنی ورکشاپ بند کر کے چلا جائے گا اور چار دن تک اس کی ورکشاپ بند رہے گی۔'' فریدہ بیگم نے کہا۔

''نذیر تو چالیس، پچاس کلومیٹر دور ایک دوسرے شہر میں رہتا ہے۔'' ظفر بولا۔

''ہاں ...... پہلے میں نے سوچا کہ گاڑی واپس لے جاؤں لیکن پھر خیال آیا کہ بہتر ہے یہاں کھڑی رہے۔ ویسے بھی جانے گاڑی کے انجن سے کیسی عجیب سی آواز آنے لگی تھی۔ اس لیے میں نے گاڑی اس کے حوالے کی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر آگئی۔ کم از کم اب کار ورکشاپ پہنچانے کی فکر تو نہیں رہی۔ جب وہ آئے گا گاڑی کا کام کر دے گا۔'' فریدہ بیگم نے ریموٹ ایک طرف رکھا اچانک اس کا موبائل فون بجنے لگا۔ فریدہ بیگم نے فون کان کو لگایا اور بات کرتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔

ظفر سوچتا ہوا باہر آگیا کہ وہ اب کیا کرے۔ نذیر کی ایک بڑی ورکشاپ تھی۔ وہ ایک عرصے سے ان کا کام کرتا چلا آرہا تھا۔ نذیر کے پاس جا کر کسی بہانے سے ورکشاپ کو کچھ دیر کے لیے کھلوانا بالکل بھی ممکن نہیں تھا۔ زیورات اس کار کی ڈگی میں تھے۔ کام کے دوران کار کی ڈگی بھی کھلے گی اور وہ زیورات کسی کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ ظفر نے غصے سے اپنا ہاتھ جھٹکا اور دل ہی دل میں بڑبڑایا کہ اگر ایسا ہو گیا تو وہ اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی تہی دست رہ جائے گا۔ اس کے دل میں ڈرائیوری کی نوکری سے نجات حاصل کرنے کی جو امنگ جاگی تھی وہ پوری ہونے سے قبل ہی دم توڑ رہی تھی۔

ظفر اداس اور پریشان سے انداز میں کبھی چوکیدار کے پاس جا کر بیٹھ جاتا تھا اور کبھی اٹھ کر لان میں ٹہلنے لگ جاتا تھا۔ اچانک ظفر کو ایک خیال نے چونکا دیا۔

نذیر کی ورکشاپ بڑی تھی اور اس کے دو دروازے تھے۔ ایک مین سڑک کی طرف بڑا آہنی گیٹ تھا جبکہ دوسرا دروازہ ورکشاپ کی عقب میں گلی کی طرف تھا۔ پیچھے گلی میں رہائشی مکانات تھے۔ اور ورکشاپ کی دیوار کے ساتھ والا مکان عباس کا تھا۔

عباس بھی کار ڈرائیور ہی تھا۔ وہ کچھ عرصہ ان کے برابر والے بنگلے میں ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا۔ ظفر کی اس کے ساتھ اچھی دوستی بھی ہوگئی تھی۔ اور پھر اچانک اس نے کام چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن اچانک ظفر کی ملاقات عباس سے ہوئی تو اس نے بتایا کہ اس نے اپنے گھر کی چھت پر بہت سے کبوتر رکھ لیے ہیں۔ وہ ان کی بازیاں لگاتا ہے اور ساتھ وہ جوا بھی کھیلنے لگا تھا۔ اس کی قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی اور وہ اس نوکری سے بھی زیادہ کمانے لگا تھا۔

تب ظفر کو حلال کی پہچان تھی اس لیے اس نے فوراً اسے نصیحت کی تھی کہ وہ حلال کو چھوڑ کر حرام کمائی کے پیچھے چل پڑا ہے جو اس کے لیے نقصان ہی نقصان ہے۔ عباس نے اس کی بات سن کر ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ''ابھی تو فائدہ ہو رہا ہے، جب نقصان ہوگا تو دیکھیں گے۔''

اس کے بعد بھی عباس کے ساتھ اس کی گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور وہ اپنی دنیا میں مگن اور خوش تھا۔

ظفر نے سوچا کہ عباس سے بہتر اس کی کوئی مدد نہیں

کرسکتا ہے۔ اگر اسے ان قیمتی زیورات میں سے کچھ دینا بھی پڑا تو وہ اسے دے دے گا۔ ظفر نے سوچا کہ ان زیورات کو حاصل کرنے کے لیے اسے عباس کو سب کچھ سچ بتانا پڑے گا۔ یہ سوچ کر ظفر کچھ پریشان سا ہوا لیکن پھر اس کا دل اس خیال سے مطمئن ہو گیا کہ وہ اس کا قابلِ اعتماد دوست ہے اور دو نمبر کام کرنے والے اپنے دھندے میں دو نمبری نہیں کرتے۔

☆......☆......☆

جیسے ہی ظفر کی ڈیوٹی ختم ہوئی وہ سیدھا عباس کے پاس چلا گیا۔ عباس اس سے بڑے پُرجوش انداز میں ملا اور اسے اپنے گھر کے اندر ایک کمرے میں لے گیا۔ کچھ باتوں کے بعد ظفر نے مقصد کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے ملنے آج ایک خاص مقصد کے لیے آیا ہوں۔''

''حکم کرو۔ پیسوں کی ضرورت ہے تو بتاؤ کتنے پیسے چاہئیے۔'' عباس نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے پھولا ہوا پرس نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''مجھے پیسوں کی نہیں بلکہ تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' ظفر نے اپنا گلا صاف کیا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔ میں حاضر ہوں۔'' عباس نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

''تم نے ایک بار کہا تھا کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جیب میں ہو تو بندا ہشاش بشاش ہوتا ہے۔ اس کے اندر توانائی ہی الگ بھر جاتی ہے۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''بس اسی طاقت کو حاصل کرنے کے لیے میں نے بھی ایک ہاتھ مارا ہے۔'' ظفر نے کہا تو عباس کے چہرے پر یکدم سنجیدگی آ گئی۔ وہ ایک عرصے سے اُلٹے سیدھے کاموں میں تھا۔ وہ ایسی باتوں کی گہرائی میں بہت جلدی پہنچ جاتا تھا۔ اس لیے وہ ظفر کے اور بھی قریب ہو گیا اور بولا۔

''مجھے کھل کر بتاؤ۔''

ظفر نے کچھ توقف کیا اور پھر زیورات چوری کر کے کار کی ڈگی میں چھپانے کی ساری کہانی سنانے کے بعد کہا کہ وہ کار اب نذیر کی ورکشاپ میں کھڑی ہے۔

ظفر کی ساری بات سننے کے بعد عباس دم بخود اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''زیورات تو بہت قیمتی ہوں گے؟''

''ہاں...... بہت قیمتی ہیں۔ اب وہ زیورات اس کار کی ڈگی سے نکالنا تمہارا کام ہے۔ جتنا حصہ تم رکھنا چاہو رکھ لو، جو مجھے دینا چاہو مجھ سے طے کر لو لیکن مجھے دھوکا نہ دینا۔''

عباس بولا۔ ''ظفر میں ساری دنیا سے دھوکا کر سکتا ہوں لیکن تجھ سے نہیں کروں گا۔ ہم دونوں مل کر اس ورکشاپ میں کھڑی اس کار کی ڈگی سے وہ زیورات نکالیں گے۔ تم نے کیونکہ سارا کام کیا ہے، اس لیے ان زیورات کے تین حصے تمہارے اور ایک حصہ میرا ہوگا۔''

ظفر خوش ہو گیا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

''اس ورکشاپ میں کیسے اُترنا ہے مجھے سب پتا ہے۔ لیکن یہ کام ہم کل رات دس بجے کریں گے۔ کیونکہ ہماری گلی میں کل سے شادی شروع ہو رہی ہے۔ مہندی کی رات ہو گی۔ خوب شور شرابا ہوگا، ساری گلی اس مہندی میں شرکت کرے گی کیونکہ ان کے گھر ہونے والی شادی میں خوب ہلہ گلہ ہوتا ہے۔ اس ہلے گلے کا ہمیں فائدہ ہوگا۔ ہم آسانی سے سیڑھیوں کے دروازے کا لاک توڑ سکیں گے۔ یا پھر ورکشاپ کی چھت میں ایک طرف جنگلہ لگا ہوا ہے۔ اگر اس نے جنگلے کو بھی تالا لگایا ہوا ہو تو ہم مہندی کے شور میں اس تالے کو بھی آسانی سے توڑ سکیں گے۔''

''یار پکڑے تو نہیں جائیں گے۔'' ظفر ڈر رہا تھا۔

''تم گھبراؤ ہی نہیں۔ میں وہ زیورات دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال لاؤں گا۔'' اس نے اطمینان سے اور بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا تو ظفر کو بھی کچھ اطمینان سا ہوا۔ اچانک ظفر کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ احمد نواز کی کال تھی۔ جیسے ہی اس نے فون کان کو لگایا دوسری طرف سے احمد نواز کی آواز آئی۔

''ظفر...... ابھی اور اسی وقت گھر پہنچو...... جلدی......'' حکم دیتے ہی فون بند ہو گیا اور ظفر سوچنے لگا کہ اس وقت اچانک اسے کیوں گھر بلا لیا ہے؟ بہرحال اس نے عباس کا موبائل نمبر لیا اور وہاں سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

جب ظفر بنگلے میں پہنچا تو وہاں کا ماحول ہی حیران کن تھا۔ لاؤنج میں احمد نواز اور اس کے ساتھ فریدہ بیگم براجمان تھیں۔ احمد نواز کا چہرہ اُترا ہوا تھا جبکہ فریدہ بیگم کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر سکینہ اور خانساماں کھڑے تھے۔ چوکیدار ظفر کے لیے گیٹ کھول

کر اور پھر بند کر کے دونوں ملازموں کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک صوفے پر انسپکٹر سعد بیٹھا ہوا تھا جو کہ فریدہ بیگم کا بھانجا بھی تھا اور دو پولیس اہلکار ایک طرف کھڑے تھے۔

جیسے ہی ظفر نے ان سب کو دیکھا اس کے جسم سے جان ہی نکل گئی تھی۔ اُسے لگا کہ وہ پھنس گیا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی احمد نواز نے ظفر کی طرف دیکھا اور پھر سعد سے بولا۔ ''یہ ظفر ہے۔ اس گھر کا ڈرائیور تم جانتے ہو۔ تم جو اس سے پوچھنا چاہتے ہو وہ پوچھ لو۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ سب ملازم میرے قابلِ اعتماد ہیں اور گھر کے افراد کی طرح رہتے ہیں لیکن میرے گھر میں ایک بڑی چوری ہوئی ہے اس لیے اس وقت میرے لیے بھی یہ مشکوک افراد ہیں۔ تم ان سے جیسی چاہو تفتیش کرو۔'' احمد نواز کا روکھا پن اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے اپنے گھر میں ہونے والی چوری کا سراغ چاہیے۔

''ظفر تم میرے پاس آجاؤ۔'' سعد نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ ظفر کی ٹانگوں میں جان نہیں تھی اور وہ بہت گھبرا گیا تھا۔ وہ چلتا ہوا سعد کے پاس چلا گیا۔

''اس گھر میں چوری ہوئی ہے۔ زیورات اور نقدی غائب ہوئی ہے۔ آنٹی فریدہ کا کہنا ہے کہ جب وہ کار ورکشاپ میں دینے گئی تھی تو اس دوران ان کے بیڈروم میں کوئی گیا اور ان کی الماری خالی کر دی۔'' انسپکٹر سعد نے کہا۔

''جب بیگم صاحبہ گاڑی ورکشاپ میں دینے گئی تھیں تو میں اس وقت گھر میں ہی نہیں تھا۔'' ظفر نے فوراً کہا۔

''ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ جب یہ مسز اکرم کے گھر سے واپس آئیں تو یہ اپنے بیڈروم میں نہیں گئی تھیں۔ ان کے پاس وقت تھا چنانچہ یہ لاؤنج میں آئیں انہوں نے سکینہ سے کہا کہ وہ اندر سے گاڑی کی چابی لا دے اور خود اس جگہ بیٹھ کر پانی پینے لگیں۔ سکینہ نے چابی ٹی وی کے پاس سے اُٹھا کر ان کو دے دی کہ ظفر نے اسے چابی بیڈروم میں رکھنے کو دی تھی لیکن اس نے اس جگہ رکھ دی اور اپنے کام میں لگ گئی تھی۔ آنٹی فریدہ پانی پینے کے بعد چابی لے کر گاڑی لے کر چلی گئیں۔ واپسی پر بھی وہ اپنے بیڈروم میں نہیں گئیں اور اسی جگہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگی کہ تم آگئے۔ انہوں نے تم سے باتیں کیں اس دوران ان کی ایک دوست کا فون آگیا اور آنٹی فریدہ فون سنتی ہوئیں ٹیرس پر چلی گئیں۔ ایک گھنٹا وہاں باتیں ہوتی رہیں اور فون بند ہونے کے بعد بھی آنٹی فریدہ اسی جگہ بیٹھی رہیں اور سکینہ سے چائے منگوا کر بھی انہوں نے اسی جگہ پی اور پھر جب شام کے بعد یہ نیچے آئیں تو کمرے میں سامان بکھرا پڑا تھا۔''

''سامان بکھرا پڑا تھا......؟'' ظفر کے منہ سے حیرت ناک انداز میں نکلا کیونکہ اس نے تو سامان کو اپنی جگہ سے ہلایا ہی نہیں تھا۔ اس نے زیورات نکال کر خالی ڈبے اسی طرح رکھ دیئے تھے۔

ظفر کی اس حیرت کو سعد نے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اس میں حیران ہونے والی کونسی بات ہے؟ جب چور آتے ہیں اور قیمتی سامان تلاش کرتے ہیں تو وہ سامان کو ادھر سے اُدھر پھینک کر چلے جاتے ہیں۔''

''جی میرا مطلب تھا کہ چور کب اور کیسے اندر آئے؟'' ظفر نے جلدی سے بات پلٹی لیکن اس کی حیرت اپنی جگہ قائم تھی کہ سامان کیسے بکھر گیا تھا؟

''میں گھر کے ملازموں کو بیڈروم دکھا چکا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ۔'' سعد اپنی جگہ سے اُٹھا اور ظفر کو فریدہ بیگم کے بیڈروم میں لے گیا۔ ظفر اس وقت واقعی حیران رہ گیا جب اس نے پورے کمرے کا سامان بکھرا دیکھا اور جس الماری میں زیورات تھے وہ بھی کھلی ہوئی تھی اور زیورات کے ڈبے کچھ کھلے اور کچھ بند ادھر اُدھر پڑے تھے۔

ظفر کے لیے سب کچھ حیران کن تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زیورات تو وہ نکال کر لے گیا تھا پھر یہ سب کس نے کیا؟ انسپکٹر سعد اس کے عقب میں کھڑا تھا۔

انسپکٹر سعد اسے واپس باہر لے آیا۔ ''کمرے کے عقب والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ چور پچھلی دیوار سے اندر آئے اور اس کھڑکی سے اندر داخل ہو گئے۔ کھڑکی کا کوئی شیشہ نہیں ٹوٹا تھا اس کا مطلب تھا کہ کھڑکی کو کسی نے پہلے ہی اندر سے کھول دیا تھا۔ تاکہ چور آسانی سے اندر داخل ہو کر اپنا کام کر کے اسی راستے سے باہر جا سکیں۔''

''میں کئی بار چوکیدار کو ہدایت کر چکا ہوں کہ ہر پانچ منٹ کے بعد وہ پیچھے کی طرف بھی ایک چکر لگایا کرے، لیکن یہ کام چور اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے۔'' احمد نواز غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا تو چوکیدار اور بھی سہم کر کھڑا ہو گیا۔

''میں چکر لگاتا ہوں صاحب جی۔'' چوکیدار بولا۔

''خاک چکر لگاتے ہو؟ قیمتی زیورات اور بیس ہزار ڈالر چوری ہو گئے ہیں۔'' احمد نواز کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ جبکہ ظفر بیس ہزار ڈالر کے بارے میں سن کر اور بھی

حیران ہوا۔ اس نے زیورات کے علاوہ وہاں کوئی پیسا نہیں دیکھا تھا۔ پھر یہ بیس ہزار ڈالر کیسے غائب ہو گئے؟ کیا پولیس رپورٹ میں لکھوانے کے لیے انہوں نے بیس ہزار ڈالر اپنی طرف سے ڈال دیے ہیں؟ ویسے بھی جب وہ زیورات چوری کر رہا تھا تو اس کا دھیان صرف زیورات پر تھا اس نے کچھ اور دیکھا ہی نہیں تھا۔

''آپ پلیز اتنا غصہ نہ ہوں۔ آپ کا بلڈ پریشر آؤٹ آف کنٹرول ہو جائے گا۔'' فریدہ بیگم نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے احمد نواز کو حوصلہ دیا۔

احمد نواز ایک بار پھر اپنے آپ پر جبر کر کے چپ ہو کر بیٹھ گیا۔ سعد ایک بار پھر تینوں ملازموں کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ بات تو طے ہے کہ کھڑکی اندر سے ہی کھولی گئی تھی اور چور اس راستے سے آ کر قیمتی سامان اور بیس ہزار ڈالر لے گئے۔ تم چاروں کے علاوہ اس گھر میں اور کوئی ملازم نہیں ہے اور کسی کا آنا جانا نہیں ہے۔ پھر وہ کھڑکی کس نے کھولی تھی؟''

انسپکٹر سعد چاروں کو باری باری دیکھنے لگا۔ اس کی مشکوک نگاہیں چاروں کے چہرے پر تیز دھار بلیڈ کی طرح لگ رہی تھیں۔ خانساماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''میں ایک عرصے سے اس گھر میں ہوں۔ اس گھر کا نمک کھاتا ہوں۔ میں ایسا کام نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی مجھے علم ہے کہ یہ چوری کب اور کس وقت ہوئی تھی۔''

سکینہ نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔ ''آپ میرا حلف لے لیں جو میں نے ایسا کام کیا ہوا۔''

''میں مانتا ہوں کہ مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی کہ میں آج زیادہ چکر نہیں لگا سکا۔ کیونکہ میرا بیٹا بیمار ہے اور میں اس کی پریشانی میں بیٹھا ہوا تھا۔ صاحب جی سے چھٹی مانگی تھی انہوں نے چھٹی دینے سے انکار کر دیا تھا اور میں بہت پریشان تھا اس پریشانی میں میں سارا دن بیٹھا ہی رہا تھا لیکن میں ایسا کام نہیں کر سکتا کہ جس سے میں حرام لقمہ کماؤں۔'' چوکیدار اپنی صفائی دیتے ہوئے رو دیا۔

''میں تو دن بھر باہر مصروف رہتا ہوں۔ بیگم صاحبہ کے کہنے پر ان کی کار ورکشاپ لے جانے کے لیے ان کے بیڈروم سے چابی لینے گیا تھا لیکن میرے ساتھ سکینہ تھی۔ چابی لے کر ہم باہر آ گئے تھے۔'' ظفر نے کہا۔

''جب تم چابی لینے گئے تھے تو اس وقت کمرے میں سامان بکھرا ہوا نہیں تھا؟'' انسپکٹر سعد نے سوال کیا۔

''نہیں جی اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ سکینہ سے پوچھ لیں۔'' ظفر نے اعتماد سے جواب دیا۔

''ہاں جی اس وقت کمرا بالکل صاف تھا۔ بالکل اسی طرح جیسی میں نے صفائی کی تھی، اور اگر سامان بکھرا ہوتا تو ہم اسی وقت شور نہ مچا دیتے۔'' سکینہ نے بھی لقمہ دیا۔

''پھر چور کب آئے اور کب انہوں نے قیمتی زیورات کے علاوہ بیس ہزار ڈالر سمیٹے اور چلتے بنے۔'' انسپکٹر سعد نے سب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میرا نقصان ہوا ہے۔ مجھے زیورات اور بیس ہزار ڈالر چاہیے۔ میری طرف سے تم ان چاروں کو تھانے لے جاؤ اور ان کو مار کر مناؤ، پیار سے مناؤ جیسے بھی مناؤ میرے زیورات اور بیس ہزار ڈالر مجھے واپس ملنے چاہئیں۔'' احمد نواز ایک بار پھر چیخا۔ وہ اپنے ملازموں کی وفاداری بھول گیا تھا اور بس اسے اپنا سامان عزیز تھا۔ ظفر کے علاوہ تینوں ملازموں نے بڑی معصومیت اور پانی میں تر آنکھوں سے احمد نواز کی طرف دیکھا۔

''آپ اطمینان رکھیں میں چور تک پہنچ کر ہی رہوں گا۔'' انسپکٹر سعد نے تسلی دی۔

''تب پہنچو گے جب سب کچھ ہڑپ ہو جائے گا؟ ان چاروں کو تم لے جاؤ۔ ان کو اُلٹا لٹکا دو۔'' احمد نواز کا غصہ بے قابو ہو رہا تھا۔

''جب تک میری تفتیش مکمل نہیں ہوتی یہ چاروں کہیں نہیں جائیں گے۔''

''یہ تینوں اس شہر کے رہنے والے نہیں ہیں۔ لیکن میرا یہاں گھر ہے۔ مجھے تو جانے کی اجازت دیں۔ جب آپ بلائیں گے میں حاضر ہو جایا کروں گا۔'' ظفر بولا ''آپ سب کو میرے گھر کا پتا معلوم ہے۔ میں کہیں بھاگ کر نہیں جاؤں گا۔'' ظفر نے کہا۔

''ٹھیک ہے تم تینوں اس گھر سے کہیں نہیں جاؤ گے اور ظفر کو گھر جانے کی اجازت ہے۔'' انسپکٹر سعد نے کہا۔

''مجھے ان تینوں سے ڈر لگ رہا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ان چوروں کا ساتھی ہوا تو ان تینوں میں سے کوئی ہمیں مروا بھی سکتا ہے۔'' احمد نواز نے اپنا اندیشہ بیان کیا۔

''یہ تینوں اپنا کام معمول کے مطابق کریں گے۔'' سعد نے کہہ کر احمد نواز کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا۔ ''میرا تجربہ کہتا ہے کہ آپ کے ملازمین بے قصور ہیں۔ آپ کو ان سے ڈرنے کی ضرورت

نہیں ہے۔ میں اپنی تفتیش چوبیس گھنٹوں میں مکمل کر کے آپ کا مجرم آپ کے سامنے کھڑا کر دوں گا۔'' انسپکٹر سعد کے لہجے میں اعتماد تھا۔

احمد نواز بہت بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم میں لرزش پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ چاروں ملازموں کو پولیس کے حوالے کر کے دم لیتا۔ احمد نواز کی طبیعت دیکھتے ہوئے فریدہ بیگم نے سکینہ کو نیند کی گولی اور پانی کا گلاس لانے کے لیے کہا۔ جب وہ دونوں چیزیں لے کر آئی تو فریدہ بیگم نے انہیں نیند کی گولی اور پانی کا گلاس دے کر کہا۔ ''آپ یہ گولی کھا کر سو جائیں آپ کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔''

احمد نواز نے نیند کی گولیوں کی ڈبیہ ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''ابھی مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے میں اپنے بیڈ روم میں جا کر کھا لوں گا۔''

احمد نواز کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور جسم کے اندر کچھ ایسا تلاطم مچا ہوا تھا کہ جیسے سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو رہا ہو۔ قیمتی زیورات اور بیس ہزار ڈالر کا نقصان برداشت کرنا احمد نواز کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اُٹھا اور اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ سکینہ پانی کا گلاس بھی پیچھے ہی لے گئی اور تپائی پر رکھ کر واپس آگئی۔

کچھ دیر کے بعد انسپکٹر سعد کے کہنے پر تینوں ملازم اپنی اپنی جگہ پر چلے گئے تھے اور ظفر کو بھی گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ انسپکٹر سعد بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس کے ساتھ دونوں اہلکار بھی تھے۔ سعد ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اسے تقریباً دو ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے کانچ ملے۔

سعد نے ان ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے کانچ کو پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک کانچ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک کانچ کے سرے پر خون لگا ہوا تھا۔ کچھ اور غور کرنے کے بعد سعد نے ٹوٹی ہوئی چوڑیاں پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر اپنے اہلکار کے حوالے کر دیں۔ وہ کھڑا ہو کر کمرے کا پھر جائزہ لینے لگا۔ حالانکہ وہ پہلے بھی کمرے کا بھرپور جائزہ لے چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکلا اور فریدہ بیگم کو تسلی دینے کے بعد چلا گیا۔

انسپکٹر سعد کے جاتے ہی فریدہ بیگم کچھ دیر اسی جگہ بیٹھی رہی۔ ملازم اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ فریدہ بیگم اپنی جگہ سے اُٹھی اور دبے پاؤں احمد نواز کے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ کمرا نیم روشن تھا اور احمد نواز بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ تپائی پر پڑا پانی کا گلاس آدھا تھا، اس کا مطلب تھا کہ احمد نواز نے نیند کی گولی کھالی ہے۔ فریدہ بیگم نے دروازہ بغیر آہٹ پیدا کیے بند کیا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی۔ اس نے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھولا اور جلدی سے اپنے موبائل فون سے ایک نمبر ملا کر کان سے لگا لیا۔ اس نے کمرا روشن نہیں کیا تھا۔ وہ اندھیرے میں ہی کھڑی تھی۔ بیل جا رہی تھی اور وہ مضطرب فون آن ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ فریدہ بیگم کو پتا بھی نہیں چلا کہ ایک سایہ اس کے عقب میں آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اچانک دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی۔

''ہیلو......''

''ہیلو کے بچے کہاں تھے؟ تمہارا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔'' فریدہ بیگم نے سرگوشی میں ڈانٹا۔

''مجھے پتا ہی نہیں چلا اور اس کی بیٹری ختم ہوگئی تھی۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''امجد تمہارا کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا۔ چوری ایسے کرتے ہیں جیسے تم نے کی تھی؟ زیورات نکالے اور پھر سب کچھ ٹھیک طریقے سے رکھ دیا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ ساتھ ہی بیس ہزار ڈالر رکھے ہوئے ہیں۔ تم نے جیولری لی اور بیس ہزار اسی جگہ چھوڑ دیے۔ اور میں اس انتظار میں ہی رہی کہ تم کب آتے ہو اور کب چوری کرتے ہو۔ وہ تو اچانک میں نے الماری کھول کر دیکھی تو مجھے پتا چلا کہ تم زیورات لے کر چلے بھی گئے ہو۔ سارا سامان میں نے بکھیرا اور بیس ہزار ڈالر بھی اس جگہ سے میں نے اُٹھائے۔ تم ان زیورات کو لے کر گئے اور بیس ہزار ڈالر چھوڑ گئے...... میں تمہاری عقل کو کیا کہوں۔''

اچانک دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی اور وہ حیرانی سے بولا۔ ''لیکن میں تو آ ہی نہیں سکا تھا...... پاشا کے آدمی میری گھات میں تھے اور میں نے پلاننگ کے مطابق چوری کی ہی نہیں ہے......''

''کیا......؟ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' فریدہ بیگم کی آواز میں حیرت تھی۔ اور اس کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نہیں آیا تھا اور میرا موبائل فون بیٹری کی وجہ سے بند نہ ہوتا تو میں آپ کو اطلاع دیتا۔''

''تم واقعی نہیں آئے؟''
''میرے نہ آنے کی اس سے بڑی کیا دلیل ہوگی کہ آپ مجھے زیورات کے بارے میں بتا چکی تھیں ۔ میں بیس ہزار ڈالر چھوڑ کر زیورات ہی کیوں لے کر جاتا......؟'' امجد نے کہا۔
''پھر زیورات کون لے گیا؟'' فریدہ بیگم کے چہرے پر حیرت برسنے لگی تھی اور اس کی ناچتی ہوئی آنکھوں میں کئی سوال دوڑنے لگے تھے۔ اس کے لیے حیرت کا نیا دروازہ کھل گیا تھا۔
''میں نے یہ سب کچھ تمہاری خاطر کیا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر رہی تھی تاکہ تم آسانی سے اپنا کام کرسکو، میں جان بوجھ کر بیڈ روم میں نہیں گئی، اور اس دوران وہ کون تھا جس سے یہ واردات کی؟'' فریدہ بیگم کی حیرت کم نہیں ہورہی تھی۔
''شکر کریں کہ بیس ہزار ڈالر بچ گئے ہیں۔''
''ہاں شکر ہے کہ بیس ہزار ڈالر بچ گئے ہیں جو میں نے اپنے قبضے میں کرکے احمد نواز کو بتایا کہ وہ بھی چوری ہوگئے ہیں۔ اپنی اصل جیولری چھپا کر اس کی جگہ نقلی جیولری بھی میں نے اسی لیے رکھی تھی تاکہ احمد نواز سے میں اور جیولری بنوا سکوں، وہ کماتے ہیں لیکن پیسا خرچ کرنے سے ان کی جان جاتی ہے۔ بہرحال تم کسی طرح میرے پاس پہنچو اور بیس ہزار ڈالر لے کر یہ ملک چھوڑ دو تاکہ تمہیں بھی سکون کی سانس آئے۔''
''میں کوشش کرکے پہنچتا ہوں۔''
فریدہ بیگم فون بند کرنے کے بعد سوچنے لگی کہ اچانک اس سائے نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور پھر یکدم اس نے رسی جیسی کوئی چیز فریدہ بیگم کے گلے میں حائل کرکے اسے پوری قوت سے کسنے لگا۔ فریدہ بیگم کی سانس رکنے لگی، اس کی آنکھیں ابل کر باہر آنے لگیں اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مزاحمت کرنے لگی، اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ گرفت اس قدر مضبوط تھی کہ فریدہ بیگم کا جسم بے جان ہوگیا۔ اس نے فریدہ بیگم کو چھوڑ دیا اور اس کے گلے میں ڈالی ہوئی رسی جیسی کوئی چیز نکالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
فریدہ بیگم کا بے جان جسم فرش پر پڑا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر اس کا موبائل فون پڑا ہوا تھا۔
اس واقعے کو پندرہ منٹ گزر گئے تھے کہ نیم روشن گھر میں ایک سایہ مین دروازے سے اندر آیا اور کچھ دیر رکنے کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ سایہ پھر نیچے آگیا اور مین دروازے سے باہر نکل گیا۔ پورے گھر میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ آسمان پر چاند بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پورے گھر میں سکوت تھا لیکن گھر کے کچن میں کچھ حرکت سی ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

اس بنگلے سے نکل کر ظفر نے عباس کو فون کیا اور اس کے پاس چلا گیا۔ عباس اس کا گھر کے باہر ہی انتظار کررہا تھا۔
''کیا بات ہے خیریت تو ہے؟'' عباس نے پوچھا۔
ظفر نے ساری صورت حال بتانے کے بعد کہا۔ ''ہمیں گاڑی سے جیولری نکالنے کا کام آج ہی کرلینا چاہیے۔ تاکہ میں اسے لے کر کہیں فرار ہوجاؤں۔''
''تم پاگل ہوگئے ہو۔ اگر تم جیولری لے کر فرار ہوئے تو تم پولیس اور اپنے مالکان کی نظر میں پکے چور بن جاؤ گے۔'' عباس نے اسے سمجھایا۔
''پھر میں کیا کروں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' ظفر بولا۔
عباس نے کچھ سوچا اور پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور بولا۔ ''آج آسمان پر چاند بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ اندھیرا بھی ہے۔ ایک کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔''
''ہاں......'' ظفر نے فوراً اثبات میں گردن ہلائی۔
''جیولری ہاتھ میں آجائے گی تو تسلی رہے گی تاکہ اگر بھاگنا پڑا تو بھاگنے کا سامان پاس ہوگا۔''
عباس اسے اپنے گھر کے اندر لے گیا۔ دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ چھت پر اندھیرا تھا۔ کچھ دیر رکنے کے بعد پہلے عباس دیوار پر چڑھا اور اس کے بعد ظفر بھی جست لگا کر دیوار پر چڑھ گیا۔ دونوں دوسری طرف کود گئے۔ دیوار اتنی اونچی نہیں تھی کہ انہیں کوئی مشکل پیش آتی۔
نیچے اترنے کے لیے سیڑھیوں پر آہنی دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ عباس نے سرگوشی کی۔ ''اسے تو توڑنا بھی مشکل ہے۔''
''پھر کیا کریں؟''
''یہاں ایک جنگلا بھی ہے جو چھت میں ہوا اور روشنی کے لیے رکھا ہوا ہے۔'' عباس نے پھر سرگوشی کی۔

وہ جنگلا زمین سے بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا اور اسے کوئی تالا بھی نہیں لگا تھا۔ عباس نے ظفر کے کان میں سرگوشی کی اور خود دیوار کود کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا جبکہ ظفر ایک طرف بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کے بعد عباس واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں موٹی رسی تھی۔ اس نے جنگلا کھولا اور رسی کا ایک سرا سامنے دیوار پر لگے پائپ کے ساتھ باندھ کر دوسرا سرا اس نے نیچے لٹکا دیا۔ اس کے بعد وہ رسی لٹک کر باری باری نیچے اُتر گئے۔

نیچے مکمل اندھیرا تھا۔ موبائل فون کی روشنی میں دونوں نے فریدہ بیگم کی کار تلاش کی۔ کار مقفل تھی۔ عباس ایسے کام کرنا جانتا تھا۔ اس نے ایک باریک تار سے ڈگی کا قفل کھولنا شروع کیا اور کچھ دیر کے بعد وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔

ظفر نے ڈگی کے اندر رکھا ہوا شاپر تلاش کیا اور اسے لے کر اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیری۔ دونوں نے ڈگی بند کی اور جیسے ہی وہ جانے لگے تو انہیں لگا جیسے گلی کی طرف والا دروازہ کسی نے کھولا ہے۔ دونوں اسی جگہ رک گئے۔ ٹارچ کی روشنی میں کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ظفر نے جلدی سے اپنے موبائل فون کی روشنی میں متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ انہیں ایک چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا ملا جو اوزار سے بھرا ہوا تھا۔ ظفر نے عباس کو اشارہ کیا اور اپنے موبائل فون کی روشنی بند کر کے دونوں اس کمرے کی طرف بڑھے اور کمرے میں جاتے ہی انہوں نے آہنی دروازہ بند کیا اور دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑے ہوگئے۔

آنے والا اس گلی کا چوکیدار تھا۔ نذیر نے اسے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ جب اس گلی میں آئے تو تالا کھول کر ورکشاپ کے اندر کا ایک چکر ضرور لگایا کرے۔ کیونکہ اندر لوگوں کی قیمتی کاریں کھڑی تھیں اور نذیر ہر ممکن حفاظت چاہتا تھا۔ اس کے لیے نذیر نے چوکیدار کی الگ سے خدمت کی تھی۔

چوکیدار کا ایک ساتھی باہر کھڑا تھا اور دوسرا چوکیدار اندر کا چکر لگا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ کی تیز روشنی ورکشاپ میں رقص کر رہی تھی۔ وہ دیکھتا ہوا جانے لگا تو اس کی نظر اوپر جنگلے سے لٹکتی ہوئی رسی پر پڑی۔ وہ قریب چلا گیا۔ اس نے اوپر دیکھا جنگلا کھلا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی نیچے اترا ہے۔ وہ اس وقت یا تو ورکشاپ میں ہے، یا پھر اپنا کام کر کے چلا گیا ہے۔

ورکشاپ کیونکہ کافی بڑی تھی۔ چوکیدار اسی جگہ کھڑا ہو کر اپنے ساتھی کو آواز نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اس دروازے کی طرف بھاگا۔ عباس اور ظفر نے جیسے ہی روشنی دور ہوتی دیکھی وہ دونوں سرعت سے باہر نکلے۔ ظفر نے اپنے موبائل فون کی روشنی آن کر دی تھی۔ وہ دونوں جنگلے کی طرف بڑھے۔ پہلے ظفر رسی سے لٹک کر اوپر چڑھا۔ اسی دوران انہیں کسی کے بھاگنے کی آواز اور ساتھ ٹارچ کی روشنی بھی اس طرف آتی دکھائی دی۔ ظفر اوپر چڑھ گیا تھا۔ عباس اوپر چڑھنے لگا۔ اچانک چوکیدار نے پینل بورڈ سے تمام بٹن اوپر کر دیے اور پوری ورکشاپ روشن ہوگئی۔

عباس ابھی کچھ ہی اوپر گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت چوکیدار بھی آگیا اس نے اپنے ریوالور کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

”رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔“

عباس کے ہاتھ سے رسی چھوٹ گئی اور وہ نیچے گر گیا۔ دونوں چوکیداروں نے اس پر قابو پالیا۔ ظفر نے دیکھ لیا تھا کہ عباس پکڑا گیا ہے۔ وہ اور بھی ڈر گیا۔ وہ تیزی سے دیوار پھلانگ کر عباس کے گھر کود گیا۔ وہاں سے وہ سیڑھیاں نیچے اُترا۔ عباس کی بیوی اور بچے کمرے میں تھے۔ اس لیے کسی کو پتا ہی نہیں چلا کہ کون نیچے آیا ہے۔

ظفر نے باہر جانے کے لیے دروازہ کھول کر جھانکا۔ باہر دونوں چوکیدار کھڑے تھے۔ ایک نے عباس کے ہاتھ باندھ کر اسے قابو کیا ہوا تھا جبکہ دوسرا چوکیدار ورکشاپ کے دروازے کو تالا لگا رہا تھا۔ کیونکہ عباس نے کسی طرح کا کوئی شور نہیں کیا تھا۔ وہ اس گلی کا رہائشی تھا، اس لیے وہ چاہتا تھا کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ چوکیدار اسے پکڑ کر سڑک کی طرف لے گئے۔ اب گلی میں کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور بڑے بڑے قدم اُٹھاتا ایک طرف چلا گیا۔ اس کا دل خوف سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔

عباس کیونکہ اس کی وجہ سے پھنسا تھا اس لیے اس نے پولیس کو صاف بتا دیا کہ اس کا ساتھی ظفر تھا۔ عباس کی نشاندہی پر پولیس اس کے گھر گئی تو ظفر اپنے بچوں کو چھوڑ کر گلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ عباس نے اسے دیکھتے ہی پولیس کو بتایا کہ وہ ظفر ہے۔ پولیس نے ظفر کو بھی قابو میں کرلیا۔ اس کے پاس شاپر میں موجود جیولری بھی انہوں نے اپنے قبضے میں لے لی۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی حسبِ معمول سکینہ نے اپنی صفائی شروع کردی۔ وہ سب سے پہلے گھر کی اوپر والی منزل صاف کرتی تھی اور اس کے بعد وہ نیچے کی صفائی کرتی تھی۔ جیسے ہی وہ اس کمرے میں گئی تو اس کی چیخ ہی نکل گئی۔ فریدہ بیگم کی لاش فرش پر پڑی تھی۔

سکینہ بھاگتی ہوئی نیچے آئی اور اس کے شور سے چوکیدار اور خانساماں بھی اس کے پاس جمع ہوگئے۔

''کیا ہوا تم چیخ کیوں رہی ہو؟'' خانساماں نے پوچھا۔

''وہ بیگم صاحبہ...... بیگم صاحبہ......'' سکینہ کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''کیا ہوا بیگم صاحبہ کو؟'' چوکیدار نے پوچھا۔

''وہ فرش پر بے جان پڑی ہیں۔'' سکینہ نے بتایا۔ ''صاحب جی کو جگاتے ہیں۔''

پھر سکینہ احمد نواز کے بیڈروم کی طرف گئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ''صاحب جی...... صاحب جی......'' جب کوئی آواز نہ آئی تو اس نے دروازہ کھولا۔

اندر احمد نواز بے سدھ سویا ہوا تھا۔ پانی کا گلاس خالی تھا اور نیند کی گولیوں کی ڈبیہ پاس ہی پڑی تھی۔

خانساماں نے آگے بڑھ کر احمد نواز کو جگانے کی کوشش کی۔ وہ اتنی گہری نیند سویا ہوا تھا کہ بار بار ہلانے پر بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی۔

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خانساماں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ سعد صاحب کو فون کرتے ہیں۔''

''کیوں نہ صاحب جی کو جگانے کی پھر کوشش کی جائے اور یہ خود ہی فون کرنا چاہیں تو کرلیں......'' چوکیدار نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

سکینہ جو اس کے پاس ہی کھڑی تھی کچھ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''صاحب جی نیند کی گولی کھا کر سوئے ہیں...... سعد صاحب کو فون کردیتے ہیں۔'' خانساماں ایک طرف رکھے ٹیلی فون کی طرف بڑھا، وہاں ڈائری پر انسپکٹر سعد کا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ خانساماں وہ نمبر ملانے لگا۔ سکینہ کچھ گھبرائی اور ڈری سہی کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

انسپکٹر سعد پولیس اہلکار کے ساتھ احمد نواز کے بنگلے میں پہنچ گیا۔ اس نے پہلے اوپر جا کر فریدہ بیگم کی نبض دیکھی اور پھر نیچے آگیا۔ اس نے احمد نواز کو جگانے کی کوشش کی۔ احمد نواز کی نیند اب اتنی گہری نہیں رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے بعد اُٹھ گیا۔ اس نے اَدھ کھلی آنکھوں سے سعد کی طرف دیکھا۔

''تم کب آئے۔'' احمد نواز نے سوال کرتے ہوئے اپنے آپ کو نیند کے خمار سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرے۔

''آپ منہ ہاتھ دھولیں۔'' سعد نے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' احمد نواز کی آنکھیں ابھی بھی پوری طرح سے نہیں کھلی تھیں۔

''آپ فریش ہولیں میں بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر سعد نے کہا۔

احمد نواز اُٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کی نیند کا خمار معدوم ہوچکا تھا۔

''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟'' احمد نواز نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

سعد نے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ آیئے۔''

''کہاں؟''

''اوپر کی منزل پر۔''

''کیوں؟''

''آنٹی کا قتل ہوگیا ہے۔'' انسپکٹر سعد نے بتایا۔

''کیا......؟'' احمد نواز نے تقریباً چیخ کر کہا اور پھر بے خودی کے انداز میں کمرے سے نکل کر اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں پھلانگنا شروع کیں۔ سعد، پولیس اہلکار اور سکینہ اس کے پیچھے تھے۔ سکینہ نے فوراً اشارہ کیا تو احمد نواز اس کمرے میں چلا گیا۔ وہ حیرت اور کرب سے فریدہ بیگم کی فرش پر پڑی لاش کو دیکھنے لگا۔

''یہ...... یہ کس نے کیا ہے؟ کب ہوا یہ؟'' احمد نواز چیخا اور آنسو آنکھوں سے جاری ہوگئے۔ سعد اسے حوصلہ دینے لگا۔ کچھ دیر کے بعد پولیس اہلکار احمد نواز کو نیچے لے گئے۔

انسپکٹر سعد نے پہلے کمرے کا جائزہ لیا۔ فریدہ بیگم کے پاس ہی اس کا موبائل فون پڑا تھا۔ انسپکٹر سعد نے فریدہ بیگم کے گلے کی طرف دیکھا تو اسے وہاں سرخی دکھائی دی۔ مزید جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر سعد نے موبائل فون اٹھایا اور نیچے آگیا۔

احمد نواز غم سے نڈھال صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ انسپکٹر

سعد کو دیکھتے ہی بولا۔ ''میں نے کہا تھا کہ مجھے ان ملازموں پر بھروسا نہیں ہے۔ یہ کچھ بھی کر دیں گے۔ ان میں سے کسی نے میری فریدہ کو مار دیا۔ اپنی چوری چھپانے کے لیے انہوں نے ایسا کیا ہے۔''

''آپ تسلی رکھیں قاتل مجھ سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔'' انسپکٹر سعد اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا موبائل فون کی ہسٹری دیکھ رہا تھا۔ آخری کال امجد نام کے شخص کی تھی۔ کال کا وقت اور دورانیہ انسپکٹر سعد کی نظر میں تھا۔

انسپکٹر سعد نے موبائل فون جیب میں ڈالا اور اسی دوران ایمبولینس آگئی۔ فریدہ بیگم کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا تو انسپکٹر سعد نے تینوں ملازموں کو اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

''ان کی موت گلا دبانے سے ہوئی ہے۔ گلا ہاتھ سے نہیں دبایا گیا بلکہ کوئی چیز ان کے گلے کے گرد حائل کر کے ان کو مارا گیا ہے۔'' انسپکٹر سعد نے بتاتے ہوئے پوچھا۔ ''ظفر کب تک آتا ہے؟''

''وہ سویرے ہی آجاتا ہے لیکن ابھی تک نہیں آیا۔'' سکینہ نے جواب دیا۔ انسپکٹر سعد نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اپنے اہلکار کو دیا اور وہ کاغذ لے کر باہر چلا گیا۔

''چوکیدار...... تم نے گھر کے اندر کسی کو آتے ہوئے دیکھا تھا؟'' انسپکٹر سعد نے اس سے سوال کیا۔

''گھر کے اندر کوئی بھی نہیں آیا۔'' چوکیدار نے جواب دیا۔

''تم ڈیوٹی ہی دے رہے تھے کہ مزے کی نیند لے رہے تھے؟'' انسپکٹر سعد کے لہجے میں تغیر آچکا تھا۔

''میں ساری رات ایک پل کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔'' چوکیدار نے گھبراہٹ بھری آواز میں کہا۔

سکینہ نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''صاحب جی میرا وہ چھوٹا سا کمرا ہے۔ وہاں ہی سوتی ہوں۔ رات میں پانی پینے کے لیے کچن میں گئی تھی۔ میں نے کچن کی لائٹ نہیں جلائی تھی کیونکہ بیگم صاحبہ کا ہمیں حکم تھا کہ رات کو نہ تو کسی طرح کا شور ہو اور نہ ہی بار بار کسی کمرے کی لائٹ روشن کی جائے...... میں وہاں پانی پی رہی تھی کہ اچانک مین دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔''

سکینہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوئی تو سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ احمد نواز کی نظریں بھی سکینہ پر جم گئی تھیں۔

''پھر کیا ہوا؟'' انسپکٹر سعد نے پوچھا۔

''وہ سایہ سا کچھ دیر اس جگہ رکا اور پھر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ میں کچن میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کروں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سایہ واپس سیڑھیاں اترا اور باہر چلا گیا۔ ہلکی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ وہ یہ چوکیدار تھا۔'' سکینہ نے بتایا تو چوکیدار کا رنگ اڑ گیا۔ اور احمد نواز کی نظریں فوراً چوکیدار پر چلی گئیں۔

''میں نے بیگم صاحبہ کا خون نہیں کیا...... میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' چوکیدار گھبرا کر بولا۔

''کمینے تم نے میری فریدہ کو مار دیا۔ اس لیے کہ میں نے تجھے چھٹی نہیں دی تھی۔ تجھے اس بات کا غصہ تھا۔'' احمد نواز تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ انسپکٹر سعد نے احمد نواز کو پکڑ کر پھر اس کی جگہ پر بیٹھا دیا۔

''نہیں نہیں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' چوکیدار بری طرح سے گھبرا گیا تھا۔

''سعد اسی نے فریدہ کو مارا ہے۔ اس کا بچہ بیمار تھا اور اسے میں نے چھٹی نہیں دی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ یہ گیٹ کے پاس بیٹھا بڑبڑا رہا تھا اور اس نے غصے میں مجھے برا بھلا بھی کہا تھا۔'' احمد نواز بولا۔

''میں مانتا ہوں کہ مجھے غصہ آیا تھا۔ میرا بیٹا بیمار ہے۔ میں نے کچھ الفاظ کہہ دیے تھے۔ لیکن میں نے ان کا خون نہیں کیا۔'' چوکیدار اپنے مؤقف پر قائم تھا۔

''پھر تم اوپر کیا کرنے گئے تھے؟'' انسپکٹر سعد نے پوچھا۔

''میں اپنے بیٹے کے لیے بے چین تھا۔ میرے موبائل فون میں بیلنس نہیں تھا۔ میں اپنے بچے کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ میں رات کو فون کرنے کے لیے اندر آیا تھا۔ ٹیلی فون کا ایک سیٹ اوپر بھی پڑا ہے۔ میں نے سوچا یہاں میری آواز سے صاحب جی جاگ نہ جائیں اور مجھ پر غصہ ہوں۔ چنانچہ میں اوپر چلا گیا اور کال کر کے اپنے بیٹے کی خیریت دریافت کر کے نیچے آگیا تھا۔'' چوکیدار نے بتایا۔

''جھوٹ بولتا ہے یہ......'' احمد نواز چیخا۔

''آپ چیک کر لیں۔ اس ٹیلی فون سیٹ سے کیا ہوا میرا نمبر موجود ہوگا۔ میں نے کس وقت کال کی وہ بھی پتا چل جائے گا۔'' چوکیدار کی آواز میں گھبراہٹ عیاں تھی۔

''اس کا جھوٹ ابھی میں کھولتا ہوں......'' احمد نواز

تیزی سے اوپر چلا گیا۔ احمد نواز جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون سیٹ تھا۔ اس نے وہ سیٹ انسپکٹر سعد کی طرف بڑھا دیا۔

''لو دیکھ لو..... شام سات بجے کے بعد اس سیٹ سے کوئی کال نہیں ہوئی۔''

انسپکٹر سعد نے فون کی ہسٹری دیکھی اور پھر چوکیدار کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس فون سے آخری کال شام سات بجے ہوئی تھی۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں صرف اوپر کال کرنے گیا تھا۔'' چوکیدار اور بھی گھبرا گیا۔

''اسے گرفتار کر کے لے جاؤ، ورنہ میں اس کا گلا دبا دوں گا۔'' احمد نواز نے چیخ کر کہا۔ اس کا رنگ سرخ ہو گیا تھا اور ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ اس دوران انسپکٹر سعد کا موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے کال سنی اور پھر احمد نواز کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ظفر بھی غائب ہے اور اس کے گھر پر تالا لگا ہوا ہے۔''

☆......☆......☆

انسپکٹر سعد نے چوکیدار کو اپنے اہلکار کے ساتھ بھیج دیا اور وہ خود امجد کے گھر چلا گیا۔ انسپکٹر سعد کو امجد کے گھر کا بھی پتا تھا اور اس سے ملنا اس کے لیے کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔

امجد اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ انسپکٹر سعد نے اس کے کمرے میں جاتے ہی کہا۔

''میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسے سوالات.....؟'' امجد نے پوچھا۔

''آپ کی اور آنٹی فریدہ کی رات دس بجکر گیارہ منٹ پر موبائل فون پر بات ہوئی تھی۔''

''ہا.....ں بس ایسے ہی۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو۔'' امجد کچھ گھبرا سا گیا۔

''یہ بات چیت بائیس منٹ تک جاری رہی تھی۔ کیا کیا باتیں ہوئی تھیں؟'' انسپکٹر سعد نے اگلا سوال کیا۔

''وہی جو ایک بہن کی اپنے بھائی کے ساتھ باتیں ہوتی ہیں۔'' امجد نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ آنٹی فریدہ آپ کی سگی بہن تھیں۔ آپ کو ان سے بات کرنے کا پورا حق تھا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کچھ غلط کام میں پڑ گئے تھے۔ اور اس نتیجے میں آپ کے سر پر بہت سا قرض ہے اور قرض لینے والوں نے آپ کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ آپ چھپ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا آپ اپنی بہن سے پیسوں کا تقاضا تو نہیں کر رہے تھے؟'' انسپکٹر سعد نے کہا۔

''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ کیوں کہا کہ وہ میری سگی بہن تھیں۔ جبکہ وہ میری سگی بہن ہیں۔''

''مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ انہیں رات کو کسی نے گلا دبا کر قتل کر دیا ہے۔''

''ہائیں...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم.....؟'' امجد کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ دنگ سا سعد کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دیر تک وہاں عجیب سا ماحول رہا اور پھر سعد کے دلاسہ دینے پر امجد کی طبیعت سنبھلی اور سعد نے کہا۔ ''آپ کو میرے سوالوں کا جواب دینا ہوگا جس کی مدد سے میں قاتل تک پہنچ سکوں گا۔''

''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' امجد بہت دکھی ہو گیا تھا۔

''کیا آپ نے اپنی بہن سے پیسوں کا تقاضا کیا تھا؟''

''نہیں وہ میری خود مدد کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں میری فکر تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں یہ ملک چھوڑ دوں۔ میں نے کاغذات تیار کر لیے تھے اور مجھے ملک چھوڑنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ تم جانتے ہو میرے بہنوئی صاحب مجھے بالکل بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ بلکہ میرا نام سننا بھی ان کو گوارا نہیں ہے۔ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، میں اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا ہوں۔ اس لیے میری بہن مجھے پیسے نہیں دے سکتی تھیں۔'' وہ کہہ کر رونے لگا۔

''ان کے گھر ہونے والی چوری میں آپ کیا کردار تھا؟ کیونکہ وہ ایک ڈراما تھا۔''

''کیسے ڈراما تھا؟''

''کیونکہ آنٹی کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں وہاں سے ملی تھیں اور ان کی کلائی پر زخم کا نشان بھی تھا۔ جو چوڑیوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے تھا۔ کمرے کا سامان بکھیرا گیا تھا۔ زیورات کے ڈبوں پر آنٹی کی انگلیوں کے نشان تھے۔ میں نے آنٹی کی انگلیوں کے نشان ان کو محسوس کرائے بغیر حاصل کر کے چیک کیے تھے۔'' کہتے ہوئے اس نے امجد پر نظر ڈالی پھر کڑے لہجے میں ''میں نے مکمل ثبوت حاصل کر لیے ہیں پھر بھی آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے اب بھی زبان نہ کھولی تو مجھے کوئی اور طریقہ ڈھونڈنا ہوگا۔''

اندھیرے میں سعد نے تیر چلایا تھا جو سید ھا نشانے پر بیٹھا اور امجد کا حوصلہ پست ہو گیا اور وہ بولتا چلا گیا۔

''جب پیسا نہ ملنے کا کوئی راستہ نہ دکھائی دیا تو فریدہ نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس بہنوئی صاحب کے بیس ہزار ڈالر ہیں۔ تب انہوں نے ایک ڈراما رچایا تھا۔ مجھے کہا تھا کہ میں چپکے سے پیچھے سے ان کی بیڈروم میں آ کر چوری کرلوں۔ انہوں نے عقب کی طرف والی کھڑکی کی چٹخنی بھی کھلی چھوڑ دی تھی۔ انہوں نے اپنے اصل زیورات کی جگہ نقلی زیورات رکھ دیے تھے۔ میں نے جا کر ان زیورات کے ساتھ بیس ہزار ڈالر چوری کرنے تھے اور ملک سے فرار ہو جانا تھا۔''

''اور تم نے ایسا نہیں کیا۔'' انسپکٹر سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

''جی..... کیونکہ میرے پیچھے کچھ آدمی لگے ہوئے تھے اور میں نکل ہی نہیں سکا لیکن اس دوران جانے کس نے وہاں سے زیورات چوری کرلیے۔ فریدہ کبھی یہ میں نے کیا ہے اور چوری کرنے کے بعد سامان نہیں بکھیرا تھا۔ جو کہ انہوں نے بکھیرا اور رات کو مجھے کال کی۔''

''زیورات تو ظفر نے چوری کیے تھے۔''

امجد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو؟''

''جب میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا تو مجھے کھڑکی کے پاس کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دیا جو قمیص کا تھا اور کھڑکی کے پٹ سے جھانکتے ہوئے ایک کیل میں پھنس گیا تھا۔ ظفر کو پتا نہیں چلا تھا۔ اگر پتا چلا ہوتا تو یقیناً وہ چھوٹا سا ٹکڑا جو وہاں پھنس کر اس کی قمیص کے پچھلے حصے سے الگ ہو کر وہاں رہ گیا تھا، وہ کیل سے چھڑا کر اپنا ثبوت غائب کر دیتا۔ تفتیش کے دوران میں نے اس کے پیچھے سے اس کی ایک طرف سے پھٹی ہوئی قمیص دیکھی جہاں سے وہ چھوٹا سا ٹکڑا غائب تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ وہ چوری اس نے کی تھی۔''

''تو آپ نے اسے پکڑا کیوں نہیں؟''

''میں اس معاملے کی تہ تک جانا چاہتا تھا۔ مجھے شک ہوا تھا کہ آنٹی فریدہ اور ظفر نے مل کر یہ چوری کی منصوبہ بندی کی ہے۔ ظفر پر میری نظر تھی۔ ظفر کی نگرانی پر جو آدمی میں نے مامور کیا تھا اچانک ظفر اس کی بے پروائی کی وجہ سے دائیں بائیں ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اور پھر رات کو آنٹی فریدہ کا قتل ہو گیا۔'' انسپکٹر سعد نے بتایا۔

''کہیں قتل ظفر نے تو نہیں کیا؟'' امجد نے کہا۔

''ظفر اس وقت حوالات میں ہے۔ مجھے اس تھانے سے فون آچکا ہے کیونکہ ظفر نے بتایا تھا کہ وہ احمد نواز کا ڈرائیور ہے۔ وہاں کا ایس ایچ او میرا کلاس فیلو ہے اور وہ جانتا ہے کہ احمد نواز سے میرا کیا تعلق ہے۔ اس لیے اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ ورکشاپ میں چوری کے الزام میں اپنے ساتھی کے ساتھ بند ہے۔ وہ نقلی زیورات بھی اس سے برآمد ہو چکے ہیں۔ اور جب اس کے ساتھی پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ ساری جیولری نقلی ہے تو اسے اتنا غصہ آیا کہ اس نے ظفر کا سر دیوار پر دے مارا۔ بہر حال ابھی وہ دونوں حوالات میں ہیں۔''

''پھر فریدہ کا قتل کس نے کیا ہے۔''

انسپکٹر سعد نے کچھ توقف کے بعد معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں قاتل تک بھی پہنچ چکا ہوں۔ اب آپ کو میرا تھوڑا سا ساتھ دینا پڑے گا۔''

☆......☆......☆

احمد نواز ڈرائنگ روم میں تھا اور اس وقت اس کا ڈاکٹر دوست اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب ڈاکٹر فارغ ہو کر جانے لگا تو انسپکٹر سعد اندر آ گیا۔

''تم کب آئے؟''

''مجھے ایک گھنٹا ہو گیا ہے میں اسی گھر میں ہوں۔'' انسپکٹر سعد نے کہا۔

''ایک گھنٹا ہو گیا ہے اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔'' احمد نواز نے کہا۔

''آپ ڈاکٹر کے ساتھ مصروف تھے۔ اس لیے میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''چوکیدار کے خلاف قتل کی ایف آئی آر کاٹ دی ہے؟'' احمد نواز نے پوچھا۔

''نہیں..... بلکہ میں نے اسے رہا کر دیا ہے کیونکہ وہ قاتل نہیں ہے۔'' انسپکٹر سعد نے کہا۔

''تم نے اسے رہا کیوں کیا؟ وہی قاتل ہے۔ میں کہہ رہا ہوں۔'' احمد نواز نے اپنی بات پر زور دیا۔

''قاتل کوئی اور ہے۔'' انسپکٹر سعد کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''کون ہے؟ کیا گرفتار کرلیا ہے تم نے؟'' احمد نواز نے پوچھا

''جی ہاں۔'' انسپکٹر سعد نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کھل کر بتاؤ۔ کس نے قتل کیا ہے میری فریدہ کا؟'' احمد نواز پُرجوش ہوگیا۔

انسپکٹر سعد نے اپنے کوٹ کی جیب سے ٹائی نکال کر احمد نواز کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے وہ ٹائی جس سے آنٹی فریدہ کا گلا دبایا گیا تھا۔''

''یہ کس کی ٹائی ہے؟'' احمد نواز نے ٹائی کی طرف ایک نظر دیکھا۔

''آپ کے کمرے سے لے کر آیا ہوں۔ یہ آپ کی ٹائی ہے۔'' انسپکٹر سعد نے بتایا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' احمد نواز نے اسے گھورا۔

''آپ نے ہی آنٹی فریدہ کا گلا اس ٹائی سے دبایا اور انہیں مار دیا۔ کیونکہ وہ اپنے بھائی امجد کے ساتھ باتیں کررہی تھیں اور آپ نے ان کی باتیں سن لیں۔ اور آپ کو یہ پتا چل گیا کہ آنٹی فریدہ نے چوری کا ڈراما اپنے بھائی امجد کے لیے رچایا تھا اور یہ بات آپ سے برداشت نہیں ہوئی اور آپ کا بلڈ پریشر شوٹ کرگیا اور آپ کو اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہوگیا تھا۔'' انسپکٹر سعد نے انکشاف کیا۔

''میں تو نیند کی گولی کھا کر سوگیا تھا۔ مجھے تو ہوش ہی نہیں تھی۔'' احمد نواز کا لہجہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔

''نیند کی گولی آپ نے قتل کرنے کے بعد کھائی تھی۔ ورنہ اس کا اثر اتنا نہیں ہوسکتا تھا کہ آپ رات ساڑھے نو بجے ایک ہلکی ڈوز کھانے کے بعد اتنی گہری نیند سوئے رہتے۔ میں اس نیند کی گولی کے بارے میں ڈاکٹر سے پوچھ چکا ہوں۔''

''شاید تم اپنی خالہ کی محبت میں مجھے قاتل بنا رہے ہو۔ کیونکہ میرا رویہ تمہاری خالہ کے ساتھ ہمیشہ سخت رہا تھا۔ اس کا انتقام لے رہے ہو تم۔'' احمد نواز بولا۔

''آنٹی کا موبائل آٹو ریکارڈنگ پر تھا۔ میں نے ان کی اس کے بھائی امجد کے ساتھ ہونے والی گفتگو سنی ہے۔ اس کی روشنی میں میں نے جو بھی کہا ہے وہ ٹھیک کہا ہے۔''

''بکواس ہے یہ۔ پاگل ہوگئے ہو تم۔'' احمد نواز چیختا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھا۔

''جب چوکیدار نے بتایا تھا کہ وہ شخص فون کرنے اوپر گیا تھا تو آپ بھاگ کر اوپر ٹیلی فون سیٹ لینے چلے گئے تاکہ اس وقت کی گئی فون کال کو آپ ڈیلیٹ کردیں۔ اور ایسا کرکے آپ فون سیٹ نیچے لے آئے تھے میں حیران تھا کہ آپ تو اُٹھ کر ایک گلاس پانی کا نہیں پیتے اوپر سے ٹیلی فون سیٹ کیسے لینے چلے گئے۔''

''تم ہوا میں تیر چلا رہے ہو۔'' احمد نواز چلایا۔

''آپ ذرا ٹائی کو غور سے دیکھیں۔ جب آپ ٹائی و آنٹی فریدہ کے گلے میں ڈال کر ان کا گلا دبا رہے تھے تو مزاحمت کے دوران ٹائی پر لگا اس کمپنی کا ٹیگ آنٹی فریدہ کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ جو میں نے لاش کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی انگلیوں سے نکال کر پلاسٹک کی تھیلی میں محفوظ کرلیا تھا۔'' انسپکٹر سعد نے نیا انکشاف کیا۔

''یہ کیا ثبوت ہے۔ اس کمپنی کی ٹائی صرف میں ہی پہنتا ہوں۔ یہ جھوٹ ہے۔'' احمد نواز نے چیخ کر اس بات کو بھی رد کردیا۔ اسی دوران انسپکٹر سعد کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ یکدم امجد اندر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی احمد نواز کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ اس کی کنپٹیوں کی رگیں پھولنے لگیں۔ وہ بے قابو ہوکر اس کی طرف بڑھا۔

''تجھے جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں آنے کی؟ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم نے اپنے دوست کی مدد سے میری کار چوری کی تھی۔ تم نے مجھے نقصان پہنچایا تھا۔ تمہاری بہن تمہارے لیے چوری کا ڈراما رچا رہی تھی اور جیں ہزار ڈالر اس نے تجھے دینے کے لیے کھیل کھیلا تھا۔ وہ مجھے دغا دے رہی تھی۔ میں نے وہ برداشت نہ کرتے ہوئے اسے مار دیا تھا اور اب تجھے بھی نہیں چھوڑوں گا......'' احمد نواز اپنا ہوش کھو چکا تھا۔ وہ بولتے ہوئے بھول گیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کن لوگوں کے سامنے کہہ رہا ہے۔ اور جب اچانک اسے احساس ہوا کہ اس نے کچھ زیادہ ہی بول دیا ہے اور ایسا بول دیا ہے کہ اس نے خود اقرارِ جرم کرلیا ہے تو وہ چپ ہوکر اسی جگہ رک گیا۔ اس کے اعصاب ڈھیلے ہوگئے۔ انسپکٹر سعد پہلے ہی سوچ کر آیا تھا کہ اگر احمد نواز نے اس کی باتوں کو ماننے سے انکار کردیا تو یقیناً وہ امجد کو دیکھ کر غصے میں پاگل ہوکر اقرارِ جرم ضرور کرلے گا۔ کیونکہ سعد اچھی طرح سے جانتا تھا کہ احمد نواز غصے میں کسی جنونی پاگل کی طرح بے قابو ہوکر اپنا ہوش کھو دیتا ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا اور احمد نواز قانون کی گرفت میں آگیا۔